www.Paksociety.com
جنوری 2012
خواتین ڈائجسٹ
سالِ نو نمبر
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
کی پیشکش
www.Paksociety.com

جنوری 2012
جلد 39 شمارہ 9
قیمت 50 روپے

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872
Email: khawateendigest@hotmail.com , info@khawateendigest.com

مدیرہ

خواتین ڈائجسٹ کا جنوری کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔
نئے سال کا پہلا شمارہ۔
ساعتیں تمام ہو رہی ہیں اور وقت کا دھارا بہتا جا رہا ہے۔ زندگی نے ایک اور سال کی مسافت طے کرلی۔ نئی خواہشوں، نئے خیالوں اور نئے خوابوں کا ایک اور سورج طلوع ہو رہا ہے۔
اب جبکہ نئے سال کی دہلیز پر کھڑے ہیں۔ سال گزشتہ ایک زیاں کی صورت ہمارے سامنے ہے۔ تقریباً ہر شعبہ میں بگاڑ کی رفتار اتنی تیز رہی کہ اصلاح احوال کی کوئی کوشش بار آور ہوتی نظر نہیں آئی۔ طاقت کا کھیل تماشا نت نئے رنگوں میں سامنے آیا۔ متعدد ادارے بے توقیر اور انتہائی اہم اور سنجیدہ مسائل مناظروں اور زبان دانی کے کمالات کی نذر ہوگئے۔
بہت کچھ کھو چکے ہیں لیکن ابھی وقت نکلا نہیں۔ قدرت نے ہمارے ملک کو بہت نوازا ہے۔ بہتری کا امکان کبھی ختم نہیں ہوتا۔ آنے والا وقت مہربان ہوسکتا ہے۔ اگر بے یقینی اور بے سمتی کی گرد سے نکل کر ایک واضح سمت کا تعین کرلیا جائے۔
اللہ تعالیٰ سے دعا ہے نیا سال ہم سب کی زندگیوں میں روشنی بن کر آئے۔ ہمارے ملک میں امن، سلامتی اور خیر ہو۔ آمین۔

انشاجی کی برسی،

انشاجی، چاند نگر کے باسی، راہ نورد، کوچہ گرد اس بستی کے ایک کوچے میں کچھ وقت قیام کیا۔ دلوں میں اپنا موہ جگا کر ایک انجانی بستی کی طرف نکل گئے جہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آتا۔
انشاجی کے کالم زندگی کے عکاس ہیں۔ سادگی، بے ساختگی، برجستگی ان کی شخصیت کی طرح تکلف اور بناوٹ سے کوسوں دور۔ غم، خوشی، تلخی، شکوہ روزمرہ زندگی کا کوئی بھی پہلو، وہ ایسے شگفتہ اور لطیف انداز میں لکھتے تھے کہ مسکراہٹ لبوں سے جدا نہیں ہونے پاتی۔
ان کی شاعری دیکھیں تو یہاں ایک اور انشاجی نظر آتے ہیں جوگ، جوگ کی باتیں، تنہائی کا دکھ سہتے انشاجی دلوں میں درد جگاتے جاتے ہیں۔
11 جنوری سنہ 1977ء کو انشاجی ہم سے جدا ہوگئے تھے لیکن ان کے کالم، ان کے سفرنامے، ان کی شاعری، ان کو اردو ادب میں ہی نہیں اردو پڑھنے والوں کے دلوں میں بھی زندہ رکھے گی۔

روبرو،

فروری کے شمارے میں بشریٰ سعید آپ کے روبرو ہوں گی۔ آپ بشریٰ سعید سے ان کی تحریر دل رقص جنوں اور سفال گر کے حوالے سے کچھ پوچھنا چاہتی ہیں تو ہمیں اپنے سوالات بھجوادیں۔ پتا یہ ہے۔
بشریٰ سعید معرفت خواتین ڈائجسٹ۔ 37۔ اردو بازار کراچی۔

اس شمارے میں،

- فرحت اشتیاق کا مکمل ناول "جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو"،
- کنیز نبوی کا مکمل ناول "روشنی کی خواہش میں"،
- نبیلہ عزیز کا مکمل ناول "پناہ"
- راحت جبیں اور صوفیہ امجد کے ناولٹ،
- راشدہ رفعت، ثمینہ عظمت علی، راحت وفا اور ام ثمامہ کے افسانے،
- رفعت ناہید سجاد اور نگہت عبداللہ کے ناول،
- خدا اور محبت کی ایمان، سعدیہ خان سے ملاقات،
- ٹی وی فنکار عمران اسلم سے باتیں،
- سفال گر پر آمنہ نذیر کا تبصرہ،
- سال نو پر قارئین سے سروے،
- کرن کرن روشنی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں،
- نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور عدنان کے مشورے شامل ہیں۔

خواتین ڈائجسٹ کے بارے میں اپنی رائے ضرور لکھیے گا۔ ہم منتظر ہیں۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔
پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے، اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔
کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔
ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔
حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

جہاد کا ثواب

حضرت انس جہنیؓ کے والد فرماتے ہیں کہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک غزوہ میں گیا۔ وہاں لوگ اس طرح ٹھہرے کہ آنے جانے کے لیے راستے بند ہوگئے۔
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں میں اعلان کرنے کے لیے ایک آدمی بھیجا۔
"جو اس طرح ٹھہرا کہ آنے جانے کا راستہ بند کردیا، اسے جہاد کا ثواب نہیں ملے گا۔" (ابوداؤد)

گالی دینا

حضرت عبداللہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔
"مسلمان کو گالی دینا بے دینی ہے اور قتل کرنا کفر ہے۔" (بخاری)
ف: جو مسلمان کسی مسلمان کو قتل کرتا ہے، وہ اپنے اسلام کے کامل ہونے کی نفی کرتا ہے اور ممکن ہے کہ قتل کرنا کفر پر مرنے کا سبب بھی بن جائے۔ (مظاہر حق)

مسلمان کا گالی دینا

حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔
"مسلمان کو گالی دینے والا اس آدمی کی طرح ہے جو ہلاکت و بربادی کے قریب ہو۔" (طبرانی، جامع صغیر)

گالی دینے والے

حضرت عیاض بن حمارؓ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا۔
"اے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! میری قوم کا ایک شخص مجھے گالی دیتا ہے جبکہ وہ مجھ سے کم درجہ کا ہے۔ کیا میں اس سے بدلہ لوں؟"
نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

"آپس میں گالی گلوچ کرنے والے دو شخص دو شیطان ہیں جو آپس میں فحش گوئی کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو جھوٹا کہتے ہیں۔" (ابن حبان)

نصیحت

حضرت ابو جری جابر بن سلیم فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا۔
"مجھے نصیحت فرمادیجیے۔"
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ "کبھی کسی کو گالی نہ دینا۔"
حضرت ابو جری فرماتے ہیں کہ اس کے بعد سے میں نے کبھی کسی کو گالی نہیں دی' نہ آزاد کو' نہ غلام کو' نہ اونٹ کو' نہ بکری کو۔ نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔
"کسی نیکی کو بھی معمولی سمجھ کر نہ چھوڑو۔ (یہاں تک کہ) تمہارا اپنے بھائی سے خندہ پیشانی سے بات کرنا بھی نیکی میں داخل ہے۔ اپنا تہبند آدھی پنڈلیوں تک اونچا رکھا کرو۔ اگر اتنا اونچا نہ رکھ سکو تو (کم سے کم) ٹخنوں تک اونچا رکھا کرو۔ تہبند کو ٹخنوں سے نیچے لٹکانے سے بچو کیونکہ یہ تکبر کی بات ہے اور اللہ تعالیٰ کو تکبر ناپسند ہے۔ اگر کوئی تمہیں گالی دے اور تمہیں کسی ایسی بات پر عار دلائے جو تم میں ہو اور وہ اسے جانتا ہو تو اس کو کسی ایسی بات پر عار نہ دلانا جو اس میں ہو اور تم اسے جانتے ہو' اس صورت میں اس عار دلانے کا وبال اسی پر ہوگا۔" (ابوداؤد)

تین باتیں

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے۔ آپ کی موجودگی میں ایک شخص نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو برا بھلا کہا۔
آپ صلی اللہ علیہ وسلم (اس شخص کے مسلسل برا بھلا کہنے اور حضرت ابوبکرؓ کے صبر کرنے اور خاموش رہنے پر) خوش ہوتے رہے اور تبسم فرماتے رہے پھر جب اس آدمی نے بہت ہی زیادہ برا بھلا کہا تو حضرت ابوبکرؓ نے اس کی کچھ باتوں کا جواب دے دیا۔
اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ناراض ہو کر وہاں سے چل دیے۔
حضرت ابوبکرؓ بھی آپؐ کے پیچھے پیچھے آپؐ کے پاس پہنچے اور عرض کیا۔
"یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! (جب تک) وہ شخص مجھے برا بھلا کہتا رہا آپ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں تشریف فرما رہے۔ پھر جب میں نے اس کی کچھ باتوں کا جواب دیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ناراض ہو کر اٹھ گئے؟"
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔
"(جب تک تم خاموش تھے اور صبر کر رہے تھے) تمہارے ساتھ ایک فرشتہ تھا جو تمہاری طرف سے جواب دے رہا تھا پھر جب تم نے اس کی کچھ باتوں کا جواب دیا تو (وہ فرشتہ چلا گیا اور) شیطان بیچ میں آگیا اور میں شیطان کے ساتھ نہیں بیٹھتا۔" (لہٰذا میں اٹھ کر چل دیا)
اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔
"ابوبکر! تین باتیں ہیں جو سب کی سب بالکل حق ہیں۔
(1) جس بندے پر کوئی ظلم یا زیادتی کی جاتی ہے اور وہ صرف اللہ تعالیٰ کے لیے اسے درگزر کرتا ہے (اور انتقام نہیں لیتا) تو بدلہ میں اللہ تعالیٰ اس کی مدد کرکے اس کو قوی کر دیتے ہیں۔
(2) جو شخص صلہ رحمی کے لیے دینے کا دروازہ کھولتا ہے' اللہ تعالیٰ اس کے بدلے اس کو بہت زیادہ دیتے ہیں۔
(3) اور جو شخص دولت بڑھانے کے لیے سوال کا دروازہ کھولتا ہے' اللہ تعالیٰ اس کی دولت کو اور بھی کم کر دیتے ہیں۔" (مسند احمد)

دعا

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا فرمائی۔
"یا اللہ! میں آپ سے عہد لیتا ہوں' آپ اس کے خلاف نہ کیجیے گا۔ وہ یہ ہے کہ میں ایک انسان ہی ہوں' لہٰذا جس کسی مومن کو میں نے تکلیف دی ہو' اس کو برا بھلا کہہ دیا ہو' لعنت کی ہو' مارا ہو تو آپ ان سب چیزوں کو اس مومن کے لیے رحمت اور گناہوں سے پاکی اور اپنی ایسی قربت کا ذریعہ بنا دیجیے کہ اس کی وجہ سے آپ اس کو قیامت کے دن اپنا قرب عطا فرما دیں۔" (مسلم)

مردوں کی برائی

حضرت عبداللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔
"اپنے (مسلمان) مردوں کی خوبیاں بیان کیا کرو اور ان کی برائیاں نہ بیان کرو۔" (ابوداؤد)

بدترین سود

حضرت براء بن عازبؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔
"بدترین سود اپنے مسلمان بھائی کی آبروریزی کرنا ہے (یعنی اس کی عزت کو نقصان پہنچانا ہے' چاہے کسی طریقے سے ہو۔ مثلاً "غیبت کرنا' حقیر سمجھنا' رسوا کرنا۔ وغیرہ وغیرہ")" (طبرانی' جامع صغیر)
ف: مسلمان کی آبروریزی کو بدترین سود اس وجہ سے کہا گیا ہے کہ جس طرح سود میں دوسرے کے مال کو ناجائز طریقہ پر لے کر اسے نقصان پہنچایا جاتا ہے' اسی طرح مسلمان کی آبروریزی کرنے میں اس کی عزت کو نقصان پہنچایا جاتا ہے اور چونکہ مسلمان کی عزت اس کے مال سے زیادہ محترم ہے' اس وجہ سے آبروریزی کو بدترین سود فرمایا گیا ہے۔ (فیض القدیر' بذل المجہود)

مسلمان کی بے عزتی

حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔
"کبیرہ گناہوں میں سے ایک بڑا گناہ کسی مسلمان کی عزت پر ناحق حملہ کرنا ہے۔" (ابوداؤد)

سفارش

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا۔
"جس شخص کی سفارش اللہ تعالیٰ کی حدود میں سے کسی حد کے جاری ہونے سے مانع بن گئی (مثلاً" اس کی سفارش کی وجہ سے چور کا ہاتھ نہ کاٹا جاسکا) اس نے اللہ تعالیٰ سے مقابلہ کیا۔ جو شخص یہ جانتے ہوئے کہ وہ ناحق پر ہے' جھگڑا کرتا ہے تو جب تک وہ اس جھگڑے کو چھوڑ نہ دے' اللہ تعالیٰ کی ناراضی میں رہتا ہے اور جو شخص مومن کے بارے میں ایسی بری بات کہتا ہے جو اس میں نہیں ہے' اللہ تعالیٰ اس کو دوزخیوں کی پیپ اور خون کی کیچڑ میں رکھیں گے' یہاں تک کہ اپنے بہتان کی سزا پاکر اس گناہ سے پاک ہو جائے۔" (ابوداؤد)

اللہ کی راہ (جہاد) میں روزے رکھنے کی فضیلت

سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اللہ کی راہ (جہاد) میں ایک دن روزہ رکھے تو اللہ تعالیٰ اس کے منہ کو دوزخ سے ستر برس کی راہ تک دور کرتا ہے۔

سیدنا عمر بن خطابؓ کی فضیلت

سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔
"میں سو رہا تھا۔ میں نے لوگوں کو دیکھا کہ وہ سامنے

لائے جاتے ہیں اور وہ کرتے پہنے ہوئے ہیں' بعض کے کرتے چھاتی تک ہیں اور بعض کے اس کے نیچے پھر عمر نکلے تو وہ اتنا نیچا کرتا پہنے ہوئے تھے' جو زمین پر گھسٹتا جاتا تھا۔"

لوگوں نے عرض کیا۔ "یا رسول اللہ اس کی تعبیر کیا ہے۔؟"

آپ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم نے فرمایا کہ "دین۔"

(صحیح مسلم)

پسندیدہ عبادتیں

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم نے فرمایا۔

"اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جس نے میرے کسی ولی سے دشمنی کی اسے میری طرف سے اعلان جنگ ہے اور میرا بندہ جن جن عبادتوں سے میرا قرب حاصل کرتا ہے اور کوئی عبادت مجھے اس سے زیادہ پسند نہیں ہے جو میں نے اس پر فرض کی ہے (یعنی فرائض مجھے بہت پسند ہیں جیسے نماز' روزہ' حج' زکوۃ) اور میرا بندہ فرض ادا کرنے کے بعد نفل عبادتیں کر کے مجھ سے اتنا نزدیک ہو جاتا ہے کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں' پھر جب میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں تو میں اس کا کان بن جاتا ہوں' جس سے وہ سنتا ہے' اس کی آنکھ بن جاتا ہوں' جس سے وہ دیکھتا ہے' اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے' اس کا پاؤں بن جاتا ہوں' جس سے وہ چلتا ہے اور اگر وہ مجھ سے مانگتا ہے تو میں اسے دیتا ہوں اگر وہ کسی دشمن یا شیطان سے میری پناہ کا طالب ہوتا ہے تو میں اسے محفوظ رکھتا ہوں اور میں جو کام کرنا چاہتا ہوں اس میں مجھے اتنا تردد نہیں ہوتا جتنا کہ مجھے اپنے مومن بندے کی جان نکالنے میں ہوتا ہے وہ تو موت کو بوجہ تکلیف جسمانی کے پسند نہیں کرتا اور مجھے بھی اسے تکلیف دینا برا لگتا ہے۔"

تشریح : اس حدیث کا یہ مطلب نہیں ہے کہ بندہ عین خدا ہو جاتا ہے بلکہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جب بندہ میری عبادت میں غرق ہو جاتا ہے اور مرتبہ محبوبیت پر پہنچتا ہے تو اس کے حواس ظاہری و باطنی سب شریعت کے تابع ہو جاتے ہیں وہ ہاتھ پاؤں کان آنکھ سے صرف وہی کام لیتا ہے' جس میں میری مرضی ہے۔ خلاف شریعت اس سے کوئی کام سرزد نہیں ہوتا۔ (اور اللہ کی عبادت میں کسی غیر کو شریک کرنا شرک ہے' جس کی سزا آگ ہے۔)

قیامت

سہل رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم نے فرمایا۔

"میں اور قیامت اتنے نزدیک نزدیک بھیجے گئے ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم نے اپنی دو انگلیوں کے اشارہ سے (اس نزدیکی کو) بتایا' پھر ان دونوں کو پھیلایا۔"

تشریح : مطلب یہ ہے کہ مجھ میں اور قیامت میں اب کسی نئے پیغمبر و رسول کا فاصلہ نہیں ہے اور میری امت آخر امت ہے اسی پر قیامت آئے گی۔

قیامت کا بیان

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ و سلم نے فرمایا۔

"قیامت اس وقت تک قائم نہ ہو گی جب تک سورج مغرب سے نہ نکلے گا۔ جب سورج مغرب سے نکلے گا اور لوگ دیکھ لیں گے تو سب ایمان لے آئیں گے' یہی وہ وقت ہو گا جب کسی کے لیے اس کا ایمان نفع نہیں دے گا جو اس سے پہلے ایمان نہ لایا ہو گا یا جس نے ایمان کے بعد عمل خیر نہ کمایا ہو۔ پس قیامت آجائے گی اور دو آدمی کپڑا درمیان میں (خرید و فروخت کے لیے) پھیلائے ہوئے ہوں گے ابھی خرید فروخت بھی نہیں ہو چکی ہو گی اور نہ انہوں نے اسے لپیٹا ہی ہو گا (کہ قیامت قائم ہو جائے گی) اور قیامت اس حال میں قائم ہو جائے گی کہ ایک شخص اپنی اونٹنی کا دودھ لے کر آرہا ہو گا اور اسے پی بھی نہیں سکے گا اور قیامت اس حال میں قائم ہو جائے گی کہ ایک شخص اپنا حوض تیار کرا رہا ہو گا اور اس کا پانی بھی نہ پی پائے گا اور قیامت اس حال میں قائم ہو جائے گی کہ ایک شخص اپنا لقمہ اپنے منہ کی طرف اٹھائے گا اور اسے کھانے بھی نہ پائے گا۔"

تشریح : اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ قیامت اچانک ہی آجائے گی کسی کو خبر بھی نہ ہو گی' لوگ اپنے اپنے دھندوں میں مصروف ہوں گے کہ قیامت قائم ہو جائے گی۔

دنیا سے دل نہ لگانا اور آخرت کی فکر میں رہنا

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم کا ایک کان کٹے' مرے ہوئے بکری کے بچے پر گزر ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ و سلم نے فرمایا۔

"تم میں کون پسند کرتا ہے کہ (مردہ بچہ) اس کو ایک درہم کے بدلے مل جائے۔"

لوگوں نے عرض کیا (درہم تو بڑی چیز ہے) ہم تو اس کو پسند نہیں کرتے ہم کہ وہ کسی ادنیٰ سی چیز کے بدلے میں بھی ملے۔"

آپ صلی اللہ علیہ و سلم نے فرمایا۔ "قسم اللہ کی' دنیا اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس سے بھی زیادہ ذلیل ہے۔ جس قدر یہ تمہارے نزدیک۔"

(مسلم' حیوۃ المسلمین)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم ایک چٹائی پر سوئے پھر اٹھے تو آپ کے بدن مبارک پر چٹائی کا نشان ہو گیا تھا۔ ابن مسعود نے عرض کیا۔

"یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم! آپ ہم کو اجازت دیجیے کہ ہم آپ کے لیے بستر بچھا دیں اور (بستر) بنا دیں۔"

آپ صلی اللہ علیہ و سلم نے فرمایا۔ "مجھ کو دنیا سے کیا واسطہ۔ میری اور دنیا کی مثال تو ایسی ہے جیسے کوئی سوار (چلتے چلتے) کسی درخت کے نیچے سایہ لینے کو ٹھہر جائے۔ پھر اس کو چھوڑ کر آگے چل دے۔"

(احمد' ترمذی ابن ماجہ)

خدا کا خوف اور تقویٰ ہی فضیلت و قرب کا باعث ہے

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ و سلم نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو جب یمن کے لیے قاضی یا عامل بنا کر روانہ فرمایا تو ان کو رخصت کرتے وقت (ایک طویل حدیث میں) آپ صلی اللہ علیہ و سلم نے چند نصیحتیں اور وصیتیں ان کو فرمائیں اور ارشاد فرمایا۔

"اے معاذ! شاید میری زندگی کے اس سال کے بعد میری تمہاری ملاقات اب نہ ہو۔"

یہ سن کر حضرت معاذؓ آپ کے فراق کے صدمہ سے رونے لگے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم نے ان کی طرف سے منہ پھیر کر اور مدینہ کی طرف رخ کر کے فرمایا۔ (غالباً "آپ خود بھی آبدیدہ ہو گئے تھے اور بہت متاثر تھے۔)

"مجھ سے بہت زیادہ قریب اور مجھ سے تعلق رکھنے والے وہ سب بندے ہیں جو خدا سے ڈرتے ہیں (اور تقویٰ والی زندگی گزارتے ہیں) وہ جو بھی ہوں اور جہاں کہیں بھی ہوں۔"

(مسند احمد' معارف الحدیث)

عرق النسا کا علاج

حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم نے فرمایا۔

"عرق النسا کا علاج یہ ہے کہ جنگلی بھیڑ (یا جنگلی دنبے) کی چکتی کو لے کر پگھلا لیا جائے' پھر اس کے تین حصے کر لیے جائیں' پھر روزانہ ایک حصہ نہار منہ پی لیا جائے۔"

فوائد و مسائل : عرق النساء ایک درد ہے جو سرین کے جوڑ سے شروع ہو کر ران کی پچھلی طرف نیچے کی طرف آتا ہے۔ بعض اوقات یہ درد ٹخنے تک بھی پہنچ جاتا ہے' مرض جتنا پرانا ہوتا جائے ٹانگ اتنی زیادہ متاثر ہوتی جاتی ہے۔

جنگلی بھیڑ کا تعین اس لیے کیا گیا ہے کہ اس کی خوراک ایسے جنگلی پودے ہیں جو گرم تاثیر رکھتے ہیں۔ اس بیماری کا سبب گاڑھا چپکنے والا مادہ ہے جو اس علاج کے نتیجے میں نرم ہو جاتا ہے۔ ✡

جب عمر کی نقدی ختم ہوئی

پروین شاکر

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں
کہیں سے آبِ بقائے دوام لا ساقی

میں حیران تھی کہ ابراہیم جلیس کے جانے کے بعد بھی یہ شعر مجھے اب تک اپنی گرفت میں کیوں لیے ہوئے ہے۔ 1978ء کی بارہویں صبح نے میری حیرت کا جواب دے دیا۔ چاند نگر کا باسی، شہر سخن کا جوگی، سواد تبسم کا سفیر ابن انشاء ہم سے بچھڑ گیا۔

اردو کے اس البیلے شگفتہ بیان کے فنی منصب کے متعلق کچھ کہنا اس وقت میرے بس میں نہیں۔ ہاں اتنا ضرور کہوں گی کہ فی زمانہ جبکہ ہر اخبار اپنی مالی اور اخلاقی استطاعت کے مطابق ایک نہ ایک کالم نگار ضرور رکھتا ہے، انشاء جی کے لیے پالیسی وضع کرنے کی جرأت کسی میں نہ ہوئی۔ اپنے موضوعات کا تعین وہ خود کرتے تھے اور ان کے قلم کی گرفت میں آتے ہی بات کیا سے کیا ہو جاتی تھی۔ کلاسیکی ادب کا رچا ہوا ذوق، مشاہدے کی دل آویزی، گہرائی اور انداز بیان کی ندرت، یہ سب کچھ مل کر ان کے کالم کو ایک دن کی عمر والے کالموں سے بالکل مختلف بنا دیتی ہیں۔ اپنے سیاق و سباق سے ہٹ کر بھی یہ زندہ جاوید ہیں۔ ان کالموں کے بارے میں مختصراً" یہی کہا جا سکتا ہے کہ ان کے ذریعے انشاء جی نے ہماری حس مزاح کی تہذیب کی۔

جہاں تک ان کی شخصیت کا تعلق ہے، تو اس کے بارے میں کچھ کہنا ان لوگوں کا حق بنتا ہے، جو ان کے بہت قریب تھے۔ عالی صاحب ہیں، اشفاق احمد صاحب، احمد بشیر صاحب ہیں، لیکن انشاء جی نے خلوص کی دولت دونوں ہاتھوں سے لٹائی تھی اور ان کے مقروض مجھ جیسے بے ہنر بھی ہیں۔

انشاء جی سے میری پہلی ملاقات آج سے کوئی آٹھ برس قبل ریڈیو اسٹیشن پر ہوئی، ان دنوں ہم لوگ اردو شاعروں پر ایک سیریز "فنکار" کے نام سے کر رہے تھے۔ میں نے ان کی شاعری پر مضمون لکھنا چاہا تو مجھے "چاند نگر" کے ساتھ انہوں نے "اس بستی کے اک کوچے میں" کا مسودہ بھی تھما دیا۔ میں مبہوت ہو گئی۔

"انشاء جی! آپ مجھے مسودہ دے رہے ہیں، حالانکہ میری آپ سے یہ پہلی ملاقات ہے۔"

"اسی لیے تو دے رہا ہوں تاکہ یہ آخری ملاقات نہ بن جائے۔"

انشا جی کی اس شگفتہ تاویل سے قطع نظر، جس چیز نے مجھے سرشار کر دیا، وہ ان کا مجھ پر اعتبار تھا۔ ہمارے درمیان قلم کا رشتہ تھا اور یہ رشتہ ان کی بڑائی کی وجہ سے ساری عمر معتبر رہا۔

اپنے مضمون میں، میں نے انشاء جی کے ہاں "چاند" کے کردار کا موازنہ شیلے کے "تصور مہتاب" سے بھی کیا تھا اور اپنی دانست میں بڑا معرکہ سر کیا تھا۔ پروگرام کے دوران انشاء جی بے حد سنجیدہ بیٹھے رہے، مگر دبیز چشمے کے پیچھے سے ان کی آنکھیں برابر مسکرائے جا رہی تھیں۔ اسٹوڈیو سے باہر نکلتے ہوئے انہوں نے بڑی آہستگی سے مجھ سے کہا۔

"بھئی! تمہارا مضمون تو بہت خوب تھا، مگر یہ جو تمہارے شیلے صاحب ہیں ناں، انہیں ہم نے پڑھا وڑھا بالکل نہیں ہے۔"

اس دور میں جبکہ موسم اور کنوینس پرابلم پر بھی گفتگو کرتے ہوئے دانشور "نطشے یا سارتر پالور کا" سے بات شروع کرنا پسند کرتے ہیں۔ ایک بہت بڑے آدمی کا، چھوٹا سا اعتراف میرا دل موہ گیا اور یوں ہمارے درمیان ساری عمر کے لیے ایک انڈر اسٹینڈنگ قائم ہو گئی۔ ریڈیو پر جب کبھی میری ریکارڈنگ ہوتی، یہ بہت کم ہوا کہ میں ان سے ملنے تھیوسوفیکل ہال ان کے دفتر نہیں گئی۔ کتابوں کے جھرمٹ میں گھرے ہوئے انشاء جی دیکھتے ہی مسکراتے اور ان کا پہلا سوال عموماً" یہی ہوتا۔

"سناؤ بھئی! کوئی نظم لکھی تم نے؟"

ایک دفعہ شرارتاً "میں نے کہہ دیا۔

"کوئی نیا کالم لکھا آپ نے؟"

انشاء جی نے چوٹ کو انجوائے کیا، مگر پھر اداس ہو گئے۔ میں نے انہیں بہت کم اداس دیکھا تھا، کہنے لگے

"اب شعر نہیں ہوتے، لوگ میری شاعری بھولتے جا رہے ہیں، کالم یاد رکھنے لگے ہیں۔"

تب میں نے انہیں یقین دلایا کہ "ایسا نہیں ہے، آپ کی بنیادی حیثیت شاعر ہی کی ہے، لیکن چونکہ "چاند نگر" کے بعد سے آپ کا کوئی مجموعہ نہیں آیا اور کالم لوگ ہر ہفتے پڑھ لیتے ہیں، اس لیے وہ آپ کو ایک کالمسٹ ہی سمجھ بیٹھے ہیں۔"

"نہیں بھئی! کالم تو میں یوں ہی لکھتا ہوں، کبھی کبھی تو دفتر میں ہی بیٹھے بیٹھے لکھ جاتا ہوں۔"

"جی ہاں! کبھی کبھی ایسا ہی لگتا ہے۔"

انشاء جی کا موڈ ایک دم خوشگوار ہو گیا، کہنے لگے۔

"کسی دفتری کالم میں تمہاری خبر لوں گا۔"

لیکن وہ بڑے ظرف کے آدمی تھے۔ انہیں صرف چھیڑنے میں مزا آتا تھا، رلانے کی حد تک تنگ کرنا کبھی ان کے مذہب میں شامل نہیں رہا۔ ان کا ظرف تو ایسا تھا کہ ان کی زندگی میں ہی ایک فلمی شاعر نے ان کی شہرۂ زمانہ غزل پر کمال ڈھٹائی سے ہاتھ صاف کیا اور وہ بجز ایک شائستہ احتجاجی کالم لکھنے کے اور کچھ نہ کر سکے۔

مجھے معلوم ہے کہ ان کی یاد میں بڑے تعزیتی اجلاس ہوں گے۔ ان کے پسماندگان کے سلسلے میں بڑی قراردادیں پاس ہوں گی۔ کسی فنڈ کے قائم کرنے کی تجویز، حکومت کو وظیفہ دینے پر آمادہ کرنے کا مشورہ، لیکن بڑی معذرت کے ساتھ میں یہ کہنا چاہوں گی کہ اپنی تمام تر خوب صورتی کے باوجود، ان الفاظ کی گواہی کوئی ایسی معتبر نہ ہو گی، جو برادری زندہ رہتے ہوئے اپنے ایک فرد کے مفادات کا تحفظ نہ کر سکی۔ وہ اس کے مرنے کے بعد اس کے لواحقین کے لیے بھلا کس حد تک مخلص ثابت ہو سکتی ہے۔

خیر! بات ہو رہی تھی، انشاء جی کی اعلا ظرفی اور فراخدلی کی۔ نو آموزوں کی حوصلہ افزائی میں احمد ندیم قاسمی کے بعد میں نے انشا جی کو ہی اتنا وسیع القلب پایا۔

یاد آ رہا ہے کہ کچھ عرصے پہلے ٹیلی ویژن سے نئے

شاعروں پر ایک سیریز شروع کی گئی تھی۔ "نئی آواز" میرا نمبر آیا تو میں نے ڈاکٹر کشفی اور ابن انشا کا نام تجویز کیا۔ "خوشبو" کا مسودہ جس شخص نے سب سے پہلے دیکھا' وہ ابن انشاء ہی تھے۔ مسودہ ہاتھ میں لیا تو بولے۔

"بتاؤ' تم سے کیسا سلوک کیا جائے؟"

"ویسا ہرگز نہیں جو اردو زبان کا ایک شاعر دوسرے شاعر کے ساتھ کرتا ہے۔"

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑے' پھر گردن ذرا سی اونچی کر کے بولے۔

"لڑکی! تم سے انصاف کیا جائے گا۔"

دوسرے دن ان کا فون آیا۔ "فوراً" پہنچو۔" میں بھاگم بھاگ دفتر گئی تو وہ میرے اشعار کے اعداد و شمار لیے بیٹھے تھے اور ایک بچے کی سی معصومیت کے ساتھ مجھے میری اپنی تفصیلات فراہم کر رہے تھے۔ اس بار مسکرانے کی باری میری تھی' لیکن میرے ہونٹوں پر نمودار ہونے والے پہلے خم کے ساتھ ہی انشاء جی نے فائل بند کر دی' اور بے بسی سے مسکرائے۔

"مشکل یہ ہے کہ تم نے ایم اے انگریزی میں کیا ہوا ہے۔"

پھر دیکھنے والوں نے دیکھا کہ "نئی آواز" انہوں نے کس محبت اور اپنائیت کے ساتھ کیا۔ انہوں نے پیش گوئی کی تھی کہ وہ دن دور نہیں جب "خوشبو" ہر تکیے کے نیچے ملے گی۔ مجھے نہیں معلوم کہ ان کی یہ پیش بینی کس حد تک سچی ثابت ہوئی' لیکن آج اگر وہ زندہ ہوتے تو "خوشبو" کی پذیرائی پر کتنے خوش ہوتے۔ انہیں اس کے ٹائٹل کی بھی بڑی فکر تھی۔

"بھئی صادقین سے بنوانا۔" انہوں نے کئی بار مجھ سے کہا تھا۔ کاش وہ اپنی اس خواہش کی تکمیل دیکھ سکتے۔

اسی پروگرام کے دوران ڈاکٹر کشفی نے میرا ایک شعر پڑھا تھا۔

دشمن ہے اور ساتھ رہے جان کی طرح
مجھ میں اتر گیا ہے سرطان کی طرح

مجھے یاد ہے کہ اس شعر کو سراہنے کے باوجود انشاء جی نے اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ کہا تھا۔

"مگر بھئی' اس شعر کی امیجری بہت خوفناک ہے۔"

اس وقت تو بات ہنسی مذاق میں ٹل گئی۔ پر کون کہہ سکتا تھا کہ جس مرض کا محض علامتی وجود انہیں شعر تک میں گوارا نہیں تھا۔ ایک دن خود ان کے جسم میں سرایت کر جائے گا اور یہ ہنستا ہنساتا' ایک زمانے کو اپنا اسیر رکھنے والا پیارا آدمی ایک دن اس ہزار پا کے شکنجے میں یوں کس جائے گا کہ اس کے پیارے آنسو بہا رہے ہوں گے اور اسے خبر بھی نہ ہو گی۔

مگر نہیں' شاید اپنے جانے کی اسے کچھ کچھ خبر ہو گئی تھی کہ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں ایک دنیا کو مسکراہٹ بانٹنے والا' ہاتھ پھیلائے کھڑا تھا۔

اب عمر کی نقدی ختم ہوئی !
اب ہم کو ادھار کی حاجت ہے
ہے کوئی جو ساہو کار بنے
ہے کوئی جو دیون ہار بنے
کچھ سال' مہینے' دن لوگو!
پر سود بیاج کے بن لوگو!
ہاں اپنی جاں کے خزانے سے
ہاں' عمر کے توشہ خانے سے

اسے کیا خبر کہ اس کے لیے سال مہینے' دن کیا' لوگ پوری پوری زندگیاں لیے کھڑے تھے۔ عمر کے توشہ خانے کے سب خزانے اس کے نام تھے' پر تقدیر کے آگے سب کے سکے کھوٹے نکلے اور ایک سانس بھی اس کا قرض نہ چکا سکی۔

☼

شب و روز' مہ و سال کا پر پیچ سفر' راہ میں کتنے ان دیکھے موڑ کتنی کھائیاں ہیں' نامعلوم کو جاننے کی جستجو میں انسان آگے بڑھتا جاتا ہے۔ کبھی کچھ پالیتا ہے اور کبھی خالی ہاتھ ہی لوٹنا پڑتا ہے۔ کبھی عمر بھر کا سفر رائیگاں ہو جاتا ہے' منزل سراب ثابت ہوتی ہے۔ جس کے لیے سرگرداں رہے وہ تو دھوکا تھا۔ سیدھی بات تو سامنے ہی دھری تھی' جو نظر ہی نہیں آئی۔

زندگی کے افق پر کچھ لوگ جگنوؤں کی مانند جھلملاتے ہیں وہ لوگ جو زندگی کو سمجھ پائے۔ جو جینے کا سلیقہ جانتے ہیں' جو اپنے فکر و عمل سے دوسروں کو راہ دکھاتے ہیں۔ سال نو کے سروے کا پہلا سوال اسی حوالے سے ہے۔ دیگر دو سوالات قارئین کے ذاتی حوالے سے ہیں۔

1۔ کچھ لوگ زندگی کے نشیب و فراز کا مقابلہ اس خوبی سے کرتے ہیں کہ ان کی شخصیت سے دوسروں کو حوصلہ ملتا ہے۔ کوئی ایسی شخصیت یا کردار جس نے آپ کو متاثر کیا یا ان کی کسی اچھی بات یا نصیحت نے آپ کی رہنمائی کی؟

2۔ اس سال آپ نے اپنا فارغ وقت کس طرح گزارا؟ مطالعہ' ٹی وی' دوست احباب سے گپ شپ یا گھومنا پھرنا؟

3۔ فارغ اوقات میں آپ کی بہترین تفریح یا مشغلہ؟ کون سی چیز زیادہ خوشی دیتی ہے؟

آیئے دیکھتے ہیں' ہماری قارئین نے کیا جوابات دیے ہیں۔

جاری ہے روشنی کا سفر

ادارہ

عروسہ شہوار ...... جہلم

1۔ کچھ لوگ ہوتے ہیں جو اپنی صلاحیت اپنی بصیرت اور اپنے قوت بازو پر بھروسا کرتے ہیں اور منزل پانے کے شوق میں آگے اور آگے ہی بڑھتے جاتے ہیں۔ ان کے راستے میں آنے والی کوئی مشکل' کوئی رکاوٹ' کوئی دیوار ان کے حوصلوں اور جذبوں کو پسپا نہیں کر سکتی۔ ان کے خواب سچ بولتے ہیں' تصور پاتے ہیں' ایسے لوگ حقیقت میں روشنی کا مینار ہوتے ہیں۔ ایسی ہی ایک ہستی ایسا ہی ایک نام "زینت فاطمہ۔" زینت فاطمہ میری بے حد پیاری دوست اس کا شمار "اسپیشل افراد" میں ہوتا ہے۔ بصارت سے محروم ہونے کے باوجود ماسٹرز کیا۔ اگرچہ بہت سی مشکلات کا سامنا رہا مگر جذبے ماند نہ پڑے۔ تعلیمی میدان میں کامیابی کے بعد ٹیچر ٹریننگ حاصل کی اور خود کو "اسپیشل ایجوکیشن" ادارے سے وابستہ کر لیا۔ اب اپنے جیسے بصارت سے محروم بچوں کو علم سکھا کر وہ بہت خوش اور مطمئن زندگی گزار رہی ہے۔ وہ زندگی کے معمولات میں بھرپور حصہ لیتی ہے۔ مہمان نوازی میں طاق اور ماہر بیوٹیشن ہے۔

2۔ فارغ وقت' سچ بتاؤں تو ملتا ہی نہیں' زندگی کے جھمیلے اور بکھیڑے اس قدر ہیں کہ فرصت کو ترس جاتے ہیں۔

"دل ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن"

مگر کیا جناب! ذرا جو فراغت ملتی ہے تو آرام میں گزارنا پسند ہے۔ ہاں! البتہ مطالعہ کا شوق جنون کی حد

تک ہے۔ گپ شپ بھی لگانے سے دلچسپی ہے۔ سیرو سیاحت کے بھی شوقین ہیں۔ اپنے پیارے ملک کے چاروں صوبوں کی سیر کرچکے ہیں ٹی وی بہت کم دیکھتے ہیں۔ بھئی ٹی وی تو آن کیا جاتا ہے تفریح کے لیے مگر ٹینشن ہے کہ اور بڑھ جاتی ہے۔ ڈراموں میں بھی وہی زندگی کا رونا دھونا' ملکی حالات میں قوم کی بے بسی ناقابل برداشت' اس لیے ٹی وی آف کردیتے ہیں۔

3۔ کام کے اوقات میں جب جب مجھے فارغ وقت ملتا ہے بلکہ ملتا کیا ہے' نکالنا پڑتا ہے' رات کو ذرا سونے سے پہلے کتب بینی' رسائل' ڈائجسٹ' اخبارات کا ڈھیر ہوتا ہے ہمارے بستر پر' پھر رات گئے تک لکھنے لکھانے کا شوق پورا کرنا۔ صبح تڑکے اٹھنا' نماز پڑھنا' چڑیوں کو دانہ' پانی ڈالنا' چائے بنانا' پھر اسکول کی تیاری۔ بھئی! ہم تدریسی فرائض بھی تو پوری ذمہ داری اور اخلاص سے انجام دیتے ہیں نا! سویرے ساڑھے سات بجے اسکول کے لیے نکلنا اور پھر تقریباً" تین' ساڑھے تین بجے گھر واپس لوٹنا۔ کھانا کھانا' پھر چائے پینا کرتے کرتے مغرب کا وقت' پھر آٹا گوندھنا' یا برتن دھونا۔ کمروں سے پھیلاوا سمیٹنا۔ اس سب سے فارغ ہوئے تو عشاء کا وقت قریب۔ رات کا کھانا کھایا' نماز پڑھی تو پھر ذہنی اور جسمانی تھکن اس قدر ہو جاتی ہے کہ مزید کسی مشقت کی توانائی اجازت ہی نہیں دیتی۔

مطالعہ کے بعد لکھنے کا کام شروع ہو جاتا ہے۔ شاعری کا بھی شوق ہے نثر نگاری کے ساتھ ساتھ اپنی شاعری کی کتاب منظر عام پر لانے کا ارادہ ہے۔ مستقبل کی معروف شاعرہ کا خطاب ملنے والا ہے۔ ایک مقامی جریدہ نکالتے ہیں "انٹرنیشنل روابط" میگزین کے لیے نمائندگی کرتے ہوئے مشہور شخصیات سے انٹرویو کرنا آرٹیکلز اور کبھی افسانہ' سروے اور فیچر بھی کرلیا جاتا ہے۔ یہی ہمارا پسندیدہ مشغلہ ہے۔ ہاں! اگر خوشی اس دن ہوئی جب ہم نے ایف ایم ریڈیو پروگرام میں بطور مہمان شرکت کی۔

ثمرین حبیب...... ٹین واٹر

1۔ آپ کے پہلے سوال کے جواب میں مجھے کچھ سوچنا نہیں پڑا' کیونکہ ایسی شخصیت مجھے ڈھونڈنے کی ضرورت پیش نہیں آئی کہ جس کی نصیحت یا اچھی بات مجھے پسند آئی ہو یا جنہوں نے زندگی کے نشیب و فراز کا سامنا حوصلہ مندی اور جرات سے کیا ہو۔ زیادہ دور نہیں جانا پڑے گا۔ آیئے! میں آپ کو ملواتی ہوں اپنی "بجو" سے۔ میری سگی بہن' میری ماں جائی مجھ سے 6 سال بڑی ہیں میری بجو۔ جنہوں نے ہر دکھ کا مقابلہ بہت حوصلے سے کیا۔

پانچویں کلاس کی ہونہار طالبہ تھیں' جب میری مما کو فالج کا اٹیک ہوا اور وہ مکمل طور پر مفلوج ہو کر بستر

کی محتاج ہو گئیں۔ میری مما بول بھی نہیں سکتی تھیں۔ میں اس وقت پاؤں' پاؤں چلنا سیکھ رہی تھی۔ گھر کی ذمے داری بجو کے نازک شانوں پر آپڑی۔ مزید ستم یہ کہ انہیں اپنی تعلیم ادھوری چھوڑنی پڑی۔

وقت گزرتا گیا۔ گیارہ سال میری مما کی طویل بیماری کا وہ عرصہ ہے جو بھلائے نہیں بھولتا۔ بجو نے گھر اور ہمیں (تین بھائی مجھ سے چھوٹے تھے) سنبھالا۔ اپنی تعلیم کی قربانی دی۔ اپنے بچپن کو گڑیا کی چنری میں باندھ کر ڈبے میں رکھ دیا۔ اتنی کم عمری میں ایسا بھاؤ' سمجھ داری' گھرداری لوگ حیران ہوتے تھے اور آج تک تعریف کرتے ہیں۔

وقت گزرتا چلا گیا' اپنے انمٹ نقوش پیچھے چھوڑتا ہوا۔ میری مما کو اللہ تعالیٰ نے مکمل صحت دی۔ بجو ہم سب بہن بھائیوں کے دکھ کی ساتھی تھیں اور ہیں۔ جب میں چھٹی کلاس میں پہنچی تو بجو نے میرے ساتھ دوبارہ اپنی تعلیم کا سلسلہ شروع کرلیا اور میٹرک کیا۔ 2009ء میں بجو کی شادی طے ہوئی۔ اس خبر سے ہماری فیملی میں تو خوشیاں تھیں ہی پر مجھے ایسے بہت سے لوگوں نے بھی بجو کی شادی کی مبارک باد دی جن سے ہمارے کوئی دلی روابط بھی نہ تھے۔ بجو کی شادی ہمارے خاندان کی واحد ایسی شادی تھی جس میں ہم سب بہن بھائی اکٹھا تھے۔ باجیاں پنجاب سے آئی ہوئی

تھیں تو دو بھائی سعودیہ سے اور آرمی والے بھائی بھی موجود تھے۔ شادی ایسے ہوئی کہ لوگ آج بھی بجو کی شادی کی مثال دیتے ہیں۔

سب ٹھیک ہو گیا' مگر اچانک ایسی قیامت ہم پر ٹوٹی اور آج تک حیران ہیں کہ ایسا بھی ہوتا ہے۔ قصے کہانیوں میں بہت پڑھا تھا' مگر حقیقت کتنی تلخ اور جان لیوا ہوتی ہے' کبھی اندازہ ہی نہ ہو پایا تھا۔ میری بجو جو پھولوں جیسی' نرم لہجے میں بولتی تھیں۔ بیمار' نڈھال' ذہنی ٹارچر کا شکار لوٹیں۔ شادی کے تین ماہ بعد میری بجو کو طلاق ہو گئی۔ بے قدر لوگوں نے میری موہنی سی بجو کو ہر وہ اذیت ان تین ماہ میں دی جس کا آپ اندازہ نہیں کرسکتے۔ ہم سب چھپ چھپ کر روتے تھے ان کے لیے' مگر بجو نے بہت حوصلے سے اور صبر سے اس دنیا کا مقابلہ کیا۔ بہت الزام تراشیاں ہوئیں۔ نوکیلے الفاظ کے نشتروں نے ان کو لہولہان کیا' مگر سلام ہے بجو کی حوصلہ مندی کو' سب صبر سے برداشت کیا۔

میری آپ سے گزارش ہے کہ پلیز میری بجو کے لیے دعا ضرور کیجیے گا۔ وہ میرا عکس ہیں۔ میرا فخر ہیں۔

2۔ یہ سال کب آیا' کب گیا کچھ خبر نہ ہوئی۔ وقت کی تیز رفتاری کے ساتھ بھاگتے بھاگتے تھک کر جب بھی کچھ پل ستانے کا من ہوا تو' کرن' خواتین اور شعاع ساتھ ہوتے تھے۔ باقی کیا رہ جاتا پیچھے؟ گھومنا'

پھرنا' نارمل سا ہی رہا۔ زیادہ ہی ہوا تو گاؤں میں ہی آمنہ (کزن) کی طرف چلے گئے۔ سب لڑکیاں ساتھ مل کے کھیتوں کو نکل گئیں۔ بس یہی تفریح رہی ٹی وی' بس نیوز دیکھ کر سمجھتی ہوں کہ دنیا فتح کرلی۔

3۔ فارغ وقت میں' میرے ہاتھ میں کتاب ہوتی ہے اور بس۔ مجھے کتابوں سے عشق ہے' چاہے کوئی سفر نامہ ہو' ناول ہو یا شاعری۔ ہاں! کبھی بہت موڈ ہوا تو نیٹ پر جا کر بھی Books سرچ کرتی رہتی ہوں۔ ارے! ایک کام تو بھول گئی۔ TEXT جی ہاں! موبائل۔۔۔ فارغ وقت میں مسیج بھی کرتی ہوں اور کون سی چیز سب سے زیادہ خوشی دیتی ہے؟ سچ بتاؤں ۔۔۔۔؟

جب عمران شام کو گاؤں واپسی پر "کرن اور خواتین" اکٹھے لاتا ہے۔ بہت خوشی ہوتی ہے۔ دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

ثمینہ اکرم ۔۔۔۔۔ کراچی

1۔ "کچھ لوگ زندگی کے نشیب و فراز کا مقابلہ اس خوبی سے کرتے ہیں کہ ان کی شخصیت سے دوسروں کو حوصلہ ملتا ہے۔" یہ جملہ پڑھ کر فوراً ہی میرے ذہن میں میری ماموں زاد ۔۔۔۔ فردوس کا نام آیا۔ واقعی وہ آپ کے پہلے سوال پر پوری اترتی ہیں۔ آفرین ہے ان پر جو لوگ زندگی کی ہر مشکل کا مقابلہ بڑے صبر و شکر سے کرتے ہیں۔

فردوس کی شادی بہت کم عمری میں ہو گئی اور بد قسمتی سے ایک بیماری میں اچانک ان کے شوہر کا انتقال ہو گیا اور وہ بھری جوانی میں ہی بیوہ ہو گئیں جبکہ ان کے بچے بہت چھوٹے تھے۔ انہوں نے بچوں کی خاطر دوسری شادی نہیں کی اور اپنی پوری زندگی اپنے بیٹوں کے لیے وقف کر دی۔ ماں اور باپ دونوں بن کر انہیں پالا اور بہت محنت اور حوصلے سے صبر و شکر کے ساتھ وہ کڑا وقت گزارا۔ ہمیشہ وہ کہا کرتی ہیں کہ "وقت کبھی ایک سا نہیں رہتا۔" اپنی زندگی میں کسی کمی کا رونا رونے سے بہتر ہے کہ اس میں بھی خدا کی طرف سے بہتری کی امید رکھیں اور خدا کی رضا میں راضی رہیں' کیونکہ ہو گا وہی جو اس کی رضا ہے۔ جس طرح سے انہوں نے اپنے بیٹوں کی تربیت و پرورش کی وہ قابل ستائش ہے۔ آج ان کے دونوں بیٹے بابر اور بلال یونیورسٹی میں پڑھ رہے ہیں اور بہت قابل اور اپنے امی کے بڑے فرمانبردار ہیں۔

ہمیشہ فردوس کے لبوں پر ایک دھیمی مسکان سجی رہتی ہے۔ جب بھی ملیں ان کی اچھی باتیں زندگی کو سہل بنانے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ نہ وہ کبھی اپنے دکھوں کا رونا روتی ہیں اور نہ ہی زندگی میں کسی کمی کا شکوہ۔ بلکہ ہر حال میں خدا پر مکمل یقین اور بھروسے کے ساتھ کہتی ہیں کہ "یہ وقت بھی گزر جائے گا۔"

2۔ اس سال میں نے اپنا فارغ وقت کس طرح گزارا؟ تو جناب الگ سے تو فارغ وقت ملتا ہی نہیں ہے۔ دن رات کچھ اس طرح بھاگ دوڑ میں بسر ہو رہے ہیں کہ کچھ پتا نہیں چلتا' کب صبح ہوئی اور کب شام ۔۔۔۔ یہ اور بات ہے کہ اپنے شوق کی خاطر اپنی مصروفیات میں سے کچھ فارغ لمحات نکال ہی لیتی ہوں۔ جب مجھے نئے مہینے کے اپنے تینوں ڈائجسٹ (کرن شعاع' خواتین) مل جائیں تو پھر میں اپنی مصروفیات سے کچھ وقت نکال کر ان کا مطالعہ ضرور کرتی ہوں۔

عموماً" دوپہر کو ایک گھنٹہ فارغ وقت ملتا ہے۔ اسی میں اپنا لکھنے پڑھنے کا شوق پورا کرتی ہوں۔ رہی بات گپ شپ کرنے کی تو اگر فریدہ کا ٹنڈو الہ یار سے فون آجائے تو میں سب کام چھوڑ چھاڑ کر فریدہ سے بات کرنے بیٹھ جاتی ہوں۔ یوں بھی وہ مجھے عموماً" دوپہر کو یا پھر رات میں ہی فون کرتی ہیں۔ اس طرح مسئلہ نہیں ہوتا۔

انیلا اور میں ایک دوسرے سے اکثر کمیونیکیٹ کرتے رہتے ہیں۔ بھلا ہو کال پیکج کا۔ اس کی بدولت ہم گھنٹوں باتیں کرتے ہیں۔ ایک دوسرے سے چھوٹی سے چھوٹی بات بھی شیئر کرتے ہیں۔ ہر وقت ہم دونوں میں ٹیلیفونک رابطہ رہتا ہے جب کہ وہ بھی بہت مصروف ہوتی ہے اور میں بھی ۔۔۔۔ مگر اس فون کی بدولت سب کام آسان ہو گئے ہیں۔ کان سے لگایا اور ہاتھ سے اپنے سارے کام کرتے جائیں۔ اس پورے سال ہم کہیں تفریح کے لیے نہیں جاسکے میں صرف اور صرف گھر تک ہی محدود ہو کر رہ گئی ہوں' (وجہ میری مہروں کی تکلیف) کیونکہ میں لمبا سفر نہیں کر سکتی' اس لیے پورے سال اپنی امی کے گھر شاہ فیصل کالونی تک نہ جاسکی' جبکہ پچھلے سال میں دو مرتبہ تو ضرور بچوں کو گھمانے پھرانے کے لیے کہیں نہ کہیں لے جایا کرتے تھے جبکہ اس سال تو سمر ویکیشن بھی ایسے ہی گزر گئیں۔ ٹی وی میں زیادہ نہیں دیکھتی۔ بس چلتے پھرتے یا کچن میں کام کرتے ہوئے دیکھ لیتی ہوں۔

3۔ فارغ وقت میں میری بہترین تفریح اور مشغلہ تو صرف اور صرف مطالعہ کرنا ہے۔ ہمیں کچھ اس طرح کے کام بھی کرنے چاہئیں جن سے ہمیں اطمینان قلب ملے۔

کیونکہ میں کہیں گھومنے پھرنے اور ملنے ملانے نہیں جا پاتی تو اپنے پیاروں سے ٹیلیفونک رابطے میں رہتی ہوں۔ فارغ وقت اگر مل جائے تو میں کچھ لکھنے لکھانے کا کام بھی کرتی ہوں۔ باقی تو سارا وقت گھر اور بچوں کی نذر ہو جاتا ہے۔ سب سے زیادہ کون سی چیز خوشی دیتی ہے؟ جس دن میری کوئی نماز قضا نہ ہو اور جس دن میں نے زیادہ سے زیادہ عبادت الہٰی میں گزارا ہو۔ اللہ تعالیٰ کا شکر اور عبادت میں گزارا ہر لمحہ مجھے بہت خوشی دیتا ہے اور ایک چیز مجھے خوشی دیتی ہے' وہ

اپنے سے جڑے رشتوں کا اپنے لیے فکر مند ہونا اور ان کے دل میں اپنی محبت کو محسوس کر کے بہت خوشی ملتی ہے۔

☆ اگر میں کسی کے کام آؤں یا کسی کی اخلاقی مدد کروں تب بھی مجھے خوشی ملتی ہے۔

☆ فریدہ اور رضوانہ اگر مجھ سے ملنے میرے گھر آئیں تو اپنی عزیز دوستوں کی آمد مجھے خوشی دیتی ہے۔

☆ اپنی امی کا اپنے لیے دعائیں کرنا بھی مجھے خوشی دیتا ہے۔

☆ سب سے زیادہ ایک اور چیز مجھے خوشی دیتی ہے جس کا ذکر میں خاص طور پر کرنا چاہوں گی' وہ یہ کہ اگر میرے محبوب کرن' شعاع اور خواتین ڈائجسٹ میں میرا خط لگ جائے' میرا نام شائع ہو تو پھر اس سے زیادہ خوشی کا لمحہ کوئی دوسرا ہو ہی نہیں سکتا۔ میں فوراً "سجدہ شکر بجالانے کے لیے دو رکعت نفل ادا کرتی ہوں۔

رابعہ فیاض قادری...... کراچی

1۔ میری پیاری امی جان جن سے میں نے ہمت صبرو استقامت اور خودداری کا سبق سیکھا۔ ہمارے بچپن میں ہی ہمارے والد صاحب کا عین جوانی میں انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد جس طرح ہماری امی نے تن تنہا بغیر کسی مدد کے ہمیں پالا پوسا' پڑھا لکھایا اور ہماری تربیت کی وہ واقعی ایک مثال ہے۔ انہوں نے کمایا بھی' گھر بھی سنبھالا غرض ماں اور باپ کے تمام فرائض اکیلے ادا کیے۔ بیٹیوں کی شادی اور شادی شدہ بیٹیوں کے سسرال کے معاملات' خاندان والوں سے میل ملاپ سب اتنے احسن طریقے سے نبھایا کہ اس کی مثال سب دیتے ہیں۔ آج ہم سب بہنیں شادی شدہ اور اپنے گھر بار کی ہیں اور ماشاء اللہ ایک اچھی زندگی گزار رہے ہیں' یہ سب ہماری ماں کی محنت' دعا اور لگن کا نتیجہ ہے جس کا اعتراف ہمارے خاندان کا ہر فرد کرتا ہے۔

اب وہ سب بچوں کی پسندیدہ نانو ہیں اور ان کو سنبھالنے اور ان کی فکر میں ہلکان رہتی ہیں۔ آج ان چند لائنوں کے ذریعے میں نے اپنی ماں کی جدوجہد کی کہانی ہی نہیں بتائی' بلکہ اعتراف بھی کیا ہے کہ "امی! آپ واقعی ایک عظیم خاتون ہیں جس کو آئیڈیل بنایا جا سکتا ہے۔"

2۔ دوسرا سوال بڑا دلچسپ ہے۔ یہ سال بڑا مبارک ثابت ہوا۔ کم از کم میری فیملی کے لیے کہ اس سال شروع میں ہم عمرہ کرنے گئے اور خدائے بزرگ و برتر نے ہمیں توفیق دی کہ میں اپنی امی اور ساس دونوں کو ساتھ لے کر گئی۔ ساتھ ہمارے شوہر اور ڈیڑھ سال کے اکلوتے صاحبزادے علی رضا بھی تھے۔ 23 دن کے یہ شب و روز میری پوری زندگی کا حاصل ہیں۔ اب کوئی جگہ اور کوئی چیز دل کو بھاتی نہیں ہے۔ لگتا ہے ہم آ گئے' دل وہیں چھوڑ آئے ہیں۔ T.V میں دیکھتی نہیں۔ ہاں! مطالعہ میرا ہمیشہ کا شوق ہے' وہی کرتی ہوں اور گھومنا پھرنا میرا اور میرے شوہر کا پسندیدہ مشغلہ ہے سو اس سے بھی لطف اٹھا لیتے ہیں۔

3۔ فارغ اوقات تو کم ہی ملتے ہیں ماشاء اللہ گھر کے کام کاج ہی مصروف کرنے کو بہت ہیں' مگر دوپہر کے دو تین گھنٹے خالص میرے ہوتے ہیں۔ یہ آفس میں ہوتے ہیں اور علی رضا سو رہے ہوتے ہیں تو بس اس وقت میں سکون سے لیٹ کر مطالعہ کرتی ہوں۔ چائے کا بھاپ اڑاتا کپ ساتھ ہوتا ہے' چاہے گرمیاں ہی کیوں نہ ہوں' چائے اور کتاب سے میرا اٹوٹ رشتہ ہے۔ خوشی اور سکون تو رب کے ذکر سے ملتا ہے' سو میری بھی عادت ہے اور میرے شوہر کی بھی کہ نماز کے ساتھ ساتھ ذکر و اذکار بھی کرتے ہیں۔ میں دوپہر میں قرآن کی تلاوت ضرور کرتی ہوں اور جو خوشی اور سکون تلاوت کر کے ملتا ہے اس کا بدل دنیا میں کوئی نہیں۔ آزمائش شرط ہے۔

مسز ہدایت علی شاہ...... مردان

1۔ قارئین! سروے میں اس امید پر شرکت کر رہی ہوں کہ مجھے بھی اس محفل میں جگہ ملے گی۔

جب چھوٹی تھی یعنی شادی سے پہلے کا زمانہ' اس وقت مدر ٹریسا اور حکیم محمد سعید (بانی ہمدرد لیبارٹریز اور مدینہ الحکمت وغیرہ) سے متاثر ہوئی۔ وہ بھی تب' جب یہ دونوں اس دار فانی سے کوچ کر گئے اور میڈیا کے ذریعے ان کی بیش بہا خدمات کا اعتراف کیا گیا۔

لیکن در حقیقت میں' جس شخصیت سے متاثر ہوں وہ بیک وقت مدر ٹریسا بھی ہیں اور حکیم محمد سعید بھی۔ وہ بچوں کو تعلیم سے آراستہ کر رہی ہیں' وہ بھی آفاقی کتاب قرآن پاک کی تعلیم۔ کبھی سکول نہیں گئیں لیکن مادری زبان لکھنا اور پڑھنا خوب جانتی ہیں اور ساتھ ساتھ کئی بیماریوں کا علاج بھی جانتی ہیں' جیسے دانت کا درد' آنکھیں دکھنا' ناف کا ٹلنا' آدھے سر کا درد' نظر بد' یرقان' تمام جلدی بیماریاں۔

ان کو رحمان بابا اور خوشحال خان خٹک کا کلام زبانی یاد ہے۔ خود تو گھر پر لکھنا پڑھنا سیکھا' لیکن ہم بہنوں کو گریجویشن کرایا اور دونوں بھائی بھی اچھی بلکہ بہترین پوسٹ پر ہیں۔ ابو نے لمبا عرصہ یعنی تیئس سال روزگار کے سلسلے میں سعودیہ میں گزارے۔ سال دو سال کے وقفے سے وطن آتے رہے۔ لیکن امی اس سارے عرصے کو بیوگی کے زمانے سے تعبیر کرتی ہیں۔ اکیلی' تنہا امی اور بچوں کی صحت' تعلیم' بیماری' علاج اور بے شمار مسائل' لیکن امی نے انتہائی' صبر' حوصلہ کے ساتھ بچوں کو پروان چڑھایا اور دینی اور دنیاوی تعلیم و تربیت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

ابو تو ریٹائرڈ ہو کر وطن واپس آئے' لیکن کیا آپ نے کبھی کسی امی کو ریٹائرڈ ہوتے دیکھا ہے؟ نہیں ناں! امیاں تو سروس کرتے کرتے اپنے خالق کے پاس چلی جاتی ہیں۔ جی بہنو! میری امی بھی آج سے پانچ سال پہلے 18 جنوری کو ہمیں چھوڑ کر چلی گئیں۔ جب تک زندہ رہیں' سب کی خدمت کرتی رہیں جب تھک گئیں تو ہمیں خدمت کا موقع ہی نہ دیا' نہ بستر سنبھالا' بلکہ چلے جانے کو ہی ترجیح دی کہ شادی شدہ بیٹیاں ان کی خدمت میں اپنے گھر نہ خراب کریں۔ بڑے بیٹے کو ملازمت سے زیادہ چھٹی نہ لینی پڑے اور چھوٹے بیٹے کا انجینئرنگ میں آخری سال تھا' انہیں تعلیم کا حرج نہ ہو۔

زندگی کے صرف آخری پندرہ دن بستر پر گزارے اور یوں سب سے مل کر رخصت ہوئیں جیسے حج پر جا رہی ہوں۔

میرے دادا ان کو دین کا ستون کہتے تھے۔ میری پھوپھوں کے لیے وہ بھابھی سے بڑھ کر ماں تھیں۔ گاؤں میں ساس بہو کے جھگڑے ان کے پاس حل ہوتے تھے۔ جٹھانی' دیورانی سے بہنوں کا سا رشتہ تھا۔ مرد حضرات اپنی بیٹی اور عورتوں کو اصلاح کے لیے ان کے پاس بھیجتے تھے۔

ہمارے گھر کی خاص بات یہ تھی کہ ہمارے گھر میں ٹی وی نہیں تھا' کیونکہ مذہبی سوچ کی وجہ سے امی اسے بے برکتی کا ذریعہ سمجھتی تھیں' البتہ ریڈیو سے بی بی سی سنتے تھے اور اخبار و رسائل دیکھتے تھے۔

امی گھر بیٹھے آمدنی کو بھی سپورٹ کر رہی تھیں۔ وہ ایسے کہ انہوں نے گائے پال رکھی تھی' جو روزانہ سات' آٹھ کلو دودھ دیتی تھی' جس پر لوگوں کو یقین نہ آتا تھا' لیکن اسے برکت کہتے ہیں۔

وہ اپنے بچوں کو اس کمی سے بچانا چاہتی تھیں جو انہوں نے ساری زندگی محسوس کی۔ جس دن ماں بنی مجھے اپنی ماں اور بھی اچھی لگی۔

2۔ سوال نمبر 2 اور 3 کا جواب یہ ہے کہ مجھے مطالعے کا شوق ہے سلائی کڑھائی کا بھی شوق ہے لیکن فارغ وقت ملنے کی شرط ہے۔ گھومنے پھرنے کے شوقین میرے میاں ہیں جن کے توسط سے پاکستان کے اکثر علاقے دیکھے ہیں۔

خدا اور محبت کی

سعدیہ خان سے ملاقات

شاہین رشید

اگرچہ راتوں رات شہرت حاصل کرنے والا دور تو نہیں رہا کیونکہ اب چینل کی بھرمار ہے۔

اب تو مقابلے کا زمانہ ہے اور کوئی بہت ہی زیادہ اعلا پرفارمنس دے تو وہ لوگوں کی نظروں میں آجاتا ہے۔

سعدیہ خان شوبز کا ایک نیا چہرہ ہیں۔ سیریل "یاریاں" سے متعارف ہوئیں۔ سیریل بہت اچھا تھا بہت سراہا گیا اور سعدیہ خان کی پرفارمنس کو بھی بہت پسند کیا گیا "یاریاں" کے بعد "خدا اور محبت" میں بھی سعدیہ نے بہت اچھا پرفارم کیا۔ آج کل وہ کمرشلز میں بھی نظر آرہی ہیں۔ اس وقت بھی کئی ڈرامے انڈر پروڈکشن ہیں ہم نے سعدیہ خان کا انٹرویو کیا۔

"کیسی ہیں سعدیہ! دو ہی سیریل آن ایر ہوئے ہیں اور اسی میں آپ نے کمال کی اداکاری کرکے سب کو حیران کردیا؟"

"میں ٹھیک ہوں جی اور بہت شکریہ پسند کرنے کا۔ ناظرین پسند کریں تو پھر بہت ہمت بڑھ جاتی ہے۔"

"سعدیہ! پروفیشن کے بارے میں بات کرنے سے پہلے میں چاہوں گی کہ آپ اپنے بارے میں کچھ بتائیں؟"

"جی میرا تعلق سیالکوٹ سے ہے۔ والدہ کا انتقال ہوچکا ہے۔ میرا ایک بھائی اور ایک بہن ہے۔ نفسیات میں گریجویشن کیا اور ایم بی اے کی ڈگری انگلینڈ سے حاصل کی۔ میرا بچپن گاؤں میں گزرا۔ بہت لاڈ پیار اٹھواتے ہوئے کیونکہ گھر بھر کی لاڈلی تھی۔ شرارتی بہت زیادہ تھی۔ محلے والے کبھی کبھی مجھ سے تنگ بھی آجاتے تھے۔ مگر بچپن کا ہی تو دور ہوتا ہے جب انسان آزادی کے ساتھ سب کچھ کرلیتا ہے۔"

"بہت خوب صورت ہو۔ کب خیال آیا کہ شوبز میں آؤں؟"

"خواہش تو میری بچپن سے ہی تھی کہ شوبز میں آؤں لیکن صرف ماڈلنگ کی حد تک۔۔۔ گھر کا ماحول ایسا نہیں تھا کہ کوئی مجھے خوشی خوشی اجازت دے دیتا۔ میری دوستیں مجھے کہتی تھیں کہ تم میں صلاحیت ہے، تم کوشش کرو تو آسانی سے اپنی جگہ بنالوگی۔ میں سنی ان سنی کردیتی تھی۔"

"دوستوں کو کیسے اندازہ ہوا کہ آپ میں صلاحیت ہے؟"

"وہ اس طرح کہ اسکول، کالج کی غیر نصابی سرگرمیوں میں بہت بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتی تھی، تلاوت و نعت خوانی سے لے کر میوزک اور اداکاری تک۔ تب ہی سب کہتے تھے کہ اپنی صلاحیتوں کو صرف تعلیمی اداروں تک محدود نہ کرو۔"

"پھر۔۔۔ کس سے رابطہ کیا؟"

"میں نے خود رابطہ نہیں کیا، کیونکہ مجھے اندازہ تھا کہ مجھے گھر سے اجازت نہیں ملے گی۔ وہ کبھی بھی نہیں چاہیں گے کہ میں شوبز جوائن کروں۔

پھر میں اچانک اتفاقیہ طور پر اس فیلڈ میں آگئی۔ ہوا یہ کہ میں نے جمال شاہ کے "ہنر کدہ" میں داخلہ لیا۔ مجھے مجسمہ سازی کا شوق تھا۔ ایک دن کلاس میں تھی۔ میرے ہاتھ میں مٹی تھی اور میں اپنے کام میں مگن تھی کہ کچھ لوگ آئے اور کہنے لگے کہ "ان ہاتھوں کو مت دھوئیں اور موبائل کو کاندھے پہ رکھ کر بات کریں، ہمیں اس انداز میں آپ کی ایک تصویر لینی ہے۔" میں نے پوچھا کہ آپ کون ہیں تو کہنے لگے کہ بتادیں گے۔ شاید انہوں نے جمال شاہ سے اجازت لے لی تھی۔ میں نے تصویر کھنچوالی۔ کچھ ہی دن گزرے تھے کہ میرے جاننے والوں اور دوستوں کے فون آگئے کہ یہ تم نے ماڈلنگ کب سے شروع کی۔ میں حیران ہوئی تو انہوں نے بتایا کہ تمہارے تو بڑے بڑے بل بورڈ شہر کے مختلف علاقوں میں لگے ہوئے ہیں ——— بعد میں معلوم ہوا کہ وہ ایک سیل فون کمپنی سے تعلق رکھنے والے لوگ تھے۔"

"پھر ان سے لڑائی کی، یا معاوضہ لیا؟"

"نہیں لڑائی تو نہیں کی کہ مجھے خود بھی شوق تھا اور مجھے خود بھی اپنے بل بورڈ دیکھ کر اچھا لگا تھا۔ دوستوں کے کہنے پر خاور ریاض سے ملاقات کی اور بس۔۔۔ آج آپ کے سامنے ہوں۔"

"گھر والوں کا کیا ری ایکشن تھا؟"

"جہاں اپنی من مانی ہو، وہاں تھوڑی مشکلات ہوتی ہیں۔ شروع شروع میں گھر والوں نے برا مانا۔ اعتراض بھی کیا، مگر پھر مان گئے۔ گھر والے تو مان جاتے ہیں، کیونکہ وہ اپنے بچوں کو سمجھتے ہیں، لیکن خاندان والوں کو سمجھانا تھوڑا مشکل ہوتا ہے لیکن خیر اب وہ بھی سمجھ ہی گئے ہیں۔"

"شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ اب اس فیلڈ میں پڑھے لکھے لوگ بھی آنے لگے ہیں، کیا خیال ہے آپ کا؟"

"جی بالکل۔۔۔ ٹی وی کے میڈیا میں تو پہلے بھی پڑھے لکھے لوگ تھے، اب تو ان میں مزید اضافہ ہوگیا ہے اور یہ بہت خوش آئند بات ہے۔ اچھے ڈائریکٹرز، اچھے پروڈیوسرز، یعنی ہر شعبے میں تجربہ کار اور تعلیم یافتہ لوگ نظر آتے ہیں۔"

"ابتدا حادثاتی طور پر ماڈلنگ سے ہوگئی، پھر کمرشلز میں کام کیا۔ ٹی وی تک آمد کیسے ہوئی؟"

"یہ بھی ایک مزے کی کہانی ہے۔ میرا پہلا ڈراما سیریل "یاریاں" تھا۔ "یاریاں" کے ڈائریکٹر نے مجھے کمرشل میں دیکھا تھا۔ اب بقول ان کے کہ میں جس سے بھی آپ کا پتا، فون نمبر پوچھتا۔ جواب ملتا ہمیں معلوم نہیں۔ ایک آدھ نے تو یہ بھی کہہ دیا کہ وہ تو اس ملک میں رہتی ہی نہیں۔ کام کرواکے واپس چلی گئی ہیں۔ بڑی مشکل سے انہیں میرا نمبر ملا۔"

"یہاں سے اندازہ ہوتا ہے کہ لوگوں میں اور اس فیلڈ میں پروفیشنل جیلسی کتنی ہے۔"

"اس فیلڈ میں ہی کیا، ہر فیلڈ میں پروفیشنل جیلسی بہت ہے۔ لوگ کبھی کسی کو آگے بڑھتا ہوا نہیں دیکھ پاتے ہیں۔ خیر ڈائریکٹر سے میری ملاقات ہوئی اور انہوں نے مجھے اپنے سیریل "یاریاں" میں مرکزی رول کے لیے منتخب کرلیا۔ جس نوعیت کا کردار تھا۔ اس کو نبھانے کے لیے فیصل قریشی اور اعجاز اسلم نے بھی میری، بہت رہنمائی کی۔"

"پہلی ہی بار مرکزی کردار ملنے پر کیا تاثرات تھے؟ اور کہیں مشکل پیش آئی؟"

"یقین نہیں آرہا تھا کہ ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ مجھے پہلے ہی سیریل میں مرکزی رول مل جائے اور زیادہ مشکل اس لیے پیش نہیں آئی کہ ٹیم بہت اچھی تھی۔ سب نے میرے ساتھ بہت تعاون کیا اور مجھے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔"

"ایک سیریل مقبول ہوجائے تو پھر آسانیاں ہی آسانیاں پیدا ہوجاتی ہیں اور آفرز کی لائن بھی لگ جاتی ہے' ایسا ہوا؟"

"جی بالکل ہوا۔ اس کے بعد سیریل "خدا اور محبت" کے ڈائریکٹر نے مجھ سے رابطہ کیا۔ مجھ سے ملاقات کی اور مجھے میرے رول کے بارے میں بتایا اور کہا کہ مزید سمجھنے کے لیے آپ کو ناول کا مطالعہ کرنا ہوگا' پھر انہوں نے مجھے ناول بھیجا اور میں نے بڑے انہماک سے پورا ناول پڑھا اور بے حد متاثر ہوئی اور جب میں نے ناول واپس کیا تو انہوں نے کہا کہ آپ اس کردار کو کرلیں گی؟ کیونکہ بہت مشکل کردار ہے۔

تب میں نے کہا کہ اگر آپ کی رہنمائی رہی تو ان شاء اللہ ضرور کرلوں گی۔"

"اور واقعی آپ نے بہت اچھا پرفارم کیا۔ ڈائریکٹر تو بہت خوش ہوئے ہوں گے؟"

"بالکل جی۔۔۔ بہت خوش ہوئے اور کہا کہ جب میں نے آپ کو یہ کردار دیا تو سوچ رہا تھا کہ پتا نہیں آپ یہ کردار کرسکیں گی یا نہیں، لیکن آپ نے مجھے مایوس نہیں کیا۔ اور جیسا میں سوچ رہا تھا' ویسا ہی آپ نے پرفارم کیا۔"

"جو لڑکی اس سیریل میں دکھائی گئی تھی' کیا آج کل ایسی لڑکیاں ہوتی ہیں؟"

"ارے یہ کیا سوال کردیا آپ نے۔۔۔ بالکل ایسی لڑکیاں ہوتی ہیں۔ جب میں خود طالبہ تھی تو بالکل ایسی ہی تھی۔ اسی طرح سر پر دوپٹہ لینا' نظریں جھکا کر بات کرنا' جب چلتی بھی تھی تو نظریں نیچی کرکے اور سب میرا مذاق اڑایا کرتے تھے کہ یہ کیسی لڑکی ہے' کیا آج کے دور میں یہ ایڈجسٹ کرپائے گی اور اب دیکھیں کہ کیسا ایڈجسٹ کیا ہے۔"

"تو اس قدر شرمیلی اور نظریں جھکا کر بات کرنے کی کیا وجہ تھی؟"

"بس کچھ تربیت ہی ایسی تھی۔ گاؤں میں پلی بڑھی تھی' جہاں بنیادی چیز شرم و حیا تھی اور یہ بھی دیکھا ہے کہ جب لڑکیوں کو تھوڑی سی بھی آزادی ملتی ہے تو وہ اس کا فائدہ اٹھاتی ہیں' مگر میں جب پڑھنے کے لیے لاہور آئی اور مخلوط تعلیمی ادارے میں پڑھائی کی تو اپنی روایات کو نہیں بھولی۔ میں آج بھی اندر سے شرمیلی اور روایت پسند لڑکی ہوں۔ انسان کی نیچر کبھی نہیں بدلتی۔"

"اپنے ڈراموں کے حوالے سے کوئی خاص بات ہو تو بتاؤ؟"

"نہیں' کوئی خاص بات نہیں' سوائے اس کے کہ جس زمانے میں "خدا اور محبت" کی ریکارڈنگ ہورہی تھی۔ شدید گرمی کے دن تھے اور سب نے گرمی کی پروا کیے بغیر بہت محنت کے ساتھ کام کیا۔ بالکل گھر جیسا ماحول تھا۔ میں کبھی نہیں بھول سکتی اس سیریل کو۔ ہاں میں وہ سین بھی نہیں بھول سکتی جس میں میری سہیلی صدف عمیر کو رونا تھا اور اسے رونا نہیں آرہا تھا۔ میں نے چپکے سے اس کو چٹکی بھری۔ مگر پھر بھی اسے رونا نہیں آیا' جس پر سب کو ڈانٹ پڑی۔"

"اپنے ڈراموں سے مطمئن ہیں؟"

"جی بالکل۔۔۔ ہمارے ملک کے ڈرامے بہت اچھے اور بہت معیاری ہوتے ہیں اور اپنے ملک اور بیرون ملک بہت پسند کیے جاتے ہیں۔ ہمارا ڈراما تو میرے خیال میں ہر دور میں اچھا رہا ہے اور ہمیشہ اچھا رہے گا۔"

"لوگ پہچان لیتے ہیں؟"

"جی جی۔۔۔ بالکل پہچان لیتے ہیں۔ بہت عزت' بہت پیار کے ساتھ ملتے ہیں اور آٹوگراف مانگتے ہیں تو مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ بھلا پہچان اور شہرت کس کو اچھی نہیں لگتی۔"

"فضول خرچ ہیں یا۔۔۔؟"

"یہ بات تو میرے خود بھی سمجھ میں نہیں آتی۔ مجھے پتا ہی نہیں چلتا کہ پیسہ کہاں گیا۔ لگتا ہے میرے ہاتھوں میں سوراخ ہے۔ اِدھر آتا ہے' اُدھر خرچ ہوجاتا ہے۔"

"کن چیزوں پر زیادہ خرچ کرتی ہیں۔"

"مجھے اس فیلڈ میں تین سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے اور میں نے اچھا خاصا کمایا ہے۔ مگر اس کے باوجود میرے پاس ہینڈسم اماؤنٹ نہیں ہے' اس کی وجہ یہ ہے کہ میرا پیسہ زیادہ تر دوسروں کی امداد میں صرف ہوجاتا ہے۔"

"فارغ اوقات میں کیا کرتی ہیں' میوزک سے لگاؤ ہے؟"

"پہلے فارغ وقت ہوا کرتا تھا' مگر اب نہیں ہے۔ اب کافی مصروفیات ہیں اور میوزک سے تو مجھے بہت زیادہ لگاؤ ہے اور آپ کو بتاؤں کہ مجھے خود بھی گانے کا بہت شوق ہے اور جب میں گنگناتی ہوں تو سب ہی میری تعریف کرتے ہیں اور مجھے مشورہ دیتے ہیں کہ میں باقاعدہ گلوکارہ بنوں۔ ویسے اب اس جانب بھی سنجیدگی سے غور کررہی ہوں۔

میں اس فیلڈ میں بہت کچھ کرنا چاہتی ہوں۔ بس مواقع ملتے رہیں۔ کتابیں پڑھنے کا شوق ہے' کھیلوں سے بھی دلچسپی ہے۔ کرکٹ سے بہت لگاؤ ہے۔ پاکستان ہار جائے تو میری بھوک ہی مرجاتی ہے۔ حالات حاضرہ سے بھی باخبر رہتی ہوں۔"

"مستقبل میں خود کو کہاں دیکھتی ہیں؟"

"مستقبل تو اچھا ہی دیکھتی ہوں۔ مگر ملنا تو وہی ہے جو قسمت میں لکھا ہے۔ بس خدا سے دعا ہے کہ جیسا میں سوچتی ہوں' سب کچھ ویسا ہی ہو۔"

"مستقبل میں ایک اور کام بھی تو کرنا ہے۔ اس کے بارے میں کچھ نہیں سوچا آپ نے؟"

"اگر آپ کا مطلب شادی سے ہے تو اس بارے میں میرے گھر والے بہت سوچتے ہیں اور میں نے سب کچھ ان ہی پہ چھوڑا ہوا ہے۔ اور ویسے بھی جب قسمت میں ہوگا' شادی بھی ہو ہی جائے گی۔ اب اس کے لیے کیا سوچنا۔ بس میری یہ دعا ضرور ہے کہ اللہ نے میری قسمت میں جو انسان لکھا ہے' وہ پڑھا لکھا ہو اور میرا خیال رکھے اور میری فیلنگز کو سمجھے۔"

"اس فیلڈ میں خوب صورتی کی کیا اہمیت ہے؟"

"اس فیلڈ میں صلاحیتیں زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔ بیوٹی ایکسٹرا کوالٹی تو ہوسکتی ہے' مگر کامیابی کی کنجی نہیں۔ نہ سفارش کام آتی ہے اور نہ ہی کسی قسم کے تعلقات' صرف اور صرف صلاحیت کام آتی ہے۔"

"اداکاری مشکل کام ہے یا آسان؟"

"جس کام کا شوق ہو' وہ آسان ہے اور جس کا شوق نہ ہو وہ مشکل ہے۔ مجھے اداکاری' ماڈلنگ سے زیادہ مشکل لگتی تھی' مگر جب سے اس میں دلچسپی لینا شروع کی ہے' میرے لیے یہ کام بھی آسان ہوگیا ہے۔"

اس کے ساتھ ہی ہم نے سعدیہ خان سے اجازت چاہی۔

☼
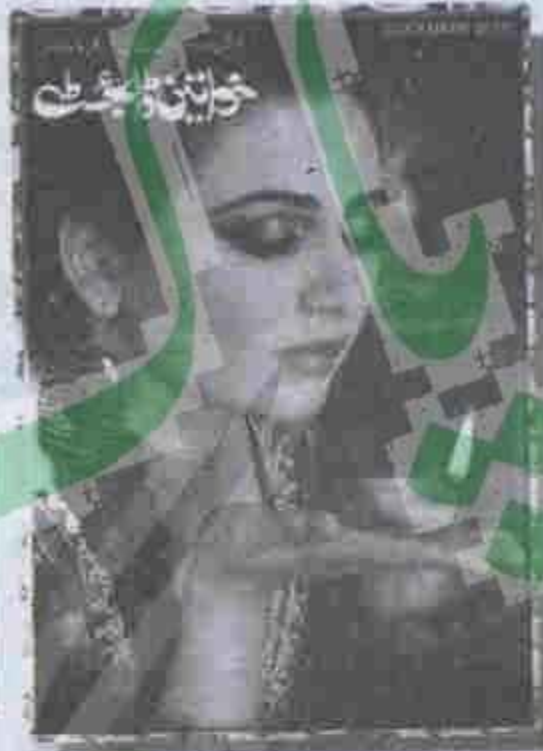
خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37-اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
khawateendigest@hotmail.com

یاسمین مغل۔۔۔ واہ کینٹ

دسمبر پھر سے آن پہنچا ہے' ایک اور سال اختتام ہوا۔ پایا ہم نے جانے کیا' مگر کھویا بہت کچھ۔ ماڈل سے لے کر سفید اجلی قمیض تک سارے کا سارا شمارہ ہی بہترین تھا۔ بازی مگر جیتی "سفال گر" نے۔ ایسا خوب صورت' منفرد (اور مشکل) ناول بڑے عرصے بعد نصیب ہوا تھا۔ آخری قسط نے دل کو عجیب سے درد سے روشناس کرادیا۔ گرانٹ کے درد کو محسوس کرتے کرتے صوفیہ کی تکلیف تک پہنچے تو لگا کہ خود بھی فنا ہو رہے ہیں۔ اس قدر خوب صورت الفاظ میں بشریٰ سعید نے اس رومینٹک تھرلر کا اختتام کیا کہ بے ساختہ انھیں خراج تحسین پیش کرنے کو جی چاہا۔

دوسری تحریر جس نے بے ساختہ چونکایا' وہ کمیرا احمد کی "دو کوڑی کی" تھی۔ اس قدر سچی اور تلخ تحریر کہ ہضم کرتے مشکل ہو رہی تھی۔ دل بے طرح ہی زہرہ کی حالت پر دکھا۔ کاش کہ عورت اپنا حق لینا سیکھ لے۔ محض سر جھکا دینے سے' صبر کر لینے سے ظلم ختم نہیں ہوتا۔ خیر دل کو ہلکا پھلکا کرنے فاخرہ جبیں کے "فیس بک ڈاٹ کام" پر پہنچے۔ اچھا تھا' مگر ایک بات ذہن میں کلبلا رہی ہے۔ یہ وہی بدبخت سائٹ ہے جس نے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ہرزہ سرائی میں بھرپور حصہ لیا اور افسوس کا مقام ہے کہ آج فیس بک استعمال کرنے والوں میں سب سے بڑی تعداد پاکستانی مسلمانوں کی ہے جو اس پر اپنا قیمتی وقت' انرجی اور علم ضائع کر رہے ہیں۔ "چراغ آخر شب" کے بارے میں تو کچھ کہنا ہی سورج کو چراغ دکھانا ہے' حرف حرف موتی اور منظر کشی ایسی دلکش کہ شہریار کے ساتھ ہم نے بھی اسلام آباد گھوم لیا۔

ج پیاری یاسمین! عورت کے حق کی بات تو چھوڑیں۔ اس معاشرے میں عورت کو زندہ رہنے کا حق مل جائے تو بڑی بات ہے۔ اس سال غیرت کے نام پر سات سو سے زیادہ خواتین کا قتل ہوا ہے اور اسمبلی میں بیٹھے لوگ اس کے خلاف آواز تک نہ اٹھا سکے' کیسے اٹھاتے وہ خود جو شریک ہیں۔

آپ کی تحریر موصول ہو چکی ہے' ابھی پڑھی نہیں' یقین رکھیں کہ قابل اشاعت ہوئی تو ضرور شائع ہوگی۔ خواتین ڈائجسٹ پر تفصیلی تبصرے کا شکریہ۔ نعیمہ ناز کا ناول اس ماہ یعنی جنوری کے شعاع میں شامل ہے۔

عامرہ جبیں' آصفہ بانو' عاصمہ گل۔۔۔ خانیوال

شعاع میں "دیوار شب" اور "ستارہ شام" ہماری فیورٹ رائٹرز کی فیورٹ کہانیاں ہیں۔ خواتین میں "چراغ آخر شب اور سفال گر" اور "جو بچے ہیں سنگ" بہترین کہانیاں ہیں' فرحت کا تو نام ہی کافی ہوتا ہے۔ پلیز ٹائٹل پر قدرتی مناظر کشی دیا کریں۔

ج عامرہ! آصفہ اور عاصمہ! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔ ٹائٹل کے بارے میں آپ کی تجویز نوٹ کرلی گئی ہے۔ اگر دیگر بہنوں نے بھی تائید کی تو ہم غور کریں گے۔

سلمیٰ سحر۔۔۔ حافظ آباد

آج میں قلم اٹھانے پر مجبور ہو گئی ہوں' پچھلے تیرہ ماہ سے میں دل تھام کر بشریٰ سعید کو پڑھ رہی تھی۔ اس سے پہلے میں نے انہیں نہیں پڑھا۔ "سفال گر" کے بارے میں کیا کہوں۔ اس سے پہلے میں نے ایسا اعتقاد نہیں پڑھا۔ اس سے پہلے میں نے ایسا دعا مانگنا نہیں سیکھا۔ اس سے پہلے میں نے ایسے اللہ کی تلاش میں فنا ہونا نہیں دیکھا۔ بشریٰ جی! آپ کی اگلی تحریر کا شدت سے انتظار رہے گا۔ جاتے جاتے بتادوں میں پچھلے دس سال سے خواتین پڑھ رہی ہوں۔ مجھے اس سے حقیقت میں تعلیم ملی۔

ج سلمیٰ! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ بشریٰ سعید تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔ تبصرہ کچھ نامکمل سا لگا۔ صرف ایک کہانی پر تبصرہ؟

شائستہ اکبر۔۔۔ ڈگری کالج جھڈو

"سفال گر" اس سال کی بہترین تحریر ہے' یہ میں نہیں' سب کہیں گے۔ فہرست میں نایاب جیلانی کو نہ پاکر جتنا دکھ ہوا' رسالے کے اندر دیکھ کر اس سے بھی دگنی خوشی ہوئی۔ جیو نایاب جیلانی! بادلوں کے پیچھے' بہت اچھا ناول رہا' ساحیہ کا کردار بہت پسند آیا۔ ساجی کی ثابت قدمی بہت اچھی لگی۔ راشدہ رفعت کا ناول "اب محبت کرنی ہے" کیا پہلے بھی شائع ہو چکا ہے؟ مجھے کچھ پڑھی ہوئی کہانی لگ رہی تھی۔ نسیم آمنہ کا "میزان" ناولٹ مکافات عمل تھا۔ روشنا جیسی لڑکیوں کو ایسی ہی سزا ملنی چاہیے۔ کیا واقعی وہ اس سزا کی حق دار تھی؟ سلسلے وار ناول اچھا جا رہے ہیں۔ افسانے سب پسند آئے' خاص کر "فیس بک" فاخرہ جبیں کا۔ خاتون کی ڈائری میں آمنہ اجالا کا انتخاب پسند آیا اور شعار میں مجھے اپنے والا شعر پسند آیا۔ ایک قاری بہن نے عازان کا مطلب پوچھا ہے تو میرے نیٹ سرچ کرنے پر اس نام کا مطلب یہ نکلا کہ عازان آزان چاہے ع سے لکھے یا آ سے مطلب سیم نکلے گا۔ یعنی عبادت کی طرف بلانا۔

ج پیاری شائستہ! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ' امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

امبر گل۔۔۔ جھڈو

آج جب تبصرہ لکھنے بیٹھی ہوں تو سوچ رہی ہوں کہ لکھنا چھوڑے ہوئے تین سال ہو گئے۔ وقت کا پتا ہی نہیں چلا۔

امی صحیح کہتی تھیں کہ

سدا نہ باگی بلبل بولے' سدا نہ باغ بہاراں
سدا نہ ماں پیے' حسن جوانی' سدا نہ محبت یاراں

امی تو مجھے چھوڑ کر چلی گئیں' مگر ماں جیسے خواتین نے کبھی بھی کسی بھی حال میں میرا ساتھ نہیں چھوڑا اور ان شاء اللہ تعالیٰ نہ ہی کبھی چھوٹے گا' صحیح غلط کی پہچان' اچھے برے کی تمیز' عقل و شعور سب کچھ اسی سے ملا ہے۔ تھینکس خواتین' دسمبر کے خواتین کا ٹائٹل بہت اچھا لگا۔ فہرست پر نظریں دوڑائیں راشدہ جی کا مکمل ناول دیکھ کر تو میں ایڈوانس میں ہی خوش ہو گئی کہ چلو کچھ تو ہلکی پھلکی سوفٹ سی نرم گرم جذبوں سے سجی تحریر پڑھنے کو ملے گی' وہ بھی کافی لمبے عرصے اور انتظار کے بعد راشدہ جی آپ کہاں غائب ہو جاتی ہیں' اتنے لمبے عرصے کے لیے نہ جایا کریں چھٹی پر' پلیز جلدی جلدی لکھتی رہا کریں' افسانوں میں فاخرہ جی کا نام پڑھ کر آنکھیں خوشی سے اور بھی چمکیں سب سے پہلے اسی کو پڑھا اور خوب انجوائے کیا۔ بے ساختہ اور جان دار جملوں نے افسانے کا مزا ہی دوبالا کردیا۔ پلیز ایک اچھا' بے ساختہ جان دار اور مزاحیہ جملوں والا مکمل ناول نیو ایئر گفٹ کے طور پر ہمیں گفٹ کردیجیے۔

ہمارے نام میں شائع ہونے والے فاطمہ چوہدری کے خط میں کیے گئے شکوے سے میں بھی سو فیصد متفق ہوں کہ واقعتاً "مکمل ناولز کی کمی تو اب بہت محسوس ہوتی ہے اور افسانوں کی بھرمار بھی اور سلسلے وار ناولز کے صفحات کی تعداد کو بھی کچھ بڑھانا چاہیے۔

ج: پیاری امبر! پچھلے ماہ تین مکمل ناول شامل تھے اور اس ماہ بھی تین مکمل ناول ہیں۔ اس سے زیادہ تعداد بڑھائی تو باقی تحریروں کو جگہ نہیں ملے گی۔

ملائکہ کوثر۔۔۔ بسم اللہ پور

ٹائٹل پر ماڈل کو دیکھ کر ایسا لگا جیسے کوئی الہڑ دوشیزہ نگاہیں جھکائے نئے سال کی آمد کی خوشی میں امید کا دیا

روشن کر رہی ہو۔ پھر دوڑ لگائی "جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو" کی طرف کہانی میں خاصا سسپنس ہے۔ میری بیٹی نمرہ بھی شوق سے پڑھ رہی ہے۔ پڑھتے پڑھتے وفور شوق سے بولی۔ مما! اگر زین کے ساتھ کچھ برا ہوا تو میں رو دوں گی۔ "میرے خواب لوٹا دو" نگہت عبداللہ کا دھیرے دھیرے زیادہ اچھا ہوتا جا رہا ہے۔ یہ گتھی تو سلجھ گئی کہ یاسمین کا رویہ اپنے شوہر کے ساتھ اتنا برا کیوں ہے۔ دو تین مہینے پہلے چھپنے والی کہانی شازیہ ہمایوں کی "نگاہ آئینہ ساز میں" اپنی مرکزی خیال کی وجہ سے دل کو بے حد متاثر کیا۔ ایک عام سی لڑکی قرۃ العین کی اچھی کاوش تھی۔

ج پیاری ملائکہ! ہمیں اندازہ ہے کہ ہماری مصنفین کی تحریریں اتنا گہرا تاثر رکھتی ہیں کہ قاری خود کو ان کرداروں کے درمیان محسوس کرتا ہے، ان کے ساتھ ہنستا ہے، ان کے دکھ پر روتا ہے اور ان کے احساسات کو دل سے محسوس کرتا ہے۔ فرحت اشتیاق کی دیگر تحریروں کی طرح اس ناول میں بھی قارئین کرداروں کے ساتھ ساتھ ہیں۔ "سفال گر" اور دیگر تحریروں کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔

آپ کی کہانی ابھی پڑھی نہیں، پڑھ کر ہی بتایا جا سکتا ہے قابل اشاعت ہے یا نہیں۔

کومل شہزادی..... گوجرانوالہ

آپی میں نے آپ سے چھوٹی سی گزارش کرنی ہے وہ یہ ہے کہ آپ نے اس سال ماہ جون میں ایک خط کے جواب میں کہا تھا کہ ہمارے پیش نظر صرف تحریروں کا معیار ہوتا ہے۔ خواہ وہ کسی نے بھی بھجوائی ہوں ہم ضرور شامل کریں گے۔ کیا آپ واقعی میں تحریر کو اسی شخص کے نام سے شائع کر دیتے ہیں جس نے آپ کو تحریر بھجوائی ہوں؟

ج پیاری کومل! ہم نے جو لکھا تھا بالکل حقیقت ہے، اچھی تحریریں خواہ کسی کی لکھی ہوں ہم ضرور شائع کرتے ہیں اور اسی کے نام سے شائع کرتے ہیں۔ آپ خود سوچیں کسی کی تحریر دوسرے نام سے کیوں شائع کریں گے۔ تحریریں اسی پتے پر بھجوائیں جس پتے پر خط بھیجا ہے۔ کاغذ کوئی بھی استعمال کر سکتی ہیں۔ صفحے کے ایک جانب سطر چھوڑ کر لکھیں۔

روشن ہاشم..... کراچی

آداب، ماڈل اچھی لگی۔ سب سے پہلے کرن کرن روشنی پڑھتی ہوں، اس کے بعد مستقل سلسلے جو اس ماہ سب ہی اچھے تھے۔ رزکمالی اور عائزہ خان کے انٹرویو پڑھے۔ ان کے بارے میں پڑھا۔ غزلیں اس ماہ کی صحیح تھیں۔ موسم کے پکوان، بیوٹی بکس کے پس سے فیض یاب ہوئے۔ اب آیئے اس سال کا بہترین ناول کی جانب جو ہے "سفال گر" بشریٰ سعید اس بار بھی نمبر لے گئیں، جتنی تعریف کریں کم ہیں۔ اینڈ صحیح رہا پسند آیا۔ "جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو" فرحت اشتیاق کا بہت اچھا چل رہا ہے۔ "اب محبت کرنی ہے" راشدہ رفعت کا اختتام پسند آیا۔ ذرا سی غلط فہمی نے کیا رنگ دکھایا، شکر ہے غلط فہمی دور ہو گئی۔ سمیرا احمد کا "دو کوڑی کی" واہ واہ سمیرا کمال کر دیا۔ بہت پسند آیا۔

ج پیاری روشن خواتین کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ، متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

سحر خان..... کوئٹہ

میں نے بہت کم اپنا تبصرہ یا رائے حوالہ ڈاک کیا ہے، شاید میرے لاشعور میں یہ بات چھپی بیٹھی ہے کہ آپ کی بزم میں میری رائے کو رد کر دیا جائے گا۔ خواتین ڈائجسٹ کے ساتھ چودہ سال مکمل ہونے کو ہیں، مگر اس تمام عرصے میں شاید ہی کسی تحریر نے مجھے اس طرح اور اتنا متاثر کیا ہو جتنا کہ "سفال گر" نے، ہر کردار گویا انگوٹھی میں نگینے کی طرح تھا، تحریر کی پختگی اور ہر کردار پر مصنفہ کی گرفت کامیاب تحریر کی دلیل ہے۔ "البا" سے لے کر "عمر" اور "حکیم بیگم" سے لے کر "صوفیہ" تک ہر کردار جیسے "سفال گر" کے لیے ہی بنا ہو، نیکی کس طرح پھیلتی اور اجالا پھیلاتی ہے۔ لاکھ دبانے اور چھپانے کے باوجود عمر کے کردار نے بڑی خوبی سے اس بات کو ثابت کیا، گرانٹ عمر کے باپ نے چاہے جیسے بھی زندگی گزاری، لیکن عمر کے کردار نے ابراہیم (دادا) کے نیک کردار کو زندہ رکھا، اپنے عمل سے۔ حکیم بیگم (بے جی) کا کردار اس دیے کی مانند تھا جو بے غرض و بے لوث ہر ایک کو روشنی فراہم کیا کرتا ہے۔ کہانی کے اختتام میں گرانٹ کی موت کا منظر جس خوبی سے مصنفہ نے تحریر کیا وہ بلاشبہ قابل داد اور موت کی اذیت کو لفظوں میں صرف وہی تحریر کر سکتا ہے جو اپنے کرداروں کے ساتھ جیتے مرتے ہیں۔ ادارہ خواتین ڈائجسٹ نے ہمیشہ بے مثال کارکردگی پیش کی ہے اور یقیناً "ہر اچھی اور بہترین مصنفہ کو متعارف کرانے کا سہرا بھی ادارے کے سر ہے" لیکن نہ جانے کیوں کچھ عرصے سے نئی اور کچھ پرانی مصنفات کی تحریر پر پڑوسی ملک کی گہری چھاپ لگ گئی اور بے حد حیرت اور معذرت کے ساتھ راشدہ صاحبہ کی تحریر پر ہوئی آپ تو بہت خوب اور خوب صورت لکھا کرتی ہیں، پھر یہ تحریر اور اس کا انداز؟ "اب محبت کرنی ہے" اور نایاب صاحبہ کا "بادلوں کے پیچھے" دونوں تحریروں کا مقصد میری سمجھ سے بالاتر رہا۔ رفعت ناہید صاحبہ آپ کی تحریر اتنی پختہ اور مکمل ہے کہ میرے پاس ایک چھوٹا سا بھی تعریفی جملہ نہیں۔ جتنا پختہ، بے ساختہ اور گہرا انداز تحریر آپ کا ہے بہت کم تحریروں میں ہوا کرتا ہے۔ نگہت صاحبہ اگرچہ "میرے خواب لوٹا دو" ابھی تک "کوئی لمحہ گلاب ہو" اور "مجھے روٹھنے نہ دینا" جیسا تاثر نہیں قائم کر سکا، لیکن چونکہ یہ آپ کی تحریر ہے تو ان شاء اللہ ہمیشہ سے زیادہ بہترین ہو گی۔

ج پیاری سحر! اس بات کا یقین کر لیں کہ خط ہمیشہ ہی ردی کی ٹوکری کی نذر نہیں ہوتے۔ آپ ہمارے نام میں جو خطوط پڑھتی ہیں۔ وہ ہماری قارئین بہنوں نے ہی لکھے ہوتے ہیں۔ دوسری اور اہم بات یہ ہے کہ ہمارے نزدیک خطوط آپ کی رائے جاننے کا ذریعہ ہیں۔ ہم موصول ہونے والے تمام خطوط پوری توجہ اور دلچسپی سے پڑھتے ہیں اور آپ کی رائے ہمارے لیے بہت اہمیت رکھتی ہے۔

خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔ تعریف کے ساتھ ساتھ آپ نے تنقید بھی کی ہے۔ ہم آپ کی تعریف و تنقید متعلقہ مصنفین تک پہنچا رہے ہیں۔

فرحانہ..... فیصل آباد

السلام علیکم! وقت نے رفتار پکڑی اور پتا بھی نہیں چلا کہ میرے پسندیدہ ناول "سفال گر" کی آخری قسط آن پہنچی۔ خوب صورت سے ناول کا دلکش سا انجام..... اس ناول سے میں نے دوسروں کو معاف کرنا سیکھا۔ اس ناول سے میں نے زندگی کو پرکھنا سیکھا۔ اسی ناول نے مجھے بتایا کہ جب محبت ہوتی ہے تو خامیاں نظر نہیں آتیں۔ یہ جاننے کے باوجود کہ گرانٹ پورن آرٹسٹ رہ چکا ہے۔ پرنیاں گرانٹ سے متنفر نہ ہوئی۔ احمد گرانٹ اس ناول میں میرا سب سے پسندیدہ کردار تھا۔ جسے بہت سی فلموں کے مکالمے مرتے وقت بھی ازبر تھے۔ جو اردو اور فارسی نہیں جانتا تھا، لیکن پھر بھی لغت سے مدد لے کر پرنیاں کو انہی زبانوں میں خط لکھا کرتا تھا، جس میں بہت سی خامیاں بھی تھیں۔ لیکن وہ مجھے ان تمام خامیوں کے باوجود بے حد پسند تھا۔ پسند کا تعلق تو دل سے ہے، صرف۔ دل سے..... البا اس ناول کا ایک اہم کردار تھی۔ سرخ رنگ کو پسند کرنے والی البا جسے کسی نے بے دردی سے قتل کر دیا تھا۔ لیکن مجھے کلیئر نہیں ہوا کہ البا کا قاتل کون تھا۔ اس بات کی ضرور وضاحت کر دیجیے گا۔

ج پیاری فرحانہ! "سفال گر" کی پسندیدگی کے لیے شکریہ، لیکن یہ کیا کہ کسی اور تحریر کا ذکر تک نہیں۔ اب تفصیلی تبصرے کے ساتھ شرکت کیجیے گا۔ البا کا قاتل ایک جنونی شخص تھا۔ اکثر اس طرح کے جنونی قتل مغرب میں پائے جاتے ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح کی عورتیں معاشرے میں گندگی پھیلا رہی ہیں اور انہیں قتل کر کے وہ معاشرے کی صفائی کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔

رضوانہ قریشی..... جلال پور پیر والا

پہلی قسط سے "سفال گر" میرا پسندیدہ ناول رہا ہے لیکن جانے کیوں اس کے اینڈ میں کچھ تشنگی سی محسوس ہوئی اور کچھ عجیب سا لگا۔ انہیں آخری قسط میں گرانٹ اور پرنیاں کے بارے میں تھوڑا زیادہ لکھنا چاہیے تھا۔ لیکن بلاشبہ سفال گر بہترین تھا۔ ایک بات جو میں پوچھنا چاہتی ہوں کہ جب گرانٹ اور البا کئی سال میاں بیوی کی طرح رہے، بلاشبہ انہوں نے شادی نہیں کی، تو صوفیہ اور عمر کس طرح رشتہ زوج میں منسلک ہو سکتے ہیں؟؟ وہ تو بہن بھائی بنتے ہیں۔

ج: پیاری رضوانہ خواتین کی محفل میں خوش آمدید اور دعائیں۔

صوفیہ البا کی بیٹی تھی اور اس کا باپ وہ شخص تھا جو البا سے ماضی میں وابستہ رہا تھا جبکہ عمر احمد گرانٹ کا بیٹا تھا۔ دونوں بہن بھائی نہیں تھے دونوں کے ماں باپ مختلف تھے۔

نجمہ بخاری۔۔۔ مظفر گڑھ

آپ کی محفل میں پہلی بار زبردستی گھسنے کی وجہ "سفال گر" ہے۔ ایک خوبصورت بے مثال اور نہ بھولنے والی تحریر' بشریٰ سعید کا "سفال گر" جیسے پوری آب و تاب سے چمکتا آفتاب' بشریٰ سعید کے قلم کی شعلہ بیانی کبھی نہ بھولنے والی تحریر اور "عمر" کا کردار اپنی تمام تر پاکیزگی اور خوبصورتی کے ساتھ "امر" ہے۔ لیکن "کرنیاں" کے ساتھ اچھا نہ ہوا۔ اور یہ اب آپ کا فرض بنتا ہے کہ بشریٰ سعید کا انٹرویو معہ تصویر کے شائع کریں۔

"فرحت اشتیاق" اپنے جوبن پہ ہیں اور روم کی سیر ہمیں گھر بیٹھے کرا رہی ہیں سکندر شہریار کا کردار آئیڈیل ہے لیزا محمود "آئی تھنک عموماً" لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ حساس' نرم دل اور خیال رکھنے والی اور خوبصورتی کو پسند کرنے والی' آثار بتاتے ہیں یہ ناول بے مثال ہو گا۔

ج:۔ نجمہ! خواتین کی محفل میں خوش آمدید اور دعائیں۔ کیا پچھلے دس سال میں کوئی ایک بھی تحریر ایسی نہ تھی جو آپ کو قلم اٹھانے پر مجبور کر دیتی؟ اب قلم اٹھا ہی لیا ہے تو باقاعدگی سے شرکت کرتی رہیے گا۔ بشریٰ عمر کے بارے میں آپ جو سوال کرنا چاہیں کر سکتی ہیں وہ آپ کے سوالات کا جواب دیں گی۔

لکھنے کا کوئی خاص طریقہ نہیں ہے' جو ہم آپ کو بتا سکیں یہ قدرتی اور خداداد صلاحیت ہوتی ہے۔ مطالعہ اور مشاہدہ تحریر کو پراثر بناتا ہے۔ آپ میں صلاحیت ہے تو ضرور لکھیں۔

ماریہ ارم گورنمنٹ کالج سانگلہ ہل

خواتین نے بہت سی رائٹرز کو متعارف کروایا ہے۔ فرحت اشتیاق' عمیرہ احمد' فائزہ افتخار اور بہت ساری رائٹرز جو کہ قابل سیلیوٹ ہیں۔ بشریٰ سعید کے "سفال گر" میں حکیم بیگم اور عمر کا کردار بہت اچھا لگا "جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو" کی صورت فرحت اشتیاق کو پڑھنے کا موقع بھی مل گیا۔ نگہت عبداللہ کا "میرے خواب لوٹا دو" بھی ان کے دوسرے ناولز کی طرح بہت زبردست جا رہا ہے۔

ج: پیاری ماریہ خواتین کی محفل میں خوش آمدید اور دعائیں۔

خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

رضوانہ شکیل راؤ۔۔۔ لودھراں

ٹائٹل اس دفعہ ہنڈرڈ پرسنٹ نمبر حاصل کر چکا ہے' خاص طور پر ماڈل گرل کے آئیز میک اپ کا جواب نہیں اور ہاتھ میں نئے سال کا "روشن چراغ" تھا۔ ماڈل کو چار چاند لگ گئے۔ کرن کرن روشنی سے ہر طرف روشنی سی پھیل گئی۔ رزکمالی اور عائزہ خان سے ملاقات کچھ خاص نہیں لگی۔ "چراغ آخر شب" رفعت ناہید سجاد نے بہت ڈوب کر لکھا ہے۔ ان کی یہ دل گداز اور تلخ حقیقت والی کہانی مدتوں فراموش نہ ہونے کے قابل ہے' اس کے سب ہی کردار اپنی اپنی جگہ اتنے مکمل اور جذبے سے سرشار ہیں دل کے بہت اندر تک مسلمانوں کا درد اترتا چلا جاتا ہے۔ کنیز نبوی سے ریکویسٹ کرنی ہے کہ تھوڑا سا ٹائم نکال کر کوئی ناول لکھیں جو خوب صورت اور حساس طرز تحریر ان کا خاصا ہے' ہم انہیں مس کرتے ہیں۔

ج پیاری رضوانہ! ہمیں افسوس ہے کہ خواتین کے کسی سلسلے میں آپ کی تحریر شامل نہ ہو سکی۔ آپ محنت کر کے اچھا انتخاب بھجوائیں' ضرور شائع ہو گا۔

خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ' آپ کی فرمائش پر کنیز نبوی کا ناول شامل ہے۔

سفال گر

آمنہ زریں

وصل سے منسلک کہانیاں اطمینان تو دیتی ہیں مگر فراموشی بھی۔

المیہ میں کیسا سحر ہے کہ جو ان مٹ نقش چھوڑ جاتا ہے۔

کیا وجہ ہے کہ لفظ تو وہی ہوں۔ ان کا چناؤ اور ترتیب ان کے اثر کو سحر میں بدل دے؟

کردار نگاری میں وہ کون سا طلسم ہے کہ جو کردار پر گزرے..... وہ ہم پر گزر جائے..... "رقص جنوں" میں بھی ایسا ہی ایک طلسماتی اثر تھا کہ ہم کرداروں کے ساتھ موجود سے ناموجود' جانے کہاں سے کہاں تک سفر کرتے رہے' مگر طلسم نہ ٹوٹا۔

بشریٰ سعید لفظوں کی فسوں گری میں خاصی مشاق ہیں۔

"سفال گر" محض ایک جملے کی تحسین کہ "بشریٰ سعید کو اتنا اچھا لکھنے پر مبارک باد" سے کہیں بڑھ کر ہے' کیونکہ اس میں کہانی کی تمام تر خوب صورتی بدرجہ اتم موجود ہے۔

کردار نگاری بھی' منظر نگاری بھی' جزئیات بھی' تفصیلات بھی' تسلسل بھی' ربط بھی' اور راز بھی۔

"سفال گر" واقعی بہت خوب صورت ہے۔

کہانی کیا ہوتی ہے؟ کیوں ہوتی ہے؟ کیسے ہو جاتی ہے؟

کیا ہم کہانی نہیں ہوتے؟

فرق صرف یہ ہے کہ ہماری کہانی ہم لکھتے نہیں' بس پڑھتے رہتے ہیں۔

یہ کہانی شاید کہانی نہیں..... داستان ہے اور داستان گوئی کی صفات سے سجی ہوئی۔

کیا نہیں اس میں؟

دنیا' طلب' انتہا' ظاہر' باطن' قسمت' اتفاق' بے بسی' شدت' خواب' سراب' تتلیاں' رنگین پروں والی' خواہشیں اور پھر بے رنگ خاکستر آنکھیں۔

کیسے عذاب ہماری گھات میں رہتے ہیں اور کیسے خواب خود ہمارے ہی ہاتھوں سے گر کر چکنا چور ہو جاتے ہیں..... کیسے اس مرحلے کی آبلہ پائی طے ہوتی ہے کیسے اس سفر میں سراب بھی ہم سے چھن جاتے ہیں..... کیسے دست حیات سے خوابوں کا سنہری جام گر جانے کے بعد ہم جی لیا کرتے ہیں۔

زندگی میں "کیوں" کا وجود ایک بار طوفان اٹھانے کے لیے آتا ہے۔ شکایت' گلے' تقاضے اور ناقدری کا بوجھل احساس' "کیوں" کا ادراک لے کر آتا ہے مگر پھر کبھی کبھی "کیوں" سوچ کی انگلی پکڑ لیتا ہے اور مرحلہ وار شناخت کی تلاش کے لیے' نتیجہ اخذ کرنے کے لیے حقیقت کو پانے کے لیے' اپنی روح کی پیاس لیے چلنے لگتا ہے' قدم در قدم' سفر در سفر۔

جب کردار احساس کی شدت سے ڈھالے جائیں تو وہ لفظوں ہی کے ذریعے پڑھنے والے کے دل تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں۔ بشریٰ نے کہا تھا "کرداروں سے انصاف کرنے کی زحمت میں نے نہیں اٹھائی۔" ابھی اگر وہ زحمت اٹھا لیتیں تو جانے کیا حشر اٹھاتیں۔

دیکھیے! پہلا کردار جس سے آپ متعارف ہونے جا رہے ہیں۔

حکیم بیگم۔

"ایک گل سن لے کاکا! میں لکھ ان ولی سہی' بے عقلی سہی' پر میری نیت وچ کھوٹ نئیں' میرے من

وچ میل نئیں۔"

دونوں جہان میں سرخروئی کا راز شاید یہی ہے کامیابی کا لفظ میں استعمال نہیں کرنا چاہتی..... وہ ایک الگ چیز ہے۔ قیمتی اجلی پوشاکوں تلے' بڑی بڑی تعلیمی سندیں لیے تن کے اندر اگر اجلا من نہیں' تو کامیابی بھی کس کام کی؟

"یہ دل بڑا چندرا ہوتا ہے بیبا! اس کی ہر بات من لیں تے یہ گل وچ کتے والا پٹہ ڈال کر اپنے پیچھے لگاتا ہے۔ جیبھ لٹک آتی ہے..... ڈیلے پھٹ پڑتے ہیں' پر اس ڈاھڈے دی من مرضی فیروی پوری نئیں ہوندی۔"

(یہ دل بڑا پاگل ہوتا ہے۔ اس کی ہر بات مان لیں تو یہ گلے میں کتے والا پٹہ ڈال کر اپنے پیچھے لگاتا ہے۔ زبان لٹک جاتی ہے۔ آنکھیں ابل پڑتی ہیں پر اس زور ور کی من مرضی پھر بھی پوری نہیں ہوتی۔)

یہ آفاقی سچ ہے۔ ضبط نفس ہی تہذیب کا ضامن ہے اور ہمارے مذہب کے فلسفہ حیات کا نکتہ آغاز بھی ضبط نفس ہے۔ قرآن کریم میں بھی ہوا پرست لوگوں کو ہانپتے ہوئے کتے سے تشبیہ دی گئی ہے۔

اور دل تو دراصل مقام حق ہے..... یہ نفس ہے جو دل کو وسوسوں اور خواہشوں میں مبتلا کر کے اپنی اتباع کرواتا ہے..... اور راہ سے بے راہ کرتا ہے۔

"میرا قصور ہے۔ سارا قصور میرا ہے۔ اللہ نے مجھے ہتھ دیے' مجھے ان سے کم لینا ہی نہ آیا۔"

یہ آفاقی اعتراف ہے..... جو زیادہ تر لوگ کرنے سے ہچکچاتے ہیں اور' اوروں پر ملبہ ڈالتے' گلہ کرتے' بیت جاتے ہیں۔

علامتی طور پر "ہتھ" سے مراد موقع بھی ہے' مہلت بھی جو جسم' ذہن اور زندگی کی صورت ہمیں عطا کیا گیا ہے۔ کتنا کام لیتے ہیں ہم ان سے۔

دیکھیے پرنیاں کے حسن و جمال کو حکیم بیگم کی زبان سے..... چاشنی بھرے لفظوں سے سادگی ٹپکتی ہے۔

"کنی وار گا سوہنی تھی نشکھی تھی۔ کدی کدی جوڑا بناتی تھی' پیروں میں گرگابی پہنتی تھی' جو رنگ وی پہن لیتی پھب جاتا۔ لاکھا نہ مسی نہ غازہ..... فیروی جھر مل جھر مل کرتا روپ تھا' رات کو جدوی چھینٹ کی رضائی وچ سوتی تے مجھے دیوا بالنے دی لوڑ نہ رہتی۔"

ایک ایسے وقت میں حکیم بیگم نے محض اپنے حسن ظن اور حسن نیت سے پرنیاں کو پناہ دی جبکہ سارا گاؤں اس کا دشمن ہو چکا تھا اور خدا کے قرب اور پاکیزگی کے دعوے دار اپنے گمان کے بل بوتے پر پرنیاں کی ذات پر رکیک حملے کر رہے تھے۔ سچ کیا تھا؟ یہ تو حکیم بیگم کو بھی معلوم نہیں تھا' فرق تو صرف حسن ظن کا تھا!

کردار کی استقامت باہر کی پڑھائی لکھائی سے ملنے والی چیز بھی نہیں۔ یہ باطنی طاقت کا نام ہے..... اور باطن کی پاکیزگی ہی دراصل اس کی طاقت ہے۔

دیکھیے! پرنیاں کا تعارف:

"ماتھا چندرماں' ابرو محراب دار' گردن راج ہنسنی سی' ہاتھ کنول روپی..... ہر ادا کے سنگ وہ نیا بہروپ بھرتی..... کسی دم برفانی صبح ایسی سپید' کبھی شہد آشام کے شگوفوں جیسی..... تو کبھی پگھلا ہوا سونا..... احمد نے کسی ایک جسم کو اتنے رنگ بدلتے کبھی نہیں دیکھا تھا' لیکن خوبروئی کے ساتھ جو تفاخر ملزوم ہوتا ہے' وہ پرنیاں میں ناپید تھا۔ وہ جیسے اپنے حسن سے کلی طور پر بے خبر تھی۔"

پرنیاں کی بے خبری' اس کی معصومیت پر دلیل ہے اور اس کی بے بسی' بڑی حقیقی۔

"میرا گناہ یہ ہے کہ میں ایک مرد سے محبت کرتی ہوں..... صرف اتنی محبت کہ اسے نہ دیکھوں تو مجھے بینائی کی ضرورت نہیں..... اس کی آواز نہ سنوں تو مجھے سماعت سے غرض نہیں..... وہ مبہم سا مسکرا دے تو میری روح سینے سے کھینچ لیتا ہے..... آنکھ کے ایک اشارے سے وہ میری نبض روکنے پر قادر ہے۔ اتنی سی محبت تو خدا مجھے معاف کرے گا۔"

دیکھیے! پرنیاں کی بے خودی۔

"وہ بہت رغبت سے کھا رہا تھا۔ وہ جب نوالہ نگلتا یا مشروب کا گھونٹ بھرتا تو اس کے گلے کا کنٹھ ہلکا سا ابھر آتا اور گردن میں ایک لہر اوپر سے نیچے تک رینگ جاتی۔ پرنیاں مبہوت سی اسے تکتی رہی تھی۔"

مشرق اور مغرب کا فرق' مزاج اور کردار' دونوں میں بخوبی جھلکتا ہے۔ باوجود تمام تر بے خودی کے..... پرنیاں مشرقی اطوار کی وجہ سے جھجک کا شکار ہوتی رہتی ہے..... دوسری طرف البا اور صوفیہ کے کرداروں میں آزاد بودوباش کا واضح رنگ نظر آتا ہے۔

پرنیاں کی محبت کا رنگ دیکھیے کہ اطالوی کھانوں سے رغبت نہ ہونے کے باوجود' فلموں اور اداکاروں سے دلچسپی نہ ہونے کے باوجود' وہ ایسا کرنے کی کوشش میں ہلکان نظر آتی ہے۔

"خدا کے لیے تم مذہب تبدیل کر لو۔" وہ گھگھیائی۔

"مجھ سے شادی کر لو۔" اس کی آواز تھکن گزیدہ تھی۔

یہ پرنیاں ہے۔

دوسری طرف البا کو دیکھیے! ہر دم حق جتلاتی سر پر سوار..... پہلی ہی ملاقات میں پرنیاں کو دق کرتی' حظ اٹھاتی' کتیا کا لفظ بے جھجک استعمال کرتی۔ اس کی تصویر کشی اس کے کردار کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔

پتلے پتلے ہونٹ' سرخ بال' سرخ جوتے' نیم برہنگی' زرد روئی' بالکل اس کی خواہش کی طرح! معصوم بچی کے کرلانے پر بے نیاز رہنا..... رائن کی بے احتیاطی پر انتقامی کارروائی کرنا' چابی کی نقل بنوا کر پاس رکھ لینا..... حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی اور بے لگام خواہشات اپنی زندگی کا توازن تو خراب کرتی ہی ہیں..... دوسروں کا بھی خواہ مخواہ۔

البا جیسے لوگ چاہت کے نام پر دھبہ بنتے رہے ہیں اور بنتے رہیں گے۔

ایسے لوگ فریب نظر کے بعد نفس پرستی کا شکار ہوتے ہیں' کیونکہ وہ اپنی خواہش سے پیار کرتے ہیں۔ کسی دوسرے سے پیار کرنا ان کے بس کا کام ہی نہیں ہوتا..... اور اپنی ہوا پرستی کو خواہ مخواہ محبت کا نام دے کر ان بے چارے کو تختہ مشق بنا ڈالتے ہیں..... جس سے محبت کا دعوا کر بیٹھتے ہیں۔

آہ..... ایسے لوگ اور ان کی محبت!

صوفیہ کی بد مزاجی اسے زیب دیتی ہے' حالات کی سختی' محبت اور شفقت سے انجان..... وہ نرمی سے بولے بھی تو کیونکر؟

کارل سے ان کے دوبدو جملے کہانی میں "کرنچ" کا مزا دیتے ہیں۔

دیکھیں' صوفیہ کو مغربی تناظر میں..... باوجود تمام تر تلخی' رسوائی کے مار ڈالنے والے احساس کے ساتھ اس نے بھی چاہے جانے کی چاہ کو چھو کر دیکھنے کی خواہش کی..... یہ کس کو نہیں ہوتی؟ اور کیوں نہ ہو؟

فرق تو وہی ہے' جو ساخت کا ہے' گل وان اور پیک وان کا.....!

کہانی خود تو بیان ہوتی ہی ہے' ایک بیان بین السطور بھی ہوتا ہے۔ کہانی میں تقدیر ہر شے پر حاوی نظر آئے گی' جس کو کوئی تدبیر بھی واپس نہیں پھیر سکتی۔ یہ ایک نادیدہ مگر موجود قوت ضرور ہے۔ ورنہ پرواز کے لیے محض خواہش کے پر کافی ہوتے..... تو گرانٹ ان پروں کے سہارے آسمان کو ضرور چھو لیتا۔ بعض اوقات خواہش کچھ ایسی ناجائز بھی نہیں ہوتی' مگر اس کی تکمیل کے لیے کی گئی عجلت' طریقہ کار کو غلط ٹھہرا دیتی ہے اور پھر مکافات عمل نہ ہو..... ایسا تو آج تک نہیں ہوا۔

یہ الگ بات ہے کہ ہم دوسروں کے مکافات عمل کے تماشائی ہوتے ہیں اور اپنے سے بے خبر!

اس کہانی میں مشرق' مغرب کی طرح متضاد کردار اور ان کے مخصوص میلان بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ خدا سے ربط کا طریقہ' زندگی گزارنے کے چلن کو کس طرح سے متاثر کرتا ہے' یہ ہمیں حکیم بیگم' پرنیاں' ایڈم گرانٹ' ابراہیم' صوفیہ اور عمر کے کرداروں سے پتا چلتا ہے۔

حکیم بیگم کا کامل یقین..... "جو ہر ناممکن کو ممکن کر سکتا ہے' اس کا نام ہی اللہ ہے' تو ہاتھ اٹھا تو سہی جھولی اڈتے سہی۔" اسی نے عمر کو دعا کی طاقت پر ایمان لانا

www.Paksociety.com

سکھایا اور دعا بھی وہ جو فرشتے کے پر کی طرح کوری اور چٹی ہونی چاہیے۔ شک کا ہلکا سا شائبہ بھی نہ ہو اس میں..... اور پھر عمر نے دیکھا کہ دعا دل پھیر دیتی ہے، مقدر بدلتی ہے اور معجزہ کرتی ہے۔

پرنیاں کے دل میں چھپا احساس جرم اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت پر اس طرح حاوی ہوا کہ اس نے اپنے حالات کا ذمہ خدا کی مستقل ناراضی پر ڈالا اور مایوسی کی کربناک کیفیت میں اپنی جان لینے کی کوشش کی اور خود کشی کی حقیقت سوائے اس کے کیا ہے کہ انسان میں سامنا کرنے کی تاب نہ ہو.....!

ابراہیم نے چمڑے کی بیلٹ مار مار کر احمد کو خدا کے قریب کرنا چاہا..... پھر وہ ہوا؟

اور جب احمد کی باری آئی..... لاشعوری طور پر اس نے صوفیہ کے ساتھ وہ ہی سخت گیری آزمائی۔ نتیجہ، صوفیہ، ماں باپ، مذہب اور بالآخر خدا سے نہ صرف برگشتہ ہوئی، بلکہ بغاوت پر آمادہ بھی۔

پر ڈاکٹر گرانٹ کے ساتھ تقدیر نے تھوڑی کرم فرمائی شاید اپنے مذہب کو ترک نہ کرنے کی بنا پر کہ جو صوفیہ کی حفاظت نہ صرف گرانٹ کے حصے میں آئی، بلکہ قدرت بھی اس کی ہم نوائی کرتی رہی۔

ماں کا رشتہ بس ممتا کا مظہر ہے، مگر اس کہانی میں اس رشتے کی بھی کئی پرتیں دکھائی دیتی ہیں۔ الباء جس نے صرف جنم دینے کا احسان کیا۔ آمنہ، جس نے اولاد کی تمنا اور تشنگی جھیل کر بھی ماں ہونے کا لطف محسوس نہ کیا۔ پرنیاں جو احساس جرم سے نڈھال خود فراموشی کے رستے پر چل نکلی۔

حکیم بیگم..... اصل تھی یا نہیں تھی وہ ہر وقت ممتا سے بھرپور تھی اور ونیس..... پرنیاں کی جدائی سہ سہ کر اس کا دل کتنا تھک چکا تھا۔ اور اس ملاقات نے پرنیاں اور ونیس کو تو رلایا ہی..... ہمیں بھی۔

"پرنیاں! تم نے کیا کر دیا؟ تمہیں مجھ پر ترس کیوں نہ آیا؟ کسی کا کچھ نہ بگڑا ہوگا، میرا تو کچھ بھی صحیح نہ رہا۔ ساری دنیا تمہیں دھتکار دیتی، میں نہ دھتکارتی، چاہے ساری دنیا تمہیں اپنا بنانے سے انکاری ہو جاتی، کیونکہ میں....." وہ آنسوؤں میں بہہ گئی۔ "اب ماں بنی ہو تو تمہیں پتا چل گیا ہوگا کہ ماں خدا کی بنائی ہوئی سب سے مجبور مخلوق ہے۔ اولاد سے محبت نہ کرنا اس کے بس کی بات ہی نہیں۔"

ساری عمر، حکیم بیگم ایک برتن بھی صحیح نہ گھڑ سکی..... اسے اپنے ہاتھوں سے "کم" نہ لینے کا قلق رہا لیکن اس نے مشق چھوڑی نہیں اور ہر دفعہ نئے سرے سے، مستقل مزاجی سے محنت کی۔ علامتی طور پر یہ استعارہ کوشش میں جتے رہنے اور مایوس نہ ہونے کا پیغام ہے اور عمر کی صورت، حکیم بیگم کی نیت کا پھل، اجر کی صورت ملا اور آخر کار وہ ایک ایسی تخلیق میں کامیاب ہو ہی گئی، جس پر اس نے اپنی محبت، یقین اور مستقل مزاجی سے کوشش کی تھی۔

صوفیہ اور عمر پر امید مستقبل کا استعارہ ہیں..... خدا سے محبت اور اس پر کامل ایمان رکھنے کے انعام کا پیغام ہیں۔

پرنیاں، جس خالص جذبے کی اسیر ہوئی۔ وہ محبت غیر فانی ثابت ہوئی۔ جس نے بے وفائی کا زخم سہہ کر بھی دم نہ توڑا..... اور آخر کار جس نے صوفیہ کو بھی صرف گرانٹ کے حوالے سے شناخت کیا۔ وہ اپنے جنون کے ہاتھوں سدا مجبور محض رہی۔ پہلے لمحے سے لے کر آخری لمحے تک!

"اس گھڑی پرنیاں پر طلوع ہوا کہ ایسا سوچنا اس کی حماقت تھی۔ محبت وہ جنس ہے جسے کبھی موت نہیں آتی۔ یہ آب حیات کے چشمے میں کھلنے والا کنول ہے۔ بقا کا بھنورا اس کے روپ کا رسیا ہے۔ فنا سے اس کا ہرگز علاقہ نہیں۔"

الفاظ کی ترتیب، ترکیب اور ان کا استعمال، تخیل، مشاہدے اور خالص زبان پر عبور ہی بشریٰ کی کہانی کو حقیقت کی تلخی کے باوجود، خوابناک ماحول میں دکھاتے ہیں۔

"نارنگی کی پھانک سا دہانہ۔"

"سرمائی ہوا میں خوش گوار خنکی تھی۔ آسمان اجلے سپید، پھولوں والا نیلا غالیچہ تھا، جو کوئی دھو کر اس کے جھروکے میں سوکھنے کے لیے پھیلا گیا تھا۔ بانکا رنگریز سورج کیسر کھلے سفید رنگ کے بادیے بھر بھر کے درو بام پر انڈیلتا تھا۔"

"ٹوٹی ہوئی مٹھیا والی ڈونگی۔ میں نلکے سے پانی بھرا اور چھوماں کے قریب کھڑا ہو کر مسواک کرنے لگا۔"

"مسواک کا پھونسڑا عمر کے حلق میں چلا گیا۔"

"ممٹی پر سے دھوپ سرک کر آنگن میں اتر آئی تھی اور وہ کل لوٹیا کبوتر....."

"سفید پروانوں ایسی کلیاں جن کے مکھ پر ارغوانی بندکیاں تھیں۔"

اور ساری کہانی میں ایسی ہی تراکیب، جن کی خوب صورتی خالص زبان کی مرہون منت ہے..... بے حدو بے حساب تخیل کا پتا دیتی ہیں اور ان سب پر مستزاد، موضوعاتی معلومات، مقامات کی سیر، عمارتوں کی نقشہ گری، فلمیں، اداکار، ان کے ادا کردہ مکالمے، ادب، شاہ پارے اور ان کے کردار..... کیا یہ سب ہمیں تخیل کی خوش رنگ وادی میں نہیں لے جاتے؟؟؟

بشریٰ سعید! آپ کی بدولت ہمارے خیال نے بھی سیر کرلی۔ دیکھیے! کچھ خوب صورت جملے۔

"دور ایک تارہ سر کے بل، بحرالکاہل میں جا گرا۔"

"وہ ترقی کی نردبان کا اسفل ترین زینہ بھی چڑھ نہ سکا تھا۔"

"وہ مال کاسد تھا، اس کی بازار میں کوئی مانگ نہ تھی۔"

"آسمان جولاہے کے کرگھے پر چڑھا ہوا قالین تھا، وہ جولاہا ساحر تھا۔"

"گھاس میں ٹھہرے ہوئے پانی کی باس، تمباکو کی مہک، کلون کی خوشبو۔"

"چندر جوت اس کی آنکھوں کی سیاہی میں گھل کر ایک سرد آگ دہکا رہی تھی۔"

"سیاہ آنکھوں کا عنکبوتی طلسم اس کے چاروں اور جال بننے لگا۔"

کچھ منظر۔

"آسمان ایک بیکراں سیاہ غربال تھا اور ستارے پارے کی چمکیلی بوندیں، جو اس غربال کے بے شمار موکھوں میں اٹکی تھیں..... اور کسی بھی آن پھسل کر گرنے والی تھیں۔"

"ساری فضا میں برف کے گالے سفید چنگاریوں کی مانند اڑ رہے تھے۔ تیزی سے بہتی ہوا بھٹ میں چھپے درندے کی طرح پھنکارتی تھی۔ جس دن کا آغاز آسمان سے اترتی ملائم سفید پھواروں سے ہوا تھا، وہ اب طوفان کی آماجگاہ بن رہا تھا۔"

"میگھ گھام در و دیوار سے کسی خودرو جنگلی بیل کی طرح لپٹا تھا۔ انار کی گلابی ہنسی شام کی دہلیز پر اٹکی تھی۔ بکائن کے پھولوں کی کسیلی مہک پر آتی جاتی سانس کے گرد ایک پھندا سا کس دیتی تھی۔" دیکھیے! انتظار کی کیفیت.....

"وہ ساری رات جاگتی رہی اور اٹھ اٹھ کر آسمان پر سپیدی کے آثار ڈھونڈتی رہی۔ مٹیالے سرمئی پروں والے کبوتر جیسا آسمان تاریکی کا ایک ایک دانہ چگتا تھا۔ سیاہ دانوں کا انبار لگا تھا اور کبوتر کی چونچ میں ایک ہی دانہ سماتا تھا۔ اس انبار کا حجم گھٹنے میں ہی نہ آتا تھا۔"

اس مقالے کو لکھنے کے بعد بھی مجھے نہیں لگ رہا کہ میں بشریٰ سعید کے انوکھے اسلوب تحریر کی تعریف کا حق ادا کر سکی ہوں یا اس سحر کو بھی بیان کر پائی ہوں جو پڑھتے وقت مجھ پر چھا جاتا ہے۔

تخیل کی دنیا میں کچھ دیر رہنا ہمیں حقیقت کے ساتھ ہم قدم ہونے کی توانائی فراہم کرتا ہے۔

بھلا خوابوں کے بغیر بھی کوئی زندگی ہے؟

کبھی کبھی جی چاہتا ہے نا..... کہ زندہ بھی ہوں..... اور دنیا سے بھی منہ پھیر لیں۔

تو ایسے ہی وقت کا حاصل "تخیل" ہے۔

اور تخیل کے پروں پر اڑنے والے پنچھیوں کی پرواز دیکھنا بھی خدا کی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے۔

رفعت ناہید سجاد

پروفیسر عباس رشید کا گھرانہ علمی و تہذیبی اعتبار سے مڈل کلاس روایات کا امین ہے۔ پروفیسر صاحب کی قابلیت اور نیک نامی مثالی ہے۔ وہ تاریخ کے مضمون کے استاد رہ چکے ہیں اور کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں' ان کا دروازہ ہر طالب علم اور خاص و عام کے لیے کھلا رہتا ہے۔ شاگرد' ان کے علمی خزینے سے فیض حاصل کرنے آتے رہتے ہیں۔ گھر کا تمام نظم و نسق پرانی گھریلو ملازمہ کریم بی کے ذمہ ہے جو بڑی جانفشانی سے سنبھالے ہوئے ہیں۔ ان کی بیگم کے ساتھ اولادوں کو بھی آزادیِ اظہار کی مکمل اجازت ہے۔ ان کی تین اولادیں ہیں۔ تنویر' عثمان اور عبیر۔

بڑی بیٹی تنویر ماں کی لاڈلی ہے۔ دورانِ تعلیم غیر نصابی سرگرمیوں میں خاصی سرگرم رہی۔ وہ مقامی کالج میں پڑھاتی۔ شادی کے بعد اس کی صلاحیتیں جیسے گہنا گئی ہیں۔ سسرال میں علم اور تہذیب دونوں کی کمی ہے۔ ساس گھر پر حاوی ہیں' اپنے آگے وہ شوہر سمیت کسی کی چلنے نہیں دیتیں۔ تنویر کا شوہر نعیم روایتی مرد ہے۔ وہ ایک مقامی روزنامے میں صحافی ہے لیکن ایک پڑھی لکھی بیوی کے ساتھ اس کا رویہ انتہائی بے حسی لیے ہوئے ہے۔ ایک بیٹی گڑیا ہے۔ جس کی نگرانی کریم بی کے سپرد ہے۔ پسند کی شادی اور نوکری کرنے کے باوجود سسرال میں اس پر زبان بندی کا اصول سختی سے لاگو ہے۔

عثمان عباس کا شمار ان نوجوانوں میں ہوتا ہے جو قابلیت اور ڈگری کے باوجود معقول نوکری حاصل نہیں کر پاتے۔ تاہم گھر کے ماحول اور پر اعتماد فضا نے اسے مکمل مایوس نہیں کیا ہے۔ وہ مختلف آئی ٹی یونی ورسٹیز کے لیے پروگرامنگ کرکے اتنا کما لیتا ہے کہ گزر اوقات اچھی ہو جائے۔

۲۷

ستائیسویں قسط
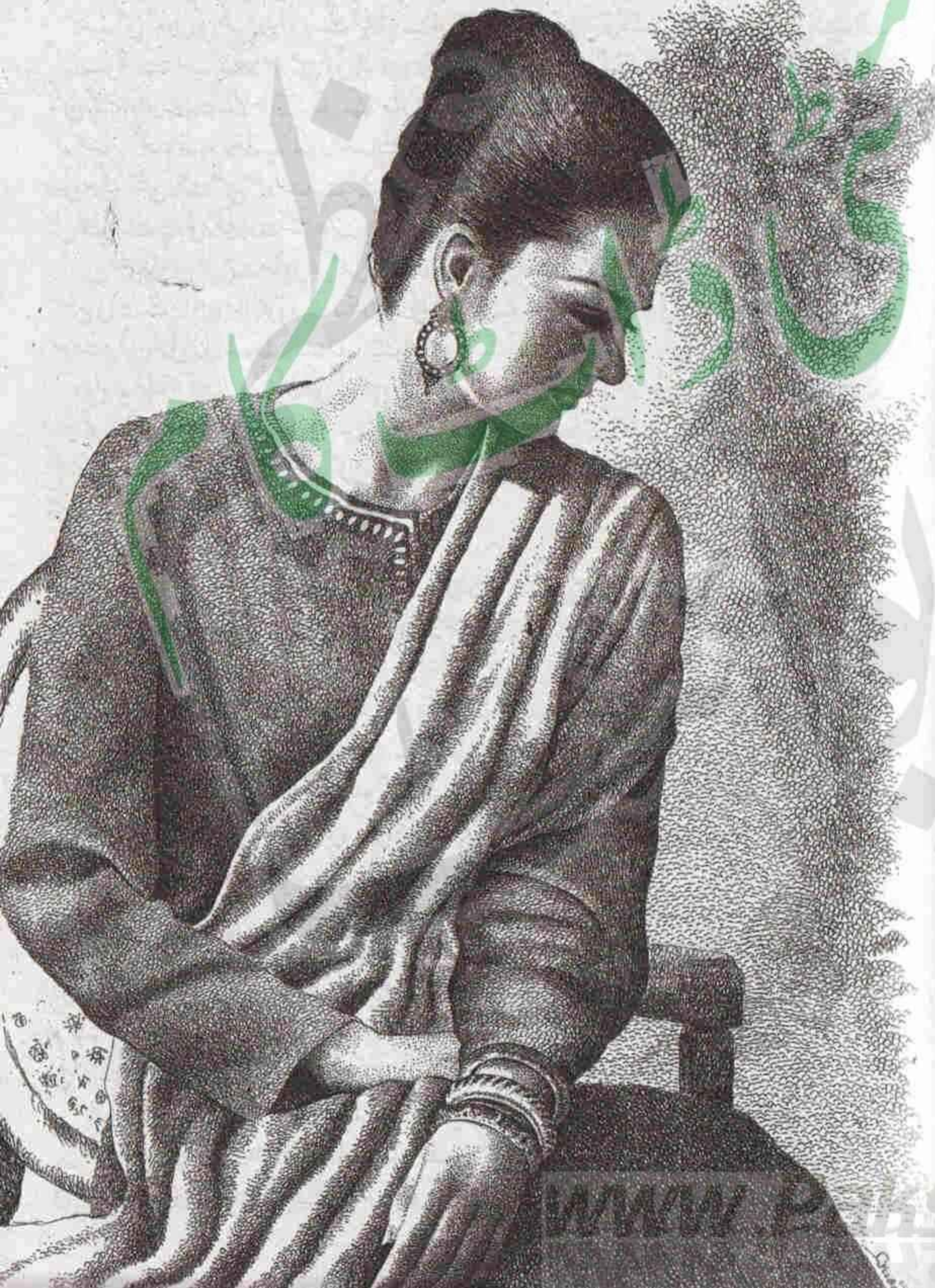
وقت جیسے جامد ہو کر ٹھہر گیا تھا۔ یوں تو ہمہ وقت بدلتا رہتا ہے، مگر پھر ویسا ہی رہتا ہے۔ جنتریوں کی جگہ ڈائری نے لے لی۔ دھوپ کے دیوار اور کوٹھے پر چڑھنے سے وقت کا تعین کرنے کے بجائے دیواروں پر لگی گھڑیوں نے ان کی جگہ لے لی۔ وقت وہی ہے، بس ناپنے کے پیمانے بدل گئے ہیں۔ واقعات تبدیل نہیں ہوتے۔ پرانے کیلنڈروں کی جگہ دیوار پر ایک نیا کیلنڈر آجاتا ہے۔

جب بھی فلموں کی طرح دیوار پر لگے کیلنڈر کے اوراق پھڑپھڑاتے ہیں تو لگتا ہے یہ اشارہ بھی تیزی سے وقت گزرنے کا ہے۔ اب اگلے منظر میں کوئی بچہ ہیرو بن چکا ہو گا یا کیمرہ ہیرو پر آئے گا جو تیز ہواؤں کی زد میں جھکی کمر، لیکن چمکتے جوان چہرے کے ساتھ لاٹھی کے سہارے سڑک کے کنارے کنارے چلا جا رہا ہو گا۔ دیگر اتفاق یہ بھی کہ عصا پر رکھا ہاتھ جو بڑھاپے کے رعشہ سے کانپ رہا ہے۔ اس کی پشت کی کھال انگلیوں کے گرد کس کرتی ہوئی ہو گی۔ لیکن وقت فلمی سہولت سے نہیں گزرتا، نہ گھڑی کی سوئیوں کی تیز حرکت سے، نہ پنکھے کی طرح چلتے بیل گاڑی کے پہیے کی رفتار سے، لیکن گزر جاتا ہے۔ بہرکیف۔

اس طرح یا اس طرح۔۔۔ سالوں کی طرح کیلنڈروں میں بھی بہت تبدیلی نہیں آتی، بس اتنا ہوتا ہے کہ اس میں مکھن کی تہ لگے براؤن سلائس پر برک مارتی لڑکی کے بجائے کسی موبائل فون کی رات بھر والی فری پیکیج کی سہولت پر فون کرتی لڑکی نک سک سے تیار، جیسے پارٹی پر جانے کے لیے بس نکلنے ہی والی ہو، بجی ہوئی ملتی ہے۔

دیوار پر کیلنڈر آویزاں کرنا کریم بی کی سجاوٹ تھی۔ اگر سال چڑھ جاتا اور کوئی کیلنڈر گھر نہ آتا تو وہ فکر مند ہو جاتیں۔ جیسے مرغا نہ ہوا تو صبح نہ ہو گی۔ ہر آئے گئے سے سفارش کرواتیں، اگر کسی کے پاس کوئی کیلنڈر فالتو ہو تو مجھے دے جانا اور بھیا ایک جیبی ڈائری بھی۔ جیبی ڈائری میں وہ اپنی منت کی نفلوں کا حساب رکھتی تھیں۔ کتنی پڑھ چکی ہیں۔ کتنی باقی ہیں اور کہتی جاتیں۔

"اللہ سے کس نے حساب رکھا ہے۔"

پھر اس برس ہا برس سے گڑی کیل پر وہ نیا کیلنڈر اٹکا دیتیں۔ شاید پہلے کیلنڈر کا دھاگا انہوں نے اس کیل کے سہارے لٹکایا ہو تو ان کے ہاتھوں میں اتنی جھریاں نہ ہوں اور ان کے ہاتھ رعشہ سے کانپتے بھی نہ ہوں۔ لیکن ان کیلنڈروں اور ڈائریوں کی تبدیلی سے فضاؤں میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

جب گھر میں گاڑی داخل ہوئی اور پھاٹک کھلا تو اس نے دیکھا۔ سڑک کے کونے پر بیٹھا باغ علی مونگ پھلیوں اور ریوڑیوں کی چھابڑی سجائے، خشک لکڑی کے کریٹ جلا کر آگ تاپ رہا تھا۔ گدڑی پوش سردی سے ٹھٹھرتا منتظر تھا، شاید کوئی بھولا بسرا راہ گزرتا مونگ پھلی کے پہاڑ پر سلگتی مٹی کی ہانڈی دیکھ کر ہی ٹھہر جائے، یا کسی کو چلتے چلتے کار روک کر خیال آجائے، اس کی ننھی بیٹی نے واپس آتے کڑکڑ کرتی ریوڑیوں کی فرمائش کی تھی۔ ابھی اندھیرا گرنا شروع ہوا تھا۔ پرائیویٹ کمپنیوں کے لوگ عموماً ایسے وقت ہی گھر کو واپس پلٹتے ہیں۔ انہیں بہت سردی نہ لگ رہی ہو تو شیشہ نیچے کر کے وہ کچھ نہ کچھ خرید کر ہی گھر جاتے ہیں۔ حالانکہ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ شہر کے بچے اب ریوڑیوں کی فرمائش نہیں کرتے۔

گیٹ بند ہوا تو اس کے ساتھ ہی گدڑی میں دبکا اپنا چہرہ چھپائے خوانچہ فروش دروازے کی اوٹ میں اوجھل ہو گیا۔

"آ گئے ہو؟" اس نے بغیر پلٹ کر دیکھے کہا۔

"ہاں!" بعض سوال اور ان کے جواب کتنے بے معنی ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود ہم انہیں دہراتے رہتے ہیں۔ عثمان اخباروں کا ڈھیر اٹھائے اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ باہر برآمدے سے تنویر کی بیٹی کے کھلکھلا کر ہنسنے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ ہنس سکتی ہے، کیونکہ نہیں جانتی ان اخباروں کے ڈھیر میں کیا لکھا ہے، جو جاتے جاتے

ماموں اس کے سر پر بطور چپت لگا کر نکل گیا تھا۔ وہ نہ ٹاک شوز دیکھ کر اپنا بلڈ پریشر بڑھانے کی عمر میں تھی، نہ ماں باپ کے درمیان حائل تلخیوں کی گتھیاں سلجھا سکتی تھی۔

اچانک ہی ساس، بہو کے ڈراموں کی جگہ دو پارٹیوں کے چاہنے والوں کے دنگل والے شوز نے لے لی تھی۔ جہاں بولتا ہر ایک ہے، سنتا کوئی نہیں۔ ملک بدترین حالات سے گزر رہا تھا اور ایسے واقعات پے در پے پیش آ رہے تھے جو قوم نے ابتدائی زمانے میں دیکھے۔ نہ مشرقی پاکستان گنوا کر۔

جب ایسٹ انڈیا کمپنی بنگالے میں لڑنے پہنچی تو نواب سراج الدولہ کو اپنی قوم پر کچھ ایسا ہی یقین تھا، لیکن ان کی میر جعفر سے آگہی نہیں تھی۔ اگر میر جعفر نہ ہوتا تو سراج الدولہ شہید نہ ہوتے۔ اگر سراج الدولہ شہید نہ ہوتے تو بنگال آزاد رہتا۔ اگر بنگال آزاد رہتا تو ہندوستان پر انگریز قدم نہ جما سکتے۔ ہماری تاریخ میں بہت سے "اگر" ہیں۔ حالانکہ "فرض" کیا اور "اگر" ریاضی کے سوال تو ہو سکتے ہیں۔ تاریخ کے نہیں۔ "اگر" میں جو کچھ سیکھنے کے لیے تھا، وہ مشکل فارمولا تھا۔ ہم سے سیکھا نہیں گیا۔ سراج الدولہ کے سو برس بعد بخت خان بھی اسی طمطنے سے نکلے تھے۔ ان دنوں بادشاہ اپنی غزل کا مقطع لکھنے میں مشغول تھے۔ دربار تقطیع کی بحث میں الجھا تھا۔ جب پورا ہندوستان انگریز کے پاس چلا گیا، تب بھی سازشوں کے یہی جال تھے اور بہت سے اگر۔۔۔

با آواز بولنے پر بابا جان جیل میں گئے۔ وہ انگریز کا وقت تھا۔

پھر انگریز کا وقت نہیں رہا۔ جب ابا جیل گئے۔

پھر مارشل لاء اور آمروں کا وقت گزر گیا۔ دودھ، شہد کی نہریں بہہ نکلیں۔ شیر، بکری ایک گھاٹ پانی پینے لگے، مگر جیل کا دروازہ جمال کے انتظار میں کھلا تھا۔ سب وہی تھا، کوئی تبدیل شدہ واقعہ نہیں ہوا۔ میر جعفر کی باری نعیم ملک نے لے لی۔

ع لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے

عبیو نے کھڑکی میں ہوا سے جھولتے پردے کے نزدیک بیٹھ کر ملال سے سوچا۔ دنیا کی ہسٹری میں شام کی عمر ہزار پانچ سو سال بھی ہو، کائنات کی کل عمر کے مقابلے میں کچھ نہیں۔ سردی کا دھیما ان تپا سورج جیسے غڑاپ سے ڈوب گیا تھا۔ شفق کے سرخ، نارنجی شیڈز دھیرے دھیرے اندھیرے میں بدلے، کہرے میں ڈھکی گھاس جیسے سرمئی میدان بن گئی۔ جیسے سب منظر غیر حقیقی تھے۔ کچی نیند میں نظر آنے والے خوابوں کی طرح، کچھ درست بھی ہو گا یا سب اسی طرح گھسیٹا جائے گا۔ سامنے فضا تاریک تھی، نہ کوئی باغ علی، نہ لکڑی کی کھپچیوں سے سلگنے والی دھواں دیتی روشنی، کوئی امید بندھے گی یا یہی چراغ جلیں گے تو روشنی ہو گی۔

آج شاید نعیم ملک کے ہاں میلہ، چراغاں ہو رہا ہو، کیونکہ بالآخر اس نے جمال کو شکست دے دی۔ اور ایسے بہت سے جمالوں نے کئی نعیم ملکوں کے ہاتھ منہ کی کھائی تھی۔ فتح حق کی ہوتی ہے یا طاقت ور کی۔ انصاف یہاں بھی ہو گا یا روز محشر ہے، جو بھی ہے۔ ہم تم سے شرمندہ ہیں جمال بھائی۔

وہ بہت دن سے نہیں آیا تھا۔ شاید کسی دن بحال بھی ہو جائے۔ یا دور دراز کے کسی گم نام علاقے میں ایک نہایت غیر اہم عہدے پر کسی دیہات سدھار قسم کے کام پر فائز کر دیا جائے۔ جہاں وہ اپنی نظروں میں چور بنا چھپتا پھرے گا۔

"دنیا دیکھتے دیکھتے کس قدر بدل گئی ہے۔" اس نے حمیرا کو ایس ایم ایس کرتے لمحے بھر کو بھی نہیں سوچا۔ ابھی اس کو دنیا میں کچھ بھی نہ بدلنے کا کیسا شدید گلہ تھا۔

"بجلی کیوں نہیں جلائی؟" سوال کے جواب سے پہلے کمرہ ایک ٹک کے ساتھ روشن ہو گیا۔ کمرے کے دروازے میں بجلی کے بٹن کے بالکل نزدیک کھڑی تنویر کو اس نے ایک نظر دیکھا۔

ہم ویسی لوگ بھی کیا کمال چیز ہوتے ہیں۔ لوگوں کی زندگیوں میں دخل دینا جیسے اپنا حق سمجھتے ہیں۔ اور اس سے عجیب بات جس پر وہ اپنا حق جتاتے ہیں' اسے لمحے بھر کو بھی کوفت نہیں ہوتی۔

"بس ایسے ہی۔" اس نے خفیف مسکراہٹ سے کہا۔ "فون پر میسیج کر رہی تھی اور اس کے لیے کسی خاص روشنی کی ضرورت نہیں ہوتی۔"

اس نے توقف سے تنویر کی طرف دیکھا' پچھلے کافی دنوں سے وہ لفظوں کو اپنی مرضی کے معنی پہنا دیتی تھی۔ کون جانے جواب اس کو اس جملے کے کسی حصے سے خطرے کی بو آجائے۔

"کیا پک رہا ہے؟" ایک اور غیر ضروری اور بوکھلایا ہوا سوال۔

"میں نے دیکھا نہیں۔ کریم پی پالک کے پتے ڈنڈیوں سے الگ کر رہی تھیں۔ اس لیے پالک میں ہی کچھ پک رہا ہوگا۔ پالک گوشت' آلو پالک' یا پالک میتھی کچھ بھی۔"

وہ ایک ٹھہرے ہوئے متوازن شخص کی طرح قدم بڑھاتی اس کے کمرے کے وسط میں ٹھہر گئی۔ وہ جیسے' بہت دور سے چل کے آئی تھی اور تھکن سے چور تھی۔ چپ چاپ اس کے پلنگ پر دراز ہو گئی۔ اس کی طبیعت پہلے سے خاصی بہتر ہو رہی تھی۔ اس کے قدموں اور فقروں میں توازن اور ترتیب بتدریج بڑھتی جا رہی تھی۔

"جاب شروع نہیں کرنی دوبارہ؟" اس نے بھی ویسی دخل اندازی اسی ڈھٹائی سے کی۔

"شاید میری ذہنی صحت ابھی اتنی اجازت نہیں دیتی۔" اس نے زندگی میں پہلی مرتبہ اپنی ذہنی صحت کے حوالے سے اس قدر سکون سے کچھ کہا تھا۔ "ویسے بھی میں تم لوگوں کے لیے خوامخواہ ذہنی کوفت کا سبب نہیں بننا چاہتی۔"

"میں.... تم لوگ۔" عبیر نے اکتاہٹ سے سوچا۔ "فاصلوں کی کوئی انتہا بھی ہو۔"

"میرا خیال ہے میں ابا' اماں کو پہلے ہی ضرورت سے زیادہ تنگ کر چکی ہوں۔ مجھے وہ بڑی سہولت سے گولی مار سکتا ہے۔ میری لاش غائب کر سکتا ہے اور تم لوگوں کو میرے ناخن تک نہیں پہنچنے دے گا۔ وہ ایسا بااختیار ہے۔" اس کا لہجہ بے تاثر سا تھا۔

عبیر کی سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ اس جملے سے کیا کہنا چاہتی ہے۔ یہ بااختیار ہونا ایک طنز ہے یا اس کے اختیارات کی حد پر ایک غیر محسوس سا فخر۔

"تم نے دیکھ لیا' جمال کس دعوے سے اس کے سامنے آیا تھا اور اس کا کیا حشر ہوا؟"

عبیر کا جی چاہا' وہ چڑچڑ کرتے ہمیشہ کی طرح جمال کا دفاع کرے یا بزدلوں کی طرح اس نظام کو کوسنا شروع کردے۔ جو جمال کا تحفظ کرنے میں ناکام ہو گیا تھا۔ لیکن اس کے پاس منطق اور لفظ دونوں ختم ہو گئے۔

"لوگ جانتے ہیں' مجرم کون ہے۔" عبیر منمنائی تھی۔

"لوگوں کے جاننے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ مجرم صرف وہ ہوتا ہے جو سزا پاتا ہے' اور یوں بھی...." وہ جیسے لفظوں کو تولنے میں لگ گئی۔ "نعیم ملک کوئی اکیلا آدمی نہیں ہے۔ اس جیسے سینکڑوں ہیں' شاید ہزاروں ہوں' ایک اکیلے نعیم ملک کو سزا دلوا کر سازشیں ختم تو نہ ہو جاتیں۔"

"کیا تمہیں ڈر تھا تنویر کہ جمال کہیں اس کو سچ مچ سزا دلوانے میں کامیاب نہ ہو جائے؟"

"نہیں' مجھے ایسا کوئی ڈر نہیں' میں نے اس کے ساتھ کام کرنے والے اس کے ساتھی' دوست' سب دیکھے تھے اور وہ اس قدر اعلا عہدوں پر تھے کہ مجھے ایسی کوئی خوش فہمی نہیں ہوئی۔"

تنویر کا چہرہ اس قدر پھیکا پڑا کہ عبیر کو شک گزرا کہ اسے کوئی اٹیک تو نہیں ہونے والا' لیکن پھر شاید جس کیفیت سے وہ گزر رہی تھی اس سے بہ سہولت نکل آئی۔

"کسی ایک برے آدمی کو مات دینے سے دنیا سے بدی کا خاتمہ نہیں ہو جاتا۔ اسی طرح کسی اچھے آدمی کی شکست کا یہ مطلب نہیں کہ دنیا سے نیکی اٹھ گئی۔ اگر کبھی اس کو میسیج کرو تو میری طرف سے معافی مانگ لینا۔"

"تم خود کیوں نہیں مانگ لیتیں۔" اس نے موبائل اس کی طرف بڑھا دیا۔

"نہیں۔ وہ اپنی جان پر کھیل کر کس خلوص سے آگے بڑھا تھا اور کتنا بااعتماد تھا' اتنا کہ مجھے بھی کبھی کبھی یقین آجاتا تھا کہ وہ کچھ کر گزرے گا اور میں کس کس سے معافی مانگوں' کس کس چیز کی معافی مانگوں۔ معاف کر دینا بھی شاید زبان سے نکلے الفاظ ہی ہوتے ہیں۔ تم سب نے مجھ پر الزامات نہیں لگائے' طعنے نہیں دیے' لیکن معاف تو نہیں کیا ہوگا' بہرکیف۔" "عبیر! کیا میں پچھلے دنوں اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھی تھی؟ میرا مطلب...." وہ ہچکچا کر رکی۔ "میں پاگل یا خبطی ہو گئی تھی؟"

"نہیں تو۔" وہ بوکھلا گئی۔ "بس ایسا تھا کہ تم شاید تھک گئی تھیں۔ تم نے تنہا اتنا بڑا بوجھ بھی تو اٹھا رکھا تھا۔"

"ہاں.... اور اس بوجھ کو اٹھا کر مجھے بھاگنا پڑا۔" "پتا نہیں میں کتنے میل بھاگی اور کتنی مدت بھاگی' کبھی ایک سمت' کبھی اس کی مخالف سمت۔ انسان بیک وقت دو طرف کی وفاداریاں نبھا رہا ہو تو کیا کہو گی تم؟ نٹے منہ! یہی کہو گی نا!"

"نہیں۔" اس نے رسان سے کہا۔ "کیونکہ انسان کمزور مخلوق ہے اور بنیادی طور پہ وفادار ہے۔ ہم اپنے اختیار میں بھی نہیں' اس لیے میں ایسا کچھ نہیں کہتی۔" اس نے پلنگ سے پاؤں اتارتے چپل میں ڈالتے کہا۔

"تمہیں مجھ سے گلے تو ہوں گے۔ میں نے تمہارا بہت نقصان کیا۔"

"گلے ہوں بھی تو دور ہو جاتے ہیں۔" اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"مجھے ان دنوں سے وہ دن زیادہ یاد ہیں جب تم میرا آئیڈیل تھیں۔ مجھے تم پر فخر تھا۔ سارے کالج میں' میں اترا کر بتاتی تھی۔ تنویر عباس میری بہن ہے۔ مجھے آج بھی تم پر اتنا ہی ناز ہے تنویر! تم جس ہمت اور بہادری سے اس سارے کرائسس سے نکل کر آئی ہو' تمہاری جگہ میں ہوتی تو کب کی تھک ہار کر گر چکی ہوتی۔ ہم سب کو تم پر فخر ہے۔ جیسے گڑیا مجھے کہتی ہے۔ "دی بیسٹ خالہ ان دی ورلڈ۔" یہ ہی جملہ میں تمہارے لیے بولتی ہوں۔ تم میرے لیے دنیا کی سب سے اچھی لڑکی ہو۔"

اس کے چہرے کا کھچاؤ آہستہ آہستہ ڈھیلا پڑنے لگا۔ کتنی مدت بعد اس نے کسی کے کہے جملوں پر پھر بے پرکھے اعتبار کر لیا تھا۔

"واپسی کا سفر ہمیشہ تکلیف دہ ہو' یہ کیوں ضروری ہے؟ اگر واپسی اس طرف ہو جہاں لوگ چوکھٹ پر چراغ جلائے آپ کے انتظار میں بیٹھے ہوں تو واپسی کیسی روشن ہوتی ہے۔"

تنویر دروازے کی چوکھٹ پر لمحے بھر کو رکی۔

"ابا کھانس رہے تھے' میں ان کے کمرے میں تو نہیں گئی' لیکن باہر تک آواز آرہی تھی۔ میرے خیال میں' میں ان کے لیے یخنی بنا کر لے جاؤں۔"

☼ ☼ ☼

"تم نے کبھی انسان کی نفسیات پہ غور کیا۔"

کہرے سے جھلسی ہوئی بدرنگ گھاس پر' جس میں سے خشک زمین کے تڑخے ہوئے ٹکڑے جابجا جھانک رہے تھے' ایک سرے سے دوسرے کنارے تک ٹہلتے جیسے شہریار کوئی دور کی کوڑی لایا تھا۔ کبھی جب وہ کوئی اہم انکشاف کرنے کے موڈ میں ہو تو ایسے ہی ٹہل ٹہل کر لیکچر دیا کرتا تھا۔ سیڑھیوں پر بیٹھی گود میں دھری باغ علی کی

موِنگ پھلیوں کے چھلکوں کے ڈھیر سے وہ چھل کے گری ہوئی مونگ پھلی کھوجتی رک گئی۔

"کسی خاص انسان کی نفسیات پر یا انسان کی عمومی نفسیات پر؟" عبیر نے پوچھا۔

شہریار ٹہلتا ٹہلتا دوسرے سرے پر بیل کے درخت پر جا پہنچا تھا۔

پتا نہیں اس شخص کو گھاس پر مسلسل چلتے رہنے کا کیا مرض لاحق ہے۔ یوں دیکھا جائے تو قابل غور نفسیات کا یہ پہلو بھی ہے، لیکن موضوع کا انتخاب تو اس نے خود کیا تھا۔ لہٰذا ردوبدل سے پیش کرنے کی اجازت نہیں تھی۔

"چلو ہم عام رویوں کی بات کرتے ہیں۔" وہ جب سیڑھیوں کے قریب سے گزرا جہاں عبیر گم شدہ مونگ پھلی ابھی تک تلاش نہیں کر سکی تھی۔ وہ جیسے جواب لینے اس کے سامنے ڈٹ کر کھڑا ہو گیا۔

"باقاعدہ کسی برگد کے نیچے بیٹھ کر تو غور نہیں کیا۔ ہاں جو لوگ راستے میں آ گئے یا توجہ میں آ گئے ان پر ضرور دھیان دیا ہے اور تم سکندر اعظم کی طرح میری دھوپ روک کر کیوں کھڑے ہو گئے ہو۔"

"کیا انسان قابل اعتبار مخلوق ہے؟" وہ جیسے اپنے سوال پر ڈٹا رہا۔

"ہونا تو چاہیے۔"

"حالانکہ میں نے تم سے کیا چاہیے پوچھا بھی نہیں تھا، کیونکہ میں جانتا ہوں، تمہیں وہ کچھ نہیں چاہیے جو میں تمہیں دے سکتا ہوں۔"

اس کی تمام تر توجہ مونگ پھلی سے اس کی طرف مبذول ہو گئی۔ "یہ کس قسم کا بیان ہے؟"

"میں پھر پوچھتا ہوں، کیا انسان قابل اعتبار مخلوق ہے۔"

"میری زندگی میں بہت زیادہ لوگ نہیں رہے، جو رہے ان میں بیشتر قابل اعتبار تھے۔ اور میں بھی پوچھ سکتی ہوں، مجھ سے پبلک سروس کمیشن کے ایک درخواست گزار کا سا سلوک کیوں کیا جا رہا ہے؟"

"جو کچھ پوچھتا ہوں، اس کا جواب دیے جاؤ، کیا تم سمجھتی ہو میں ان قابل اعتبار لوگوں میں سے ایک ہوں؟"

"کیسا عجیب سوال ہے اور مجھ سے پوچھ رہے ہو، تم ٹھیک تو ہو نا؟"

"احتیاط اچھی چیز ہے، میں اکثر ڈبل چیک کر لیتا ہوں۔" وہ پھر سے اس کی دھوپ چھوڑ کر گھاس کو روندنے نکل گیا۔

"اور یہ اتنے وہمی کب سے ہو گئے ہو؟"

"زیادہ دن نہیں گزرے، ٹھیک سے یاد نہیں، ہفتہ، دس دن یا کچھ زائد....."

"سو بھلکڑ بھی ہو گئے ہو، بھولنے لگ گئے ہو، بڑھاپے کے آثار.....؟"

"بڑھاپے کا تعلق سال، مہینوں سے نہیں ہوتا، اگر آپ کو لگے آپ بوڑھے ہو رہے ہیں تو آپ بوڑھے ہو چکے ہوتے ہیں۔" وہ اس سے دو سیڑھی نیچے جیسے جگہ کو ناپ تول کر بیٹھتے بولا۔

"تمہیں پتا ہے عبیر! میں بہت اچھا سامع ہوں، جب کوئی بولتا ہو تو میں نہیں بولتا۔ صرف سنتا ہوں، آج میری خواہش ہے، ہم دونوں اپنا رول بدل ڈالیں، تم چپ چاپ اسکرین کی طرف دیکھتی جاؤ، میں برق رفتاری سے ٹائپ کیے جاتا ہوں۔"

"اوہ، ہاں۔" اس نے خجالت سے کہا۔ "میں نے تمہیں لمبی لمبی میلز بھی کی ہیں اور آن لائن مل جاؤ تو بے سمجھے بولی بھی، بہت ہوں، تم میں واقعی بہت برداشت ہے۔"

"مجھ میں تو برداشت کی بہت کمی ہے لڑکی! چیز میرے مطلب کی ہو تو دلچسپی لیتا ہوں، ورنہ پروا نہیں، مطلبی سمجھ لو۔"

"کیا بات ہے شہریار۔" اس نے رسان سے پوچھا۔ "کچھ ہوا ہے؟"

"پتا نہیں کیا ہوا ہے' میں اچانک ماضی میں چلا گیا' یہ بھی ایک وقت گزاری کا شان دار ذریعہ ہے' جیسے آپ ایک کتاب میں سے اپنی پسند کے پیراگراف اور جملے ڈھونڈ کر بار بار پڑھتے ہیں۔ حالانکہ وہ لکھے جا چکے ہیں۔ اور محفوظ ہو گئے ہیں۔ پھر بھی آپ اس امید پر کھولتے ہیں' شاید وہاں کچھ نیا ہو' کریم بی کہانی سناتی تھیں نا' جو پلٹ کر دیکھتا ہے' پتھر کا ہو جاتا ہے تو شاید میں پتھر کا ہو گیا ہوں' یا شاید تمہارے بقول بوڑھا ہو گیا ہوں' پچھلے دس' بارہ دن جو میں غائب رہا' شاید ایک ٹائم ٹنل time tuunel سے گزرتا رہا۔ تھوڑی بہت ابنارملٹی تو میرے جیسے انسان میں ہونی بنتی ہے نا۔"

"تمہارے جیسے انسان میں؟" عبیو نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ "تم کیا کوئی مختلف مخلوق ہو گئے ہو؟"

"دیکھو عبیو! میں اپنی بات سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں' میری اٹھان تم سب سے مختلف رہی ہے' میں کئی سمتوں کا انسان ہوں۔ پیدا کہیں اور ہوا تھا' تربیت کہیں اور پائی' اور اتفاق دیکھو کہ زندگی گزارنے کو دونوں میں سے کوئی ٹھکانہ نہیں چنا۔ کبھی ہاسٹل' کبھی میس' ایسے شخص میں بہت سے جب پڑ جاتے ہیں۔ بری بات تو یہ ہوتی ہے کہ وہ ان گروپس سے ٹوٹ جاتا ہے اور وہیں یہ اچھی بات بھی ہوتی ہے کہ وہ گروپ سے ٹوٹا ہوا ہوتا ہے۔ خاندان کی پناہ میں پلنے کے بجائے رنگ برنگے انسانوں میں اپنا وجود منواتا ہے۔ جنگل کے قانون کی طرح فٹ ہوتا ہے تو زندہ رہتا ہے۔ بھانت بھانت کے لوگوں سے ملتا ہے' انگلی پکڑ کر چلنے والے آدمی کے مقابلے میں پانچ سال کا تجربہ ایک سال میں کر لیتا ہے۔ ہوتا ہے کہ نہیں؟ تجربے کی معراج بھی؟ اور ایک چیز جب بیک وقت اچھی بھی ہوتی ہے اور اچھی نہیں بھی..... دیکھو اگر میں خبطی لگ بھی رہا ہوں تو کیا حرج ہے۔"

اس نے اس کی حیرت سے کھلی آنکھوں میں جم کر دیکھا۔

"جو کچھ کہہ رہا ہوں' صبر سے سن لو' کیا پتا اس میں تمہارے کام کی کوئی چیز بھی نکل ہی آئے۔"

"تمہارا خیال ہے' میں اس قدر کاروباری ہوں۔" عبیو نے جیسے ماحول میں پھیلی کسی سختی کو اپنی نرم روی سے پگھلانا چاہا۔ "لیکن کہو تمہاری قصہ گوئی کے تو ہم سب معتقد ہیں۔"

"مجھے عمر تو ٹھیک سے یاد نہیں کیا تھی' معاف کرنا۔" وہ بات توڑ کر رکا "میں قصہ قبل مسیح سے شروع کرنے والا ہوں۔ لیکن جب میں ڈی. جی خان میں گھر کے سامنے والی گلی میں سگریٹ کی خالی ڈبیوں سے پٹھو گرم کھیل رہا تھا یہ قصہ تب کا ہے۔ یہ کھیل ہمارے علاقے میں خاصا مقبول تھا۔ ہم سارا دن زمین پر گری پڑی خالی ڈبیاں اکٹھی کرتے' ان کو پچکا کر ایک مینار سا بنایا جاتا تھا۔ ہماری چپل اسٹرائکر ہوتی' ایک خاص فاصلے سے اپنی اپنی چپل اتار کر ان ڈبیوں کے مینار پر ماری جاتی۔ شاید تم اس طرح نہیں سمجھو گی۔ یوں سمجھ لو یہ ہمارے علاقے کا Alley Bowling تھا۔ اس سے تم ڈی. جی خان کے اس دیہات کی کسمپرسی کا اندازہ لگا سکتی ہو کہ ہمارے کھیل کی ایک بھی چیز بازار سے نہیں خریدی جاتی تھی۔

اس سارے علاقے میں اونچی نیچی کچی پکی دکانیں تھیں۔ اس میں ایک کریانے کی دکان میرے والد صاحب کی بھی تھی۔ جس میں مٹی کے تیل کا دیا جلتا تھا۔ بجلی میری پیدائش سے تھوڑا پہلے اس علاقے میں آ گئی تھی' مگر بجلی کا بکثرت استعمال بوجوہ نہیں ہوتا تھا۔ سڑکوں پر کھمبے تھے' لیکن ان کھمبوں پر بلب نہیں تھے۔ نشے کے عادی کھمبے پر چڑھ کر بلب اتار کر بیچ آتے تھے۔ ایسا میں نے کبھی دیکھا نہیں' لیکن سننے میں یہی آیا تھا۔ خیر میرے زمانے میں سڑکیں تو تھیں کم از کم۔ والد صاحب بتاتے ہیں کہ ان کے زمانے میں ڈی. جی خان سے باہر جانا ہوتا تو دریا پر پل نہ ہونے کی وجہ سے کشتیوں پہ بیٹھ کر دریا پار کیا جاتا تھا۔ خیر یہ تو ضمناً آ گیا' ہاں تو میں کیا بتا رہا تھا بھلا؟"

وہ واقعی غائب دماغ دکھائی دیتا تھا۔

"تم سگریٹ کی خالی ڈبیوں سے پٹھو گرم کھیل رہے تھے۔"

"ہاں میں پٹھو گرم کھیل رہا تھا۔ ایک چپل میرے پاؤں میں تھی اور ایک ہاتھ میں' میں نے ایسا نشانہ مارا کہ ساری ڈبیاں فضا میں اڑ گئیں۔ عین اس لمحے میں نے اپنے گھر کے دروازے پر اپنے ابا کے ساتھ ایک شخص کو دیکھا۔ میرا خیال تھا' وہ میرے نشانے کی داد دینے کو ٹھہر گئے تھے۔ ابھی زوردار تھپکی دیں گے۔ لیکن میں نے ان کے چہرے کا تاثر کچھ مختلف پایا۔ ان کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ لیکن وہ میرے اس عمل پر کچھ خاص خوش دکھائی نہیں دے رہے تھے۔"

"یہ میرا چھوٹا والا لڑکا ہے۔" ابا نے دروازے ہی سے میرا تعارف کروایا۔

میں پہلی نظر میں ان پر عاشق ہو گیا۔ شاید اس لیے کہ وہ خوش لباس تھے یا شاید اس لیے کہ ان کے دونوں پیروں میں جوتے تھے۔ جو ہماری گلی کی دھول سے خاک آلود ہو کر بھی جگمگا رہے تھے اور ان سب سے علیحدہ' منفرد ان کی مسکراہٹ تھی۔ کپڑوں اور جوتوں سے زیادہ اجلی' شفاف جگمگاتی ہوئی' میں نے دوڑ کر دی میں پڑی چپل اٹھا کر پہنی اور اچھا بچہ بن گیا۔ جب مجھے پتا چلا' وہ ابا کے بھائی ہیں تو میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ اگر وہ دونوں بھائی تھے تو ان میں اتنا فرق کیوں تھا۔ کیونکہ ہم سب بہن' بھائیوں میں کوئی فرق نہیں تھا۔ میں ان دنوں اسکول بھی جاتا تھا اور میں نے اسکول میں سیکھا تھا' ایک طبقہ دوسرے طبقے پہ زیادتی کرتا ہے تو اس زیادتی کو برداشت کر لینا چاہیے اور برداشت نہ ہو تو رو لینا چاہیے' احتجاج کے درس ہم نے نہیں سیکھے تھے۔

اس رات صحن میں عمارت کی پیشانی پر سانپ کی طرح پھن اٹھائے بلب کے نیچے موڑھوں پر ابا اور تایا بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ میں ان کی بہت سی باتیں سمجھ نہیں سکا۔ شاید خاندانی سیاست' ماضی کے قصے' معلوم نہیں کیا۔ لیکن میں چوری چوری ان کی طرف دیکھتا ضرور تھا اور جب وہ میری چوری پکڑتے تو مسکراتے ضرور تھے۔ بلکہ وہ مجھ سے زیادہ میری طرف دیکھتے اور مسکراتے تھے۔

"تمہارے اس لڑکے کی شکل حمید بھائی سے ملتی ہے۔ حیران کن حد تک شباہت ہے' تمہیں حمید بھائی یاد نہیں ہوں گے' تم بہت چھوٹے تھے۔"

"کچھ پتا ہی نہیں چلا' پھر ان کا بھی....." ابا خیالوں میں نابود گئے۔ "مدتوں ان لوگوں نے ان کی واپسی کی راہ دیکھی۔"

"ہاں' جو بچھڑ گئے وہ پھر کم ہی ملے۔ آزادی تو خون میں نہا کر ہی ملتی ہے۔" خوش باش تایا ماضی کے کسی ایسے منظر میں گم ہوئے کہ ان کی آنکھیں نم ناک ہو گئیں۔

"آپ کے پاس تصویریں بھی تو تھیں اس وقت کی۔"

"ہاں' مگر اس میں وہ نہیں ہیں۔"

وہ جانے ماضی کے کس حصے میں اٹک گئے تھے۔ میری خواہش تھی' وہ پھر میری طرف دیکھیں' عین اس لمحے میری دعا آسماں کو چھوتی عرش پر پہنچی اور مقبول ہوئی۔

"کس جماعت میں پڑھتے ہو بیٹا؟" وہ اچانک میری طرف متوجہ ہوئے۔

"پانچویں کلاس میں۔"

"واہ' خوب!" ان کی آنکھوں کی نمناکی خوشی کی ایک چمک میں بدلی۔ شاید ان کو یقین تھا ان کے چھوٹے بھائی کے بچے گلیوں میں ڈنڈے بجاتے پھرتے ہیں۔

"اپنا اسکول بیگ لے کر آؤ۔"

کیا اسکول بیگ' جو اسکول میں بیگ لاتا تھا' بچے اس پر ہنستے تھے۔ ہم تو اپنے گھر کے میز پوش میں کاپیاں کتابیں ترتیب سے رکھتے' سائیڈ پر بال پن' پنسل رکھ کر گٹھڑی کی گانٹھ بنا کر بیگ تیار کر لیتے تھے۔ کبھی کوئی بڑی پکی گانٹھ

مارتا تو اسکول جا کر کھولنی مشکل ہو جاتی۔ خاص طور پر سردیوں کے موسم میں۔ شل انگلیوں کے ساتھ ہم ابھی کھولنے کی جدوجہد میں ہوتے کہ ایسے میں ماسٹر صاحب کسی معذرت کو قبول کیے بغیر کس کے منہ پر طمانچہ مارتے تھے۔ سرکاری اسکولوں میں منہ پر "تھپڑ مارنا" قانون میں شامل تھا۔ تم بور تو نہیں ہو رہیں۔"

"تم نے میری محویت توڑ دی۔ مجھے لگا تھا جیسے کسی نے میرے گال پر زور کا چانٹا رسید کیا ہو۔"

خیر! تایا نے بیگ کھولا یعنی میز پوش کی ناٹ کھولی۔ سب سے اوپر والی نوٹ بک اٹھائی۔ "کاپی حساب" میں نے خوش خط لکھا ہوا تھا۔ پہلا صفحہ کھولتے ہی انہوں نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ اور میری طرف متوجہ ہوئے۔

"یہ سوال ریڈ انک سے کراس کیوں کر رکھا ہے بیٹا؟"

میں ان کے سوال پر باغ باغ ہو گیا۔ شکر ہے اس قابل قسم کے آدمی کو کوئی بات نہیں بھی پتا۔ میں نے ان کو سمجھایا۔

"اس کو کاٹا کہتے ہیں۔ لال کاٹے کا مطلب سوال غلط ہے۔" میں نے فخر سے بتایا۔

"لیکن سوال تو ٹھیک ہے۔" انہوں نے حیرت سے کہا۔ "درست سوال کو غلط قرار دینے کا مطلب..... ان کو یہ خود حل کرنا نہیں آتا۔"

پھر انہوں نے میرا املا چیک کیا۔ میں نے علامہ اقبال کے علامہ پر زبر ڈال رکھی تھی۔ ماسٹر صاحب نے کاٹ کر اصلاح کی۔ علامہ کے ع کے نیچے زیر ہوتی ہے۔ آگے سرخ سیاہی میں ہدایت درج تھی۔

"سخت محنت کی ضرورت ہے۔"

تایا باقاعدہ خفا ہو گئے۔ انہوں نے ابا کو خوب ڈانٹا۔

اس سے اگلی صبح مجھے پتا چلا میں تایا کے ساتھ لاہور جا رہا ہوں۔

میں اٹھارہ سال کا نہیں تھا نہ مجھے ووٹ دینے کا حق تھا۔ میرے لیے ایک فیصلہ کیا گیا' جسے مجھے قبول کرنا ہی تھا۔ میری رائے کسی نے نہیں مانگی لیکن میرا خاندان مجھ سے ساری عمر گلہ کرتا رہا کہ میں انہیں برے وقت میں چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ یہ میری نسل کی طرف سے پہلی ہجرت تھی۔ میں نے شہر بدر ہو کر ابا کے نقش قدم پر چلنے کی روایت ڈالی۔

اگلے دن میں ایک اجنبی شہر کے انجان گھر میں تھا۔ گھر کا پہلا کمرا ایک طویل گیلری تھی' میلوں لمبی۔ تمہیں پتا ہے نا' بچپن میں جو چیزیں بڑی بڑی لگتی ہیں بڑے ہو کر وہ خود بخود چھوٹی ہو جاتی ہیں میں آج تک سوچتا ہوں وہ گیلری جو میں نے پہلے دن دیکھی' کون سی تھی۔ یہ پیچھے والی گیلری تو ایسی جناتی نہیں۔ خیر! ابھی فرصت رہی تو خوابوں کی نفسیات کی طرف سب کو اکٹھا کر کے اس موضوع پر بھی بات کریں گے۔ جمال بھائی کے پاس ضرور اس کا بھی کوئی نہ کوئی منطقی جواز موجود ہو گا۔ میں نے اس گیلری کے ایک سرے پر تم سب کو پایا۔ تایا نے مجھے تمہارے حوالے کرتے کہا۔

"یہ اب تمہارے ساتھ رہے گا۔"

"ہاں! مجھے یاد ہے۔" عبیرہ نے جیسے کہو لیا۔ "تم رو رہے تھے اور میں اتنی بے وقوف تھی کہ میں نے براہ راست تم سے پوچھ لیا' تم رو کیوں رہے تھے۔ دراصل میں سوچ رہی تھی' ابا نے ضرور کوئی ظلم کیا ہے ورنہ کریم بی تمہیں اپنے گھر سے اٹھا کر لانے پر اس قدر خفا کیوں ہوتیں۔"

"اس گھر میں میری آمد ایسی تھی جیسے کسی علامتی ڈرامے کا دوسرا ایکٹ ہوتا ہے۔ تم تو ڈرامے لکھتی ہو۔ تمہیں پتا ہے نا' پہلے منظر کا دوسرے منظر سے ربط لازم ہے۔ ورنہ ڈرامہ بے سروپا ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ ایکٹ دو سین نمبر 1 ایسے تھا کہ اسٹیج بدل گیا تھا۔ منظر بدل گیا' کردار وہ نہ رہے حتیٰ کہ ناظرین بھی وہ نہیں رہے۔ یہاں میری

ملاقات مختلف لوگوں سے رہی' تب مجھے پہلی بار پتا چلا سب لوگ ایک جیسے نہیں۔ وہ ایک دوسرے سے کس طرح مختلف ہوتے ہیں۔ اس کا تجربہ مجھے جماعت ششم میں ہی ہو گیا تھا۔ میں عجیب بھلکڑ آدمی تھا جیسا کہ ابھی تم نے کہا۔ میں پچھلوں کو سہولت سے بھول کر نئے لوگوں میں مگن ہو گیا۔ کیا بھول جانا اتنا آسان کام ہے عبیرہ!؟"

"پتا نہیں۔" وہ گومگو میں نظر آئی۔ "پتا نہیں ہم کس کو بھولنے کی فکر میں ناکام ہو رہے ہیں۔" اس نے پتا نہیں کے بعد کا باقی فقرہ صرف اپنے ذہن میں ترتیب دیا تھا۔

"پھر میری ملاقات ان لوگوں سے رہی جنہوں نے میرے ذہن پہ تادیر اور گہرے نقش چھوڑے۔ ٹیکے والے نقوش جیسے آپائی کا پیر مکوڑا شاہ تھا۔ یاد ہے نا' وہ کیسے مٹی کی ننھی سی گیلی ڈلی لے کر اس کا مالٹا بناتی تھیں' گول سڈول مالٹا' جسے موسمی ظاہر کرنے کے لیے تہہ میں ایک ننھا سا دائرہ بناتیں اور اوپر والی گولائی پر مالٹے کے پتوں کی تازہ کونپل گاڑ کر اس کو اصلی مالٹے کی شکل میں ڈھال لیتی تھیں۔ کچھ دن بعد پتے خشک ہو کر جھڑ جاتے لیکن وہ نقش اور سوراخ موجود رہتے تھے۔ سو میرے وجود پر جو اضافی جھاڑ پھونس تھا' وہ تو جھڑ گیا لیکن نقش گہرے تھے' جو ابھی تک موجود ہیں۔

سر عباس تھے' آپائی تھیں' کریم بی' پھر میرے عزیز از جان دوست عثمان' رضا' تنویر' حمیرا اور تم' ہم سب جیسے ایک دوسرے کا حصہ بن گئے۔ پھر جب میں اس نئے سیٹ اپ میں گھل مل گیا تو مجھے اسے بھی چھوڑنا پڑا۔ ان ہی نشانوں اور سوراخ کو سر پہ سجائے۔ یہ بھی ہجرت کی ایک دوسری شکل تھی۔ ویسے تو ہم کیا۔ ہماری ہجرت کیا۔

پھر ہوا یوں کہ میں راولپنڈی میڈیکل کالج گیا' اوکاڑہ' سیاچن' احمد پور..... پہاڑوں سے اترا تو صحرا میرا مقدر ہوئے۔ میں اس کہانی کو دہرا کر صرف اپنی تسلی کر رہا ہوں ورنہ یہ قصہ تمہارے لیے اجنبی ہے نہ میرے لیے۔ البتہ مجھے غلط پاؤ تو ٹوک دینا.....

پھر ایک دن مجھ پر بڑا عجیب و غریب انکشاف ہوا۔ مجھے یقین تھا۔ میں تم سب کو سمجھتا ہوں۔ وجہ مجھے معلوم نہیں لیکن باقی لوگوں کے مقابلے میں تمہیں زیادہ۔"

وہ کچھ دیر رکا۔ اسے لگا' وہ اس انداز میں جملے کو روانی میں ادا نہیں کر سکے گا۔ اس سے قبل کہ اس کی آواز لڑکھڑاتی۔ اس نے خود کو روک لیا۔

"میں اپنے کشف پر نازاں ہوں۔ جب میں نے اچانک محسوس کیا تم میں کوئی تبدیلی آرہی ہے۔ اس سے قبل کہ تم خود سے یا مجھ سے کوئی اعتراف کرتیں' مجھے اس کا ادراک تم سے بھی پہلے ہو گیا۔ جب تم اپنے زخمی کلاس فیلو کے ساتھ تھیں' جب ایک اجنبی مہمان کو تم نے کھانے پر روک لیا' جب ریلوے کے اپنے کمپارٹمنٹ میں چڑھتے میں نے تم سے ایک سوال کیا۔"

اس پر بھی اچانک ایک الہامی کیفیت اتری تھی۔ وہ جو کچھ سنا رہا تھا' بے سروپا اور بے مقصد نہیں ہانک رہا تھا۔ یوں جملہ ادھورا چھوڑ کر چپ سادھ لینے میں کیا مصلحت ہو سکتی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ یا شاید آ گیا تھا۔

عبیرہ جیسے کتنی دیر کے لیے سناٹے میں آ گئی۔ اپنی ڈائری سے چند گنے چنے ورق سنانے کا اس کا مقصد کیا تھا۔ وہ اچانک چپ ہو گیا۔ چپ ہونے میں مصلحت کیا تھی۔ وہ بتاتی تو کیا بتاتی۔ یہ قصہ اتنا عام تو نہیں تھا کہ یوں اڑتا پھرتا۔ اس نے تو اپنی زبان سے کبھی ایسا جملہ ادا نہیں کیا' بلکہ باضابطہ طور پر کبھی خود سے بھی نہیں سوچا۔ کیا وہ اس کا تصور پڑھ لیتا ہے؟ کوئی لہر ہے' جو اس کے دماغ سے نکلتی ہے اور اڑتی اڑتی اوپر چلی جاتی ہے۔

"میں نے تمہیں پریشان کر دیا...؟ مجھے اچھا تو نہیں لگا لیکن شاید میں یہ اعتراف تمہارے منہ سے سننے کا خواہش مند تھا۔ تم سارے اعترافات عمر بھر میرے سامنے رکھتی آئی ہو' پھر اس اتنے بڑے فیصلے میں ایسی بے اعتباری کیوں؟ تم نے ذکر نہیں کیا تو مجھے خیال آیا' تمہارا مجھ پر اعتبار ختم ہو گیا یا.... تم مجھے فاصلوں پر رکھ کر سوچ

رہی ہو یا... شاید اپنے کسی فیصلے پر خود مطمئن نہیں ہو... اس ساری کہانی میں، میں نے تمہیں بھی شہروالی ٹیوشن نہیں دی۔

میں دس بارہ روز پہلے اسلام آباد گیا تھا اور اس سے ملا تھا۔ ایک ساری شام میں نے اس کے ساتھ گزاری اور میں اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ ایک مخلص اور اچھا لڑکا ہے۔ میں کبھی تمہارے انتخاب سے مایوس نہیں ہو سکتا۔ تم غلط چیز چن ہی نہیں سکتیں اور آج جب میں عین اس جگہ بیٹھا ہوں جہاں وہ اس دن بیٹھا تھا تو مجھے بہت اچھا محسوس ہو رہا ہے۔

میں تم سے ایک بات کہوں؟ حالانکہ یہ بات خود اس کو کہنی چاہیے مگر مجھے یقین ہے اس نے اب تک نہیں کہی ہو گی اور تم نے اسے کہنے بھی نہیں دی ہو گی۔ وہ سچ مچ تم سے محبت کرتا ہے۔ حالانکہ دیکھا جائے تو یہ لفظ اپنے استعمال میں اس قدر پھٹیچر ہو چکا ہے لیکن اس کی محبت یقیناً "پھٹیچر" نہیں ہے۔ اور اگر میں کہہ رہا ہوں اور تمہارے لیے کہہ رہا ہوں تو سوچ لو یقیناً "پوری ذمہ داری سے کہہ رہا ہوں۔ بعض لفظ بے معنی نظر آنے کے باوجود بہت اہم ہوتے ہیں۔ دراصل ڈیڑھ بجے جب ہم سوروں کے خوف سے اٹھے اور اپنے اپنے ٹھکانوں پر جانے لگے تو ہم دونوں نے محسوس کیا، ہمارا ٹھکانا جدا نہیں تھا، شاید محور بھی مختلف نہیں تھا، جس وقت نزدیک کی مسجد سے مؤذن نے صبح کی آمد کی اطلاع اللہ کی عظمت کے ساتھ دی تو ہم نے غور کیا، ہم اتنی دیر سے ایک ہی انسان کی بات کیے جا رہے ہیں۔ تم سمجھتی ہو نا وہ ایک ہی انسان کون ہو سکتا ہے؟"

شہریار نے دیکھا، وہ جلدی جلدی پلکیں جھپکا رہی تھی وہ اپنے آپ میں خجل ہونے لگا۔ یہ کون سی مردانگی ہوئی کہ ایک بہادر لڑکی کہ جس کے آنسو بڑی قیمت رکھتے ہوں، ارزاں کر دینا کیا کمال ہوا۔ شہریار کو محسوس ہوا۔ وہ خود بھی اسی تیزی سے آنکھیں جھپک رہا تھا۔ حالانکہ وہ خود بھی جذباتی ہونے سے بہت کتراتا تھا۔

"حمیرا ہوتی تو اب تک کافی بنا کر لا چکی ہوتی۔"

وہ اس سے نظریں اور موضوع دونوں چرانے لگا۔

"چلو! تمہیں کافی بنا کر پلاتا ہوں۔" وہ اٹھا اور اس کا انتظار کیے بنا تیزی سے اندر چلا گیا۔

☼ ☼ ☼

تم نہ آئے تو ہر چیز وہی تھی جو ہے
آسماں حد نظر! راہ گزر، راہ گزر

گڑ والی نیم گرم چائے کا ایک طویل گھونٹ بھرتے اس کو یاد آیا، آج جس چائے کو وہ اس رغبت سے پی رہی ہے، کل اس کی خاطر وہ نوکری چھوڑنے پر آمادہ تھی۔ اس کا مطلب وقت گزرا ضرور ہے۔

"اب جو آئے ہو تو ٹھہرو......"

"پروین! یہ بتاؤ، تم نے کبھی شاعری پڑھی یا سنی ہے؟"

"ہمارے گاؤں کے سب بزرگ پیدا ہی شاعر ہوتے ہیں۔" اس نے پردے سرکا کر گرد مٹی کے ساتھ روشنی کو اندر آنے کا راستہ دیا۔ "ہمارے ہاں بولیاں ہوتی ہیں، ٹپے ہوتے ہیں۔ اب تو فلمی گانے بھی ہوتے ہیں۔ کبھی اکبر سے ہیر سن کر دیکھیں درختوں پر بیٹھے پرندے رونے لگتے ہیں۔"

عبیر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ "یہ کس قسم کی تشبیہ ہے پروین؟"

"آج آپ بہت خوش ہو۔ پرندوں کے رونے پر بھی ہنس پڑیں۔"

اس نے ایک دم اپنی ہنسی روک لی۔ "واقعی کبھی ہم بے جگہ اپنی خوشی کا اظہار کر جاتے ہیں۔"

"تم اور اکبر ایک ہی گاؤں کے ہو؟"

"حیرت ہے، آپ کو اکبر نے کچھ نہیں بتایا۔ چلو، اس نے ضروری نہیں سمجھا ہو گا۔ آپ نے کبھی گاؤں دیکھا ہے، کیسا ہوتا ہے؟"

"صرف ایک گاؤں دیکھا ہے۔"

"وہاں جہاں کسی بوڑھے بابا نے آپ کو گڑ دیا تھا، جو آپ نے مجھے دے دیا۔ آپ کو پتا ہے میں اس لیے ہر روز تھوڑا تھوڑا کر کے کھاتی ہوں کہیں ختم نہ ہو جائے۔ گڑ تو شہر میں بھی ملتا ہے، مگر اس گڑ کی الگ سے پہچان ہوتی ہے اور آپ نے گاؤں دیکھا ہے تو آپ کو یہ بھی پتا ہو گا، گاؤں میں لوگ کمرہ بند کر کے نہیں سوتے۔ وہ کھلی ہوا میں سوتے ہیں۔ ہم ناشتے میں ڈبل روٹی بھی نہیں کھاتے۔ چائے گرمی کرتی ہے اور وہاں گوشت کی دوکانیں نہیں ہوتیں۔ ایک تالاب ہوتا ہے، گائے بھینسیں ہوتی ہیں۔ درخت ہوتا ہے۔ جس پر سایہ ہوتا ہے۔"

"سایہ تو درختوں کا ہوتا ہی ہے پروین۔ یہ گاؤں کا کیا کمال ہوا۔"

"کمال تو ہوتا ہے آپا! کیونکہ یہ سایہ درخت کے نیچے نہیں، درخت کے اوپر ہوتا ہے۔ چھوڑیں! آپ کو نہیں سمجھ آئے گا۔ آپ کو کیا پتا وہاں خوشبو صرف گوبر اور پتوں کی ہوتی ہے یا لکڑیاں اور اپلے جلنے کی اور جب سوکھی مٹی پر بارش کا چھینٹا پڑتا ہے تو سب پر حاوی مٹی کی خوشبو ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں آوازیں بھی شہر سے الگ ہوتی ہیں۔ روٹیاں پکنے کی تھپ تھپ ہے، لہسن کے تڑکے کی چھن ہے، منڈیر پر بیٹھے بولتے کووں کا شور اور جب ان کا بس چلتا ہے، صحن میں رکھی روٹی، دسترخوان سمیت اٹھا کر اڑ جاتے ہیں۔ بیلوں کی گھنٹیوں کی آواز ہے۔ گاؤں میں گاڑی کے ہارن کی آواز نہیں آتی۔ ہاں! اگر کبھی گاڑی کا ہارن سنائی دے تو گاؤں کی لڑکیاں ڈر کے رونے لگتی ہیں۔"

"وہ کیوں؟" اس نے اچنبھے سے پوچھا۔

"اس لیے کہ گاڑیاں ہمارے گھروں کو برباد کرنے آتی ہیں۔" وہ اس کو بہت دل شکستہ نظر آئی۔

"تمہیں گھر یاد آ رہا ہے؟ تم چھٹی لے کے کچھ دن کے لیے گاؤں چلی کیوں نہیں جاتیں؟"

"بڑے صاحب نے کچھ فائلیں بھجوائی تھیں۔" وہ ایک دم کاروباری اور آن ڈیوٹی ہو گئی۔

"یہ جس کاغذ پر ٹیگ لگا ہے، وہ آؤٹ ٹوڈے ہے۔"

وہ اس کے سامنے سے چائے کی خالی پیالی اٹھاتے بالکل روکھی اور اجنبی ہوگئی تھی۔ اس کا بے ساختہ جی چاہا' وہ اس کے اس قدر پروفیشنل ازم پر داد دے' لیکن اس نے ایک دم ہی اپنے گرد دیواریں کھڑی کرلی تھیں۔ کہ پھر سے ایک ہو۔

اس نے فائل گھسیٹ کر کھولی۔ ٹی بریک ختم ہوئی' کافی پارٹی کی گپ شپ تمام ہوئی' مسافر اپنے ٹانڈے بھانڈے سمیٹ کر جاچکا تھا۔

"کیا اب بھی نہ جانا لوگو.....!"

جب وہ پیالی اٹھانے اس کی ڈیسک کے نزدیک جھکی تھی تو اس نے دیکھا' اس کی آنکھوں کے کنارے نمکین پانی سے تر تھے۔

"سرمئی رنگ کہ ہے ساعت بے زار کا رنگ"

اس کو قلق ہوا۔ ہم سب کتنے کمزور انسان ہیں۔ کتنی آسانی سے جذبات کے دھارے میں بہتے نکل جاتے ہیں۔ اسے گزشتہ شام یاد آئی اور بے سبب بھیگتی اپنی آنکھیں۔ پروین وسایا کو بھی کوئی چیز تنگ کررہی ہے۔ لڑکی گاؤں کی ہو یا شہر کی' قابل ہو یا ان پڑھ' بہادر بننے کی کوشش ضرور کرتی ہے۔

"سنو پروین وسایا.....!" وہ جب اگلے کسی چکر میں کسی کام سے اس کے کمرے میں آئی تو اس کی آنکھیں برس برسا کر خشک ہوچکی تھیں۔

"میری ایک دوست کا فون آیا ہے۔ وہ دور سے آئی ہے اور بہت تھوڑی دیر کے لیے آئی ہے اور اس کے پاس بس یہی وقت ہے۔ وہ مجھ سے ملنے آنا چاہتی ہے۔ کیا آفس آورز میں ملاقات کی اجازت ہے؟"

"ایسے کوئی احکامات تو نہیں کہ اجازت نہ ہو۔ جب احکام منفی نہ ہوں تو ہم سمجھ سکتے ہیں کہ ہے اجازت....."

"ارے واہ پروین..... تمہیں تو سرکاری ملازمت میں ہونا چاہیے تھا۔ یہاں تو تم محض اپنا ہنر ہی ضایع کررہی ہو اور سنو! وہ آدھے گھنٹے تک پہنچ جائیں گے۔ میری دوست کا نام ثریا ہے۔ اس کے ہزبینڈ بھی ساتھ ہوں گے۔ تم ان کو ویٹنگ میں بٹھا کر مجھے اطلاع دینا پلیز!"

"بہت بہتر۔" وہ مؤدب لہجے میں فائل اٹھا کر غائب ہوگئی۔

بہت دیر نہیں گزری تھی' جب اچانک اس نے آفس میں بھگدڑ کی سی آواز سنی' جیسے ہر طرف شور شرابا تھا۔ لوگ تیز آواز میں ایک دوسرے کو پکار رہے تھے۔ پکے فرش پر بھاگتے ہوئے قدموں کی آوازیں تھیں۔ وہ باہر آئی تو لمحے بھر کے لیے سارے منظر کا کوئی حصہ اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ ثریا اور اس کا میاں دہشت زدہ سے لاؤنج میں کھڑے تھے۔ پروین وسایا پاگلوں کی طرح چیخ چیخ کر اکبر اعظم کو آوازیں دے رہی تھی۔ ناخنوں کی کھرونچوں سے اس نے ثریا کے شوہر کا چہرہ لہولہان کردیا تھا۔

پھر دیکھتے دیکھتے اس نے اپنا جوتا اتارا اور دھڑا دھڑ اس کی پٹائی شروع کردی۔ وہ چیخیں مار کر رو رہی تھی۔ کسی ہوش کھوئے ہوئے انسان کی سی' ہسٹریک چیخیں' اس کا شوہر خود کو پروین کی گرفت سے چھڑانے کی لگاتار کوشش کررہا تھا لیکن پروین کی گرفت اس کے گریبان پر اس وقت تک ڈھیلی نہیں ہوئی کہ وہ ماربل کے فرش پر بے ہوش ہو کر گر نہیں گئی۔

(باقی آئندہ ماہ انشاءاللہ)

راشدہ رفعت

معمولی سی بات نے بڑھتے بڑھتے ٹھیک ٹھاک قسم کے جھگڑے کی صورت اختیار کرلی تھی۔ چار دن بعد میرے بھانجے کی سالگرہ تھی اور میں نے اس کے گفٹ کے لیے جنید سے پیسے مانگے تھے۔

"مہینے کا آخر ہے' پیسے کہاں سے دوں۔" انہوں نے رکھائی سے جواب دیا تھا۔

"وہیں سے دیں' جہاں سے پچھلے مہینے شاہ زیب کی سالگرہ پر دیے تھے۔" مجھے ان کی بات سن کر غصہ آگیا تھا۔ پچھلے مہینے اپنے بھتیجے کی سالگرہ کے لیے تو جھٹ سے بٹوہ کھول کر فٹ سے میرے ہاتھ میں پیسے تھمائے تھے کہ کوئی اچھا سا گفٹ لے آؤں اور میرے بھانجے کی دفعہ آنکھیں ماتھے پر رکھ لی تھیں۔

"دیکھو' تمہیں پتا ہے کہ اس دفعہ ہاتھ کچھ تنگ ہے۔ حورین کی بیماری پر کتنا خرچا اٹھا ہے' پھر ہانی' حمزہ کے اسکول والوں نے پارٹی اور فنکشن کے طور پر کتنے پیسے اینٹھ لیے ہیں۔ سب کچھ جانتے بوجھتے نئے نئے مطالبے کررہی ہو۔"

"اپنے بچوں کی بیماری اور اسکول کے خرچے آپ کو نظر آگئے اور وہ جو آپ کی منجھلی آپا آدھے درجن بچوں کے ساتھ ہفتہ بھر قیام وطعام کرکے گئی ہیں' اس کا ذکر ہی گول کردیا۔ سارا بجٹ تو نصرت آپا کی آمد کی وجہ سے ڈسٹرب ہوا تھا۔" میں نے انہیں یاد دلایا۔

"تو بہن کے آنے پر گھر کے دروازے بند کردیتا کیا۔" جنید مزید آگ بگولا ہوئے۔

"یہ میں کب کہہ رہی ہوں' لیکن خود انصاف کیجیے کہ اپنی بہن اور اس کے بچوں پر تو ہزاروں روپے خوشی خوشی لٹا دیے اور میں اپنی بہن کے بچے کے کھلونے کے لیے چند سو مانگ رہی ہوں تو وہ آپ کو کھل رہے ہیں۔"

"اچھا بابا! دماغ کیوں چاٹ رہی ہو۔ دے دوں گا پیسے۔" انہوں نے بے زاری سے جواب دیا۔

"بیوی ہوں آپ کی۔ ایسا لہجہ کیوں استعمال کررہے ہیں' پیسے چاہئیں' خیرات نہیں۔" مجھے بھی ٹھیک ٹھاک غصہ آگیا تھا۔

"بلاوجہ بات بڑھا رہی ہو تم ممتاز! کس چیز کی کمی ہے، جو کماتا ہوں تم لوگوں پر ہی خرچ کرتا ہوں۔ اپنی ذات پر تو پھوٹی کوڑی خرچ نہیں کرتا۔ نہ سگریٹ کی عادت ہے، نہ پان کی لت۔ مرد تو یار دوستوں پر ہی اتنا پیسہ لٹا دیتے ہیں۔ بجائے اس کے کہ میری قدر کرو، صبر شکر کر کے گزارا کرو، گھر کے واحد کفیل کو گھریلو سکون فراہم کرو۔ تم الٹا چیخ چیخ کر میرا دماغ پلپلا کر دیتی ہو۔ پتا بھی ہے، کمانا کتنا مشکل ہے، مہنگائی آسمانوں کو چھو رہی ہے۔ تم لوگوں کی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے صبح سے شام کتنی جان مارتا ہوں۔ تم اندازہ لگا ہی نہیں سکتیں۔" جنید نے بلاوجہ کا لیکچر جھاڑ دیا تھا۔

"کماتے ہیں تو احسان نہیں کرتے۔ بیوی بچوں کی کفالت کرنا آپ کی ذمہ داری بھی ہے اور فرض بھی۔ پھر ایسا کون سا شاہانہ طرز زندگی ہے ہمارا اس پر بھی کہہ رہے ہیں کہ صبر شکر کر کے گزارا کرو۔" میں بھی بگڑی تھی اور بس پھر یوں ہی بات سے بات نکلتی چلی گئی۔ بچے الگ سہمے کھڑے تھے۔

"پتا نہیں کون سی منحوس گھڑی تھی، جو تم جیسی عورت میری زندگی میں شامل ہوئی۔ کسی گناہ کی سزا ہو تم۔ مسلسل عذاب کی طرح میرے سر پر مسلط ہو۔ میری ہی ہمت ہے جو تم جیسی جھگڑالو اور بد زبان عورت کے ساتھ گزارا کر رہا ہوں۔"

آخر جنید ہی بکتے جھکتے واک آؤٹ کر گئے تھے۔ موبائل اور والٹ اٹھائے، بائیک کو کک لگا کر جانے اس غصے کے عالم میں کہاں گئے تھے۔

کتنی دیر تک میں سر پکڑے روتی رہی۔ ایک ذرا سی بات کو بنیاد بنا کر کتنا فساد برپا کر گئے تھے۔ اس بندے کے لیے، اس کے گھر، اس کے بچوں کے لیے زندگی وقف کر کے رکھ دی تھی میں نے۔ سسرال والے آتے تو ان کی خاطر مدارت، آؤ بھگت میں کوئی کسر نہ چھوڑتی، اپنی ہستی ہی مٹا رکھی تھی میں نے۔ اپنی ذات پر کوئی خرچا کرنا بھی چاہتی تو اگلے اور پھر اس سے اگلے مہینے پر ٹال دیتی۔ پرسوں ہی بازار میں مجھے اپنی پرانی کلاس فیلو ملی، بلکہ وہ کیا ملی، میں ہی اسے پہچان کر اس کے پاس پہنچی تھی، وہ تو ایک نظر میں مجھے پہچان ہی نہ پائی۔

"اف اللہ! ممتاز کیا حال بنا لیا ہے تم نے اپنا۔ کالج کی خوب صورت ترین لڑکیوں میں سے ایک تھیں تم اور اب تو اپنی عمر سے دس سال بڑی لگ رہی ہو۔"

نزہت سدا کی منہ پھٹ تھی۔ میں کھسیا کر رہ گئی تھی۔ کیا بتاتی کہ شادی شدہ زندگی کی ذمہ داریوں نے میری خوب صورتی کو ماضی کا قصہ بنا دیا ہے۔ ہر آڑے وقت میں، ہر مشکل گھڑی میں، جس صبر و شکر کے ساتھ میں نے جنید کے ساتھ زندگی بتائی بجائے اس کے وہ اس بات کا اعتراف کریں، مجھے کسی گناہ کی سزا اور عذاب مسلسل قرار دے گئے۔

روتے روتے میری ہچکی بندھ گئی تھی۔ حورین نے مجھے پانی کا گلاس لا کر تھمایا تو مجھے اپنی چھ سالہ بیٹی پر پیار بھی آیا اور افسوس بھی ہوا۔ ہم میاں، بیوی میں اور کسی بات پر اتفاق ہو نہ ہو، یہ اتفاق رائے ضرور تھا کہ اپنے لڑائی جھگڑے بیڈ روم تک محدود رکھیں گے اور بچوں کو کسی بھی جھگڑے کی بھنک نہ پڑنے دیں گے۔ جنید کہتے تھے کہ ماں، باپ کی شکر رنجیوں سے اولاد کی نفسیات پر برے اثرات مرتب ہوتے ہیں اور مجھے ان کی بات سے پورا اتفاق تھا، لیکن آج جانے کیوں، ہم دونوں میاں، بیوی اپنا ہی وضع کردہ فارمولا بھول گئے تھے۔ دونوں نے ہی بچوں کے سامنے دل کھول کر جی کی بھڑاس نکالی تھی۔

"پاپا گندے ہیں، آپ سے اتنا سارا لڑ کر گئے ہیں۔" حورین روہانسی ہو رہی تھی۔ مجھے دھچکا سا لگا۔ وہ جنید کی لاڈلی بیٹی تھی۔ بیٹوں کی نسبت جنید اکلوتی بیٹی پر جان چھڑکتے تھے۔ اس کے منہ سے باپ کے لیے منفی رائے سن کر مجھے افسوس ہوا تھا۔

"نہیں بیٹا! ایسی کوئی بات نہیں۔ پاپا بے چارے تھکے ہارے آئے تھے۔ آفس میں بہت کام ہوتا ہے نا، تھک جاتے ہیں۔ تمہارے پاپا آفس میں پوری ایمان داری سے کام کرتے ہیں، لیکن ان کے ساتھی کام میں ڈنڈی مارتے ہیں، پاپا کو ان پر جو غصہ آیا تھا، وہ مجھ پر نکال دیا۔"

میں نے جنید سے اپنی ناراضی فراموش کرتے ہوئے حورین کا دل باپ کی طرف سے صاف کرنا چاہا تھا اور کسی حد تک بات سچ بھی تھی۔ جنید جس محکمے میں تھے وہاں "ہذا من فضل ربی" کے بہت مواقع میسر تھے۔ ایسے محکمے، ایسی پوسٹ پر دیانت داری سے کام کرنا ناممکن حد تک مشکل امر تھا اور جنید جب موڈ میں ہوتے تو یہ تسلیم کرتے تھے کہ میری وجہ سے یہ ناممکن کام ممکن بنا ہوا ہے۔ میں بیویوں کی بڑی صابر، شاکر اور قانع قسم کی کیٹیگری سے تعلق رکھتی تھی، لیکن آج کس طرح بغیر کسی بات کے بے نقط سنا کر چلے گئے مجھے۔ دل میں دوبارہ ناراضی کی لہر اٹھی تھی لیکن بیٹھ کر کڑھنے سے کیا حاصل تھا۔

گھر کے سارے کام ادھورے پڑے تھے۔ لوڈشیڈنگ کے شیڈول کی وجہ سے صبح کے بجائے شام کو واشنگ مشین لگائی تھی اور ابھی کپڑوں کا ایک چکر ہی لگا تھا کہ جنید سے جھگڑا ہو گیا۔ اتنا قیمتی وقت فضول سے جھگڑے کی نذر ہو گیا تھا۔ بچوں کو ہوم ورک جلد مکمل کرنے کی ہدایت کرتے ہوئے میں دوبارہ پچھلے صحن میں کپڑے دھونے چلی گئی۔

بیڈ شیٹس اور پردے مل ملا کر کپڑوں کا ڈھیر اکٹھا ہوا پڑا تھا۔ دھوتے دھوتے کمر اکڑ گئی تھی۔ جنید ابھی تک نہ آئے تھے، اب ذرا ذرا سی فکر بھی دامن گیر ہونے لگی۔ موبائل اٹھا کر ان کا نمبر ملانا چاہا تو پتا چلا بیلنس مکا پڑا ہے۔

ٹھنڈی سانس بھر کر کچن کا رخ کیا۔ اکثر گھروں میں کھانا دوپہر کو بنتا ہے، لیکن چونکہ جنید تازہ سالن شوق سے کھاتے تھے اور لنچ وہ آفس میں کرتے تھے، سو میں شام کو ان کی آفس سے واپسی کے بعد تازہ سالن پکاتی تھی۔

بچ جاتا تو اگلے دن لنچ باکس بنا کر آفس کے لیے ساتھ کر دیتی۔ ورنہ وہ آفس کینٹین سے کچھ بھی سستا سا لے لیتے۔ سچ تو یہ تھا کہ جنید بھی مردوں کی صابر شاکر نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ ورنہ عموماً مرد کتنے چٹورے ہوتے ہیں۔ دوستوں میں کھا پی کر گھر کا رخ کرنے والے، لیکن جنید چاہے کچھ باہر سے لاتے یا گھر میں اچھا سا پکواتے، بچوں کے بغیر کھانے کا تصور نہ کر سکتے تھے۔

آج میں نے ان کی فرمائش پر اچار گوشت بنایا تھا، لیکن اللہ جانے اتنی دیر کہاں لگا دی تھی۔ جیسے جیسے وقت بڑھتا جا رہا تھا میرے دل میں ان کے لیے غصہ کم اور پریشانی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ بچوں کو بھوک لگی تھی سو ان کو کھانا کھلا دیا۔ خود عشاء کی نماز کے لیے کھڑی ہو گئی، اتنے میں۔ جنید کی بائیک کا ہارن سنائی دیا۔ نیت کے دوران ہی میرے دل نے سکون کا سانس لیا۔ ہانی نے بھاگ کر دروازہ کھولا تھا۔

"بابا! یہ گفٹ پیک کیسا ہے؟" وہ اندر آئے تو حمزہ اور حورین نے اشتیاق سے پوچھا تھا۔ میں نے بھی سلام پھیر کر ان کی طرف دیکھا، وہ گفٹ پیک حورین کو تھما رہے تھے۔

"جاؤ بیٹا! یہ احتیاط سے اندر میری رائٹنگ ٹیبل پر رکھ آؤ۔ چار دن بعد سنی کی برتھ ڈے ہے۔ اس میں ہم سب مل کر یہ گفٹ دیں گے۔"

"لیکن بابا اس میں ہے کیا؟" ہانی کا تجسس ختم نہ ہو رہا تھا۔

"بیٹا! ریموٹ کنٹرول والی گاڑی ہے، بالکل ایسی جیسی آپ کے پاس بھی ہے۔" انہوں نے پیار سے جواب دیا تھا۔ ہانی نے مطمئن ہو کر اثبات میں گردن ہلا دی۔

"آپ ہاتھ منہ دھو لیں۔ بس وتر رہتے ہیں، پھر میں کھانا لگاتی ہوں۔" میں نے جنید کو مخاطب کیا۔

"ہاں، ہاں آرام سے پڑھ لو۔" انہوں نے بھی نارمل سے انداز میں جواب دیا۔ لگتا ہی نہ تھا کہ سر شام لڑ جھگڑ کر وہ گھر سے گئے تھے۔ نماز پڑھ کر میں کچن میں گئی۔ پیچھے پیچھے جنید بھی آ گئے تھے۔

"اندر بچے ٹی وی دیکھ رہے ہیں۔ کھانا یہیں دے دو۔ تم نے بھی نہیں کھایا ہو گا نا۔" وہ نرمی سے پوچھ رہے تھے۔

"آج تک رات کا کھانا آپ کے بغیر کھایا ہے؟"

میں نے الٹا سوال کیا۔ وہ جواباً مسکرا دیے تھے۔

"سنی کے لیے گفٹ لے آیا ہوں۔ پیک اسی لیے کروالیا کہ اپنے بچوں کا جی نہ للچائے۔"

"اچھا کیا۔" میں نے تائید کی۔

"ویسے سچی بات تو یہ ہے کہ دوسروں کے بچوں کے لیے پیسے خرچ کرتے ہوئے جی تھوڑا سا دکھتا ہے۔ پچھلے مہینے اتنا مہنگا کھلونا شاہ زیب کو دلا دیا۔ اب سنی کو گفٹ دے رہے ہیں۔ ہمارے بچوں کو کتنے مہینوں سے کوئی نیا کھلونا نصیب نہیں ہوا۔" وہ آزردہ ہو رہے تھے۔

"مجبوری ہے جنید! سماجی تعلقات بھی نبھانے پڑتے ہیں اور دو، چار مہینوں تک کچھ بچت ہو گئی تو ہانی، حمزہ کی برتھ ڈے سیلیبریٹ کرلیں گے۔ ڈھیر سارے کھلونے آجائیں گے۔" میں نے تجویز پیش کی۔

اور ڈھیر سارا خرچا بھی تو ہو جائے گا۔ آج کل تو سالگرہ کی تقریب میں بھی لوگ ایسے بے دریغ پیسہ لٹاتے ہیں کہ شادی کی تقریب کا گمان ہونے لگتا ہے۔" جنید بھی سچ ہی کہہ رہے تھے۔

"اچھا چھوڑیں۔ کن باتوں میں لگ گئے۔ کھانا کھائیں اور بتائیں کیسا بنا ہے اچار گوشت۔"

میں نے ان کی توجہ کھانے کی جانب دلوائی اور وہ واقعی باتیں چھوڑ کر رغبت سے کھانے لگے تھے۔ کھانے کے بعد وہ بیڈ روم میں چلے گئے تھے۔ میں نے کچن سمیٹ کر بچوں کا ٹی وی زبردستی بند کروایا اور انہیں ان کے بیڈ روم میں ہانک کر سلانے لے گئی۔ کمر میں آج شدید درد ہو رہا تھا۔ ابھی جنید کے آفس کے کپڑے اور بچوں کے یونیفارم پریس کرنا باقی تھے، لیکن میرے شہزادے کہانی سنے بغیر جان نہ چھوڑتے تھے۔ کہانی سنتے سنتے ہی بچوں کی آنکھیں نیند سے بند ہونے لگی تھیں۔

"بچپن بھی کتنا بے فکری کا دور ہوتا ہے۔" میں بچوں پر لحاف ڈال کر زیرو پاور کا بلب آن کر کے دھیرے سے ان کے پاس سے چلی آئی۔

اسی سال بچوں کا بیڈ روم الگ کیا تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ شروع میں مجھے بچوں کے بغیر نیند ہی نہ آتی تھی۔ رات میں کتنی دفعہ اٹھ اٹھ کر ان کے کمرے میں جھانکتی، لیکن آہستہ آہستہ عادت پڑ ہی گئی تھی۔ لاؤنج میں آئرن اسٹینڈ رکھا تھا۔

کپڑے پریس کر کے جس وقت میں اپنے بیڈ روم میں گئی تو پونے بارہ ہو رہے تھے۔ لائٹ آن تھی، لیکن جنید گہری نیند سوئے ہوئے تھے اور میں جو یہ سوچ کر آئی تھی کہ بیڈ روم میں جا کر ان سے ہلکا پھلکا گلہ شکوہ کروں گی۔ انہیں گہری نیند سوتا دیکھ کر یہ خواہش آپ ہی آپ دم توڑ گئی۔ بے چارے واقعی بری طرح تھک جاتے تھے اور آج تو تھکن سے میرا بھی برا حال ہو رہا تھا۔

لائٹ بند کرنے ہی لگی تھی کہ سامنے ٹیبل پر دھرے گفٹ پیک پر نگاہ پڑی۔ میں نے ویسے ہی اٹھا کر وزن کا اندازہ کیا۔ اور پھر گفٹ پیک واپس میز پر رکھا تو ٹیبل کیلنڈر کی طرف دھیان چلا گیا۔

بارہ تو بجنے والے تھے۔ میں نے اگلے دن کی تاریخ پلٹنے کے لیے کیلنڈر اٹھایا اور اسی لمحے دماغ میں جھماکا سا ہوا۔ اگلا دن شروع ہونے ہی والا تھا، لیکن جو دن گزر گیا تھا یہ بھی کوئی عام سا دن تو نہ تھا۔

نو سال پہلے اسی دن اسی بیڈ روم میں، میں دلہن بنی بیٹھی تھی۔ شادی کی سالگرہ ویسے تو ہم نے کبھی بھی سیلیبریٹ نہ کی تھی، لیکن یاد رہ جاتا تو ایک دوسرے کو وش تو کر دیتے تھے، لیکن اس بار نہ تو جنید کو یہ تاریخ یاد رہ پائی تھی، نہ مجھے۔ ہائے زندگی کے جھمیلے۔

میں لائٹ آف کر کے جنید کے پہلو میں آکر لیٹ گئی۔ ذہن کے پردے پر نو سال پہلے کے مناظر فلم کی طرح چلنے لگے تھے۔ مہرون لہنگے میں ملبوس، بھاری کامدار آنچل اور شرم سے جھکی گردن اور گھڑی کی ٹک ٹک، یہ ہی کوئی بارہ، پونے بارہ کا وقت تھا۔ رسمیں ختم ہو چکی تھیں۔ میری بڑی نند سب لڑکیوں بالیوں کو ہانک کر کمرے سے باہر لے گئی تھیں اور جاتے وقت میرے کان میں سرگوشی بھی کر دی تھی۔

"سنبھل کر بیٹھ جاؤ، جنید کو بھیج رہی ہوں۔" اور ذرا دیر بعد جنید بھی آگئے تھے۔

اگر آج کی تقریب میں ہر زبان پر دلہن کی خوب صورتی کے چرچے تھے تو دولہا کی وجاہت کے تذکرے بھی زبان زد عام تھے۔

جنید اس زمانے میں واقعی بہت ہینڈسم تھے۔ میری اکثر دوستوں کا کہنا تھا کہ جنید بھائی ہمایوں سعید میں ملتے ہیں۔ اس وقت ہمایوں سعید ہی مشہور ہیرو تھا اور شاید خوب صورتی کا پیمانہ بھی۔ مجھے تو خیر وہ کہیں سے بھی ہمایوں سعید جیسے نہ لگے تھے۔ بلکہ سچ کہوں تو شاید اس سے بھی زیادہ اچھے لگے تھے۔ کتنے پیار سے انہوں نے میری کلائی میں سونے کا کنگن پہنایا تھا۔ بلاشبہ سونا اس وقت سستا تھا، لیکن میری بھابھیوں، بہنوں وغیرہ کو منہ دکھائی میں گولڈ رنگ یا زیادہ سے زیادہ لاکٹ سیٹ ملتا تھا۔ میں کنگن پا کر تو خوش تھی ہی لیکن اس سے بھی زیادہ جنید کا اظہار محبت مجھے مسرور کر رہا تھا۔

"مہناز! تم اندازہ نہیں سکتیں کہ تمہارا ساتھ پا کر میں کتنا خوش ہوں۔ مجھے اپنی خوش بختی پر یقین نہیں آرہا۔ تم میرے لیے آسمانی تحفہ ہو۔ جنت کی حور ہو۔"

وہ جذبات کی شدت سے چور میرے کان میں سرگوشی کر رہے تھے اور میں شرم سے دہری ہوئے جا رہی تھی۔ بیتا وقت یاد کر کے میرے لبوں پر آپ ہی آپ مسکان پھیل گئی، لیکن پھر اسی پل جنید کے آج جھگڑے کے دوران بولے جانے والے ڈائیلاگ بھی یاد آگئے، جس میں انہوں نے مجھے کسی گناہ کی سزا، مسلسل عذاب اور بھی جانے کن کن القاب سے نوازا تھا۔ دھیمی سی مسکان غائب ہو گئی تھی، میں نے سوتے ہوئے جنید پر خفگی بھری نگاہ ڈالی، مگر پھر دوبارہ مسکرا دی تھی۔

منہ کھول کر خراٹے لیتے ہوئے کتنے معصوم لگ رہے تھے۔ ماضی کے ہمایوں سعید کی چھوٹی سی توند بنیان میں قدرے نمایاں ہو رہی تھی۔ سر کے بال بھی آگے سے قدرے اڑ چکے تھے، لیکن پھر بھی وہ جیسے بھی تھے، مجھے عزیز تھے، بلکہ شاید ہر گزرتے دن کے ساتھ ہمارے تعلق میں مزید گہرائی آتی جا رہی تھی۔ ہمارے تین پیارے پیارے سے بچے جو بلاشبہ ہم دونوں کی ہی جان تھے۔ پرسکون گھریلو زندگی جس میں کبھی گرمی، سردی، تلخی، لڑائی، جھگڑے تو چلتے رہتے تھے، لیکن ہم دونوں کے دکھ سکھ سانجھے تھے۔

زندگی میں جب بھی کوئی مشکل وقت آیا، مجھے ان کے وجود سے ڈھارس ملی اور انہیں مجھ سے۔ ہمارے رشتے میں پیار، محبت، اعتبار سب کچھ شامل ہے، اگرچہ اظہار کا وقت ملنا مشکل ہو گیا ہے اور انہوں نے جو آج مجھے کسی گناہ کی سزا کہا، تو کوئی دل سے تھوڑی کہا، بس ایویں غصے میں جذبات کے اظہار پر قابو نہ رکھ پائے جیسے کبھی جذبات کی شدت سے مغلوب ہو کر مجھے جنت کی حور بنا دیا تھا اور میں کتنے دن ہواؤں میں اڑتی رہی۔

لیکن اب پتا چل گیا ہے کہ میں نہ تو جنت کی حور ہوں، نہ کسی گناہ کی سزا۔ میں تو بس ان کی بیوی ہوں۔ ان کی زندگی کی ساتھی، ہم دونوں ایک دوسرے کے بغیر بالکل نامکمل ہیں، بالکل ادھورے۔

میں نے جنید کی طرف بہت محبت سے دیکھا تھا، پھر ان کا شانہ پکڑ کر ہلایا۔ دو، تین بار ہلانے کے بعد انہوں نے مندی مندی آنکھیں کھول کر سوالیہ نگاہوں سے مجھے دیکھا۔

"ہیپی ویڈنگ اینورسری جنید!" میں نے مسکرا کر انہیں وش کیا۔

"اچھا ہاں، میں بھول گیا تھا۔ تمہیں بھی مبارک ہو جانو!" انہوں نے بدقت آنکھیں کھول کر مبارک باد دی اور پھر دوبارہ انہیں نیند کا غوطہ آگیا۔ میں نے بھی مسکرا کر دوسری طرف کروٹ لے لی۔ واشنگ مشین لگانے کی وجہ سے جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ نیند سے میری بھی آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ میں جانتی تھی کہ کچھ لمحوں بعد کمرے میں جنید کے زوردار خراٹوں کے ساتھ میری بھی مدھم خراٹیاں گونج رہی ہوں گی۔

☆

ثمینہ عظمت علی

سونے اور جاگنے کی درمیانی کیفیت میں ایک عجیب سا احساس ہوا اور کچھ ہیولے سے نظر آنے لگے۔ مدھم سی روشنی میں یوں محسوس ہوا جیسے ایک پہاڑ سا شخص کھڑا ہو' ایک بہت بڑے پروجیکٹر ٹائپ آلے کی شبیہ بھی محسوس ہوئی اور وہ قوی الجثہ شخص اس کے اندر کوئی آلہ گھسانے کی کوشش کر رہا تھا۔

ہماری حسیں ایک دم جاگنے سی لگیں۔ کیا تھا یہ؟ کوئی خیال؟ خواب؟ وہم؟ کوئی اشارہ؟ یا علامت؟ چھٹی حس۔ مائنڈ سائنس' تھرڈ آئی' پیش گوئی؟ کوئی دہشت گردی کی واردات ہونے والی ہے' خود کش حملہ؟

بدنصیبی سے پتا کھڑکنے پر بھی ہم لوگوں کے دل میں پہلا خیال یہ ہی آتا ہے۔

لیکن یہ خبر ہمیں دی جارہی تھی۔ چند دن پہلے ہی ہمیں نیا شوق جاگا تھا۔ نفسیات مابعد الطبیعات' یا نفسیات آگے تھی اور طبیعات پیچھے تھی۔ یہ تو فرائیڈ اور آئن اسٹائن ہی جانیں یا کچھ اور تھا جو ان سے پہلے تھا اور کوئی تھا جو ان کے آگے تھے اور کسی کے ہونے نے کسی کو ڈبویا تھا' لیکن جب ہم نے ٹی وی پر کئی جادوگروں یا شعبدہ گروں کو لیپ ٹاپ آگے رکھے اور پہلے اور بعد یا بعد اور پہلے کی مشقیں کرتے دیکھا تو ہمیں بھی نیا شوق جاگا۔

افسانے تو ریجیکٹ ہو ہی چکے تھے' اب کیا اچھا ہوتا جو ہم مستقبل بینی پر عبور پاکر کم از کم افسانوی پیش گوئیاں ہی کر لیتے۔ مثلاً "عبیر کی شادی فاروق سے ہوگی یا شہریار سے۔ جویا اور معاذ کی شادی کب ہوگی اور سفال گر کے بعد نیا ناول کون سا شروع ہوگا' لیکن شاید قدرت نے ہمیں ان چھوٹی موٹی پیش گوئیوں کے لیے نہیں بنایا تھا کہ محض شادی بیاہ کی تاریخیں طے کرنا (وہ بھی افسانوی) ہمارا کیریر ٹھہرتا۔

اور کیا' کیا تھا؟ رات کو دائرہ در دائرہ کی ایک ڈرائنگ بنا کر تھوڑی دیر اسے گھورا ہی تھا کہ ایک ہی مشق کے بعد ہمارے اوپر دہشت گردی کی اتنی بڑی واردات منکشف ہو رہی تھی' جس کی نشاندہی کے بعد ہم ہر مارننگ' نون' آفٹر نون' ایوننگ اور لیٹ نائٹ شو کے مہمان بننے والے تھے اور ہمیں ذوالفقار مرزا سے زیادہ کوریج ملنے والی تھی۔

ہم نے سوچا کہ قبل اس کے خودکش حملہ آور اپنا کام کر گزرتا اور ڈی آئی جی کو صرف اس کا ہیڈ ملتا' ہمیں اس کی نشان دہی کر دینی چاہیے۔ کس کو بتائیں؟ کسی نیوز چینل کو... نہیں' پھر تو بس طوفان برپا ہو جائے گا اور ایسی ایسی بریکنگ نیوز لگیں گی کہ سب کے اعصاب بریک ہو جائیں گے۔ کسی فوجی افسر کو یا 15 پر فون کریں' کیا کریں؟

دھڑ دھڑ دھڑ دھڑام۔

ایک زوردار دھماکا ہوا اور ہم چیخ مار کر اٹھ بیٹھے۔

آنکھیں بند اور کانوں پر ہاتھ۔

"اف خدایا' ہم نے موقع ضائع کر دیا۔" آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ ہم نے آنسو پونچھتے ہوئے آنکھیں کھول لیں' ٹی وی لگانے کے لیے کہ دیکھیں واردات کس جگہ ہوئی۔ ابھی سارے چینل سب سے

پہلے خبر دینے کی بھاگ دوڑ میں ہوں گے۔ کتنے مرے؟ کتنے مرنے والے ہیں اور لواحقین عین ان لمحات میں کیا محسوس کر رہے ہیں۔

"وچھا تھیونی؟ (کیا ہوا؟)" وہ موبائل ہاتھ میں لیے جھلائے ہوئے کھڑے تھے۔

موبائل کی ٹارچ کی روشنی میں دیوار پر ان کا دیوہیکل سایہ نظر آ رہا تھا اور موبائل ایک خوف ناک ہتھیار کا ہیولہ لگ رہا تھا اور وہ اس میں چارجر گھسانے کی کوشش میں مصروف تھے۔

"تم ہمیشہ میرا سنھی (تتلی) پن والا چارجر ہیڈان ہوڈان (ادھر ادھر) کر دیتی ہو۔"

ہم ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئے۔ آج کل ہماری قوم کا سب سے بڑا مسئلہ تتلی پن والا چارجر ہی تو ہے۔

"کتنی دفعہ تم سے کہا ہے کہ رات کو دیر تک ڈپ (خوف) والی کتابیں نہ پڑھا کرو اور یہ کاغذ پر گولڑے کی باتیں' آج کی باتیں' کل تک کی باتیں' ٹو دی پوائنٹ باتیں' تیرے مطابق باتیں' میرے مطابق باتیں' آف دی ریکارڈ باتیں....."

"افوہ! اب بس بھی کر دیں۔" ہم نے جھلا کر کہا۔

"تو اب یہ نئی بات سنو! صدر صاحب چیک اپ کے لیے دبئی چلے گئے۔" انہوں نے ہیڈ لائن سنائی۔

"بھا! چھوڑ بھی دیں بے چارے کو۔ پہلے ہی اس کا باپ مر گیا' بیوی مر گئی' ساس گئی' بڑا دکھی ہو گا۔" مرک بولی۔

"ہاں وتا یو فقیر کہتا تھا' عید والے دن سب سوّیاں پکائیں۔ جب پک جائیں تو سارے مر جائیں۔ میں رووں بھی' کھاؤں بھی۔"

✲ ✲ ✲

بھاجائی! میری دوستوں میں سے تو کوئی اس نغمے کی دُھن پک نہیں کر پا رہی" مرک نے مایوسی سے بتایا۔

"کیوں بھئی؟ یہ تو اتنا مشہور ہے۔" ہم نے حیرت سے کہا۔

"کسی نے سنا ہی نہیں۔ ان کو تو بس آج کل کے گانے آتے ہیں۔ آلو انڈے اور جانے کیا کیا' پہلے تو کبھی ٹی وی پر پرانے گیت آ بھی جاتے تھے۔"

"تو بھئی یوٹیوب جو ہے۔" ہم نے کہا۔

"ارے ہاں!" مرک اچھل پڑی۔ "یہ خیال تو مجھے آیا ہی نہیں۔"

"کنوار... اے کنوار (دلہن)"

"یہ تو چچی کی آواز لگ رہی ہے۔" مرک نے کہا۔

ہم نے اٹھ کر دیکھا تو چاچی جو چاچی کنوار کہلاتی ہیں' ہاتھ میں پیالا لیے چلی آ رہی ہیں۔

"کنوار! میں تمہارے لیے شولا لائی ہوں۔"

ہائیں' چاچی شعلہ بیاں تھیں' شعلہ زباں تھیں اور بعض اوقات شعلہ جوالا بن جاتی تھیں' لیکن یہ کس خوشی میں شعلہ لیے ہمارے گھر چلی آ رہی ہیں۔ شعلہ بھی کوئی ایسی چیز ہے' جو کسی کے گھر بھجوائی جائے۔ الٰہی خیر یہاں کیا کیا رواج ہیں۔

"چاچی کنوار! میں آپ کے شولا کی خوشبو کے پیچھے پیچھے آیا ہوں۔" ہمارے دیور نے آتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟ تم نے کہیں آگ لگانی ہے جو شعلے کی خوشبو کے پیچھے بھاگ رہے ہو۔ تمہاری عمر تو شبنم کے پیچھے بھاگنے کی ہے۔" ہم نے اس سے کہا۔

"توبہ کریں بھاجائی! میں تو کسی شبنم کو نہیں جانتا۔ ہاں! صرف ایک پاکستانی اداکارہ شبنم تھی جو شاید میرے ننڈھ پن (بچپن) میں ہی کہیں لاپتا ہو گئی تھی۔ میں بھلا اس کے پیچھے کیوں دوڑوں گا۔ مجھے تو فلمیں دیکھنے کا بھی شوق نہیں۔" وہ بولتا چلا گیا۔

"اڑے چریا! (بے وقوف) تم کیا جانو شبنم کون تھی اور ہماری فلمیں کیا تھیں؟" چاچی شولے والے پیالے کو ٹیبل پر رکھ کر شعلہ بن گئیں۔

"وہ ہمارا سنہری دور' وہ محمد علی' زیبا' ندیم' شبنم' وہ رانی وہ ممتاز اف! وہ شبنم کا جھٹکا کھا کر رکنا اور بابو کہنا۔

"میرا بابو چھیل چھبیلا میں تو ناچوں گی۔"

چاچی کی شعلہ بیانی عروج پر تھی۔

"لیکن چاچی! چھیل چھبیلا تو اس کا بابو ہے' وہ کیوں ناچے گی؟" ہم نے پوچھا۔

"یہ تو تم بتاؤ کنوار! یہ تمہارے سارے اردو گانے بابو پر کیوں ہوتے ہیں۔

مٹی کے کھلونے بابو لے جا

آئے گا شہری بابو' تم دل پہ رکھو قابو وغیرہ۔"

"اس لیے کہ شاید ان شاعروں' فلم سازوں یا اداکاروں کا تعلق ٹھٹھہ سے رہا ہو۔" ہم نے کہا۔

"اس؟ وہ کیسے۔"

"کیونکہ وہاں ہر گھر میں ایک بابو پایا جاتا ہے۔ جی جی "ان" کو بابو کہتی ہیں۔ پھپھو اماں کا ایک بیٹا بابو کہلاتا ہے تو ایک بابو خالہ کے گھر موجود ہیں۔"

"ہاہا۔" چاچی زور' زور سے ہنسنے لگیں۔ "اس حساب سے تو سارے ہیرو یہیں پیدا ہوئے ہوں گے اور سندھ' بنگال کا حصہ رہا ہو گا۔"

"جس شوق اور جس مقدار میں یہاں مچھلی کھائی جاتی ہے' مجھے تو اب بھی یہ بنگال کا ہی حصہ لگتا ہے۔"

(دائرے) بنا کر کیا کر رہی تھیں؟ کل تک تو بھبی شتی (اچھی بھلی) تھیں؟"

"اور یہ آپ کیا آدھی رات کو ٹارچ لیے سخت مشکوک قسم کی حرکات و سکنات میں مصروف بلکہ مبتلا نظر آتے ہیں۔ ہم تو ستارۂ امتیاز حاصل کرنے کے قریب تھے اور نکلا کیا؟ کہیں بہتر تھا کہ آپ ٹیوب لائٹ ہی جلا لیتے تو ہم اس عقدہ لاینحل میں....."

"اللہ ڑے! تم ادھ رات کو نیند سے اٹھ کر اتنی مشکل اردو کیسے بول لیتی ہو؟ اور ٹارچ اس لیے جلائی کہ تمہاری نیند خراب نہ ہو اور یہ پاچھے (سائے) تم جانتی ہو گی کہ جہاں سے روشنی نکل رہی ہو' اس کے بہت وجھے (نزدیک) کی کوئی چیز ہو تو وہ بہت بڑی نظر آتی ہے۔

ہم چھوٹے تھے تو جب بجلی چلی جاتی تھی تو موم بتی یا لالٹین کے آگے ہاتھ لا کر بھت (دیوار) پر شکلیں بناتے تھے۔"

"ہاں ہاں..." ہم بھی پُرجوش ہو گئے۔ "ہمارے ابا ہمیں خرگوش' چڑیا' شیر جانے کیا' کیا بنا کر دکھاتے تھے۔"

ہم کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ شاید بچپن کبھی نہیں مرتا۔

"یہ دیکھو!" وہ ہمیں مختلف شکلیں بنا بنا کر دیوار پر دکھانے لگے۔

"دیکھو! میں نے تمہیں پرانے بچپن کے دن یاد دلا دیے۔"

"خیر' اتنے پرانے بھی نہیں۔" ہم نے اترا کر کہا۔ پھر اچانک خیال آیا۔ "آپ تھے کہاں اتنی دیر سے؟"

"اوطاق میں تاج کے ساتھ بیٹھا تھا۔"

"تاج! من تیرا حاجی بگو یم تو میرا حاجی بگو۔"

"پھر پتا نہیں کون سے جنتر منتر پڑھنا شروع ہو گئی ہو' سو جاؤ ماٹھ کر کے۔"

✲ ✲ ✲

مرک اور ہم کاغذ قلم لیے ساتھ بیٹھے تھے' جب وہ گھر میں داخل ہوئے۔

"یہ کیا تم دونوں یاجوج ماجوج کی طرح بیٹھی رہتی ہو۔"

"یہ ہماری آپس کی بات ہے۔" ہم نے مسکرا کر کہا۔

"بھا!... وہ میں نا بھاجائی سے قومی نغمہ "اے روح قائد" لکھوا رہی ہوں۔ ہمارے اسکول میں پروگرام ہے۔ بھاجائی نے ہی مجھے اس نغمے کا مشورہ دیا۔"

"میں تو سدا ئیں کہتا ہوں' اس کے اندھ پوڑھی (بوڑھی) روح ہے۔"

"تم لکھو مرک!" ہم نے انہیں گھورتے ہوئے کہا۔

"اے روح قائد! آج کے دن ہم تجھ سے وعدہ کرتے ہیں۔"

"ہاں! صرف آج کے دن' باقی 364 دن

وعدے توڑنے کے لیے۔ وعدہ کوئی قرآن و حدیث تو نہیں۔" وہ پھر بیچ میں بولے۔

"دریاؤں کی تہہ میں اتریں گے...
رخشندہ گوہر لائیں گے۔"

"اڑے یہ رخشندہ گوہر تو ہی تمہاری دوست ' ادی رخشی! وہ کیا بوڑ (سیلاب) میں ڈوب گئی ہیں؟ ہاں! ہم کیا دریا میں اتریں گے۔ دریا تو خود ہمارے گھروں میں آ گئے۔"

افلاک کی حد کو چھو لیں گے
تارے بھی زمین پر لائیں گے

"جن کو ہم نے خود آسمان کا تارا بنایا ' انہوں نے عزت تار تار کردی۔" اب کے ہماری ذہنی رو بھٹکی۔ (سلمان ' آصف ' عامر نے وطن کی آبرو بیچی اور کیا سستی بیچی۔)

کردیں گے عمل سے بھی ثابت
باتیں تو ہمیشہ کرتے ہیں

اس بار ہماری آواز بہت مدھم تھی اور وہ جو ٹی وی آن کرچکے تھے ' زور زور سے ہنسنے لگے۔

"باتیں ہی تو کرتے ہیں آج تک اور اب تو زیادہ باتیں کرتے ہیں۔ دن رات باتیں ' کھری باتیں ' آپس

"اوہو! مچھلی پر یاد آیا ' یہ شولا تو یہیں رہ گیا۔ میں تمہارے لیے بنا کر لائی تھی۔"

"پھر وہی شعلہ؟" ہم ٹھٹکے۔ کھول کر دیکھا تو کچھ مختلف قسم کے دال چاول تھے۔

"بھاجائی! یہ یہاں کی خاص ڈش ہے شولا ' خاص موقعوں پر بنائی جاتی ہے۔" مرک نے بتایا۔

"اوہو بھئی! ہم اتنی دیر سے کیا سمجھے جا رہے ہیں۔ کیا کیا نام ہیں کھانوں کے ' کل کسی ڈش کا نام ایٹم بم نہ رکھ دینا۔"

"لیکن بھاجائی! یہ تو بتادیں کہ ہماری حکمرانی سے لے کر فلموں تک سارے سنہری دور گزر کیوں گئے؟؟"

✲ ✲ ✲

رات کی محفل جمی ہوئی تھی۔ ہم سب مزے سے لماں کی بنی ہوئی پنجیری اڑا رہے تھے اور خوب کچہری ہو رہی تھی۔

"اے بدھ نہ سہی۔ (اے سنو تو سہی)" وڈی ادی نے کہا۔

"جی ادی۔" ہم نے پوچھا۔

"مرک نے بتایا تھا کہ تم افسانے بھی لکھتی ہو۔"

"اف! کیا ذکر چھیڑ دیا۔"

تذکرہ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز

"جی... وہ۔" مزے دار پنجیری حلق میں اٹک گئی۔

"پھر تو تم دوسری رائٹرز کو بھی جانتی ہوگی ' دوستی ہوگی تمہاری۔" انہوں نے اشتیاق سے کہا۔

"جی... کسی کسی کو۔" مکمل انکار کرنا ہمیں اچھا نہ لگا۔ کہنے میں کیا تھا۔

"ہاں تو بس ' رفعت آپا کو میرا مسیج دے دو۔" وہ پرجوش ہو گئیں۔

"ان سے کہہ دو کہ اگر عبد کی شادی فاروق ہی سے کرنی ہے تو شہریار بے چارے کو حمیرا کے ساتھ سیٹ کردیں۔"

"اور اب تو فوزیہ بھی کافی سدھر گئی ہے ' تو رضا اس کے لیے مناسب رہے گا اور اگر ثریا کامیاں بھی گرفتار ہو جائے تو وہ عثمان کے ساتھ شادی کرسکتی ہے اور..."

"جی ابھی اور بھی ہے؟" ہم حق دق ان کے مشورے سنے جا رہے تھے۔

"ہاں ہاں! جمال تنویر سے شادی کرلے سب ہنسی خوشی رہنے لگیں گے۔"

ہم بھونچکا رہ گئے ' ان کے یوں ٹکڑے ملا کر تصویر مکمل کرنے پر۔ ایڈیٹر صاحبہ کا تعارف وڈی ادی سے کروا دیتے تو وہ یقیناً "اپنا اگلا ناول ان سے لکھواتیں۔ ابھی ہم اس شادی خانہ آبادی کو ہضم کرنے کی کوشش کرہی رہے تھے تو ننڈی (چھوٹی) ادی بولیں۔

"میری طرف سے فرحت اشتیاق کو کہہ دو کہ

"جب متاع جاں ہے تو" کا ڈرامہ بنے تو پلیز اس میں عالی کو زندہ رکھیں۔"

"لیکن یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ کہانی کی بنیاد ہی...."

"کیوں نہیں ہوسکتا ' ہوسکتا ہے۔ جس کے مرنے کی اطلاع ملی ہو وہ عبادنہ ہو ' ڈیڈ باڈی شناخت نہ ہوئی ہو اور عالی کہیں زندہ ہو۔"

"ادی! آپ بھول رہی ہیں ' یہ ڈرامہ مہرین جبار بنا رہی ہیں ' ایکتا کپور نہیں۔" ہم نے وضاحت کی۔

"تو تو کیا ہوا ' اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

"ویسے عالیہ بخاری نے گیتی اور سالار کی شادی کروا کے بڑا اچھا کیا۔" وڈی ادی کی سوئی اب تک شادی پر اٹکی ہوئی تھی۔

اب کوئی ان سے پوچھے ' مصنفات کے ساتھ ہمارے اتنے تعلقات ہوتے تو سب سے پہلے ان کو نہ لکھنے کا مشورہ دیتے ' کیونکہ یہ سب لکھنا بند کردیتیں تو ہمارا افسانہ بھی شاید شائع ہو جاتا۔ ہماری قسمت کیا مستقل مزاج ہے کہ بچپن سے لے کر آج تک مزید محنت کا ہی درس ملتا ہے۔ بچپن میں "ہمدرد نونہال" اور ماہنامہ "ٹوٹ بٹوٹ" میں ہر ماہ ہمارا نام اس صفحے پر شامل ہوتا رہا جس کی سرخی "مزید محنت کی ضرورت ہے" ہوتی تھی۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ خواتین ڈائجسٹ میں ایسا کوئی صفحہ موجود نہیں ' سو اور یہ کار خیر ایڈیٹر صاحبہ صرف فون پر ہی انجام دے دیا کرتی تھیں۔

ہم ان سے کہنا چاہتے تھے کہ اگر ادیب بننے کے لیے اتنی محنت کی ضرورت ہوتی تو سڑک پر کام کرنے والے مزدور ' گھروں میں کام کرنے والی ماسیاں اور پرائیویٹ اسکولز کی استانیاں ادب میں نوبل پرائز لے لیتیں۔ یہاں تو جس کے پاس کرنے کو کچھ اور نہ ہو وہ ادیب بن جاتا ہے ' ادیب بننے کے لیے تو ویلا (فارغ) ہونا شرط ہے۔

کسی کو جیل بھیج کر دیکھ لیں ' چاہے چٹا ان پڑھ ہو اور کبھی "بچوں کی دنیا" بھی نہ پڑھا ہو تو وہاں سے تعلیم یافتہ اور صاحب کتاب ہو کر نکلتا ہے۔ پتا نہیں محنت سے ان کی کیا مراد تھی۔ ایک ہی چیز کو بار بار لکھ کر کاغذات جیسی قیمتی نعمت ضائع کرنے کی کیا ضرورت ہے ' جبکہ ہم پہلے ہی ہر دوسری چیز کی طرح جنگلات کی کمی کا شکار بھی ہیں۔ فرماتی ہیں کہ مشتاق احمد یوسفی ایک مضمون کو ستر بار لکھتے ہیں۔ اگر یوسفی صاحب کو اس عمر میں بھی خوش خطی کی مشقیں کرنے کا اتنا شوق ہے تو اس میں ہمارا کیا قصور ہے۔ چلیے! اگر آپ کو 70 کا ہندسہ اتنا ہی عزیز ہے تو ہم اپنے افسانے کی 70 کاپیاں فوٹو اسٹیٹ کروا کر بھیج دیتے ہیں۔ پھر کہتی ہیں کہ کہانی کمزور ہے۔ ارے! ہماری کہانی ہے یا ملک کی معیشت۔

آپ تو بس چاہتی ہیں کہ ہمیشہ وڈی ادی کی پسند کی کہانیاں لکھی جائیں ' جس میں کسی کی کسی نہ کسی طرح کسی سے شادی ہو جائے اور عورت دن رات سب کی خدمتیں کرتی رہے۔ شوہر سے مار کھا کر بھی اس کی خطائیں معاف کردے۔ بدتمیز نند کو اپنے جہیز کا سامان دے دے۔ نالائق دیور کی ماں بن کر دکھادے۔ بیمار دادی کے لیے سوپ ' سسر کے لیے کھچڑی اور

سانس کے لیے جوس بنا کر دے اور علی الصباح تمام اہل خانہ کے لیے رات کے بچے ہوئے قیمے کے پراٹھے بنائے۔ (اور یہ قیمہ بچایا کیسے جائے‘ یہ بھی اسی کا درد سر ہے۔)

"اماں!" بابا نے ہمیں بلایا۔

"جی بابا!" ہم ان کی طرف متوجہ ہوئے۔ وہ افسردہ اور شکستہ سے نظر آئے۔ انہوں نے تھک کر ٹی وی کی آواز کم کر دی تھی۔ ٹی وی پر بولنے والوں نے تو تھکنا نہیں تھا۔ "اماں! اگر واقعی کسی کے ساتھ رابطہ ہے ہتم میل وغیرہ کرتی ہو تو کسی میڈیا پرسن کو میرا پیغام پہنچا دو۔

"میرے ملک میں اتنی مایوسی نہ پھیلائیں۔"

"ہر موضوع خاص طور پر اسلام اور پاکستان کے خلاف موضوعات پر پروگرام نہ کریں اور روشن خیالی کے نام پر ہر حد پار کرنے والوں کو اتنی کوریج نہ دیں۔ کیوں بلاتے ہیں ایسے لوگوں کو روزانہ؟ ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے‘ لیکن روز‘ روز دیکھ کر لگتا ہے کہ یہ بہت زیادہ ہیں۔ "میڈیا لانچ" کی اصطلاح اب ہم جیسے بڈھوں کی بھی سمجھ میں بھی آتی ہے۔"

ہم چپ سے ہو گئے۔ دراصل یہ موضوع پچھلے دنوں ہم سب کے درمیان بڑا ڈسکس ہو تا رہا تھا۔

"قائداعظم ڈے کے پروگرام اور روٹین کے پروگرام۔"

ہم کس طرف جا رہے تھے؟

ہمارے پاس کرنے کو کیا صرف متنازع باتیں رہ گئی تھیں۔

قائداعظم کی موت کیسے واقع ہوئی؟

وہ سیکولر تھے؟

شاید ہی دنیا کے کسی میڈیا میں لوگ ٹی وی پر بیٹھ کر ملک کے خلاف اتنا بولتے ہوں جتنا ہمارے ملک میں بولا جاتا ہے۔ میڈیا کو آزادی ملی‘ لیکن کیا اس کی قیمت ملک کی عزت رکھی گئی؟

یہاں کھلے عام کوئی بھی کہہ دیتا ہے کہ ہمیں اسلام کے اندھیرے سے نکل آنا چاہیے۔

جس کا جی چاہتا ہے وہ پاکستان کے خاتمے (خدانخواستہ) کی تاریخ طے کر دیتا ہے۔

یہاں بے حیثیت‘ بے عہدہ‘ بے چہرہ‘ بے بنیاد لوگوں کو کھلا چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ چوراہے میں اسلام اور پاکستان کی دھجیاں اڑا دیں۔

یہاں out of no where کسی کو اپنا بیسٹ باؤلنگ اٹیک کہہ کر بھیج دیا جاتا ہے کہ وہ دو قومی نظریے کو تار‘ تار کر دے اور اسلامی جمہوریہ پاکستان کے چینل کے پروگرام میں ٹیبل پر ہاتھ مار کر دعوا کرے کہ.....

"ہم پاکستان کو سیکولر بنا کر رہیں گے۔"

Two nation theory is rubbish

(دو قومی نظریہ بکواس ہے)

کون ہیں یہ لوگ؟

ہمیں اس رات والا واقعہ یاد آگیا۔ جب موبائل کی روشنی کے آگے ان کے سائے نے دیوار پر ایک خوف ناک شکل اختیار کر لی تھی۔

کیا یہ شکلیں بھی اتنی ہی خوف ناک تھیں یا میڈیا ان پر روشنی اتنے قریب سے ڈال رہا تھا کہ یہ اپنے قد سے بڑی نظر آتی تھیں۔

اور وہ ہاتھ؟

ہاتھ تو ایک ہی ہوتا ہے جو دیوار پر مختلف شکلیں بنا کر ڈراتا ہے۔ اب بھی کوئی ہاتھ دیوار پر خوف ناک شکلیں بنا کر ڈراتا ہے اور عوام کو مجبور کرتا ہے کہ اسے دیوار کا لکھا سمجھا جائے۔ دلوں میں وسوسے ڈالنے والوں سے تو پناہ مانگی گئی ہے۔

کون ہیں یہ؟

حقیقت‘ مصنوعی طور پر بڑے نظر آنے والے سائے‘ ہیولے

یا محض بُتانِ وہم و گماں!

☼

نبیلہ عزیز

ایک ناگوار سی بو بیڈ روم میں داخل ہوتے ہی اس کے نتھنوں سے ٹکرائی تھی اور اس کے قدم وہیں دہلیز پہ ہی ٹھٹک کر رک گئے تھے۔ اسے یوں لگا جیسے اس کا دم گھٹ رہا ہو، اگر وہ پانچ منٹ اور وہیں کھڑی رہتی تو یقیناً چکرا کے گر جاتی، اسی لیے وہ یکدم پلٹی اور دروازہ کھول کر باہر جانے کو لپکی تھی۔

"رکو.....!" افگن افروز کی بھاری گمبھیر اور بوجھل آواز اس کے قدموں کی زنجیر بن گئی تھی۔ وہ اس کی آواز پہ دروازے میں کسی بت کی مانند کھڑی رہ گئی۔ اس کا دایاں ہاتھ دروازے کے ہینڈل پہ مضبوطی سے جما ہوا تھا، جیسے اسے چھوڑ کر واپس پلٹنے کا کوئی ارادہ نہ ہو۔

"ادھر آؤ....." اس نے سر کے اشارے سے اسے قریب آنے کو کہا تھا، مگر وہ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی آگے یا پیچھے نہیں ہلی۔

"میں کہہ رہا ہوں، ادھر آؤ، میرے پاس۔" وہ غصے سے دانت پیس کر بولا تھا لیکن وہ پھر بھی ٹس سے مس نہ ہوئی۔

"میں کیا بکواس کر رہا ہوں؟ تمہیں سنائی نہیں دے رہا.....؟"

اس نے یکدم شیر کی طرح دھاڑتے ہوئے ہاتھ میں پکڑا شیشے کا گلاس زور سے دروازے کی سمت دے

مکمل ناول

مارا تھا' وہ یکدم ایک سائیڈ پہ ہوئی تھی اور گلاس دروازے سے ٹکرا کر چکنا چور ہو گیا تھا۔ گلاس میں موجود مشروب کے چھینٹے اس کے پیروں پہ اور کپڑوں پہ گرے تھے' وہ ٹھٹک کر دور ہٹ گئی.....

"دروازہ بند کرکے ادھر آؤ' میرے سامنے۔" اس نے پھر سے آرڈر دیا..... اب کی بار وہ اس کے خطرناک تیوروں سے کافی اچھی طرح باخبر ہو چکی تھی جب ہی دروازہ لاک کرکے اپنی سادہ اور نفیس سی چپل کے نیچے چھوٹے چھوٹے کانچ خزاں رسیدہ پتوں کی طرح روندتی ہوئی' اس کے سامنے دفعہ تین سو دو کے مجرم کی طرح آن کھڑی ہوئی' اسے پتا تھا کہ اب اس کی رہائی ناممکن ہو چکی ہے.....!

"واپس کیوں بھاگ رہی تھیں.....؟" اس نے اسے سرتاپا سرد نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا تھا لیکن جواب ندارد!

"گونگی اور بہری کیوں ہو گئی ہو.....؟" اسے ایک بار پھر تاؤ آیا تو زور سے اس کی کلائی پکڑ کر جھٹکے سے کھینچی اور وہ سلونے پتھر کی مورتی اس کے اوپر ہی آن گری گرتے ہی اس کی حس و حرکت بیدار ہو گئی۔ اس نے بوکھلا کر پیچھے ہٹنا چاہا تھا لیکن اس کی کمر جکڑی جا چکی تھی۔ اس نے اس کا حصار توڑ کے نکلنا چاہا لیکن یہ بھول گئی کہ گرفت افگن افروز جیسے طاقتور مرد کی ہے.....!

"میں نے تم سے کہا تھا' ہر روز تاوان بھرو گی تم' اور ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں.....؟ تم ابھی سے بھاگنے لگی ہو.....؟ ابھی تو پوری زندگی پڑی ہے' کیسے گزرے گی یہ زندگی؟" وہ اس کا دوپٹہ اس کے گلے سے نکال کر دور پھینک چکا تھا اور وہ اس کی بات اور اس کے انداز پہ بپھر گئی تھی۔

"میں ہر تاوان بھرنے کے لیے تیار ہوں' بشرطیکہ آپ ہوش و حواس میں ہوں۔ میرے کسی ناکردہ گناہ کی سزا دینی ہے تو مجھ سے نظر ملا کر سزا دیں' آنکھوں پہ نشے کی پٹی چڑھا کر نہیں....." وہ بھی جواباً" اسی کے لب و لہجے میں بولی تھی جس پہ افگن افروز کا ہاتھ اٹھا اور پانچوں انگلیاں اس کے رخسار پہ ثبت ہو گئیں۔

"اور میں نے تم سے یہ بھی کہا تھا کہ کبھی بیویوں والے زعم میں آ کر مجھ سے بات مت کرنا' بات کرنی ہے تو اپنی اوقات میں رہ کر بات کرنا' ورنہ سارے زعم توڑ کر رکھ دوں گا۔"

اس نے غرا کر اسے یاد دلایا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے تھے۔

"رونا مت' نفرت ہے مجھے آنسوؤں سے"۔ ہر بات پہ پابندی تھی' وہ گھٹ گھٹ کے رونا چاہتی' پھر بھی رو نہیں سکتی تھی۔

"جاؤ' اپنا حلیہ درست کرکے آؤ۔" اس نے سختی سے کہتے ہوئے یکدم اسے بازوؤں کے تنگ گھیرے سے آزاد کر دیا اور وہ تیزی سے اس کے سینے سے الگ ہوئی تھی یوں جیسے کسی اذیت ناک اور ناقابل برداشت اسیری سے رہائی ملی ہو۔

"میں انتظار کر رہا ہوں' جلدی آؤ۔" جانے سے پہلے ہی جلدی آنے کی تاکید کی جا رہی تھی۔ وہ دوپٹہ اٹھا کر تیزی سے باتھ روم میں گھس گئی۔ باتھ روم میں گھستے ہی اس کے سینے میں دبی سسکیوں اور آنکھ کے کناروں پہ ٹھہرے اشکوں کو راستہ مل گیا تھا وہ دیوار گیر آئینہ کے سامنے کھڑی واش بیسن پہ دونوں ہاتھ جما کر جھکی ہوئی ہچکیوں سے رو رہی تھی۔

افگن افروز نجانے کس جنم کا بدلہ لے رہا تھا اس سے..... وہ بے بسی سے جتنا سوچتی اتنا ہی رونا آتا۔ آخر وہ جاتی تو کہاں جاتی.....؟ کرتی تو کیا کرتی؟ ان دونوں نے اک دوسرے کو جو سمجھا تھا' وہ غلط تھا.....!

☼ ☼ ☼

فجر کی پہلی اذان پہ ہی اس کی آنکھ کھل گئی تھی.....!

اس نے ذرا سی کروٹ بدل کر گردن موڑ کر بیڈ کے بائیں طرف دیکھا۔ وہ تکیے پہ سر رکھے اوندھا لیٹا بے حد گہری اور بے سدھ سو رہا تھا۔ اس وقت اس کے چہرے پہ اک بے خبری اور اطمینان کا عالم تھا۔ جس

روز اسے چوٹ لگتی تھی اس روز وہ پہروں تڑپتا تھا اور پہروں سلگتا تھا' رات آنکھوں میں کٹتی تھی اور آنکھیں عذاب میں کٹتی تھیں اور یہی عذاب مائدہ کو اپنی ذات پہ جھیلنا پڑتا تھا۔ اپنی روح کچلنا پڑتی تھی' اپنی نسوانی انا کو مجروح کرنا پڑتا تھا' تب جا کے وہ پرسکون ہو کر سکون کی نیند سوتا تھا۔ کل رات بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ وہ اسے اپنی وحشت کا نشانہ بنا کے سکون سے سو رہا تھا اور وہ پھر بھی صبر کیے اپنی قسمت پہ شاکر تھی۔ نماز پڑھنے کے لیے اپنے بال سمیٹتی ہوئی اٹھی تو نجانے کیوں' اپنے اوپر سے کمبل ہٹاتے ہوئے اس کی نظر افگن افروز پہ ٹھہر سی گئی تھی۔

کتنا خوب صورت تھا وہ' مردانہ وجاہتوں سے مالا مال' شاندار شخصیت کا مالک' ایک مکمل مرد.....! لیکن اس مکمل مرد کی ذات ادھوری تھی' ہر بات ادھوری تھی' اس کی ہر رات ادھوری تھی اور یہی ادھورا پن اس کا ایک زخم' ایک ناسور بن گیا تھا جس کی تکلیف افگن افروز کو کم اور مائدہ کو زیادہ ہوتی تھی' بالکل ایسے جیسے اس وقت ہو رہی تھی اور اسی تکلیف کے احساس تلے' وہ اسے ہی دیکھے جا رہی تھی' جب افگن افروز نے کروٹ بدلی اور اس کا ہاتھ مائدہ کی گود میں آ پڑا تھا۔ وہ یکدم گھبرا گئی تھی کیونکہ افگن افروز کا اس وقت نیند سے بیدار ہونا بھی عذاب سے کم نہیں تھا۔

اس کے بیدار ہونے سے یقیناً" مائدہ کی نماز قضا ہو جاتی' جو اسے کسی بھی طور منظور نہیں تھا' اسی لیے وہ اس کے کروٹ بدلنے پہ دم سادھ گئی' پھر اس کی گہری نیند کا اطمینان کر لینے کے بعد احتیاط سے اس کا ہاتھ اپنی گود سے ہٹایا اور خود آہستگی سے بیڈ سے اتر گئی۔ دوبارہ اس پہ کمبل ڈال کر خود باتھ روم میں چلی آئی..... پندرہ منٹ بعد نکلی اور نماز پڑھنے کے لیے باہر چلی گئی' بیڈ روم میں پھیلی ——— ناگوار بو اور لوازمات کی وجہ سے اس کا بیڈ روم میں نماز پڑھنے کو دل نہیں چاہا تھا اسی لیے جائے نماز اٹھا کر نیچے آ گئی تھی۔

ڈرائنگ روم میں جائے نماز بچھا کر نماز ادا کی' تسبیح پڑھی اور دعا مانگنے کے بعد دادی بی کے کمرے کا رخ کیا۔

"اسلام علیکم دادی بی! صبح بخیر۔" اس نے اندر آتے ہی انہیں سلام کیا وہ بھی جاگ رہی تھیں اور اسی کے انتظار میں تھیں کہ کب وہ آئے اور انہیں وضو کروائے' کیونکہ وہ خود سے نہ تو اٹھ سکتی تھیں اور نہ ہی چل پھر سکتی تھیں۔

"وعلیکم السلام بیٹا! جیتی رہو' سدا سہاگن رہو۔" انہوں نے شفقت سے اس کے سر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے دعا دی تھی۔

"آمین....." وہ ان کی دعا سمیٹتی ہوئی جھکی اور انہیں سہارا دے کر وہیل چیئر پہ بٹھانے لگی۔

"جب سے تم اس گھر میں آئی ہو' میری کوئی بھی نماز قضا نہیں ہوئی' ورنہ تمہارے آنے سے پہلے اکثر

فجر کی نماز قضا ہو جاتی تھی۔"

وہ ان کی وہیل چیئر دھکیلتی ہوئی باتھ روم کی سمت لے جارہی تھی، جب دادی بی نے اس کی خدمت گزاری پہ تعریف کی تھی بلکہ احسان مانا تھا اس کا.....!

"چلیں شکر ہے میرے آنے کا کوئی تو فائدہ ہوا۔ میرے آنے سے یہ نیک کام ہوا ہے تو مجھے اور کیا چاہیے بھلا.....؟" وہ ہلکے سے مسکرائی تھی۔

"ان شاء اللہ! اللہ تمہیں اجر دے گا۔" دادی بی ہر وقت اسے دعائیں ہی دیتی رہتی تھیں اور وہ ان کی اتنی محبت، اپنائیت اور اتنے خلوص پہ ہمیشہ چپ ہو کے رہ جاتی تھی کیونکہ وہ اپنے آپ کو اس قابل نہیں سمجھتی تھی لیکن پھر بھی اس قابل بنادی گئی تھی.....

"افگن رات کو کب آیا تھا؟" دادی بی نے پوچھا۔

"جلدی آگئے تھے۔" اس نے آہستگی سے جواب دیا۔

"تو پھر مجھ سے ملنے کیوں نہیں آیا؟" انہیں اچھنبا ہوا۔

"حواسوں میں نہیں تھے۔" وہ مختصر سا کہہ کے رخ موڑ گئی تھی اور دادی بی اس کے جواب کا مفہوم جان گئیں۔

پھر جب تک انہوں نے نماز اور مائدہ نے سپارہ پڑھا تھا ان کے درمیان خاموشی ہی چھائی رہی لیکن جیسے ہی وہ ان کی وہیل چیئر دھکیلتی ہوئی باہر لان میں لے کر آئی، ان کی زبان پہ رکے الفاظ بھی باہر نکلنے لگے تھے۔

"اس نے تمہیں کچھ کہا تو نہیں؟" پہلا تشویش بھرا سوال آیا تھا۔

"کہہ بھی لیں تو کیا فرق پڑتا ہے؟" اس نے سر جھٹکا۔

"فرق پڑتا ہے بیٹا! تم اس کی بیوی ہو، اسے تمہارا خیال کرنا چاہیے۔" دادی بی کو مائدہ اور افگن افروز کی طرف سے پریشانی ہورہی تھی۔

"خیال تو وہ تب کریں گے، جب وہ ہوش میں ہوں گے۔ اور جب وہ ہوش میں ہوتے ہیں۔ تب وہ گھر پہ نہیں ہوتے۔" وہ ذرا سی تلخی سے بولی تھی۔

"میں نے تو سوچا تھا کہ شادی کے بعد بدل جائے گا وہ لیکن ....." دادی بی اپنی بات ادھوری چھوڑتے ہوئے چپ ہو گئیں۔

"یہ شادی میری اور آپ کی مرضی سے ہوئی ہے۔ اگر ان کی مرضی سے ہوتی تو شاید وہ بدل ہی جاتے۔" وہ ٹھیک کہہ رہی تھی اس لیے دادی بی جواباً کچھ نہ کہہ سکیں۔

"تم نے پوچھا نہیں کہ اس نے ڈرنک کیوں کی.....؟" کافی دیر بعد انہوں نے دوبارہ سوال کیا۔

"وجہ معلوم ہو تو پوچھنے کا فائدہ؟" اس نے استہزائیہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

"لیکن مائدہ! میں تمہیں پہلے بھی سمجھا چکی ہوں کہ اسے اس کے حال پہ مت چھوڑو انٹرفیر کرو اس کی ذات میں۔ حق جتاؤ، بیویوں والے انداز اپناؤ، اسے بتاؤ کہ تم اس کی ہو اور وہ تمہارا ہے....." دادی بی اسے سمجھا رہی تھیں۔

"ہونہہ! میرے بتانے سے میں ان کی اور وہ میرے نہیں ہو جائیں گے، حقیقت کیا ہے یہ آپ بھی جانتی ہیں۔" مائدہ نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے ان کی ڈھلکی ہوئی گرم چادر اٹھا کر ان کے گرد پھیلادی۔

"لیکن بیٹا! یہ زندگی ہے، جیسے یہ گزارنا چاہتا ہے ویسے زندگی نہیں گزرتی، وہ تو پاگل....."

"پلیز دادی بی! میں آپ کے لیے چائے لے کر آتی ہوں، جب تک آپ یہ اخبار پڑھیں۔" مائدہ نے ان کی بات کاٹتے ہوئے ان کی طرف اخبار بڑھادیا۔

سورج کی کرنیں سنہرا سنگھار کیے دھوپ کے گھنگھرو باندھے ہر صحن، ہر آنگن میں دن بھر رقص کرنے کے لیے اتر چکی تھیں اور سرد موسم میں ان کے اس رقص سے جو لوگ مسرور ہو رہے تھے، ان میں دادی بی بھی شامل تھیں داخلی دروازے کے سامنے وہ وہیل چیئر پہ بیٹھی اخبار پڑھ رہی تھیں، جب مائدہ ان کے لیے چائے بنا کر لائی۔

"تھینک یو بیٹا.....!" انہوں نے نرمی سے کہتے ہوئے کپ اس کے ہاتھ سے تھام لیا تھا۔

"آپ بھی کمال کرتی ہیں دادی بی! یہ تو میرا فرض بنتا ہے، اس میں تھینکس کی کیا ضرورت ہے..... بلکہ مجھے تو آپ کا کام کر کے خوشی محسوس ہوتی ہے۔" وہ ایک کرسی کھینچ کر خود بھی ان کے پاس ہی بیٹھ گئی تھی۔

"بیٹا! آج کل کوئی بھی اپنا فرض اور اپنا حق نہیں مانتا، بڑی جلدی آنکھیں پھیر لیتے ہیں سب۔ ایسے حالات میں اگر کوئی پھر بھی اپنا فرض پورا کرتا ہے تو اس کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔" وہ بھی جواباً سنجیدگی سے بولی تھیں۔

مائدہ کچن میں آگئی، اسے افگن کے لیے ناشتا تیار کرنا تھا۔ دادی بی کے اور افگن افروز کے کام وہ خود اپنے ہاتھوں سے سر انجام دیتی تھی۔ عیشاں سے دوسرے کام کرواتی تھی۔

☼ ☼ ☼

کافی دیر ہو گئی تھی۔ وہ ابھی تک نیچے نہیں آیا تھا، اس لیے مائدہ کو خود ہی اوپر آنا پڑا۔ وہ دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوئی واش روم سے پانی گرنے کی آواز بتا رہی تھی کہ وہ شاور لے رہا ہے۔ وہ خاموشی سے آگے بڑھ کے کمبل تہہ کر کے رکھنے لگی بیڈ پہ جھکی وہ بیڈ شیٹ کی شکنیں دور کر رہی تھی، جب واش روم کا دروازہ کھلا اور وہ تولیے سے بال رگڑتا ہوا باہر آیا۔

"گڈ مارننگ....." وہ مائدہ کی موجودگی سے بے خبر ڈریسنگ ٹیبل کی سمت بڑھ رہا تھا، اس کی آواز پہ چونک کر پلٹا تھا۔ وہ پیازی رنگ کے جارجٹ کے نفیس سی کڑھائی والے شلوار سوٹ میں ملبوس نکھری ستھری سی کھڑی ہاتھ میں پکڑا کشن بیڈ پہ رکھے دو تکیوں کے درمیان رکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پہ رات کے قصے کا شائبہ تک نہیں تھا۔ اس کا چہرا بے تاثر اور انداز بے نیاز سا لگ رہا تھا۔

افگن افروز کی نظریں اس پہ ٹھہر سی گئیں۔ نم آلود بالوں سے اس کی پوری کمر ڈھکی ہوئی تھی۔ اس کے بال بے حد گھنے اور سیاہ تھے۔

"اب کیسی طبیعت ہے آپ کی.....؟" وہ گلاس اور خالی مشروب کی بوتلیں ٹرے میں رکھتے ہوئے بولی تو افگن افروز چونک گیا۔

"کیا ہوا ہے میری طبیعت کو..... میں تو بالکل ٹھیک ہوں؟" وہ بے ساختہ حیرانی سے بولا۔

"ابھی ٹھیک ہیں ناں، رات کو ٹھیک نہیں تھے۔ رات کو تو آپ کی طبیعت خاصی خراب تھی۔"

"رات کو.....؟" وہ اس کی بات کا مطلب سمجھ کے لب بھینچ گیا۔

"جی رات کی ہی بات کر رہی ہوں۔" وہ زور دے کر بولی۔

"تم کہنا کیا چاہتی ہو.....؟" وہ اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔

"جو آپ سمجھ نہیں پارہے۔" وہ استہزائیہ ہنسی اور اسی ہنسی پہ غصے میں آکر افگن افروز نے اس کا بازو دبوچ لیا۔

"میں کیا سمجھتا ہوں اور کیا نہیں..... تمہیں اس سے کوئی مطلب نہیں ہونا چاہیے۔ سمجھیں تم؟" اس نے مائدہ کے بازو کو جھنجھوڑا۔

"کیوں مطلب نہیں ہونا چاہیے؟ میں آپ کی بیوی ہوں، ملازمہ نہیں....."

"میں بیوی کو ملازمہ سے زیادہ کا درجہ نہیں دیتا۔" وہ حقارت سے بولا تھا۔

"تو پھر شادی کیوں کی تھی؟" مائدہ جانتی بھی تھی پھر بھی سوال کر بیٹھی۔

"کیونکہ ایک ملازمہ کی ضرورت تھی مجھے، میرے گھر کو، میری دادی بی کو، اس لیے ضرورت کے لیے کرنا پڑی۔"

"لیکن یہ ضرورتیں تو کوئی اور ملازمہ بھی پوری کر سکتی تھی.....!"

"ہاں کر سکتی تھی لیکن صرف گھر کی ضرورتیں۔ میری ضرورتیں وہی ملازمہ پوری کر سکتی تھی جس کے ساتھ "بیوی" کا دم چھلا ہوتا۔"

”یہ کام تو عیشاں بھی کر سکتی تھی‘ اسے بھی آپ ”بیوی“ کا دم چھلا پہنا سکتے تھے؟“

”نہیں! اسے نہیں پہنا سکتا تھا کیونکہ وہ ایک سادہ سی‘ نیند کی دیوانی اور اپنی ذات میں مست رہنے والی لڑکی ہے۔ تمہاری طرح اس نے کبھی افگن افروز پہ اور اس کے گھر پہ بری نظر نہیں ڈالی‘ کبھی حسرت سے نہیں دیکھا‘ میں کیا ہوں‘ اور کیا نہیں ہوں..... اسے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ اپنے کام سے کام رکھتی ہے‘ بدنیتی نہیں دکھائی۔“

افگن افروز نے اس کی ذات کے پرخچے اڑا دیے تھے۔ مائدہ کے چہرے کی رنگت متغیر ہو گئی۔ اس نے پل بھر میں اس کا سارا زعم‘ سارا غرور توڑ کے رکھ دیا تھا۔ وہ جواباً ”کچھ کہنے کے قابل — نہیں رہی۔

”تم کیا سمجھتی ہو کہ میں انجان ہوں..... کیا میں نہیں جانتا کہ تم نے مجھ سے شادی کیوں کی.....؟“

اس نے مائدہ کی تحیر سے پھیلی ہوئی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے طنزیہ انداز میں پوچھا تھا۔

”آپ واقعی نہیں جانتے کہ میں نے آپ سے شادی کیوں کی..... اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ مجھے دولت کی ہوس تھی اور میں یہ سب آسائشات پانا چاہتی تھی تو یہی سہی‘ مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا مجھے آپ کا نام مل گیا میرے لیے یہی کافی ہے۔“

مائدہ آہستگی سے کہتی ہوئی رخ موڑ گئی تھی‘ مبادا وہ اس کی آنکھوں میں آنسو نہ دیکھ لے۔

”تو پھر جھگڑا کس بات کا ہے؟ تم جو چاہتی تھیں‘ وہ مل گیا‘ وہ کافی ہے تو پھر خوش رہو‘ میرے معاملات میں انٹرفیر کیوں کرتی ہو؟“

”میں نے آپ کے معاملات میں انٹرفیر نہیں کیا‘ صرف آپ کی طبیعت پوچھی ہے۔“ مائدہ کا لہجہ بھیگ رہا تھا۔

”مت پوچھو میری طبیعت‘ مجھ سے کچھ بھی مت پوچھو‘ کیونکہ میں بتاؤں گا ہی نہیں۔“

وہ سختی سے کہہ رہا تھا اور مائدہ لب بھینچ کر چپ ہو گئی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتا دروازے پہ دستک ہوئی تھی۔

”صاحب جی! بڑی بیگم صاحبہ نیچے بلا رہی ہیں‘ وہ ناشتے پہ آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔“ دستک کے بعد عیشاں کی آواز سنائی دی تھی‘ جسے دادی بی نے پیغام دے کر بھیجا تھا۔

مائدہ آنکھوں کے گوشے ہاتھ کی پشت سے رگڑتی ہوئی باہر نکل گئی تھی اور افگن افروز نے ہاتھ میں پکڑا ہوا تولیہ نفرت سے بیڈ پہ اچھال دیا اور ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آکھڑا ہوا۔

”ہونہہ! یہ عورتیں.....!“

☼ ☼ ☼

وہ صبح نو بجے آفس آیا تھا اور اس وقت شام کے چھ بج رہے تھے۔ وہ ابھی تک آفس میں ہی تھا۔ اسے مسلسل نو گھنٹے ہو چکے تھے کام کرتے ہوئے۔ لنچ بھی نہیں کیا تھا صرف چائے اور سگریٹوں پہ گزارا ہوتا رہا تھا اور ابھی بھی نجانے اور کتنا مصروف رہتا کہ اچانک اس کے ایک دوست کا فون آگیا۔

”ہیلو.....؟“ اس نے سگریٹ ایش ٹرے میں مسلتے ہوئے فون اٹھایا کی۔

”حسام بات کر رہا ہوں۔“

”جانتا ہوں‘ بولو؟“ اس نے لیپ ٹاپ کے کی بورڈ پہ انگلیاں چلاتے ہوئے پوچھا۔

”تم ولیمہ کے فنکشن میں نہیں آرہے کیا.....؟“

”نہیں۔“ اس نے دوٹوک لہجے میں انکار کر دیا۔

”ہوں! مجھے بھی تم سے یہی امید تھی بلکہ کئی لوگوں کو تم سے یہی امید تھی۔“ حسام نے طنز کیا تھا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا.....؟“ افگن افروز کی انگلیاں تھم گئیں۔

”کل شادی کے فنکشن میں تمہاری حالت بتا رہی تھی کہ تم ولیمہ اٹینڈ نہیں کرو گے‘ اس لیے کہہ رہا ہوں۔“

”کیوں؟ کیا ہوا تھا میری حالت کو..... ٹھیک ٹھاک ہی تو تھی.....“ وہ انجان بنتے ہوئے بولا۔

”تم جتنے ٹھیک ٹھاک ہو‘ یہ پورا شہر جانتا ہے۔ تمہارے چلے جانے کے بعد بھی چہ میگوئیاں ہوتی ہیں لیکن تمہیں کچھ خبر بھی ہو تب ناں..... تم تو دیوانے ہو گئے اور بس۔“

حسام کو کل رات سے غصہ تھا‘ اسی لیے اس کی کلاس لے رہا تھا۔ اسے افگن افروز کا یوں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے فنکشن سے چلے جانا بالکل اچھا نہیں لگا تھا۔

”میں اس محفل میں نہیں بیٹھ سکتا جہاں وہ بھی موجود ہو۔ مجھ سے برداشت کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ تمہیں اگر میرا اتنا ہی خیال تھا تو تم نے اسے انوائٹ کیوں کیا تھا؟“ افگن افروز کو حسام پہ غصہ آیا۔

”یار! ہم دونوں تو شروع سے دوست ہیں لیکن کچھ کاروباری دوست احباب بھی تو ہوتے ہیں ناں؟ انہیں بھی تو انوائٹ کرنا تھا اور تم جانتے ہو جمال پیرزادہ بھی میرے کاروباری دوست احباب میں شامل ہوتا ہے‘ مجھے نہ چاہتے ہوئے بھی اسے انویٹیشن کارڈ بھیجنا پڑا تھا‘ لیکن مجھے کیا پتا تھا کہ اس کے ساتھ.....“ حسام کہتے کہتے چپ ہو گیا تھا۔

”تمہیں پتا نہیں تھا لیکن اندازہ تو ہونا چاہیے تھا ناں.....؟“ افگن افروز بمشکل اپنا غصہ ضبط کر رہا تھا۔

”اندازہ تھا‘ اسی لیے تو تمہیں بھابھی کو ساتھ لانے کے لیے کہا تھا۔“ حسام بے ساختہ بول گیا اور افگن افروز اس کی بات پہ ٹھٹک گیا تھا۔

”کیوں‘ اسے کیوں ساتھ لے کر آتا.....؟“ افگن افروز کا لہجہ اور انداز تیکھا تھا۔

”تاکہ دوسروں کو بھی پتا چلتا کہ تم شادی کر چکے ہو اور اپنی میرڈ لائف میں بہت خوش ہو‘ تمہارے لیے کسی کا ہونا یا نہ ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔“

حسام کی بات پہ وہ حیران رہ گیا تھا۔ اس نے کتنی گہری اور کتنے کام کی بات کہی تھی‘ جو خود اس کی عقل میں آج تک نہیں آئی تھی۔

”دیکھو افگن.....! صرف جلنا ہی نہ سیکھو‘ جلانا بھی سیکھو‘ جلنا فن نہیں ہوتا‘ کسی کو جلانا فن ہوتا ہے اور تمہیں یہ فن نہیں آتا۔ کبھی آزما کر دیکھو‘ بڑا لطف پاؤ گے۔ تمہارے سینے میں جلتی آگ پہ پھوار برسے گی۔ اگر ایسا نہ ہوا تو میرا نام بدل دینا۔ اپنی لائف کو ایسا بناؤ کہ دیکھنے والے رشک کریں اور ہاتھ سے نکلے وقت پہ پچھتائیں۔ پچھتاوا اپنا مقدر بنانے سے بہتر ہے کہ کسی اور کا مقدر بنا دو.....“ حسام نے اس کی سوچ کے کئی در وا کر دیے تھے۔ افگن افروز کے دماغ میں جھماکا ہوا تھا.....!

☼ ☼ ☼

شام کے سائے ڈھل چکے تھے۔ پوری کائنات پہ ملگجا سا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ وہ واپس گھر آرہا تھا۔ سڑک پہ بھاگتی دوڑتی گاڑیوں میں — اس کی گاڑی کی اسپیڈ سب سے زیادہ تھی کیونکہ وقت کم تھا اور اسے وقت پہ پہنچنا تھا۔ وہ کافی تیز ڈرائیونگ کر رہا تھا‘ اسی لیے بڑی جلدی گھر پہنچ گیا تھا۔ چوکیدار نے اس کی گاڑی دیکھتے ہی گیٹ کھول دیا تھا۔ اس کی سلور کلر کی پراڈو فراٹے بھرتی ہوئی اندر گیٹ کے سامنے والی روش پہ آرکی۔ گاڑی سے اتر کر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اندر آگیا۔

”السلام علیکم.....!“ اس نے ڈرائنگ روم میں بیٹھی دادی بی کو سلام کیا۔

”وعلیکم السلام.....“ دادی بی اس کے سلام سے ہی چونک گئیں۔ انہیں اس کا لہجہ بدلا ہوا محسوس ہوا تھا۔

”کیسی طبیعت ہے آپ کی.....؟“ وہ چند قدم چلتا ہوا ان کے قریب آگیا تھا۔

”میری طبیعت تو ٹھیک ہے لیکن تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی.....“ دادی بی اس کے بدلے ہوئے تیور بھانپ چکی تھیں۔

”میں ٹھیک ہوں‘ وہ..... وہ لڑکی کہاں ہے؟“ افگن افروز نے مائدہ کے بارے میں پوچھا لیکن کتراتے ہوئے انداز میں۔

”کون لڑکی؟“ دادی جان تو چکی تھیں لیکن اس کے منہ سے اگلوانے کے لیے جان بوجھ کر استفسار کیا تھا۔

"وہی لڑکی جو یہاں کام کرتی ہے۔" وہ نام لینے سے گریز کر رہا تھا۔

"اچھا عیشاں کی بات کر رہے ہو..... وہ کچن میں ہے۔" انہوں نے کچن کی طرف اشارہ کیا۔

"نہیں میں دوسری لڑکی کی بات کر رہا ہوں۔"

"دوسری لڑکی کون ہے اس گھر میں....." وہ جھنجھلا کر بولی تھیں۔

"وہ کیا نام ہے اس کا..... ہاں مائدہ، اسی کی بات کر رہا ہوں۔"

"اوہ اچھا! تو یوں کہو ناں کہ تم اپنی بیوی کی بات کر رہے ہو؟ وہ بھلا کہاں ہو گی؟ کچن میں کھانا تیار کر رہی ہے۔" دادی بی نے بھی انجان بننے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

"مجھے اس سے کام ہے، میں بھی آتا ہوں۔" وہ کہہ کر ڈرائنگ روم سے نکل آیا، اس کا رخ کچن کی طرف تھا۔

"بس بھی کریں چھوٹی بیگم صاحبہ! اس ہنڈیا کو اور کتنا بھوننا ہے.....؟" عیشاں کی آواز کچن سے باہر تک آ رہی تھی۔

"دادی بی بتا رہی تھیں جب تک ہنڈیا اچھی طرح بھنی ہوئی نہ ہو، افگن کو پسند نہیں آتی، وہ سالن یونہی چھوڑ دیتے ہیں۔"

"خیر، آپ صرف ہنڈیا کی ہی بات نہ کریں، انہیں تو لوگ بھی بھنے ہوئے ہی پسند ہیں اور جو بھنے ہوئے نہیں ہوتے، انہیں وہ خود بھون دیتے ہیں۔" عیشاں مذاق اڑانے والے انداز میں بولی تھی۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے عیشاں، وہ صاحب ہیں تمہارے، ان کے بارے میں بات کرتے ہوئے تمیز سے کام لیا کرو۔" مائدہ نے اسے فوراً ڈانٹ دیا تھا اسے عیشاں کا یوں مذاق اڑانا اچھا نہیں لگا تھا۔

"سوری بیگم صاحبہ! میں تو بس۔"

"تم دادی بی سے اور مجھ سے ہنسی مذاق کر لیتی ہو یہی کافی ہے، لیکن اس سے زیادہ اوور ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔" مائدہ نے عیشاں کو اس کی حد یاد دلا دی تھی اور افگن افروز اس کا انداز دیکھتا رہ گیا تھا۔

"مائدہ.....!" اس نے بمشکل اسے نام سے پکارا تھا اور چولہے کا بٹن بند کرتی مائدہ اس کی آواز پہ یکدم کرنٹ کھا کے پلٹی تھی کہ اسے یقین نہیں آیا تھا کہ اسے افگن افروز نے پکارا ہے۔

"آپ نے مجھے بلایا ہے.....؟" اس کی بے یقینی اس کے لہجے میں بھی سمائی ہوئی تھی۔

"ہاں! میرے ساتھ آؤ۔ مجھے تم سے بات کرنی ہے۔"

وہ سر ہلا کر کہتا ہوا واپس پلٹ گیا اور مائدہ ہاتھ میں پکڑا چھوٹا سا کپڑا عیشاں کو تھما کے اپنا دوپٹہ درست کرتی ہوئی باہر نکل آئی تھی۔

"اللہ خیر!" سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس نے اللہ سے خیر کی دعا مانگی۔ دل عجیب سا دھڑک رہا تھا کیونکہ افگن افروز نے پہلی بار اسے پکارا تھا اور اس نے پہلی بار اس کا یہ روپ دیکھا تھا، اسی لیے دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے بمشکل اپنی تمام ہمتیں مجتمع کرتے ہوئے اندر کمرے میں قدم رکھا۔ وہ سامنے ہی منتظر کھڑا نظر آیا تھا۔

"جی" وہ اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔

"میرے دوست حسام کو جانتی ہو ناں.....؟"

"جی.....!" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"کل اس کی شادی تھی۔"

"تو.....؟" مائدہ نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"آج اس کا ولیمہ ہے۔"

زندگی میں پہلی بار افگن افروز کو بات کرتے ہوئے مشکل پیش آ رہی تھی، اس لڑکی کو جسے وہ ہمیشہ سے دھتکارتا آ رہا تھا، اسے آج یوں ایک دم سے بیوی کا درجہ دینا اور اس طرح بات کرنا بڑا عجیب سا لگ رہا تھا۔

"پھر.....؟" وہ یک لفظی سوال کر رہی تھی۔

"اس نے ہمیں ولیمہ کے فنکشن میں انوائٹ کیا ہے۔" اس کی بات پہ مائدہ نے پلکیں اٹھا کر براہ راست اس کی بوجھل آنکھوں میں دیکھا تھا۔

"اس نے تو غالباً "ہمیں" کل بھی انوائٹ کیا تھا؟"

"ہاں کیا تھا، لیکن کل میں جلدی میں تھا، اس لیے اکیلا ہی چلا گیا۔" اس نے بات ٹالی۔

"جلدی میں تو آپ اس وقت بھی ہیں؟" مائدہ نے اسے لاجواب کر دیا تھا۔

"کیا ارادہ ہے تمہارا... کیا تم میرے ساتھ جانا نہیں چاہتیں؟" اس نے ذرا ٹھہر کر دوٹوک پوچھا۔

"جانے کو تو آپ مجھے جہنم میں بھی لے جائیں گے تو ساتھ چلوں گی، انکار کا تو کبھی سوچ بھی نہیں سکتی۔" وہ ہلکے سے سر جھٹک کر بولی۔

"تمہارے پاس فنکشن میں پہننے کے لیے ساڑھی ہو گی؟" افگن افروز نے اپنی نفرت کا سر کچلتے ہوئے بمشکل سوال کیا۔

"آپ نے پہلے کبھی مجھے ساڑھی پہنے دیکھا ہے؟"

"لیکن آج میں تمہیں ساڑھی میں دیکھنا چاہتا ہوں۔" اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"ساڑھی میں دیکھنا چاہتے ہیں یا ساڑھی میں دکھانا چاہتے ہیں؟" افگن افروز اس کی بات پہ ٹھٹک گیا تھا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" اس نے تیوری پہ بل ڈالتے ہوئے پوچھا تھا۔

"میرے مطلب کو چھوڑیں، آپ اپنی بات کریں۔ کیا کہہ رہے تھے آپ؟"

"میرے ساتھ مارکیٹ چلو، کسی اچھے بوتیک سے ساڑھی لے کر آتے ہیں۔ ٹائم بہت کم ہے، چلو میرے ساتھ۔" وہ کہتے ہوئے دروازے کی سمت بڑھ گیا۔

"میں مارکیٹ نہیں جاؤں گی۔" وہ اپنی جگہ پہ کھڑی رہی۔ اس نے افگن افروز کے پیچھے قدم نہیں بڑھائے۔

"کیوں؟" وہ دروازے کے قریب جا کر رک گیا۔

"کیونکہ میں ساڑھی نہیں پہنوں گی۔" اس نے صاف انکار کر دیا۔

"کیوں نہیں پہنو گی؟ کیا برائی ہے ساڑھی پہننے میں؟" وہ دوبارہ اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

"تو اس میں اچھائی کیا ہے؟" اس نے الٹا افگن سے سوال کر ڈالا۔

"کیا یہ اچھائی کم ہے کہ یہ لباس مجھے پسند ہے، میں تمہیں پہننے کے لیے کہہ رہا ہوں.....؟" وہ اپنا مزاج ٹھنڈا رکھتے ہوئے دھیمے لہجے میں بات کر رہا تھا۔

"آپ نے صرف مجھے ساڑھی پہننے کے لیے کہا ہوتا تو شاید میں ساری زندگی ساڑھی اپنے تن سے جدا نہ کرتی، لیکن افسوس کہ آپ کی یہ فرمائش "صرف میرے لیے" نہیں ہے۔"

مائدہ نے اسے لیکچر دے ڈالا تھا اور افگن افروز اس کے اس لیکچر پہ چونک گیا تھا۔

"آپ فیصلہ کر لیں۔ میں تب تک دادی کو بتا کر آتی ہوں کہ میں آپ کے ساتھ جا رہی ہوں۔"

وہ کہہ کے باہر نکل گئی تھی اور افگن افروز وہیں بیڈ پہ بیٹھ گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ تیار ہو کر بیڈ روم سے باہر نکلی ہی تھی کہ سامنے سے آتے افگن افروز کے قدم بری طرح ٹھٹک کر تھم گئے تھے۔ پہلی نظر میں تو وہ پہچان ہی نہیں پایا تھا کہ وہ عام سے حلیے میں رہنے والی عام سی لڑکی مائدہ ہی ہے..... افگن کی نظریں بے یقین تھیں، شاید اس لیے کہ اس نے اسے اس طرح سراپا پہلی بار دیکھا تھا ورنہ آج سے پہلے جب بھی اسے دیکھا تھا، ہوش و خرد سے بیگانہ ہو کر دیکھا تھا۔ نشے کی حالت میں تو اسے یہ بھی پتا نہیں چلتا تھا کہ وہ اچھی طرح لگ رہی ہے یا بری.....؟

لیکن آج اسے دیکھ کر لگ رہا تھا کہ "وہ عام سی لگتی ہے، پر عام سی ہے نہیں!"

وہ کتنی خاص ہے یہ تو وہ جانتا ہی نہیں تھا، اسی لیے تو اسے گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ سیاہ رنگ کے بے حد قیمتی اور نفیس سی لانگ شرٹ اور چوڑی دار پاجامے میں ملبوس تھی۔ اس کے دوپٹے اور قمیص پہ سیاہ ہی ریشمی دھاگے سے کامدار بارڈر بنا ہوا تھا اور اس دھاگے کے کام میں کہیں کہیں سلور کانچ کے موتی چمک رہے تھے جیسے کالی رات میں چمکتے ستارے۔ اس

نے ہم رنگ ہیل والی سینڈل پہن رکھی تھی۔ بالوں کو ہیربن کی مدد سے تیکھا سا ہیر اسٹائل دیا تھا اور ہلکے پھلکے میک اپ کے ساتھ اس کی شفاف دمکتی جلد اور بھی جگمگا رہی تھی۔ جیولری میں اس نے آویزے اور صرف بریسلٹ پہنا ہوا تھا۔ افگن افروز تو اس کی چھب دیکھتا رہ گیا تھا' وہ کتنی خوب صورت اور پرکشش لگ رہی تھی' وہ اسے بتا بھی نہیں سکتا تھا۔

"چلیں....؟" مائدہ اسے ایک ہی جگہ ٹھہرے دیکھ کر خود ہی قریب آگئی تھی۔

"ہوں! ہاں چلیں۔" وہ چونک کر متوجہ ہوا تھا۔ مائدہ اس کے ساتھ سیڑھیاں اترتی ہوئی نیچے آگئی۔

"خدا حافظ دادی بی!" وہ انہیں خدا حافظ کہنے ڈرائنگ روم میں آئی تھی۔

"ماشاء اللہ! اللہ نظر بد سے بچائے۔ اللہ میرے بچوں کی جوڑی سلامت رکھے.... فی امان اللہ۔"

انہوں نے ان دونوں کی بلائیں لے ڈالی تھیں اور انہیں دعاؤں میں رخصت کیا تھا۔

"میں نے حسام اور اس کی وائف کے لیے شادی کا گفٹ لیا تھا لیکن کل اسے دے نہیں سکا۔ گاڑی میں ہی رہ گیا تھا' اس لیے اب یہ گفٹ تم انہیں اپنی طرف سے دے دینا۔" افگن نے گاڑی کی پچھلی سیٹ پہ رکھے گفٹ کی طرف اشارہ کیا۔

"اپنی طرف سے.... کیا میں اور آپ الگ ہیں....؟" مائدہ نے نکتہ اٹھایا۔

"کہہ سکتی ہو۔" اس نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے بے نیازی سے کہا۔

"کہہ تو میں اور بھی بہت کچھ سکتی ہوں لیکن ڈرتی ہوں کہ آپ کو تکلیف نہ ہو۔" اس کا لہجہ طنزیہ تھا۔

"میری تکلیف سے نہ ڈرو۔ اپنی تکلیف سے ڈرو کہ تمہیں اپنے کیے پہ سزا بھی مل سکتی ہے اور میری دی ہوئی سزا کو تم سے بہتر کوئی نہیں جان سکتا۔"

"ہاں! اس معاملے میں تو واقعی خوش قسمت ہوں کہ آپ نے آج تک اگر سزا دی ہے تو صرف مجھے ہی دی ہے۔ وہ بھی ان گناہوں کی جو میں نے نہیں کسی اور نے کیے ہیں۔" مائدہ کے لب و لہجے میں تلخی اتر آئی تھی۔

اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا اچانک اس کا موبائل بج اٹھا۔ اس نے سیل نکال کر دیکھا نمبر اجنبی تھا۔

"ہیلو افگن افروز اسپیکنگ۔" اس نے بہت نپے تلے اور شائستہ سے انداز میں کہا۔

"السلام علیکم بیٹا! کیسے ہو؟" دوسری طرف کسی عورت کی آواز سنائی دی تھی لیکن وہ پہچان نہیں پایا تھا۔ افگن کے لیے فون پہ یہ آواز یکسر اجنبی تھی۔

"وعلیکم اسلام! میں ٹھیک ہوں' آپ کون ہیں؟" اس نے ذرا الجھ کر پوچھا تھا۔

"بیٹا.... ! میں حلیمہ بات کر رہی ہوں' مائدہ کی امی۔" انہوں نے اپنا تعارف کروایا۔

"مائدہ کی امی....؟"

افگن افروز نے خود کلامی کے سے انداز میں کہتے ہوئے ذرا سی گردن موڑ کر مائدہ کی سمت دیکھا تھا لیکن مائدہ اس کے منہ سے اپنی امی کا ذکر سن کے بری طرح چونک گئی تھی اور نجانے کیوں پل بھر میں اس کے چہرے کی رنگت بھی متغیر ہو گئی تھی لیکن شکر تھا کہ اس کے ایسے تاثرات اور ایسی کیفیت کا افگن افروز نے کچھ خاص نوٹس نہیں لیا تھا' شاید اس لیے کہ اس کا دھیان پہلے ہی دو طرف بٹا ہوا تھا' ایک ڈرائیونگ کی طرف اور ایک فون کی طرف!

"کیسی ہیں آپ؟" نجانے وہ کس موڈ میں تھا کہ ان کا حال چال بھی پوچھ رہا تھا ورنہ پہلے تو اس نے یہ زحمت بھی کبھی نہیں کی تھی۔

"میں ٹھیک ہوں بیٹا! تم سناؤ کیسے ہو۔" انہوں نے کافی جھجک کر پوچھا تھا کیونکہ پہلے اس سے بات جو نہیں ہوئی تھی۔

"میں بھی ٹھیک ہی ہوں آپ سنائیں آج آپ نے کیسے یاد کر لیا؟" وہ حلیمہ بی بی سے بات تو کر رہا تھا لیکن مائدہ کا دل اندر ہی اندر ٹھبرا رہا تھا۔ اس کی بے چینی اس کی ہتھیلیوں میں اتر آئی تھی۔

"بس بیٹا! اتنے دن ہو گئے تھے۔ مائدہ کی طرف سے کوئی خیر خبر نہیں ملی' اس لیے سوچا آج خود ہی پتا کر لوں کافی دیر سے تم لوگوں کے گھر کے نمبر پہ فون کر رہی تھی لیکن کسی نے فون ہی نہیں اٹھایا' اس لیے پریشان ہو کر تمہارے نمبر پہ فون کر دیا۔ اب پتا نہیں تم مصروف تھے یا فارغ' میں تو اپنی پریشانی میں تمہیں ڈسٹرب کر بیٹھی ہوں۔"

وہ شرمندہ سے لہجے میں بات کر رہی تھیں' افگن افروز کو ان کی شرمندگی پہ خود شرمندگی محسوس ہوئی تھی۔ آج ذرا دیر کے لیے ہی سہی وہ سرد مہری کے خول سے نکلا ہوا تھا' اس لیے محسوسات جاگے ہوئے تھے' تب ہی اسے شرمندگی کا احساس ہوا تھا۔

"نہیں! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم دراصل ایک فنکشن میں جا رہے ہیں۔ مائدہ بھی ساتھ ہی ہے۔ آپ اس سے بات کر لیں' میں ڈرائیو کر رہا ہوں' خدا حافظ۔" اس نے ان کی جھجک اور شرمندگی محسوس کرتے ہوئے موبائل مائدہ کی طرف بڑھا دیا تھا۔ اور مائدہ نے بمشکل اپنے تاثرات کنٹرول کرتے ہوئے موبائل اس کے ہاتھ سے لے کر کان سے لگایا تھا۔

"السلام علیکم امی!" اس کا لہجہ بے حد دھیما اور آواز دبی دبی سی تھی۔

"وعلیکم السلام میری بچی! کیسی ہو.... اتنے دنوں سے ماں کی کوئی خیر خبر نہیں لی تم نے' اور نہ ہی اپنا حال چال بتایا؟"

وہ بہت پیار اور محبت بھرے لہجے میں پوچھ رہی تھیں۔ ان کی اداسی مائدہ کو ان کے لہجے سے ہی محسوس ہو گئی تھی۔

"بس گھر کے کاموں میں اور دادی بی کے ساتھ وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلتا اور آپ کے پاس تو فون بھی نہیں ہے' جس پہ کال کر کے میں آپ کی خیر خبر لے سکوں؟"

"شیخ صاحب کا فون ہے تو سہی...." حلیمہ بی بی بے ساختگی میں کہہ گئیں لیکن پھر خود ہی چپ بھی ہو گئی تھیں لیکن اسی ذرا سی دیر میں مائدہ کے جسم کا سارا خون جیسے زرد پڑ گیا تھا۔ اس نے بے ساختہ ہاتھ میں پکڑے ٹشو سے اپنی پیشانی اور چہرے سے نادیدہ پسینے کو تھپتھپا کے خشک کیا تھا۔

"ٹھیک ہے امی! آپ فون بند کریں۔ میں خود آپ کو کال کر لوں گی اس وقت ہم راستے میں ہیں۔"

اس نے فوراً" انہیں ٹال دیا لیکن وہ اس کی کیفیت سمجھ گئی تھیں۔

"ٹھیک ہے' اللہ تم لوگوں کو خیر و عافیت سے منزل پہ پہنچائے' ہم بعد میں بات کر لیں گے۔ اپنا خیال رکھا کرو' اللہ حافظ....!" انہوں نے بھی بات کو طول دیے بغیر بات سمیٹ دی تھی اور مائدہ نے گہری سانس کھینچتے ہوئے فون بند کر دیا تھا.... اور اپنے آپ کو پر سکون کرنے کے لیے اپنا سر سیٹ کی پشت سے ٹکا کر پلکیں موند لی تھیں اور اس کے برابر والی سیٹ پہ بیٹھا افگن افروز بظاہر تو ڈرائیونگ میں ہی مصروف نظر آ رہا تھا لیکن اس کا دھیان کہاں تھا؟ مائدہ ہرگز نہیں جان سکی تھی۔

"اپنی امی کی کال پہ تم اتنا گھبرا کیوں گئی تھیں؟"

اس کے ٹھہرے ہوئے لہجے اور مبہم سے سوال پہ مائدہ نے کرنٹ کھا کر پٹ سے آنکھیں کھول دیں اور افگن افروز کی طرف عجیب بد حواس اور متوحش سی نظروں سے دیکھا تھا گویا وہ اس کی کیفیت اور اس کے تاثرات سے اتنا انجان بھی نہیں تھا جتنا نظر آ رہا تھا۔ وہ اک نظر میں ہی اس کی کیفیت فوراً" بھانپ گیا تھا۔

"کیا بات ہے.... میرے سوال پہ تو تم اور بھی گھبرا گئی ہو؟" اس نے سامنے ونڈ اسکرین سے نظریں ہٹاتے ہوئے مائدہ کے چہرے کو بغور دیکھا تھا۔

"نن نہیں' ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔" اس نے فوراً" نفی میں گردن ہلائی تھی۔

"تمہارے چہرے سے تو ایسی ہی بات نظر آ رہی

ہے۔"

وہ بڑے یقین سے کہہ رہا تھا۔ مائدہ نے اس کی بوجھل مگر گہری نظروں کے خوف سے پلکیں جھکا لی تھیں۔

"نہیں بس میرا ان کی تنہائی اور اکیلے پن کی طرف خیال چلا گیا تھا۔"

"تنہائی اور اکیلا پن....؟"

"جی! دراصل جب میں ان کے پاس تھی تو انہیں بڑا سہارا رہتا تھا۔ کام کاج بھی نہیں کرنا پڑتا تھا اور اگر وہ بیمار ہوتی تھیں تو تب بھی میں ہی ان کی دیکھ بھال کرتی تھی، مگر اب تو ان کے پاس کوئی بھی نہیں ہے سارا دن اکیلے گھر میں بیٹھے گزر جاتا ہو گا۔" اپنی ماں کی پریشانی کے خیال سے ہی مائدہ کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔

"کیوں؟ اکیلے کیوں.... ان کے ہزبینڈ' میرا مطلب ہے کہ تمہارے والد صاحب وہ بھی تو ہوتے ہیں.... ان کے ہوتے ہوئے بھی اکیلا پن ہوتا ہے؟" اس نے ذرا سی حیرانی ظاہر کی۔

"جی! وہ اپنی شاپ پہ ہوتے ہیں، صبح جاتے ہیں اور شام کو آتے ہیں اس لیے دن کا وقت تو اکیلے ہی گزرتا ہے نا؟"

"وہ تو ہر بیوی کا گزرتا ہے۔"

"لیکن جن بیویوں کے پاس بچے ہوتے ہیں ان کا وقت اچھا گزر جاتا ہے۔ جب میں ان کے پاس تھی تب ان کا وقت بھی اچھا ہی گزرتا تھا اب میری شادی کے بعد انہیں تنہائی اور اکیلا پن محسوس ہونے لگا ہے۔"

مائدہ خود کو کافی حد تک سنبھال چکی تھی اس لیے آسانی سے بات کر لی تھی۔

"ہوں! یہ بھی ٹھیک کہہ رہی ہو تم جن عورتوں کے پاس بچے ہوں وہ مصروف رہتی ہیں' بچے واقعی بہت پیارے اور...."

اپنی دھن میں کچھ کہتے کہتے اسے نجانے کیا خیال آیا کہ اس نے یکدم لب بھینچ لیے۔ اس کے نارمل سے چہرے پہ سرد و سپاٹ سی کیفیت جم گئی تھی۔ مائدہ نے پلکیں اٹھا کر اس کی خاموشی پہ اس کا بغور جائزہ لیا تھا۔ وہ جان چکی تھی کہ اس کی خاموشی کا سبب کیا ہے....؟

ان دونوں کے ذہنوں میں اپنی اپنی اذیت کے جھکڑ سے چل رہے تھے اور وہ دونوں سوچوں کی تیز آندھی میں بھٹکتے ہوئے اپنی زندگی اور اپنے حال سے کئی قدم پیچھے چلے گئے تھے۔ وہ ڈرائیو کر رہا تھا اور وہ سیٹ سے سر ٹکائے بیٹھی سامنے سڑک پہ دیکھ رہی تھی....!

☆ ☆ ☆

حلیمہ بی بی کو تقریباً" تین گھنٹے ہو گئے تھے بازار گئے ہوئے لیکن ابھی تک ان کی واپسی کا کوئی امکان نظر نہیں آ رہا تھا اور اس کی جان خشک پتے کی طرح لرز رہی تھی۔ وہ ایک ایک سیکنڈ' منٹ اور گھڑیاں گن رہی تھی۔ جیسے جیسے وقت آگے بڑھ رہا تھا اس کا خون خشک ہو رہا تھا اور ہتھیلیوں میں ٹھنڈا پسینہ اتر رہا تھا۔ دل عجیب سی گھبراہٹ کا شکار تھا۔ اس نے تین بار آیت الکرسی پڑھ کے خود پہ پھونکی اور اماں کی واپسی کی دعا کرنے بیٹھ گئی' ابھی چند سیکنڈ ہی گزرے تھے کہ دروازے پہ زوردار دستک ہوئی۔ اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا تھا۔ اس کی بدحواسی کا یہ عالم تھا کہ اس میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ یہی پوچھ لیتی کہ باہر کون ہے....؟ وہ لبوں کو سیے چپ بیٹھی رہی مگر دوسری بار دروازہ پہلے سے بھی زیادہ زور سے بجا تھا اور اب کی بار چپ رہنا مشکل تھا....

"کک.... کون ہے؟" اس کے حلق سے بمشکل آواز برآمد ہوئی تھی۔

"میں ہوں شیخ زمان' دروازہ کھولو۔" باہر سے سنائی دینے والی آواز نے اس کے ہاتھ پیر سُن کر دیے تھے۔ وہ جس عفریت سے بچنے کے لیے تمام دروازے بند کیے بیٹھی تھی' وہی دروازے پہ کھڑی اسے دروازہ کھولنے کو

کہہ رہی تھی۔

"مم.... مگر اماں تو گھر پہ نہیں ہیں۔" اس نے جیسے دروازہ نہ کھولنے کا بہانہ ڈھونڈا تھا۔

"اماں گھر پہ کیسے ہو گی.... اماں تو باہر کھڑی ہے تیری۔" شیخ زمان کی چبائی ہوئی آواز سنائی دی تھی۔

"باہر....؟" اسے یقین نہیں آیا تھا۔

"مائدہ! دروازہ کھولو بیٹا! کیا بحث لگا رکھی ہے....؟"

باہر سے اماں کی آواز سنائی دی تو اس کے جسم میں ٹوٹتی ہوئی جان دوبارہ سے سرایت کر گئی تھی اور پلک جھپکتے میں اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا تھا اور دروازہ کھلتے ہی جہاں اماں نے اسے تعجب آمیز نظروں سے دیکھا تھا' وہیں شیخ زمان نے اسے بڑی خشمگیں نظروں سے دیکھا تھا۔ وہ اپنی پسینے سے نم آلود پیشانی دوپٹے سے پونچھتی ہوئی سامنے سے ہٹ گئی۔ وہ دونوں اندر آ گئے تھے۔

"کیا بات ہے' دروازہ کیوں نہیں کھول رہی تھیں؟" اماں نے ہاتھوں میں پکڑے تھیلے برامدے میں بچھے تخت پہ ڈھیر کر دیے تھے۔ سودا سلف کافی زیادہ تھا اس لیے ان کے بازو تھک چکے تھے۔ مائدہ فوراً" باورچی خانے میں جا کر ان کے لیے پانی لے آئی تھی۔

"تمہاری اماں پوچھ رہی ہیں کہ تم دروازہ کیوں نہیں کھول رہی تھیں....؟" اس کی خاموشی پہ شیخ زمان نے جان بوجھ کر اماں کا سوال دہرایا۔

"وہ میں سمجھی کہ آپ کی دکان سے کوئی لڑکا آیا ہے کسی کام سے اور اماں کا پوچھ رہا ہے' اسی لیے میں نے کہہ دیا کہ اماں گھر پہ نہیں ہیں۔" اس نے بروقت بہانا ترتیب دیا تھا۔

"حالانکہ میں نے خود بول کر بتایا تھا کہ میں ہوں شیخ زمان؟" شیخ زمان نے اپنی بات پہ زور دے کر کہا تھا۔

"میں نے سنا نہیں تھا۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"تم اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو....؟" اماں کی سانسیں ہموار ہوئیں تو بیٹی کے چہرے کی سمت دیکھنے کا خیال آیا تھا۔

"نن.... نہیں میں بھلا کیوں گھبراؤں گی....؟" اس نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا اور نظریں چرا لی تھیں۔

"آج گرمی بہت ہے' بار بار پسینہ آ رہا ہے اچھا ہوا۔ آپ پہلے آ گئیں' ورنہ میں تو نہانے جا رہی تھی اور آپ گلی میں کھڑی ہو کے میرا انتظار ہی کرتی رہتیں۔"

وہ بات کو ادھر ادھر ٹالتی ہوئی کمرے سے اپنے کپڑے اٹھا کر باتھ روم میں گھس گئی کافی دیر ٹھنڈے پانی سے شاور لینے کے بعد اس کے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے تھے اور دل و دماغ بھی پرسکون ہو چکے تھے کیونکہ اب اسے کوئی ڈر اور کوئی خوف نہیں تھا۔ اب اماں جو گھر پہ تھیں.... لیکن شیخ زمان کی فرمائش نے اس کا سارا سکون غارت کر ڈالا تھا۔ اس کے اعصاب میں پھر سے تناؤ آ گیا تھا۔

"حلیمہ! میں اندر کمرے میں پنکھے کے نیچے بیٹھتا ہوں' تو ایک گلاس شربت کا بنوا کے اندر کمرے میں بھیج دے۔ آج گرمی بہت ہے' بار بار پیاس لگ رہی ہے۔"

وہ مائدہ پہ اک چھیدتی ہوئی نظر ڈال کے اندر چلا گیا تھا اور مائدہ تلملا کے رہ گئی ظاہر ہے اماں تھکی ہوئی آئی تھیں وہ بھلا شربت کیسے بناتیں.... شربت تو اسی نے بنانا تھا اور کمرے میں اسے دے کر بھی اسی نے آنا تھا۔ یہی سوچ کر وہ پیروں کے تلوے سے سر کی چوٹی تک جل اٹھی تھی۔ انکار کرنا بھی فضول تھا۔ یقیناً" وہ تھوڑی دیر بعد کوئی اور کام کہہ دیتا۔ اس لیے بہتر تھا کہ وہ شربت ہی بنا دیتی۔

اس نے زچ ہو کر مٹھیاں اور لب بھینچ لیے تھے اور قدم باورچی خانے کی سمت بڑھا دیے تھے۔ تھوڑی دیر بعد اس نے خود پہ جبر کرتے ہوئے شربت بنایا اور شیخ زمان کے کمرے میں پہنچا آئی تھی لیکن اس آنے اور جانے کے دوران مائدہ کو لگا شیخ زمان کی ہوس زدہ نظریں اس کے جسم کے ساتھ چپک کے رہ گئی ہوں اور

ان نظروں نے اسے غلیظ' ناپاک اور گندا کر کے رکھ دیا ہو۔ اس کی چھیدتی ہوئی نظریں مائدہ کی روح کا عذاب بن چکی تھیں اور اسی عذاب کے احساس سے وہ اندر ہی اندر گھلس کے رہ جاتی تھی۔ بے بسی بے پناہ تھی' کوئی راہ فرار نہیں تھی.....!

✲ ✲ ✲

رات کے سوا بارہ بجے کا وقت تھا لیکن وہ ابھی تک گھر نہیں آیا تھا..... اور دادی بی ڈرائنگ روم میں بیٹھی ہمیشہ کی طرح اس کے انتظار میں تھیں۔

مطالعہ کرنا ان کا بہت پرانا شوق تھا' جو بچپن سے جوانی' جوانی سے بڑھاپے اور غریبی سے امیری تک ان کے ساتھ آیا تھا اور ان کے اسی شوق کی خاطر ان کے اکلوتے اور لاڈلے پوتے نے انہیں گھر میں باقاعدہ ایک چھوٹی سی لائبریری بنادی تھی۔

البتہ ان کے دل میں کچھ اور خواب' کچھ خواہشیں اور کچھ ارمان بھی ہیں یہ جاننے کی اس نے کبھی زحمت ہی نہیں کی تھی۔ وہ ان کے وہی شوق پورے کرتا تھا جو اس کی اپنی ذات سے منسوب نہیں ہوتے تھے اور دادی بی کو بھی اسی بات کا قلق رہتا تھا کہ وہ ان کی ہر بات مانتا ہے۔ ہر طرح کا خیال رکھتا ہے لیکن اس معاملے میں آکر لاپروائی' بے نیازی اور سرد مہری برت جاتا ہے۔ ان کے دل کے ارمانوں اور خواہشوں سے نظریں چرا کے گزر جاتا ہے یہ احساس کیسے بنا کہ ان کی عمر ایسی نہیں تھی جہاں وہ ارمانوں کے پورا ہونے کا انتظار کرتیں' ان کا تو یہ معاملہ تھا کہ آج ہیں' کل نہیں۔

اس نے تو دل کو پتھر اور احساسات سے عاری کر لیا تھا اور اسی لیے وہ رنجیدہ اور غم زدہ رہتی تھیں۔ اس وقت بھی وہ اسی کا انتظار کر رہی تھیں اور وہ تھا کہ جیسے شہر ہی چھوڑ گیا تھا بالآخر وہ خود ہی اٹھیں اور فون سیٹ کے پاس آگئیں۔ اس کا نمبر ڈائل کیا اور ریسیور کان سے لگالیا۔ دوسری طرف بیل جا رہی تھی لیکن وہ کوئی کال ریسیو نہیں کر رہا تھا پھر بھی وہ مسلسل کوشش کر رہی تھیں اور ایک بار ان کی کوشش کامیاب ٹھہر ہی گئی۔

''ہیلو!'' اس کی بھاری گمبھیر اور بوجھل آواز پہ ان کا دل کٹ کے رہ گیا تھا۔

''افگن!'' وہ بڑے دکھ سے بولی تھیں۔

''ڈونٹ وری! میں آ رہا ہوں۔'' اس نے مختصر سے الفاظ میں کہہ کر فون بند کر دیا اور وہ بند ریسیور کو دیکھتی رہ گئیں۔ ان کی بوڑھی آنکھوں میں دکھ سے آنسو آ گئے تھے۔ اب وہ اسے کیا کہتیں کہ وہ انہیں بڑھاپے میں ستا رہا ہے۔ انہیں بے وجہ اذیت دے رہا ہے' ان کے دل پہ رنج کا بوجھ بڑھا رہا ہے لیکن اگر وہ اسے کہہ بھی دیتیں تو اس پہ بھلا کیا اثر تھا..... وہ ٹہل ٹہل کر تھکنے لگی تھیں' جب باہر گیٹ پہ گاڑی کا ہارن سنائی دیا تھا پھر ذرا توقف سے گیٹ کھلنے اور گاڑی گیراج میں رکنے کی آواز سنائی دی تھی۔ رفتہ رفتہ کاریڈور سے بھاری قدموں کی چاپ ابھرتی ہوئی قریب آتی چلی گئی تھی اور ڈرائنگ روم کے داخلی دروازے پہ آ کر یہ چاپ بھی ٹھہر گئی' انہوں نے پلٹ کر پیچھے دیکھا تھا۔

''خیریت؟ آپ بار بار فون کر رہی تھیں؟'' مختصر سے الفاظ میں پوچھا گیا۔

''کیا تمہیں نہیں پتا کہ میں کیوں بار بار فون کر رہی تھی؟'' انہوں نے خفگی سے کہا۔

''آئی ایم سوری! میں بزی تھا۔'' پہلے سے بھی مختصر جواب آیا۔

تم فارغ کب ہوتے ہو.....؟ ایک دادی رات بھر پوتے کے لیے جاگ کر اس کی واپسی کی راہ دیکھتی ہے اور پوتا آ کے پوچھتا ہے..... ''آپ کو کوئی کام تھا تو بتائیں.....؟''

وہ بڑے دکھ اور کرب سے بولی تھیں لیکن پوتے کو شرم کب تھی بھلا.....؟

''تو پھر کیوں جاگ رہی ہیں؟ ہزار بار کہہ تو چکا ہوں کہ میرا انتظار مت کیا کریں۔ دل چاہے گا تو گھر آؤں گا' ورنہ نہیں آؤں گا' آپ کب تک اپنی بوڑھی ہڈیوں کو میرے انتظار میں لٹکائے رکھیں گی؟ آپ

جس افگن افروز کے انتظار میں بیٹھی ہیں' وہ تو کب کا مر چکا ہے اب کبھی نہیں آئے گا۔ مت کیا کریں اس کا انتظار۔'' وہ یکدم غصے سے پھٹ پڑا تھا۔

''وہ تھی تو تمہیں سب سے محبت تھی' وہ چلی گئی تو ساری محبتیں بھی چلی گئیں کیا تمہیں اب اپنی دادی بھی بری لگنے لگی ہے..... اگر ایسی ہی بری لگتی ہوں تو اٹھا کر گھر سے باہر پھینک دو اور اکیلے رہو اس گھر میں' تاکہ نہ تمہیں میری پرواہ کرنی پڑے اور نہ مجھے تمہاری فکر ہو.....'' وہ رو رہی تھیں اور وہ لب بھینچ کے رہ گیا تھا۔

''ہاں میرے اندر کی ساری محبتیں مر چکی ہیں' ہر احساس مر گیا ہے' کسی کی پروا نہیں رہی مجھے' اور یہ بات آپ خود اچھی طرح جانتی ہیں اور آپ یہ بھی یاد رکھیں کہ افگن افروز اس وقت زندگی جی نہیں رہا' زندگی نبھا رہا ہے' صرف اس لیے کہ کہیں میری موت کو وہ اپنی بے وفائی کا صدمہ نہ سمجھ لے' ورنہ مر تو میں اسی روز گیا تھا جس روز وہ.....'' کہتے کہتے اچانک اس نے لب بھینچ لیے۔ اس کی زبان کو زیب نہیں دیا تھا کہ وہ بات مکمل کرتا۔

''لیکن دنیا اس لڑکی پہ ختم نہیں ہو جاتی۔''

''دادی بی! ساری باتیں' ساری حقیقتیں جانتی تو ہیں آپ۔ پھر کیوں بھول جاتی ہیں' میری دنیا اس لڑکی پہ ہی ختم ہوتی تھی اور اس لڑکی پہ ہی ختم ہو گئی؟'' وہ بولا مگر تلخ اور استہزائیہ سا۔

''پلیز دادی بی! اب اس ٹاپک کو یہیں ختم کر دیں رات کے اس پہر کچھ حاصل نہیں ہو گا سوائے سر درد کے۔'' اس نے سختی سے کہتے ہوئے انہیں روک دیا تھا اور پلٹ کر سیڑھیوں کی سمت بڑھ گیا۔

''افگن.....!'' وہ بے بسی سے زچ ہو کر پکاریں۔

''پلیز سمجھنے کی کوشش کریں دادی بی! ان باتوں کے لیے یہ وقت موزوں نہیں ہے۔ یہ ساری باتیں کسی اور وقت پہ اٹھا رکھیں۔ اس وقت گہری نیند آ رہی ہے' آپ بھی سو جائیں اور مجھے بھی سونے دیں۔''

اس نے ہاتھ اٹھا کر بے نیازی سے کہا اور سیڑھیاں چڑھ گیا تھا اور وہ وہیں کھڑی دیکھتی رہ گئیں۔ وہ واقعی بے حس ہو چکا تھا' اب تو ان کی بھی پروا نہیں کرتا تھا ورنہ پہلے تو.....!

✲ ✲ ✲

وہ مالی سے پورے لان کی کانٹ چھانٹ کروا کے پودوں کو پانی دے کر فارغ ہوئیں تو اچانک انہیں وقت کا احساس ہوا تھا کیونکہ انہوں نے ابھی افگن کے لیے ناشتا بھی بنانا تھا اس لیے سارے کام وہ پس پشت ڈالتے ہوئے اندر آگئیں عیشال ڈرائنگ روم اور ٹی وی لاؤنج کی صفائی میں مصروف تھی۔

وہ شروع سے ہی افگن افروز کے لیے کھانے پینے کی اشیاء خود تیار کرتی تھیں اس کے سارے کام وہ اپنے ہاتھوں سے کرتی تھیں۔ ناشتہ بنا کر انہوں نے عیشال سے کہا۔

''اوپر جاؤ اور افگن سے کہو ناشتا تیار ہو چکا ہے' جلدی آجائے ورنہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔'' انہوں نے عیشال کو اوپر بھیجا اور وہ مؤدب سے انداز میں سر ہلا کر اوپر چلی گئی اور وہ خود اس کا ناشتا لگانے میں مصروف ہو گئیں۔

اور ٹھیک پانچ منٹ بعد وہ شاندار ڈریسنگ کیے' عمدہ خوشبو لگائے' خوب صورت ہیر اسٹائل مگر سرد و سپاٹ چہرے کے ساتھ ڈائننگ روم میں داخل ہوا تھا۔

''گڈ مارننگ.....'' بے تاثر سا لہجہ تھا' وہ بھلا کیا جواب دیتیں' خاموشی سے کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی تھیں' وہ بھی ان کی خاموشی نوٹ کر چکا تھا کیونکہ ان کی طرف سے اس کی ''گڈ مارننگ'' کا کوئی جواب نہیں آیا تھا انہوں نے جوس کا جگ اور گلاس اس کے سامنے رکھ دیا تھا' وہ نہار منہ جوس پینے کا عادی تھا۔

''آئی ایم سوری.....!'' اس نے گلاس اٹھاتے ہوئے سنجیدگی سے کہا لیکن دادی بی نے پھر بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے اپنے لیے کپ میں چائے انڈیلنے لگیں۔

''شاید رات میں کچھ زیادہ بول گیا تھا' مجھے اتنا نہیں

بولنا چاہیے تھا۔ ایم رئیلی سوری۔"

وہ جوس پینے سے پہلے سر جھکائے آہستگی سے اور سنجیدگی سے معذرت کر رہا تھا لیکن دادی بی نے اس کی کوئی بھی بات کانوں پہ نہیں دھری تھی' جس پہ وہ قدرے جھنجلا گیا تھا۔

"دادی بی! میں آپ سے مخاطب ہوں' میں سوری بول رہا ہوں آپ سے۔" اس نے گلاس ٹیبل پہ پٹخ دیا تھا۔

"مجھ سے کیوں مخاطب ہو؟ اور کیوں سوری بول رہے ہو؟ کیا اہمیت ہے میری تمہاری نظر میں؟ جیسے گھر کے باقی ملازم ہیں ویسے میں بھی ہوں' بس اتنا فرق ہے کہ وہ کوارٹرز میں رہتے ہیں اور میں تمہارے گھر کے بیڈ روم میں رہتی ہوں۔ تمہارا مجھ پہ یہی احسان ہے کہ تم نے مجھے ایک کمرا دے رکھا ہے' ورنہ روٹی پانی' جوتی کپڑا تو باقی سب کو بھی مل رہا ہے۔ وہ بھی کام کرتے ہیں' میں بھی کام کرتی ہوں۔ جب ان کاموں سے ہٹ کے کوئی بات کرتی ہوں تو تمہیں ناگوار گزرتا ہے۔ آخر کو تم مالک ہو' کسی ملازم کی اپنی ذات میں مداخلت ناگوار تو گزرے گی۔۔۔ لیکن تم بے فکر رہو' آئندہ ایسا نہیں ہو گا' میں پوری کوشش کروں گی کہ تمہارے کسی بھی کام میں مداخلت نہ کروں جو تمہیں ناگوار گزرے۔۔۔" انہوں نے غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا اور رخ موڑ لیا تھا۔

"دادی بی! آپ یہ۔۔۔"

"مت کہو مجھے دادی بی۔ میں صرف نام کی دادی بی ہوں' ورنہ میری کیا اوقات ہے خوب جانتی ہوں میں۔ تمہارے لیے وہی اہم تھی' جس کے ہجر میں جوگی بنے پھر رہے ہو۔ وہ گئی تو سب کچھ گیا' پوری دنیا ہی ختم ہو گئی اور جب تمہاری دنیا ہی ختم ہو گئی ہے تو ہم کس کام کے۔۔۔"

آج ان کی چپ اور برداشت کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا اسی لیے جو منہ میں آیا کہتی چلی گئی تھیں اور افگن افروز ششدر سا بیٹھا ان کی صورت دیکھ رہا تھا۔

"میں جیوں یا مروں' میری پروا مت کرنا اور تم ہر ناجائز اور غلط کام کرو۔ گھر آؤ یا نہ آؤ میں تمہاری پروا نہیں کروں گی۔ بھول جاؤں گی کہ میرا کوئی پوتا بھی ہے بس زندگی کے دن پورے کرنے ہیں' سو ہو ہی جائیں گے۔ تم خود مختار ہو' اپنی مرضی کے مالک ہو جو چاہے کرو۔ میری طرف سے آزاد ہو۔"

وہ اپنے اندر کا غبار نکال کے کرسی دھکیل کر کھڑی ہوئیں اور اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

ناشتا وہیں ادھورا پڑا رہ گیا تھا۔ افگن نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔ آج تک اس نے جو کچھ بھی کیا تھا یا جو کچھ بھی ہوا تھا' وہ کبھی اس پہ اس طرح خفا نہیں ہوئی تھیں۔ کبھی غصہ نہیں کیا تھا' کبھی مشتعل نہیں ہوئی تھیں اور آج اگر وہ مشتعل اور برہم ہوئی تھیں تو اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ آج واقعی کوئی ایسی چوٹ لگی ہے جس کا اثر ان کے دل پہ ہوا ہے۔ ورنہ وہ اپنے لاڈلے پوتے کو اس طرح ڈانٹ دیں۔۔۔ کبھی ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

اور اسی بات پر افگن افروز کو بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ دادی بی نے اتنا غصہ اسی پہ کیا ہے۔۔۔ اور اگر کیا ہے تو یقیناً" وہ خود بھی بہت بے چین اور اذیت میں ہوں گی' "آخر اس نے ان کا دل کیوں دکھایا۔۔۔؟ اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔۔۔" یہی سوچتے سوچتے وہ خود بھی بے چین اور مضطرب ہو گیا تھا اور ایک جھٹکے سے اٹھ کر وہاں سے نکل آیا۔ لمبے لمبے ڈگ بھرتا گاڑی تک آیا اور گاڑی نکال لے گیا۔۔۔!

☼ ☼ ☼

"مائدہ۔۔۔! مائدہ۔۔۔!" اماں اسے باہر سے آوازیں دیتی ہوئی اندر کمرے میں آ گئی تھیں۔

"مائدہ۔۔۔!" انہوں نے بالآخر اس کے قریب آ کر اسے پکارا تو وہ چونک کر جیسے ہوش میں آئی تھی۔

"جج۔۔۔ جی اماں! کیا بات ہے؟" وہ یکدم بستر پہ لیٹی ان کی آواز سن کر اٹھ بیٹھی تھی۔

"کہاں کھوئی رہتی ہو' میں آوازیں دے دے کر تھک جاتی ہوں۔" وہ خفگی سے بولیں۔

"کہیں نہیں اماں! بس ایسے ہی کسی سوچ میں تھی شاید۔" اس نے سر جھٹکتے ہوئے کہا اور دوپٹہ اٹھا کر کندھوں پہ پھیلا لیا تھا۔

"ہر وقت کمرے میں کیوں بیٹھی رہتی ہو...... ذرا سا کام کیا اور کمرے میں ذرا سا کام کیا پھر کمرے میں، یہ کیا سلسلہ بنا رکھا ہے تم نے...... کل شیخ صاحب بھی یہی بات کہہ رہے تھے کہ مائدہ ہم لوگوں سے کھنچی کھنچی سی کیوں رہتی ہے؟"

اماں اس کے قریب اس کے بستر پہ ہی بیٹھ گئی تھیں اور مائدہ کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔

"ایسی تو کوئی بات نہیں ہے اماں کام ہی تو کر رہی ہوتی ہوں آپ کے سامنے......" اس نے ان کی بات ٹالی۔

"میں کاموں کی بات نہیں کر رہی، اکیلے بیٹھے رہنے کی بات کر رہی ہوں، ہمارے پاس بھی تو بیٹھ سکتی ہو......، باتیں کر سکتی ہو، ہمیں بھی خوشی ہو گی، یا پھر یہ کہو کہ تم شیخ صاحب کو ابھی بھی غیر سمجھتی ہو، انہیں باپ نہیں سمجھتیں......؟"

اماں آج اس کے پاس گلے شکوے لے کر آئی تھیں جن کو سن کے مائدہ کے دل پہ ہاتھ پڑا تھا۔ جی چاہا وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دے اور اپنے اندر کا سارا غبار نکال دے لیکن اسے پتا تھا کہ اماں اس وقت شیخ صاحب کی حمایت میں بول رہی ہیں، اس لیے اس نے اگر کچھ بھی کہا تو انہیں ناگوار لگے گا لہٰذا وہ نہ چاہتے ہوئے بھی خاموش ہی رہی مگر اس کی روح کے آنسو اس کے دل پہ گرنے لگے۔

"اب کیا بات ہے چپ کیوں ہو گئی ہو؟" انہوں نے اسے خاموش دیکھ کر دوبارہ متوجہ کیا۔

"کچھ نہیں اماں! بس ایسے ہی اتنے دنوں سے ایک بات سوچ رہی تھی، اگر آپ میرا ساتھ دیں تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔"

اس نے کہتے ہوئے بے ساختہ ان کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیے تھے، اماں نے اس کے انداز پہ چونک کر حیرت سے اسے دیکھا۔

"کیسی بات......؟" وہ حیرانی سے پوچھ رہی تھیں۔

"اماں پلیز! میری بات کا برا مت ماننا، مگر میں گھر میں رہ رہ کر بور ہو گئی ہوں مجھے ڈپریشن ہونے لگا ہے، میں تھوڑا ٹائم گھر سے باہر گزارنا چاہتی ہوں۔ میں جاب کرنا چاہتی ہوں، آپ یہ مت سمجھیں کہ میں یہ جاب اپنی کوئی ضرورتیں یا خواہشیں پوری کرنے کے لیے کرنا چاہتی ہوں میں خود اعتماد ہونا چاہتی ہوں، میرے اندر اعتماد کی کمی ہے، میں یہ کمی دور کرنا چاہتی ہوں۔ اماں! میں دنیا کے قدم قدم سے ملا کر چلنا چاہتی ہوں، پلیز اماں! اگر میں اسی ایک چار دیواری میں رہی تو ایک روز میرا دم گھٹ جائے گا اور آپ کو اس کمرے میں میری لاش ملے گی۔ پلیز مجھے اجازت دے دیں...... مجھے کھل کے سانس لینے دیں، مجھے جینے دیں پلیز۔"

اس نے روہانسے لہجے میں کہتے ہوئے جیسے التجا کی تھی اور اماں اس کا چہرا دیکھتی رہ گئیں۔ وہ اس کی اس انوکھی فرمائش پہ حیران پریشان تھیں۔

"یہ کیا کہہ رہی ہو تم......؟" وہ پریشانی سے گویا ہوئی تھیں۔

"اماں! میں اپنی حالت، اپنے دل کی بات اور کس سے کہوں کی سوائے آپ کے......؟ پلیز آپ میری بات سمجھنے کی کوشش کریں، میرے پاس تعلیم ہے، عقل ہے، شعور ہے، مجھے اپنی عقل اور شعور کا استعمال کرنے دیں، پلیز اماں مجھے روکیے مت۔"

"یہ اچانک بیٹھے بیٹھے کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ یہ بھی کوئی تک ہے بھلا......؟" انہوں نے خفگی سے کہتے ہوئے اس کے ہاتھوں سے اپنے ہاتھ چھڑا لیے تھے۔

"اماں! یہ میں نے اچانک بیٹھے بیٹھے نہیں سوچا، بلکہ یہ سب سوچتے ہوئے تو مجھے مہینے ہو گئے ہیں بس میں ڈرتی تھی کہ آپ کو میری جاب کی فرمائش بری لگے گی لیکن آپ میری ماں ہیں، آپ میری خواہش پوری نہیں کریں گی تو اور کون کرے گا...... آپ کی ایک "ہاں" میری بے سکون زندگی میں سکون بھر دے گی پلیز۔"

مائدہ اتنی جذباتی ہو رہی تھی کہ اس نے ماں کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے تھے اور اماں ششدر سی ہو کر دیکھنے لگیں۔

"دیکھو مائدہ! تم جانتی ہو کہ میں شیخ صاحب کو بتائے بغیر کوئی کام نہیں کرتی، اس لیے وہ گھر آتے ہیں تو ان سے بات کرتی ہوں۔ وہ مان گئے تو کر لینا جاب، اگر نہ مانے تو ضد مت کرنا۔ میں ان کے ساتھ بحث و تکرار نہیں کر سکتی۔" وہ خفگی سے کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

"اماں! میں آپ کی بیٹی ہوں، شیخ صاحب کی نہیں۔ مجھے آپ نے اجازت دینی ہے اور مجھے آپ کی ہی اجازت کی ضرورت ہے، وہ اجازت دیں یا نہ دیں مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

مائدہ بالآخر کہہ ہی گئی تھی اور اماں یکدم پلٹ کے اسے تعجب بھری بے یقین نظروں سے دیکھنے لگیں آج وہ انہیں مسلسل حیران کر رہی تھی۔

"کیا کہا تم نے......؟" ان کی حیرانی ان کے لہجے سے بھی جھلک رہی تھی۔

"کچھ غلط نہیں کہہ رہی...... میں آپ کی بیٹی ہوں یہی حقیقت ہے میرے اچھے برے کا خیال آپ کو ہونا چاہیے شیخ صاحب کو نہیں آپ ان سے اجازت طلب نہیں کریں گی صرف یہ بتائیں گی کہ میں جاب کرنا چاہتی ہوں اور آج یا کل میں جاب کی تلاش شروع کر دوں گی۔"

"مائدہ! کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ کیسی عجیب عجیب باتیں کر رہی ہو۔ تم ہوش میں تو ہو ناں......؟"

"اماں! میں ہوش میں ہوں لیکن آپ نہیں ہوں۔ جوان بیٹی کی ماں ہیں آپ لیکن پھر بھی نادان ہیں۔ باقی ماؤں کی طرح آنکھیں اور کان کھلے رکھا کریں جوان بیٹیوں کی مائیں غافل نہیں رہتیں۔ ہر وقت چوکس اور چوکنا رہتی ہیں، سمجھ ہی نہیں رہیں، میں آخر ایسا کہوں کہ ساری حقیقتیں آپ پہ واضح ہو جائیں......" مائدہ کہتے کہتے بے بسی سے جھنجلا گئی تھی۔

"تمہارا مطلب ہے کہ میں کم عقل ہوں، نادان ہوں...... تمہارا دھیان نہیں رکھتی؟" انہیں اس کی بات پہ اچنبھا ہوا تھا۔

"جی بالکل میں نے یہی کہا ہے۔" اس نے سر ہلا کر اعتراف کیا تھا اور اماں دنگ رہ گئی تھیں۔

"مائدہ تم اپنی ماں کو ایسا......"

"آئی ایم سوری اماں! آپ کی کم عقلی اور نادانی نے آج مجھے بولنے پہ مجبور کر دیا ہے ورنہ آپ خود عقل مند ہوتیں تو میرے کہے بنا ہی سب کچھ سمجھ جاتیں، مجھے یہ نہ جتانا پڑتا کہ اماں! زیادہ دیر گھر سے باہر مت رہا کریں مجھے ڈر لگتا ہے۔ اماں! رات کو نیند کی گولی کھا کر نہ سویا کریں ورنہ مجھے نیند نہیں آتی آپ نیند کی گولی کھا کے سوتی ہیں میری نیند اڑ جاتی ہے۔ ساری ساری رات جاگ کے گزار دیتی ہوں، کبھی نہا دھو کر نئے کپڑے نہیں پہنتی، الجھے الجھے شکن آلود کپڑوں اور میلے کچیلے حلیے میں کیوں پھرتی ہوں؟ زیادہ ہنستی نہیں ہوں زیادہ باتیں نہیں کرتی ہوں، کمرے سے باہر نہیں بیٹھتی ہوں، چپ رہتی ہوں، سوچ میں گم رہتی ہوں، آخر کیوں......؟ کبھی جاننے کی زحمت کی آپ نے......؟ کئی بار کہا اماں! میں صرف آپ کی بیٹی ہوں شیخ زمان کی نہیں۔ میری فکر میں آپ جاگا کریں، شیخ زمان کیوں جاگتا ہے بھلا......؟"

وہ اماں کے کندھوں پہ دونوں ہاتھ رکھتے ہوئے بولی اور یکدم پھٹ پڑی تھی اور حلیمہ بی بی کے قدموں تلے سے جیسے زمین سرک گئی تھی۔ ان کا وجود جیسے کسی نے دھجیوں میں اڑا دیا تھا۔ وہ مائدہ کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہی تھیں اور مائدہ زیادہ دیر ان کے سامنے کھڑی نہ رہ سکی۔ وہاں سے نکل آئی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ اپنے آفس روم میں بیٹھا کچھ ضروری فائلز چیک کر رہا تھا جب اس کے کمرے کا دروازہ کھلا۔

"مے آئی کم ان سر......؟" اس نے حسام کی آواز پہ چونک کے سر اٹھایا۔ وہ دروازے میں کھڑا اجازت طلب کر رہا تھا۔

"کم ان......" اس نے آہستگی سے سر ہلایا۔

"تھینک گاڈ! اندر آنے کی اجازت تو ملی، ورنہ تمہاری شکل دیکھ کر تو یہی لگ رہا تھا کہ تم منع کر دو گے۔"
حسام دروازے کا ہینڈل چھوڑ کے اندر آ گیا تھا۔
"کیا میرے منع کرنے سے تم واپس چلے جاتے؟" افگن اپنے سامنے رکھی فائل کے بے ترتیب پڑے پیپرز سمیٹنے لگا۔
"بالکل نہیں" حسام نے نفی میں گردن ہلائی اور اطمینان سے کرسی پہ بیٹھ گیا تھا۔
"تو پھر میں تمہیں منع کیوں کرتا؟ جب تم نے میرے منع کرنے کے باوجود بھی واپس نہیں جانا تھا۔" افگن نے کہتے ہوئے فائل ایک طرف رکھ دی۔
"دیکھ لو، مجھے تم سے کتنی محبت ہے۔ تمہارے منع کرنے کے باوجود بھی تمہیں چھوڑ کے واپس نہیں جاتا۔" حسام نے مسکرا کے کہا تھا لیکن افگن افروز کے سرد و سپاٹ چہرے کے تاثرات اور بھی سرد ہو گئے تھے۔ اس کے چہرے پہ تناؤ آ گیا تھا۔
"محبت کا نام نہ لو اور جو جی چاہے کہہ لو......" اس نے سپاٹ سے لہجے میں کہا اور انٹرکام پہ حسام کے لیے چائے آرڈر کی تھی۔
"یعنی کہ تمہاری ایک محبت کھوئی ہونے سے ہماری ساری محبتیں کھوئی ہو گئی ہیں...... ہماری اپنائیت، ہمارا خلوص، ہماری چاہت سب بیکار ہے تمہاری نظر میں......؟ تم نے ہماری محبت کو اس محبت سے مشروط کر دیا ہے جو تمہارے لیے کبھی تھی ہی نہیں، جس نے تمہیں دولت پر سے وار کے ایک سائیڈ پہ رکھ دیا ہے۔"
حسام کو اس کی بات بری لگی تھی اس لیے تلخی سے اسے حقیقت کا آئینہ دکھا گیا، جس پہ افگن افروز بری طرح بلبلا اٹھا تھا۔
"بکواس بند کرو اپنی۔"
"بکواس بند ہو سکتی ہے مگر حقیقت نہیں اور حقیقت یہی ہے کہ تم ابھی تک لکیر پیٹ رہے ہو، تم نے برباد کر لیا ہے خود کو......" حسام باز آنے والا نہیں تھا۔
"میں برباد ہوا ہوں ناں، آپ لوگوں کو کیا تکلیف ہے؟ کبھی تمہیں، کبھی دادی بی کو اور کبھی کسی اور کو۔" وہ یکدم چیخ اٹھا، اسے دادی بی کا صبح والا رویہ یاد آ گیا تھا۔
"مگر تمہیں یہ احساس ہو جائے ناں کہ ہمیں کیا تکلیف ہے تو تم یہ سوال ہی نہ کرو، مگر افسوس تو اس بات کا ہے کہ تمہیں احساس ہی نہیں ہے اور ہاں اس غلط فہمی میں مت رہنا کہ تمہاری بربادی پہ کسی اور کو بھی تکلیف ہو گی، ہونہہ! ایسا ہرگز نہیں ہے۔ تمہاری بربادی پہ اگر کسی کو تکلیف ہوتی ہے تو وہ صرف میں ہوں یا پھر دادی بی ہیں، کسی تیسرے کا سوچنا بھی مت......!"
حسام طنزیہ اترا ہوا تھا اور افگن افروز کا اس کی باتوں پہ خون کھول رہا تھا۔ اس موضوع پہ آ کر اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ لوگوں کی زبانیں کھینچ لے یا پھر ان کی گردنیں اڑا دے۔ اس معاملے میں وہ بہت بے رحم اور سفاک ہو جاتا تھا۔
افگن افروز کا سیل فون بجنے لگا تھا۔
"ہیلو......!" آواز اور انداز سپاٹ تھا۔
"صاحب! میں رشید بات کر رہا ہوں ہسپتال سے، بڑی بیگم صاحبہ کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے، بہت بری حالت ہے ان کی، آپ جلدی سے آ جائیں صاحب۔"
افگن افروز کے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی تھی اور یوں لگا کہ اس بلڈنگ کا ملبہ پورے کا پورا اس کے سر پہ آ گرا ہو......
دونوں آگے پیچھے تیز رفتاری سے دھڑا دھڑ سیڑھیاں اترتے پارکنگ میں پہنچے تھے......
دادی بی کی تکلیف کا خیال ہی اس کے لیے سوہان روح ثابت ہو رہا تھا اور اس کے اپنے جسم سے جیسے جان نکلی جا رہی تھی۔ اور یہ سوچ الگ کچوکے لگا رہی تھی کہ وہ دولت کے رویے سے ناراض تھیں اس سے اگر ناراضی میں انہیں کچھ ہو جاتا تو......؟ افگن کا دل ڈوبنے لگا تھا۔

☼ ☼ ☼

پورے چوبیس گھنٹے ہو گئے تھے افگن اور حسام کو آئی سی یو کے باہر انتظار کرتے ہوئے اس نے آئی سی یو میں داخل ہوتے ڈاکٹر اظفر کو بازو سے پکڑ کے روک لیا تھا۔
"دیکھیے ڈاکٹر! میں آپ سے معذرت چاہتا ہوں میں اور زیادہ انتظار نہیں کر سکتا، اگر دادی بی کی حالت آپ لوگوں کے کنٹرول سے باہر ہے تو آپ مجھے ابھی بتا دیں میں انہیں کہیں اور شفٹ کرا لیتا ہوں۔"
"مبارک ہو مسٹر افگن! آپ کی دادی بی اب خطرے سے باہر ہیں۔" وہ ڈاکٹر اظفر سے کچھ کہہ ہی رہا تھا کہ اتنے میں آئی سی یو کا دروازہ کھلا اور ڈاکٹر رضوان نے آ کر اسے دادی بی کی زندگی کی نوید سنائی تھی، جس پہ ڈاکٹر اظفر بے ساختہ مسکرا دیے تھے اور اللہ کا شکر ادا کیا تھا۔
"لیکن آئی ایم سوری! آپ کی دادی بی اب چل نہیں سکتیں، ان کی ٹانگیں بہت متاثر ہوئی ہیں۔"
ڈاکٹر رضوان کی اگلی بات نے افگن افروز کے آس پاس کئی دھماکے کر ڈالے تھے۔ وہ اک جھٹکے سے ان کی سمت پلٹا تھا۔
"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"
"مسٹر افگن! ہمیں بہت افسوس ہے اس بات کا، لیکن ہمیں شکر ادا کرنا چاہیے کہ ان کی زندگی تو بچ گئی ہے نا، ورنہ ایسے شدید ایکسیڈنٹ کے بعد ان کے بچنے کی ہرگز امید نہیں تھی۔"
وہ اسے سمجھا رہے تھے اور افگن پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔
"افگن بیٹھو یہاں......" حسام نے آگے بڑھ کے اسے بازو سے تھاما۔ لیکن افگن ضبط نہ کر سکا۔ اس کے آنسو بہہ نکلے تھے......! زندگی میں پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ وہ رویا تھا۔

☼ ☼ ☼

"میں آپ سے ایک بات کرنا چاہتی تھی۔" شیخ زمان کھانا کھا رہا تھا۔ جب حلیمہ بی بی چارپائی پہ ان کے قریب ہی آ بیٹھیں۔
"کہو، کیا بات کرنی ہے......؟" وہ اجازت دیتے ہوئے بولے۔
کچن کے دروازے سے لگی کھڑی مائدہ کا دل دھڑکنے لگا تھا، اسے پورا یقین تھا کہ شیخ زمان اس کی جاب کا سن کر بھرپور مخالفت کریں گے......
"میں کئی دنوں سے سوچ رہی تھی کہ مائدہ پورا دن گھر میں اکیلی اور فارغ بیٹھی رہتی ہے اس لیے بہتر ہے کہ وہ بے کار بیٹھنے کے بجائے کوئی جاب کر لے، آپ کا کیا خیال ہے اس بارے میں......؟"
حلیمہ بی بی نے بات کرتے ہوئے اپنی نظریں پوری طرح سے شیخ زمان پہ ہی جما رکھی تھیں۔ لہجہ بے حد مضبوط اور بے لچک تھا، فیصلہ کن اور دو ٹوک۔
"کیا کہا......؟" شیخ زمان کا ہاتھ منہ میں نوالہ ڈالتے ہوئے وہیں کا وہیں ٹھہر گیا تھا، "مائدہ جاب کرے گی؟"
"جی! ہاں۔"
"کیوں؟" شیخ زمان کے تیور بدل گئے تھے۔
"کیونکہ میں چاہتی ہوں وہ گھر پہ اکیلی اور فارغ نہ بیٹھے۔" آج ان کا لہجہ اور آواز دبے دبے اور دھیمے سے نہیں تھے۔ وہ ایک ماں تھیں اور جب ایک ماں اپنے بچوں کے لیے اپنے موقف پہ ڈٹ جائے تو اسے اس کے موقف سے ہٹانا دنیا کا مشکل ترین کام بن جاتا ہے۔
"کیوں؟ کیا اس جیسی دوسری لڑکیاں گھروں میں اکیلی اور فارغ نہیں بیٹھی ہوئی...... یا پھر یہ کہو کہ وہ گھر سے باہر گھومنا پھرنا چاہتی ہے؟"
شیخ زمان کو اپنا شکار ہاتھوں سے نکلتا ہوا محسوس ہوا تھا تب ہی تو وہ گھٹیا طنز پہ اتر آئے تھے۔
"زبان سنبھال کے بات کریں شیخ صاحب! آپ کی بیٹی ہے وہ۔" حلیمہ بی بی نے بیٹی پہ زور دیا۔
"میری بیٹی ہوتی تو مجھ سے پوچھ کے کام کرتی...... دونوں ماں بیٹی نے اندر ہی اندر سب کچھ طے کر لیا اور مجھے اب بتا رہی ہو؟"
انہوں نے غصے سے کہتے ہوئے ہاتھ میں پکڑا ہوا نوالہ واپس ٹرے میں پھینک دیا تھا اور کچن میں کھڑی

مائدہ کا دل اچھل کر حلق میں آگیا اسے پتا تھا کہ اب ضرور کوئی نہ کوئی ہنگامہ برپا ہو گا۔

"خبردار! کوئی نہیں کرے گی نوکری ووکری' اسے کہو اونچی ہواؤں میں اڑنے کے خواب چھوڑے اور گھر میں بیٹھے' باہر نکلے گی تو لوگ سو سو باتیں بنائیں گے کہ شیخ زمان اپنی سوتیلی بیٹی کو دو وقت کی روٹی بھی نہیں کھلا سکتا..... کیا لوگوں کے سامنے میری ناک کٹوانا چاہتی ہو تم دونوں؟" شیخ زمان آپے سے باہر ہو رہا تھا اور حلیمہ بی بی اس کے تاثرات نوٹ کر رہی تھیں۔

"اچھا! اب آپ کی ناک کٹ رہی ہے اور جب حرا جاب کرتی تھی تب آپ کی ناک نہیں کٹتی تھی؟" حلیمہ بی بی نے شیخ زمان کی بیٹی کا نام لیا جسے وہ ایک سال پہلے شادی کر کے رخصت کر چکا تھا۔

"وہ بچی تھی' کم عقل تھی نوکری کرنے کا شوق تھا اسے' مجبوراً" مجھے اس کی بات ماننا پڑی۔" شیخ زمان نے ذرا سنبھلتے ہوئے جواب دیا۔

"یہ بھی بچی ہے' کم عقل ہے' اسے بھی شوق ہے اور مجبوراً" تمہیں اس کا شوق پورا کرنا ہی پڑے گا۔ آپ زیادہ پریشان نہ ہوں' میں نے مائدہ سے کہہ دیا ہے وہ بس کچھ عرصہ ہی جاب کرے گی اور اس کے بعد میں اس کی شادی کر دوں گی' جیسے حرا اور فرح کی کی تھیں اچھے اور پڑھے لکھے گھرانوں میں۔"

حلیمہ بی بی نے شیخ زمان کو جتایا اور وہ لب بھینچ کے رہ گیا۔

حلیمہ بی بی کہہ کے وہاں سے اٹھ گئی تھیں۔

✲ ✲ ✲

"آخر آپ جا کہاں رہی تھیں؟" افگن افروز دکھ سے جھنجلایا ہوا تھا۔

"عالیہ سے ملنے۔" وہ پلکیں موندتے ہوئے آہستگی سے بولی تھیں اور افگن نے چونک کر ان کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔

"عالیہ سے ملنے.....؟"

افگن افروز کی آواز جیسے کسی کنویں سے سنائی دی تھی۔ "مگر کیوں؟"

دادی بی کی بند پلکوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور افگن ششدر سا ان کے بوڑھے اور جھریوں زدہ چہرے کی سمت دیکھ رہا تھا۔

"بھیک مانگنے جا رہی تھی تمہاری آزادی کی' اس سے کہنا تھا کہ میرے پوتے کو مزید برباد نہ کرو۔ خود چلی گئی ہو تو اپنی یادیں بھی لے جاؤ' کیوں چھوڑ گئی ہو برباد کرنے کے لیے.....؟ تاکہ وہ تمام عمر انہی یادوں میں تڑپ تڑپ کے جیتا رہے اور میں..... میں اپنے پوتے کو دیکھ کر تڑپتی رہوں..... ہونہہ! مگر..... میں تو اس سے بھیک بھی نہیں مانگ سکی۔ میری ٹانگوں نے میرا ساتھ ہی نہیں دیا' مجھے راستے میں ہی روک لیا ہے' لیکن کوئی بات نہیں زندگی میں ایک بار اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کے اپنے پوتے کی آزادی ضرور مانگوں گی چاہے وہ کہیں بھی ملے....." انہوں نے جیسے عہد کیا تھا۔

"نہیں دادی بی! ہرگز نہیں' آپ ایسا کچھ نہیں کریں گی جس سے میری شخصیت کا کوئی کمزور پہلو نظر آئے' میں اس کے سحر میں نہیں اس کے قہر میں قید ہوں۔ اس نے کیا سوچ کر میرے ساتھ بے وفائی کی.....؟ کیا میں کچھ بھی نہیں تھا.....؟ میں پاگل ہوتا ہوں تو صرف یہ سوچ سوچ کے کہ کیا افگن افروز اتنا ارزاں تھا کہ وہ دولت کی چمک دمک میں اسے دیکھ ہی نہیں پائی..... وہ دولت جسے محبت کرنے والے ہاتھوں کا میل کہہ کر ٹھکرا دیتے ہیں اور عالیہ نے اسی ہاتھوں کے میل کو سینے سے لگا لیا.....؟"

وہ اندر سے دکھی ہو رہا تھا' جب ہی تو دادی بی سے سب کہہ رہا تھا۔

"اگر وہ ہاتھوں کے میل کو سینے سے لگانے والی عورت تھی تو تم کیوں اسے سوچ سوچ کے اپنا خون جلاتے ہو.....؟"

"وہ ہاتھوں کا میل نہیں تھی دادی بی! وہ میری ذات پہ لگا ایک گہرا دھبہ تھی' وہ جب سے دور گئی ہے یہ دھبہ اور بھی نمایاں ہو گیا ہے اور میں اس دھبے کی وجہ سے چھپاتا پھر رہا ہوں' میں نے اپنی ذات پہ خول چڑھا لیا ہے تاکہ کسی کو کچھ نظر نہ آئے..... اور اس کوشش میں افگن افروز خود کہاں گم ہو گیا ہے یہ تو میں بھی نہیں جانتا۔" افگن افروز پژمردہ سا دادی کے سامنے بیٹھا تھا۔

✲ ✲ ✲

عصر کا وقت ہو رہا تھا اور حلیمہ بی بی اپنے گھر کے صحن میں پریشان اور بے کل سی ٹہل رہی تھیں۔ سارا دھیان مائدہ کی طرف لگا ہوا تھا وہ صبح نو بجے کی نکلی تھی اور اس وقت شام ہو رہی تھی نجانے اسے کہیں نوکری ملی بھی تھی یا نہیں..... اپنی عزت محفوظ رکھنے کی خاطر نجانے کہاں کہاں دھکے کھاتی پھر رہی تھی تاکہ وہ شیخ زمان کے خوف سے بچی رہے اور اس کی گندی اور غلیظ نظروں سے اپنے آپ کو کچھ دیر دور رکھ سکے اور اس کوشش میں وہ صبح سے شام کر چکی تھی اور ابھی تک گھر نہیں آئی تھی.....!

وہ برآمدے میں جھانک کر دیوار سے لگے کلاک پہ ٹائم دیکھ رہی تھیں جب دروازے پہ اچانک دستک ہوئی تھی۔

لیکن سامنے مائدہ کے بجائے ان کی ایک جاننے والی کھڑی تھیں۔

"کیسی ہو حلیمہ! اندر نہیں آنے دو گی؟" نسرین آپا اور حلیمہ بی بی کے آپس میں کافی اچھے تعلقات تھے دونوں ایک دوسرے کو کافی قریب سے جانتی تھیں اور ایک دوسرے کے حالات بھی سمجھتی تھیں۔

"ٹھیک ہوں آؤ اندر آؤ۔" وہ سامنے سے ہٹ گئیں۔

"کیا بات ہے حلیمہ کچھ پریشان سی لگتی ہو؟" نسرین آپا پہلی نظر میں ہی حلیمہ بی بی کے چہرے کی پریشانی بھانپ چکی تھیں۔

"تم بیٹھو تو سہی' میں پانی لے کر آتی ہوں۔" حلیمہ بی بی انہیں چارپائی پہ بٹھا کر باورچی خانے کی طرف بڑھیں۔

"ارے نہیں حلیمہ! پانی وانی کی کوئی ضرورت نہیں ہے میں افگن صاحب کے گھر سے ابھی پانی پی کر ہی آئی ہوں۔ بیگم صاحبہ کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ جان تو بچ گئی لیکن چلنے پھرنے سے معذور ہو گئی ہیں' آج ہسپتال سے گھر آئی ہیں' میں نے سوچا میں بھی جا کر ان کی عیادت کر آؤں' جتنا عرصہ ان کے گھر کام کیا' انہوں نے کبھی یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ وہ مالک ہیں اور میں ملازم۔ انہوں نے ہمیشہ برابری کا سلوک کیا ہے' اپنے ساتھ بٹھا کر کھانا کھلاتی تھیں۔ آج ان کی تکلیف دیکھی نہیں گئی مجھ سے۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے' اللہ اپنے بندوں کے کیسے کیسے امتحان لیتا ہے؟"

"اوہ!" انہوں نے گہری سانس کھینچی تھی۔ حلیمہ بی بی جانتی تھیں کہ نسرین نے افگن صاحب کے گھر میں کافی عرصہ کام کیا ہے۔

"اب تم بتاؤ کہ تمہیں کیا ہوا ہے' تم کیوں پریشان ہو؟" ان کی توجہ دوبارہ حلیمہ بی بی کی طرف مبذول ہو چکی تھی۔

"وہ میں دراصل مائدہ کے لیے پریشان تھی وہ صبح سے نوکری کی تلاش میں نکلی ہوئی ہے اور ابھی تک نہیں آئی۔" انہوں نے بالآخر بتا ہی دیا تھا۔

"مائدہ نوکری کی تلاش میں.....؟" نسرین آپا کو اچنبھا ہوا۔

"جی! وہ صبح سے شام تک گھر میں فارغ بیٹھی رہتی ہے جب تک حرا کی شادی نہیں ہوئی تھی تب تک تو ٹھیک تھی لیکن اب اکیلی اور فارغ رہ رہ کر اکتا گئی ہے اس لیے میں نے کہا کہ وہ کہیں نوکری کر لے۔" حلیمہ بی بی سب کو یہی باور کرا رہی تھیں کہ مائدہ کو جاب کرنے کے لیے انہوں نے خود کہا ہے۔

"مائدہ کے لیے جاب کے علاوہ بھی کچھ سوچا ہے یا نہیں؟" نسرین آپا نے ان کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

"آپا! اس وقت اصل مسئلہ اس کی جاب ہے' اسے جاب مل جائے تو میں مطمئن ہو جاؤں گی اور سہولت سے اس کے لیے رشتہ تلاش کر سکوں گی بلکہ اس کام

میں آپ کو بھی میرا ساتھ دینا ہوگا۔"

"ارے! ضرور ساتھ دوں گی تم اس کام میں ہاتھ تو ڈالو۔ جوان بیٹی کو کب تک گھر میں بٹھا کے رکھو گی؟" نسرین آپا انہیں کافی اچھا اور مخلصانہ مشورہ دے رہی تھیں۔

"السلام علیکم اماں.....!" اتنے میں کھلے دروازے سے مائدہ بھی اندر چلی آئی تھی، حلیمہ بی بی نے چونک کے اسے دیکھا۔

"ارے تم آ گئیں؟ اتنی دیر کیوں لگا دی تھی .....اب تو دل ہولنے لگا تھا۔" حلیمہ بی بی فوراً" اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی تھیں۔

"مجھے گھر سے باہر ڈر نہیں لگتا اماں!" مائدہ اپنی چادر اتارتے ہوئے بولی، پھر نسرین کو دیکھ کر انہیں سلام کرتے ہوئے ان کی سمت جھکی تھی انہوں نے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا تھا۔

"وعلیکم السلام! جیتی رہو، خوش رہو..... کہیں نوکری ملی؟" وہ نرمی سے پوچھ رہی تھیں۔

"ارے خالہ! آج کل نوکری کا ملنا بھی ایسے ہو گیا ہے جیسے کسی ڈگری کا ملنا، جس کے لیے چار چار سال محنت کرنا پڑتی ہے۔ صبح شام دھکے کھانا پڑتے ہیں۔ اپنا خون جلانا پڑتا ہے، بھوک اور دوسروں کی باتیں برداشت کرنا پڑتی ہیں اور میرا تو ابھی پہلا دن ہے؟" وہ تلخی سے سر جھٹکتے ہوئے بولی تھی۔

"تم پریشان نہ ہو اللہ بہتر کرے گا۔" نسرین آپا کچھ سوچتے ہوئے اس کا سر تھپک کر کھڑی ہو گئیں، پھر دعا سلام کے بعد وہاں سے رخصت ہو گئیں۔ پیچھے وہ دونوں ماں بیٹی سوچ میں گم اور پریشان بیٹھی تھیں۔

☆ ☆ ☆

"عیشال! عیشال!" افگن افروز ڈائننگ روم میں کھڑا عیشال کو آوازیں دے رہا تھا لیکن وہ نجانے کہاں غائب ہو چکی تھی۔

"جج.....جی صاحب جی.....؟" وہ فوراً" بھاگی بھاگی آئی تھی۔

"کہاں تھیں تم؟ تمہیں پتا بھی ہے کہ میں آفس سے لیٹ ہو رہا ہوں اور تم نے ابھی تک ناشتہ بھی نہیں لگایا۔" افگن اپنی کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھتے ہوئے عیشال پہ غصہ نکال رہا تھا۔

"سوری صاحب جی! میں بیگم صاحبہ کو ناشتا کروا رہی تھی۔ میں نے سوچا آپ ابھی سو رہے ہیں اس لیے ناشتا ذرا لیٹ بناؤں گی۔"

"اف.....! تم بھی کمال کی چیز ہو۔" وہ اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے بریف کیس اٹھا کے باہر نکل گیا۔ اب یہاں کھڑے رہ کر ناشتا تیار ہونے کا انتظار کرنا فضول تھا۔ اسے ٹھیک دس بجے ایک میٹنگ کرنا تھی اس لیے تیز تیز قدم اٹھاتا اپنی گاڑی کی سمت بڑھ رہا تھا جب نسرین آپا کی آواز پہ اسے ٹھہرنا پڑا تھا.....

"سنیے صاحب جی۔" وہ بھی تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی گاڑی کی دوسری طرف سے گھوم کے اس کے سامنے آ گئی تھیں۔

"جی کہیے.....؟" وہ پینٹ کی جیب سے گاڑی کی چابی نکالتے ہوئے ان کی سمت متوجہ ہوا تھا۔

"وہ دراصل کل آپ اور حسام صاحب کسی لڑکی کے لیے بات کر رہے تھے جو بیگم صاحبہ کی دیکھ بھال کر سکے، ان کا خیال رکھے اور انہیں اچھی طرح سنبھال سکے۔" نسرین آپا نے جلدی جلدی اپنی بات شروع کی۔

"وہ اچھا! تو آپ کی نظر میں کوئی لڑکی ہے.....؟"

"جی ہاں صاحب! بہت اچھی لڑکی ہے جیسی آپ چاہتے ہیں ویسی ہی ہے، اپنے کام سے کام رکھنے والی سمجھ دار اور خاموش طبع ہے۔ نفاست پسند بھی ہے گھر کا ہر کام جانتی ہے۔" نسرین آپا نے فوراً" مائدہ کی خوبیاں بیان کی تھیں۔

"ہوں! ٹھیک ہے آپ اس لڑکی کو کل صبح سات بجے بھیج دیجیے گا۔ میں اس سے مل لوں گا مناسب لگی تو کل ہی اسے کام پہ رکھ لوں گا۔"

"ٹھیک ہے صاحب! مہربانی آپ کی۔" نسرین آپا سر ہلا کر سامنے سے ہٹ گئیں اور افگن گاڑی نکال

لے گیا تھا اسے آفس پہنچنے کی جلدی تھی۔

☆ ☆ ☆

شیخ زمان ناشتا کرنے کے بعد اپنی دکان پہ جانے کے لیے گھر سے نکلا تو مائدہ بھی عجلت سے گھر کے کام نپٹا کر جاب کی تلاش میں نکلنے کے لیے تیار ہونے لگی۔

"اماں! دعا کرنا مجھے آج کام مل جائے، یوں جگہ جگہ دھکے کھانا بھی اچھا نہیں لگتا۔" وہ اپنے بالوں کو سلجھا کر کیچو میں جکڑتے ہوئے بولی۔ دروازے میں کھڑی حلیمہ بی بی اسے ہی دیکھ رہی تھیں۔

"ان شاء اللہ مل جائے گا کام۔" انہیں اپنے رب پہ پورا بھروسا تھا اسی لیے یقین سے بولی تھیں۔ اتنے میں باہر کا دروازہ بجنے لگا۔

"یہ صبح صبح کون آ گیا؟" حلیمہ بی بی حیرانی سے کہتی ہوئی باہر آئیں اور دروازہ کھول دیا۔

"ارے نسرین.....؟" انہیں نسرین کو دیکھ کر اور بھی حیرانی اور تعجب ہوا تھا۔

"اتنی حیران کیوں ہو رہی ہو.....؟ کیا میں نہیں آ سکتی.....؟"

"ارے نہیں آپا! یہ بات نہیں ہے آپ اتنے اتنے دن ادھر کا چکر نہیں لگاتیں اس لیے کہہ رہی ہوں، کیونکہ ابھی کل شام کو ہی تو آپ آئی تھیں اور میں سوچ رہی تھی اب مہینے ڈیڑھ مہینے بعد ہی آپ کی شکل دیکھنا نصیب ہوگی۔" وہ سامنے سے ہنستے ہوئے بولیں اور نسرین آپا اندر آ گئیں۔

"بس مائدہ کی وجہ سے کھنچی چلی آئی ہوں، کہاں ہے وہ.....؟"

"مائدہ کی وجہ سے.....؟ کیا مطلب ہے آپ کا.....، خیر تو ہے؟" حلیمہ بی بی اب تو ذرا ذرا سی بات پہ چونک جاتی تھیں۔

"جو میں نے پوچھا ہے وہ بتاؤ ناں.....؟"

"جی! وہ اندر تیار ہو رہی ہے۔"

"اچھا! مائدہ کو بلاؤ۔" انہوں نے کہا اور برآمدے میں بچھے تخت پہ بیٹھ گئی تھیں۔

"مائدہ.....!" انہوں نے وہیں کھڑے آواز دی تھی۔

"باہر آؤ تمہاری خالہ آئی ہیں۔ تم سے کوئی کام ہے شاید۔"

"جی ابھی آئی۔" وہ اندر سے بولی۔

"السلام علیکم خالہ!" خیریت صبح صبح کیسے رستہ بھول گئیں۔" مائدہ نے بھی آتے ہی حیرانی ظاہر کی تھی۔

"ارے پگلی! بیٹھ ادھر، کل شام سے ہی تمہارے کام کے لیے سوچ رہی تھی، پھر صبح ہوتے ہی تمہارے کام کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئی۔"

"میرے کام کے لیے.....؟"

"ہاں! تمہارے کام کے لیے، اب تم بتاؤ کہ تمہارے لیے کام کرنا ضروری ہے یا پھر....."

"میرے لیے کام کرنا ضروری ہے چاہے کام کوئی بھی ہو۔" مائدہ درمیان میں ہی بول پڑی تھی۔ اس کا لہجہ اور انداز بے حد سنجیدہ تھے۔

"افگن صاحب کی دادی بی بی کی دیکھ بھال کرو گی؟" انہوں نے سنجیدگی سے سوال کیا۔

"یہ کیسا کام ہے؟" مائدہ کو اچنبھا ہوا۔

"ارے بیٹا! ایسے کام ہزاروں مجبور اور ضرورت مند لڑکیاں کر رہی ہیں۔ اتنا بڑا گھر ہے ان کا، بیگم صاحبہ بالکل اکیلی ہوتی ہیں۔ افگن صاحب صبح آفس کے لیے نکلتے ہیں اور شام کو واپس آتے ہیں بلکہ یوں کہو کہ رات کو واپس آتے ہیں۔ گھر میں چوکیدار، مالی، ڈرائیور اور ایک ملازمہ بھی ہے لیکن وہ بے چاری اکیلی بیگم صاحبہ کو اور گھر کو نہیں سنبھال سکتی، اس لیے افگن صاحب چاہتے ہیں کہ کوئی اچھی اور سمجھ دار لڑکی ملے تو وہ اسے بیگم صاحبہ کی دیکھ بھال اور تیمارداری پہ مامور کر دیں۔ وہ تو خود بڑی ہشاش بشاش اور چاق و چوبند خاتون تھیں لیکن اس نامراد ایکسیڈنٹ نے انہیں بستر سے لگا دیا ہے۔ بڑی نفاست پسند طبیعت کی ہیں، اسی لیے وہ چاہتے ہیں کہ کوئی سلیقہ مند لڑکی ملے اور تنخواہ بھی اچھی دیں

گے۔"

"تو کیا وہ مجھے کام پہ رکھ لیں گے؟" مائدہ نے جیسے یقین چاہا۔

"ہاں کیوں نہیں رکھیں گے بھلا۔۔۔ میں ابھی ان ہی سے بات کر کے آئی ہوں وہ آفس کے لیے نکل رہے تھے میں نے تمہارے لیے بات کی تو کہنے لگے کہ کل صبح سات بجے بھیج دینا' تم جا کر ان سے مل لینا اور ساتھ میں یہ بھی بتا دینا کہ میں نے تمہیں بھیجا ہے۔" انہوں نے مائدہ کو تفصیل سے سمجھایا۔

"سچ خالہ! مجھے کام مل جائے گا ناں؟"

مائدہ نے ان کے ہاتھ تھام لیے تھے۔ اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ ہی نہیں تھا کہ وہ اس گھر کی چار دیواری سے چند گھنٹوں کے لیے آزاد ہو رہی ہے اس کا مقصد یہاں سے نکلنا تھا ورنہ اسے کام سے تو کوئی غرض نہیں تھی' شیخ زمان کی نظروں سے چھپنا چاہتی تھی اور یوں بھی اس کی تعلیم زیادہ نہ تھی۔ اسے کسی بڑے دفتر میں مشکل سے ہی ملازمت ملتی۔

"ہاں ہاں! مل جائے گا پگلی!" انہوں نے اثبات میں سر ہلایا تھا اور مائدہ بے ساختہ ان کے گلے لگ گئی تھی۔

✵ ✵ ✵

وہ صبح فجر کے وقت بیدار ہوئی وضو کر کے نماز پڑھنے کھڑی ہو گئی۔ وہ نماز پڑھ کے دعا مانگ رہی تھی جب اس کے کمرے کا دروازہ ہلکی سی آہٹ سے کھلا اور بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی۔ مائدہ نے اپنی بند آنکھیں کھولتے ہوئے یکدم گردن موڑ کے اپنے پیچھے دیکھا تو اک سنسنی سی پورے جسم میں سرایت کر گئی اس کے لب دعا کرنا بھول گئے وہ شیطان اس کے قریب آ چکا تھا۔

"آہ۔۔۔!" تکلیف کے مارے اس کے منہ سے اک شدید قسم کی آہ نکلی تھی اسے جائے نماز سے بالوں سے پکڑ کے اٹھایا اور اسے خونخوار نظروں سے دیکھا۔

"تم کیا سمجھتی ہو کہ اس طرح نوکری کر کے اور گھر سے باہر رہ کر تم مجھ سے بچ جاؤ گی یا پھر وہ تمہاری بے وقوف ماں تمہیں مجھ سے بچا لے گی۔۔۔؟ ہونہہ! بھول ہے تم دونوں ماں بیٹی کی تمہارے لڑکپن سے لے کر تمہاری جوانی تک تم پہ میرا جتنا بھی خرچ ہوا ہے' وہ ایک بار تم سے وصول کر کے ہی رہوں گا۔ بس انتظار کرو کہ یہ ہوتا کب ہے۔۔۔؟ اور ہاں اب اگر اپنی ماں کو کچھ بتایا تو یاد رکھنا کھڑے کھڑے اسے طلاق دے کر گھر سے باہر کر دوں گا میں اگر اسے برداشت کر رہا ہوں تو صرف تمہاری وجہ سے۔ نوکری کرو' بے شک کرو' لیکن مجھ سے بچنے کے خواب مت دیکھو' ورنہ آنکھیں نکال دوں گا۔۔۔ سمجھیں تم۔۔۔؟"

اس نے اک جھٹکے سے اس کے بال چھوڑے۔ وہ کافی غیر متوازن قدموں پہ کھڑی تھی' سیدھی جائے نماز پہ عین سجدے کی جگہ جا گری تھی اس کا سر زور سے زمین سے ٹکرایا اور وہ چکرا گئی۔۔۔ اس نے اپنے چکراتے ہوئے سر کو تھاما' وہ وہیں جائے نماز پہ بیٹھی اپنے گھٹنوں میں منہ دیے پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی تھی۔

"اے اللہ! اگر مجھ سے کوئی غلطی' کوئی گناہ ہو گیا ہے تو مجھے معاف فرما دے۔ مجھے اس شیطان سے بچا لے اے اللہ! میری عزّت و ناموس کی حفاظت تیرے ذمے ہے۔ میرا دامن داغ سے بچانا بے شک تو اپنے بندوں کو ان کی برداشت سے زیادہ نہیں آزماتا۔"

وہ گھٹنوں میں منہ چھپائے کافی بلند آواز میں روتے ہوئے اپنے رب کے آگے فریاد کر رہی تھی اور شیخ زمان جیسا شیطان یہ نہیں جانتا تھا کہ یہ وقت قبولیت کا وقت ہوتا ہے۔۔۔!

✵ ✵ ✵

"کیا بات ہے مائدہ تم روتی رہی ہو؟" حلیمہ بی بی اس کی سوجی ہوئی متورم آنکھیں دیکھتے ہی بھانپ گئیں کہ وہ روئی ہے۔

"نہیں۔" اس نے سختی سے انکار کر دیا۔

"تو پھر تمہاری آنکھیں اور چہرا۔۔۔؟"

"آپ مجھے لیٹ نہ کریں' جلدی سے ناشتا دیں' مجھے نکلنا بھی ہے۔" وہ ٹائم دیکھتے ہوئے عجلت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی تھی۔

"اکیلی چلی جاؤ گی افگن صاحب کے گھر۔۔۔؟"

"ظاہر ہے' کام میں نے اکیلے کرنا ہے تو میں نے اکیلے ہی جانا ہے نا۔" وہ لاپروائی سے کہتی ہوئی ان کی بات ٹال گئی تھی۔

اس نے جلدی جلدی دو چار لقمے زہر مار کیے اور حلیمہ بی بی کو اللہ حافظ کہتے ہوئے باہر نکل آئی۔ شیخ زمان اس کو سولی پر لٹکا کر مزے سے سو رہا تھا۔

✵ ✵ ✵

مائدہ اس گھر کے وسیع و عریض احاطے کو حیران اور مرعوب نظروں سے دیکھتی ہوئی گیٹ کے قریب آئی تھی اور بیل بجا دی۔۔۔ اگلے پانچ سیکنڈ میں اندر سے چوکیدار نمودار ہو گیا۔

"جی فرمائیے' کس سے ملنا ہے؟"

"جی وہ۔۔۔ افگن افروز صاحب سے ملنا ہے۔" مائدہ نے اپنا اعتماد بحال رکھنے کی کوشش کی۔

"کس سلسلے میں ملنا ہے آپ نے؟" چوکیدار پوری معلومات چاہ رہا تھا۔

"وہ دراصل انہیں بیگم صاحبہ کے لیے کسی۔۔۔"

"اوہ اچھا اچھا' میں سمجھ گیا آپ نسرین آپا کی طرف سے آئی ہیں؟" چوکیدار کو بھی شاید پہلے سے پتا تھا۔

"جی! مجھے نسرین خالہ نے ہی بھیجا ہے۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"آئیے! اندر آجائیے' صاحب بھی آپ کا انتظار کر رہے تھے۔" چوکیدار اسے اندر آنے کے لیے راستہ دیتے ہوئے خود پیچھے ہٹ گیا۔ وہ اندر آئی اور چوکیدار کی معیت میں چلتی ہوئی اندر پہنچی اس آدمی کو دیکھتی رہ گئی تولیہ سے بال رگڑتا ہوا انہی کی سمت پلٹا تھا۔

"صاحب!" چوکیدار نے کافی دھیمے اور مؤدب لہجے میں پکارا تھا۔ افگن نے تولیے والا ہاتھ روکتے ہوئے چوکیدار کی سمت دیکھا لیکن اس کے ساتھ ایک اجنبی لڑکی کو دیکھ کر چونک گیا۔

"صاحب! نسرین آپا نے بیگم صاحبہ کے لیے بھیجا ہے انہیں۔" چوکیدار نے تعارف کرایا۔

"اوہ اچھا! ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ انہیں۔ میں دس منٹ میں آرہا ہوں۔"

افگن کا لب و لہجہ نپا تلا سا تھا۔ اس نے ٹیبل پہ رکھا جوس کا گلاس اٹھا کے منہ سے لگا لیا۔ مائدہ افگن افروز کو دیکھتی ہوئی چوکیدار کے ساتھ واپس پلٹ گئی وہ اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر چلا گیا۔ وہ ڈرائنگ روم کا جائزہ لے رہی تھی افگن افروز نے ڈرائنگ روم میں قدم رکھتے ہوئے گلا کھنکار کے اسے متوجہ کیا تو وہ یکدم گڑبڑا کے صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"السلام علیکم۔۔۔!" اسے اچانک سلام کرنے کا خیال آیا تھا۔

"وعلیکم السلام! بیٹھیے۔" افگن نے اسے دوبارہ بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی اس کے مقابل والے صوفے پہ بیٹھ گیا۔

"کیا نام ہے آپ کا؟"

"مائدہ امین!"

"آپ کو پتا ہے کہ آپ کو یہاں کس کام کے لیے بھیجا گیا ہے؟"

"جی! بڑی بیگم صاحبہ کی دیکھ بھال کے لیے۔" اس نے آہستگی سے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

"تو کیا آپ دادی بی کی دیکھ بھال کر سکیں گی؟" وہ اپنے مطلب کے دوٹوک سوال پوچھ رہا تھا۔

"جی کیوں نہیں۔۔۔ اسی لیے تو آئی ہوں۔" مائدہ کا رفتہ رفتہ اعتماد بحال ہو رہا تھا۔

"آپ جانتی ہیں' کسی کی دیکھ بھال کی ذمہ داری اٹھانا آسان کام نہیں ہے؟"

"کسی کو اپنا سمجھ کر یہ ذمہ داری اٹھا لیں تو ذرا بھی مشکل نہیں لگتی' لیکن اگر محض کام سمجھ کر یہ ذمہ داری نبھائی جائے تو واقعی بہت مشکل لگتی ہے۔" مائدہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا تھا۔

"تو آپ کیا سمجھ کر یہ ذمہ داری نبھائیں گی؟" افگن نے مائدہ کے چہرے کی سمت دیکھتے ہوئے پوچھا تھا نظریں کافی گہری تھیں۔

"میں ان کو اپنا سمجھ کر ذمہ داری نبھاؤں گی۔"

"کیوں؟ آپ کا ان کے ساتھ ایسا کیا ریلیشن ہے کہ آپ انہیں اپنا سمجھ کے ذمہ داری نبھائیں گی؟" افگن کا لہجہ اور انداز تیکھا ہو گیا تھا۔

"دیکھیے سر! میرا۔ انسانیت کا رشتہ ہے' آپ مجھے تنخواہ کے نام پہ کچھ بھی نہ دیں میں تب بھی ان کی دیکھ بھال کے لیے آسکتی ہوں' کیونکہ وہ اس وقت بے بسی اور معذوری کے دور سے گزر رہی ہیں۔ انہیں کسی انسان کے سہارے کی ضرورت ہے اور مجھے خوشی ہے کہ ان کی خدمت کے لیے اللہ نے مجھے منتخب کیا ہے' مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔"

"حیرت ہو رہی ہے آپ کی بات پہ۔" افگن نے اپنی حیرت کا برملا اظہار کیا تھا۔

"حیرت کس بات پہ ہے آپ کو......؟"

"آپ کے انسانیت بھرے لیکچر پہ' کیونکہ عورت اپنے مفاد کے بغیر کبھی کوئی کام نہیں کرتی۔" افگن کا لہجہ سرد ہو گیا تھا۔

"آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں...... اپنے مفاد کے بغیر تو کوئی بھی انسان کام نہیں کرتا' صرف عورت پہ ہی الزام کیوں رکھ رہے ہیں آپ؟"

"کیونکہ عورت کو مجھ سے بہتر کوئی نہیں جانتا......" افگن افروز یکدم اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے چبا کر بولا تھا۔

"اور مرد کتنا مفاد پرست ہے' یہ مجھ سے بہتر کوئی نہیں جانتا۔"

مائدہ بھی اپنے اندر کی تلخی چھپا نہیں پائی تھی۔ اس کا جی چاہا ایک پل میں افگن افروز پہ مرد کی مردانگی اور کرتوتوں کے قصے واضح کر کے رکھ دے لیکن وہ کام کے لیے آئی تھی...... اسی لیے چپ ہو رہی تھی...... اور خاموشی تو دوسری طرف بھی چھائی ہوئی تھی وہ لب بھینچے نجانے کیا سوچ رہا تھا......

"دیکھیے سر! آپ نے جو کہنا ہے کہہ دیجیے ورنہ مجھے اجازت دیں۔"

وہ اپنا بیگ اٹھاتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی تھی لیکن افگن افروز اب اتنا بھی مشتعل نہیں ہوا تھا کہ جس سے کام تھا اسے ہی نکال دیتا۔

"ٹھہریئے مس مائدہ امین!" اس نے مائدہ کے بڑھتے ہوئے قدموں کو روک دیا تھا اور خود صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا...... وہ فیصلہ کر چکا تھا۔

"آپ آج سے ہی اپنا کام جوائن کر سکتی ہیں اور ہاں' آپ نے تنخواہ کتنی لینی ہے' یہ بھی بتا دیجیے گا۔" وہ کہہ کے وہاں رکا نہیں بلکہ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا باہر نکل گیا۔ مائدہ کو افگن افروز کی عجیب سی شخصیت پہ حیرت ہو رہی تھی۔ اس نے تو خالہ نسرین سے بہت تعریفیں سنی تھیں اس کی' اور وہ تو پہلی ملاقات میں ہی کاٹ کھانے کو دوڑ رہا تھا۔ اس کا عجیب و غریب رویّہ اسے حیرت میں ڈال رہا تھا......

☼ ☼ ☼

دادی بی اور مائدہ کی انڈر اسٹینڈنگ ایسی ہوئی کہ وہ دونوں ہی اپنے اپنے غم بھول گئیں اور اک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش میں مگن ہو گئیں۔ دادی بی کو مائدہ کی صورت میں ایک ساتھی اور غم خوار مل گیا تھا وہ دن بھر ان کے ساتھ رہتی ان کی باتیں سنتے ہوئے کام نپٹاتی رہتی تھی اور شام ڈھلے جب وہ واپسی کے لیے رخصت ہوتی تو وہ دونوں ہی اداس ہو جاتی تھیں۔

مائدہ کا گھر واپس جانے کو دل ہی نہیں چاہتا تھا۔ اسے پتا تھا کہ وہ واپس جائے گی تو شیخ زمان کی غلیظ نظروں سے سامنا ہو گا اسی لیے وہ اکثر اپنے ٹائم سے بھی لیٹ ہو جاتی تھی۔ آج بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ مائدہ کا چھ بجے آف ہو چکا تھا لیکن وہ پھر بھی جانے کے لیے تیار نظر نہیں آ رہی تھی۔ دادی بی کو وضو کروا کے وہ خود وضو کرنے چلی گئی' پھر واپس آ کر اس نے بھی نماز کی نیت باندھ لی تھی۔

"السلام علیکم دادی بی!"

افگن دادی بی کے بیڈ روم کا دروازہ کھول کے اچانک اندر داخل ہوا تھا لیکن جیسے ہی دادی بی کے بیڈ کے قریب نظر پڑی۔ اس کے قدم اور الفاظ وہیں تھم گئے تھے۔

"وعلیکم السلام! آؤ بیٹھو......" دادی بی سلام پھیر چکی تھیں اور تسبیح پڑھ رہی تھیں افگن کو دیکھتے ہی فوراً بول پڑی تھیں۔

"ہوں! کیسی ہیں آپ۔" وہ دھیمے اور بھاری قدموں سے چلتا ہوا ان کے قریب آ گیا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" دادی بی نے حیرت سے کہتے ہوئے اسے متوجہ کیا تھا اور افگن بری طرح چونک اٹھا۔ مائدہ سلام پھیر چکی تھی اور اب دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا مانگ رہی تھی۔

"کچھ نہیں! میں صرف یہ سوچ رہا ہوں کہ مس مائدہ امین اپنے وقت سے آدھا گھنٹہ لیٹ ہو چکی ہیں' انہوں نے گھر نہیں جانا؟" افگن کو بھی اس کے لیٹ ہونے کا احساس ہو چکا تھا اسی لیے گھڑی سمت دیکھا تھا۔

"ارے بیٹا! مائدہ تو اکثر ہی لیٹ ہو جاتی ہے۔ مغرب کی نماز میرے ساتھ پڑھ کے گھر واپس جاتی ہے۔"

"اچھا......؟" اسے اچنبھا ہوا تھا۔

"ٹھیک ہے دادی بی! میں اب چلتی ہوں۔" وہ جائے نماز سمیٹ کر چادر اوڑھتی ہوئی ان کے پاس آ گئی تھی۔

"ارے بیٹا! تھوڑی دیر اور ٹھہر جاتیں ہمارے ساتھ کھانا کھا لیتیں۔"

"نہیں دادی بی! کھانا میں اماں کے ساتھ جا کر کھاؤں گی۔ وہ میرا انتظار کر رہی ہوں گی۔ آپ مجھے اجازت دیجیے۔ میں چلتی ہوں۔" اس نے انکار کر دیا تھا۔

"ڈرائیور سے کہو' وہ تمہیں چھوڑ آتا ہے۔ شام کافی گہری ہو چکی ہے۔" "نہیں دادی بی! میں چلی جاؤں گی مہربانی آپ کی۔" مائدہ نے ان کے قریب بیٹھے افگن کو دیکھتے ہوئے انکار کر دیا تھا۔ وہ چپ چاپ ان دونوں کی گفتگو اور اپنائیت بھرے لہجے سن رہا تھا۔

"نہیں بیٹا! شہر کے حالات تو ویسے ہی بہت خراب ہیں' جوان لڑکیوں کا اس وقت اکیلے باہر نکلنا ٹھیک نہیں ہے۔ افگن اٹھو بیٹا! رشید سے کہو مائدہ کو اس کے گھر ڈراپ کر آئے۔" انہوں نے افگن کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"رشید گھر پہ نہیں ہے۔" افگن نے لٹھ مار سا جواب دیا۔

"کیوں کہاں ہے وہ......؟"

"عیشاں کو لے کر ڈاکٹر کے پاس گیا ہوا ہے اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" افگن کو اب دادی بی کے سوال و جواب پہ الجھن ہونے لگی تھی۔

"دیکھو بیٹا! وہ اکیلی اس وقت کیسے جائے...... جوان جہان لڑکی ہے کوئی حادثہ نہ ہو جائے۔ ایسا کرو تم اسے ڈراپ کر دو' بس پانچ دس منٹ کا راستہ ہے' ذرا سی زحمت کر لو۔"

دادی بی نے ڈرائیور کا کام افگن کے کندھوں پہ ڈال دیا...... لیکن وہ اتنی مروت نبھانے والا نہیں تھا۔

"آئی ایم سوری' یہ کام میرا نہیں ہے۔"

وہ کہہ کے وہاں سے اٹھ گیا تھا اور دادی بی اور مائدہ دیکھتی رہ گئیں۔ دادی بی کو اس سے ایسی بے مروّتی کی ہرگز امید نہیں تھی۔ مائدہ کو پتا تھا کہ دادی بی کو افگن افروز کے رویے پہ شرمندگی ہوئی ہے اسی لیے وہ انہیں شرمندگی کے احساس سے نکالنے کے لیے کافی نارمل اور لاپرواہ سے انداز میں مخاطب ہوئی تھی۔

"افگن صاحب ٹھیک ہی تو کہہ رہے ہیں دادی بی! ڈرائیور ہوتا تو اور بات تھی۔ اب وہ کہاں مجھے ڈراپ کرنے کے لیے جائیں......؟ انہیں تنگ کرنے سے بہتر ہے میں خود ہی چلی جاؤں' وہ بھی تو آفس سے تھکے ہوئے آئے ہیں۔"

"لیکن مائدہ اس نے......"

"ڈونٹ وری دادی بی......! انہوں نے ایسا کچھ بھی نہیں کہا جو مجھے یا آپ کو برا لگے۔ تھکن کے باعث

بندے کا مزاج ایسا ہو ہی جاتا ہے' میں آسانی سے گھر چلی جاؤں گی آپ فکر نہ کریں۔ اپنا خیال رکھیے گا' اللہ حافظ۔"

وہ انہیں سمجھا کر تسلی دیتی ہوئی باہر نکل آئی تھی لیکن باہر آکر اس کے قدم ست پڑ گئے تھے اور اس کے قدموں کی سستی ٹیرس میں کھڑے افگن افروز سے چھپی ہوئی نہیں رہ سکی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ یہاں سے جانا نہیں چاہتی تھی لیکن کسی مجبوری کی وجہ سے جا رہی تھی۔ اس نے دوبار ٹھہر کر' پلٹ کر اس گھر کو دیکھا۔ اور بڑی حسرت بھری نظروں سے دیکھا پھر آگے بڑھ کر دروازہ عبور کر گئی۔ افگن افروز کو اس کا انداز سمجھ میں نہیں آیا تھا وہ الجھ سا گیا تھا.....!

☼ ☼ ☼

اندھیرے کے باوجود سڑک الیکٹرک پول اور گاڑیوں کی روشنیوں میں جگمگا رہی تھی مائدہ پیدل چلتی ہوئی رہائشی ایریا سے نکل کر فٹ پاتھ پہ آگئی تھی۔ اس کے قدم اب بھی ست روی سے اٹھ رہے تھے۔ اس کا دل چاہتا تھا وہ دن رات گھر سے باہر رہے تاکہ ایک پل کے لیے بھی شیخ زمان کی نظروں کا سامنا نہ ہو..... لیکن لاکھ کوششوں کے باوجود بھی ایسا ہوتا نہیں تھا۔ وہ شیطان تو جیسے دروازے پہ ہی نظریں جمائے بیٹھا ہوتا تھا..... مائدہ وہ اپنے دھیان میں گم چلی جا رہی تھی جب اسے لگا جیسے کہ شیخ زمان نے اسے پکارا ہے..... اس نے اپنا وہم سمجھ کر سر جھٹک دیا تھا۔

"مائدہ! گاڑی میں بیٹھو' میں تمہیں ہی لینے کے لیے آیا ہوں۔" دوبارہ شیخ زمان کی آواز سنائی دی تو اس نے یکدم کرنٹ کھا کے دیکھا تھا۔ شیخ زمان پرانے ماڈل کی اپنی پھٹیچر سی گاڑی میں بیٹھا اسے مخاطب کرتے ہوئے بیٹھنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ لیکن یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ مائدہ اس کے ساتھ اکیلی گاڑی میں بیٹھ جاتی..... اسے تو سوچ کے ہی جھرجھری سی آگئی تھی۔

"میں چلی جاؤں گی۔"

"مجھے پتا ہے چلی جاؤ گی لیکن میرے ساتھ جانے میں کیا حرج ہے۔"

"میں نے کہا ناں چلی جاؤں گی خود۔" مائدہ چبا کر بولی تھی۔

"بہت پر نکل آئے ہیں تم دونوں ماں بیٹی کے' کاٹ کے رکھ دوں گا۔ آرام سے گاڑی میں بیٹھو۔ تمہاری بکواس سننے نہیں آیا۔ تمہاری ماں نے بھیجا ہے مجھے۔"

شیخ زمان گاڑی سے نکل آیا اور مائدہ گھبرا گئی کہ آس پاس کے لوگ کیا سوچیں گے..... یہاں کوئی تماشا نہ بن جائے۔

"آپ کو میری ماں بھیجے یا میرا باپ' میں آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔" اس نے نفرت سے کہتے ہوئے منہ پھیر لیا تھا۔

"تمہارا تو باپ بھی جائے گا۔ کیسے نہیں جاتیں تم....." شیخ زمان نے غصے سے مشتعل ہوتے ہوئے مائدہ کی کلائی دبوچ کر اسے گاڑی کی سمت کھینچا تھا اور پھر مائدہ کی برداشت جواب دے گئی۔ اس نے شیخ زمان کے لمس پہ پاگل ہوتے ہوئے ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے منہ پر دے مارا۔ اور اس سے پہلے کہ شیخ زمان غیض و غضب میں آکر جواباً کوئی کارروائی کرتا مائدہ اس کی گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑا کر یکدم بھاگ کھڑی ہوئی۔ اور ایسی اندھا دھند بھاگی کہ اس نے پیچھے پلٹ کر دیکھنے کی بھی زحمت نہیں کی۔ اور یونہی بھاگتے بھاگتے اسے ہوش اس وقت آیا جب وہ اپنے گھر کے سامنے پہنچ گئی تھی۔ اس نے دروازہ دھڑا دھڑ پیٹ ڈالا۔

"اماں دروازہ کھولو۔" اس کی آواز ہانپ رہی تھی اور سانس پھولی ہوئی تھی۔

"اماں۔" اس نے دروازہ زور زور سے دھڑ دھڑایا تھا۔

"اللہ خیر کرے کیا ہو گیا ہے بھئی.....؟" حلیمہ بی بی نے دروازہ کھولتے ہوئے دہل کے کہا تھا اور مائدہ نے اندر داخل ہو کر اپنے پیچھے دروازہ بند کر دیا تھا۔

"ارے کیا ہو گیا ہے بیٹا مجھے کچھ بتاؤ تو سہی.....؟" حلیمہ بی بی بھی گھبرا گئی تھیں۔

"اماں!..... وہ' وہ شیخ زمان..... وہ میں نے اسے۔" مائدہ کی سانس پھولی ہونے کی وجہ سے بات بھی بے ربط سی تھی۔

"کیا ہوا ہے شیخ صاحب کو.....؟" حلیمہ بی بی الجھ گئیں۔

"اماں! وہ مجھے گاڑی میں....." مائدہ وہیں دروازے کے قریب ہی ڈھے گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

حلیمہ بی بی کے گھبراہٹ کے مارے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے تھے۔ وہ بھی اس کے قریب ہی بیٹھ گئی تھیں۔

"مائدہ! بتاؤ ناں کیا ہوا ہے' میرا دل گھبرا رہا ہے؟"

"اماں! میں نے انہیں تھپڑ مار دیا ہے۔ وہ..... وہ زبردستی مجھے گاڑی میں بٹھا رہے تھے' میں نے انکار کر دیا تو میری کلائی پکڑ کر کھینچنے لگے' مجھے کچھ سمجھ نہیں آیا کہ میں کیا کروں..... اس لیے غصے میں۔"

وہ کہتے ہوئے رو پڑی اور حلیمہ بی بی ساکت بیٹھی رہ گئیں۔ ان کا دماغ سن ہو چکا تھا۔ انہیں اپنی زندگی اور اپنی بیٹی کی عزت خطرے میں نظر آ رہی تھیں اور بچاؤ کا کوئی راستہ نہیں تھا.....!

☼ ☼ ☼

"لگتا ہے تم ساری رات سوئی نہیں ہو' یا پھر روتی رہی ہو....." وہ دادی بی کو اخبار سنانے کے لیے بیٹھی تو دادی بی نے اچانک سوال داغ دیا تھا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے دادی بی! آپ نیوز سنیں۔" مائدہ کی آواز کافی بوجھل ہو رہی تھی۔

"نہیں! مجھے وہ نیوز سناؤ جو تمہارا چہرہ اور تمہاری آنکھیں سنا رہی ہیں۔" دادی بی اپنی بات پہ جم چکی تھیں۔

"میرے پاس کچھ اچھا نہیں ہے سنانے کے لیے۔" مائدہ کا سر جھک گیا تھا۔

"اچھا تو اس اخبار میں بھی نہیں ہے جو تم مجھے سنانے کے لیے بیٹھی ہو۔"

"ہاں تو یہی سمجھ لیں کہ میری نیوز آپ کو اس اخبار کی کسی سرخی سے ہی مل جائے گی روز کسی نہ کسی لڑکی کے ساتھ کچھ نہ کچھ ہوتا ہی رہتا ہے' کسی لڑکی کے ساتھ بہنوئی زیادتی کر ڈالتا ہے' کسی لڑکی پہ سوتیلے باپ کی بری نظر ہوتی ہے' کوئی اجتماعی زیادتی کا شکار ہو جاتی ہے کسی کو اغوا کر لیا جاتا ہے اور کسی کو....."

"مائدہ.....؟" دادی بی اسے درمیان میں ہی روک چکی تھیں وہ بلا کی ذہین تھیں انہیں نیوز سمجھ آچکی تھی۔

"دادی بی سب کچھ سمجھ چکی تھیں۔ مائدہ ان کے قدموں میں آ بیٹھی تھی اور ان کے گھٹنے پر سر رکھ کے تڑپ تڑپ گئی تھی۔

"میرے اماں' ابا نے اپنی پسند سے شادی کی تھی اس لیے خاندان میں کسی نے بھی ان کا ساتھ نہیں دیا۔ وہ دونوں اکیلے رہتے تھے لیکن میری پیدائش کے آٹھ سال بعد ابا کی وفات ہو گئی اور اماں اکیلی رہ گئیں دو تین سال وہ ادھر ادھر کرائے کے مکانوں میں دھکے کھاتی رہیں لیکن ایک بیٹی کے ساتھ وہ کب تک خوار ہو سکتی تھیں' انہیں کسی کے سہارے اور سر پہ چھت کی ضرورت تھی اس لیے انہوں نے اپنے آپ کو اور اپنی بیٹی کو محفوظ رکھنے کے لیے شیخ زمان سے شادی کر لی۔ شیخ زمان کی اپنی بھی دو بیٹیاں تھیں جنہیں اماں نے ہمیشہ مجھ سے بھی زیادہ پیار دیا۔ جب تک وہ رہیں' سب ٹھیک تھا' جیسے ہی ان کی شادیاں ہوئیں' شیخ زمان کی نظریں غلیظ سے غلیظ تر ہوتی گئیں۔ راتوں کو اماں دوا کھا کر سو رہی ہوتیں تو شیخ زمان میرے کمرے کا دروازہ کھولنے کی کوششوں میں لگ جاتا۔ اماں گھر سے باہر نکلتیں تو وہ تنہائی ڈھونڈنے لگ جاتا اور میں اپنی عزت چھپا چھپا کر ہلکان ہو جاتی ہوں' اسی لیے میں نے نوکری کر لی تاکہ مجھے سارا دن گھر پہ نہ رہنا پڑے لیکن کل شام کو جب میں واپس جا رہی تھی تو وہ اچانک کہیں سے آگیا اور مجھے ساتھ چلنے کا کہنے لگا اور میں نے اس کی زبردستی پہ اس کے منہ پہ تھپڑ مار دیا تھا' جس پہ مجھے

توقع امید تھی کہ وہ مجھے اور اماں کو گھر آ کر خوب تنگ کرے گا، مارے گا، ہنگامہ اٹھائے گا، لیکن اس نے کچھ نہیں کیا، وہ کل رات سے خاموش ہے۔ پتا نہیں اب اس کی خاموشی کے پیچھے کیا راز ہے؟ کیا کرے گا وہ...... کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔"

مائدہ روتے ہوئے سب کچھ بتا گئی تھی اور دادی بی گم صم سی ہو کر رہ گئیں۔ ان کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہوئے تھے۔ مائدہ کے آنسوؤں سے ان کا گھٹنا بھیگ چکا تھا......

☼ ☼ ☼

"مائدہ بی بی......!" عیشاں کی آواز پہ سوپ بناتی مائدہ نے پلٹ کر پیچھے دیکھا۔

"ہوں کہو......" اس نے دوپٹے سے ہاتھ پونچھتے ہوئے کہا۔

"صاحب نے آپ کو اپنے کمرے میں بلایا ہے۔" عیشاں نے پیغام پہنچایا۔

"صاحب نے......" مائدہ چند ثانیے کے لیے ٹھٹک سی گئی۔ پھر اگلے ہی لمحے وہ خود کو سنبھالتی افگن کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ وہ پہلی بار اوپر اس کے کمرے کی طرف آئی تھی اس لیے جھجک بھی ہو رہی تھی لیکن کچھ دیر کے لیے شرم و جھجک کو بالائے طاق رکھ کر اس نے دروازے پہ اک اعتماد بھری دستک دے ڈالی۔

"لیس کم ان۔" اندر سے سنائی دینے والی آواز گمبھیر اور بے انتہا سرد تھی۔ مائدہ کو اس آواز کا سرد پن اپنے جسم و جان میں سرایت کرتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ وہ اپنی تمام تر ہمتیں مجتمع کرتی دروازہ دھکیل کر اندر چلی آئی وہ اپنے کمرے میں زخمی شیر کی مانند ادھر ادھر ٹہل رہا تھا اس کے ہاتھ کی انگلیوں میں سلگتا سگریٹ اس کے غصے کی نشاندہی کر رہا تھا۔

"السلام علیکم......" مائدہ نے سلام کیا لیکن وہاں سے سلام کا جواب نہ آیا۔

"بیٹھیے مس مائدہ امین!" اس نے ضبط کرتے ہوئے کافی طنزیہ سے انداز میں صوفے کی سمت اشارہ کیا تھا۔

"تھینک یو سر!" وہ شکریہ ادا کرتے ہوئے صوفے پہ بیٹھ گئی تھی۔

"یقیناً" آپ کو پتا ہو گا کہ میں نے آپ کو یہاں کس لیے بلایا ہے......؟" وہ سگریٹ کا گہرا کش لیتے ہوئے سگریٹ کو ایش ٹرے میں مسل چکا تھا۔

"جی! پتا ہے مجھے۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"لیکن آپ کو یہ نہیں پتا کہ میں آپ کی ساری چال بازی سمجھتا ہوں۔" افگن کے لب و لہجے میں نفرت اور حقارت تھی۔ مائدہ نے یکدم چونک کے اسے دیکھا تھا۔

"چال بازی......"

"ہاں چال بازی، جو آپ نے دادی بی کے سامنے کھیلی ہے، خود کو مظلوم اور غریب ظاہر کرتے ہوئے۔"

"سر! میں اگر کوئی چال بازی کر رہی ہوں تو دعا کرتی ہوں میرا رب مجھے ابھی ابھی اس کی سزا دے دے اور دادی بی کے سامنے میں نے صرف اپنی زندگی کی کتاب کھول کے رکھی ہے اب اس کتاب کو پڑھ کے ان کے دل میں کیا خیال آیا ہے...... اور کیوں آیا ہے اس کے بارے میں میں بھلا کیا کہہ سکتی ہوں؟ اس میں میرا کیا قصور ہے۔ آپ کو اگر یہ سب منظور نہیں تو انکار کر دیجیے۔ آپ کسی کے پابند یا محتاج تو نہیں ہیں ناں۔ محتاج تو مجھ جیسے اور دادی بی جیسے لوگ ہوتے ہیں، جو کسی کے آسرے اور سہارے پہ جی رہے ہوتے ہیں۔"

مائدہ کا لہجہ بے بسی لیے ہوئے تھا۔

"مس مائدہ امین! میں ایموشنل بلیک میل ہونے والا آدمی نہیں ہوں، مجھے زندگی میں صرف ایک عورت نے بلیک میل کیا ہے، اس کے بعد دوبارہ نہیں ہو سکتا۔" وہ یکدم غرا کے بولا تھا۔

"تو آپ کیوں ہو رہے ہیں ایموشنل...... آپ نے جو بھی کام کرنا ہے ٹھنڈے دل و دماغ سے کریں۔"

"میں ٹھنڈے دل و دماغ سے کیسے کر سکتا ہوں سب؟ جبکہ دادی بی آپ کے حق میں بول رہی ہیں۔"

"ان کی بات ٹالنا کون سا مشکل ہے آپ کے لیے۔"

مائدہ کے اطمینان سے کہنے پہ وہ اور بھی مشتعل ہو گیا۔ اس نے صوفے کے ہتھے پہ ہاتھ جما کر مائدہ کی سمت جھکتے ہوئے اسے خونخوار نظروں سے دیکھا تھا۔

"مس مائدہ امین! مجھ سے شادی کرنے کے بعد اپنے عورت ہونے کا ہر روز تاوان بھرو گی تم۔ ہر روز اذیت دوں گا۔ ہر روز تڑپو گی۔ مجھ سے بھاگنے کی کوشش کرو گی اور میں تمہیں بھاگنے نہیں دوں گا......" وہ اک اک لفظ چبا چبا کر ادا کر رہا تھا اور مائدہ کے چہرے پہ اک بے بس سی مسکراہٹ ابھر کر معدوم ہو گئی تھی۔

"مجھے منظور ہے سر!" اس نے سب کچھ سہنے اور برداشت کرنے کے لیے رضامندی دے دی تھی اور افگن افروز اس کے اس فیصلے پہ جیسے یکدم چپ سا ہو گیا۔ مائدہ کے سنہری رنگت والے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے اس نے گہری سانس کھینچی اور سیدھے ہوتے ہوئے پیچھے ہٹ گیا۔

"ٹھیک ہے، آپ نکاح کی تیاری کریں۔"

افگن نے بھی اپنا فیصلہ سنا دیا تھا جب تک دادی بی ٹھیک تھیں، افگن اپنی من مانی کرتا آیا تھا لیکن جب سے وہ ایکسیڈنٹ کے بعد معذوری کا شکار ہوئی تھیں، افگن نے انہیں پریشان کرنا چھوڑ دیا تھا، وہ ان کی بات نہیں ٹالتا تھا اور دادی بی نے اس کی اسی سعادت مندی کا فائدہ اٹھا لیا، انہوں نے افگن کے لیے مائدہ کا انتخاب کر لیا۔ افگن راضی نہیں تھا مگر مائدہ جسے ایک گھر، ایک سائبان، ایک پناہ مل رہی تھی وہ انکار کیسے کرتی اور کیسے پیچھے ہٹتی...... افگن افروز جو بھی تھا، جیسا بھی تھا اسے قبول تھا، کیونکہ وہ اسے اپنا نام دے رہا تھا شیخ زمان سے پناہ دے رہا تھا چاہے غصے میں ہی سہی کم از کم اپنا تو رہا تھا ناں......؟

"تھینک یو......" وہ کہہ کے باہر نکل آئی تھی۔

"مائدہ! کیا کہا افگن نے؟" دادی بی کو عیشاں نے بتا دیا تھا کہ مائدہ افگن صاحب کے کمرے میں گئی ہے اس لیے وہ اسی کے انتظار میں تھیں۔

"کہتے ہیں نکاح کی تیاری کریں۔" مائدہ بے حد آہستگی سے بولی تھی۔

"ارے سچ......؟" خوشی کے مارے ان کا چہرہ کھل اٹھا اور مائدہ ان کے قریب بیٹھتے ہوئے ان کے کندھے سے لگ گئی تھی......!

☼ ☼ ☼

حلیمہ بی بی نے فرح اور حرا دونوں کو فون کر کے بلا لیا تھا۔ ان کے شوہر اور بچے بھی ساتھ آئے تھے۔ وہ سب ہی مائدہ کے نکاح پہ بہت خوش تھے اور اپنی اس خوشی کا اظہار بھی کر رہے تھے، البتہ شیخ زمان سب کے درمیان موجود ہوتے ہوئے بھی چپ اور گردن جھکائے بیٹھا تھا۔

"شیخ صاحب آپ کیوں چپ ہیں؟ آپ کی بیٹی رخصت ہو رہی ہے کچھ تو بولیے......؟"

حرا کا شوہر وسیم احمد ان کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے بڑی اپنائیت اور لگاوٹ سے بولا، جس پہ شیخ زمان نے اسے محض اک نظر دیکھا، اور چہرہ دوسری سمت پھیر لیا۔

"آپ کی طبیعت خراب ہے تو آپ کو ڈاکٹر کے پاس لے چلتے ہیں" وہ انہیں بولنے پہ اکسا رہا تھا۔

"میری طبیعت ٹھیک ہے، تم لوگ جو کر رہے ہو، کرتے رہو۔" شیخ زمان نے وسیم احمد کا ہاتھ اپنے کندھے سے جھٹک دیا۔

"ارے شیخ صاحب! آپ تو غصہ ہی کر گئے...... حالانکہ آپ جانتے ہیں کہ آپ غصہ کریں گے تو آپ کی بیٹیوں کی زندگی پہ اثر پڑے گا اور ایک نہیں، دو دو بیٹیوں کی زندگی خراب ہو گئی، طلاق کا ٹیکا سجا کر گھر آ گئیں تو کیا جواب دیں گے لوگوں کو؟"

وسیم احمد غصے سے چبا کر بولا تھا اور شیخ زمان ایک بار پھر چپ ہو گئے تھے۔ دلہن بنی مائدہ امین کو تو یہ خبر ہی

نہیں تھی کہ وسیم احمد اس کے لیے فرشتہ ثابت ہوا ہے۔ اس روز جب وہ شیخ زمان کو تھپڑ مار کے بھاگی تھی۔ وسیم احمد بھی وہیں کھڑا یہ سب تماشا دیکھ رہا تھا۔ شیخ زمان نے مائدہ کے پیچھے بھاگنے کی اور اسے پکڑنے کی کوشش کی تھی لیکن اسے وسیم احمد نے قمیص کے کالر سے پکڑ کے دبوچ لیا تھا وہ ساری صورت حال سمجھ چکا تھا اور اسے یہ بھی اندازہ تھا کہ مائدہ کو یہ تھپڑ مہنگا بھی پڑ سکتا ہے اسی لیے اس نے شیخ زمان کی شیطانیت کے سامنے اس کی بیٹی کو لا کھڑا کیا' سوتیلی بیٹی کو بچانے کے لیے اس کی سگی بیٹی کی دھمکی دی کہ اگر اس نے دوبارہ مائدہ پہ بری نظر ڈالی یا اسے تنگ کیا' یا حلیمہ بی بی کو کچھ کہا تو وہ حرا کو طلاق دے کر گھر بھیج سکتا ہے اور جب باپ کے کرتوت سامنے آئیں گے تو فرح کے سسرال والے بھی اسے نکال باہر کریں گے اور یہی وجہ تھی کہ اس روز سے لے کر آج تک شیخ زمان خاموشی کی بکل مارے پھر رہا تھا۔ کب افگن کا رشتہ آیا کب رشتہ طے ہوا اور کب شادی کا دن سر پہ آن پہنچا ...... اسے اس چیز سے کوئی دلچسپی نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی اس نے کسی کام میں مداخلت کی تھی۔ اللہ کا احسان تھا کہ سب کچھ بخیریت انجام پا گیا تھا جس پہ حلیمہ بی بی اور مائدہ بھی اندر ہی اندر حیران اور بے یقین ہو رہی تھیں مگر ساتھ ساتھ اللہ کا شکر بھی ادا کر رہی تھیں جس نے انہیں سرخرو کر دیا تھا اور وہ باعزت طریقے سے اپنے گھر کو رخصت ہو گئی تھی۔ وسیم احمد کی دھمکی کچھ کم نہیں تھی۔ شیخ زمان اپنی ہوس اور نفس کی آگ میں اپنی بیٹیوں کی زندگی برباد نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے بے بس ہو کر ہاتھ مل تارہ گیا تھا......!

☼ ☼ ☼

وہ مسلسل تین گھنٹوں سے دلہن بنی ایک ہی انداز میں بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھی لیکن وہ اس کے انتظار سے بے خبر اور لاپروا نجانے کہاں گم تھا کہ اپنے بیڈ روم میں آنے کا بھی ہوش نہیں تھا اور مائدہ بھی جیسے تہیہ کیے بیٹھی تھی کہ اس کے دیکھے بنا نہ تو چینج کرے گی اور نہ ہی سوئے گی صبح کے چار بج چکے تھے جب وہ نشے میں غرق بوجھل قدم اٹھاتا ہوا بیڈ روم میں داخل ہوا تھا اور اس کے بے ربط قدموں پہ اس کی دل کی دھڑکنیں بھی بے ربط ہو گئی تھیں۔ اس کے تھکے تھکے اعصاب پہ چھائی نیند ایکدم سے ہوا ہو گئی تھی۔

وہ جو ذرا سا تکیہ کا سہارا لیے بیٹھی تھی اسے دیکھ کر فوراً سیدھی ہو بیٹھی۔ افگن افروز بھی سیدھا بیڈ کی سمت آیا اور اپنا موبائل فون جیب سے نکال کے بیڈ پہ اچھالتے ہوئے خود بھی وہیں ڈھیر ہو گیا تھا۔ مائدہ بیڈ کے وسط میں بیٹھی ہوئی تھی اور وہ بیڈ پہ اس کے سامنے آڑا ترچھا لیٹا ہوا تھا۔ اس نے تو مائدہ کو اک نظر دیکھنے کی بھی زحمت نہیں کی تھی' بلکہ آنکھیں بند کیے جیسے وہیں سونے کی کوشش کر رہا تھا۔

"آپ یہاں آ کر صحیح سے سو جائیں۔ میں اٹھ جاتی ہوں۔" مائدہ نے اسے ڈرتے ڈرتے اور دھڑکتے دل سے مخاطب کیا تھا۔

"اٹھنے کی کیا ضرورت ہے۔ بیٹھی رہو' رات ابھی ختم نہیں ہوئی۔" افگن اپنے بالوں میں ہاتھ پھنساتے ہوئے اٹھ بیٹھا۔

"آپ تھکے ہوئے لگ رہے ہیں سو جائیں۔" مائدہ کو اس کے منہ اور کپڑوں سے اٹھنے والی بو سے اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ ڈرنک کر کے آیا ہے۔

"تم تو نہیں تھکیں ناں؟" افگن نے اپنے ہاتھ سے اس کے گال کو تھپتھپاتے ہوئے کہا تھا اور مائدہ کا چہرہ سرخ پڑ گیا تھا۔

"افگن! آپ یہ کیا......؟"

"مت نام لو میرا۔ برداشت نہیں ہو گا مجھ سے' وہ بھی...... وہ بھی اسی طرح نام لیتی تھی میرا۔ شادی کی پہلی رات بھی اس نے اسی طرح پکارا تھا اپنی...... اپنی محبتوں کے یقین...... جھوٹے یقین دلائے تھے اس نے جھوٹی تھی وہ اور تم بھی جھوٹی ہی ہو اسی کی طرح دھوکے باز' بے وفا اور مرد کی دولت پہ ایمان ہو نہہ......! عورت کو صرف دولت ہی نظر آتی ہے' چاہے وہ افگن

افروز کی ہو یا جمال پیرزادہ کی۔"

افگن نفرت و حقارت سے بول رہا تھا اور مائدہ کا دل وہیں بند ہو گیا' جہاں اس نے اپنی "اس" کا ذکر کیا تھا۔ آج کی رات بھی وہ اسی کا غم منا رہا تھا۔ اسے سامنے بیٹھی سجی سنوری دلہن بنی مائدہ نظر ہی نہیں آ رہی تھی مائدہ کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے کر مسل دیا تھا۔ بے شک اس کی شادی کافی عجیب حالات میں ہوئی تھی لیکن اس سیج پہ آ کر تو اس کے دل کے ارمان بھی وہی ہو گئے تھے' جو باقی عام لڑکیوں کے ہوتے ہیں اور اس کی آمد سے پہلے وہ انہی ارمانوں اور خوابوں کی محفل سجائے بیٹھی تھی..... لیکن اب.....!

"آپ کی طبیعت اس وقت ٹھیک نہیں ہے۔ آپ آرام کریں۔ میں چینج کر کے آتی ہوں۔" مائدہ اپنا دوپٹہ اور لہنگا سنبھالتی ہوئی بیڈ سے اترنے لگی۔

"کچھ نہیں ہوا میری طبیعت کو' میری طبیعت روز ایسی ہی ہوتی ہے۔" افگن نے اس کی کلائی پکڑ کر اسے روک لیا۔

"مطلب..... آپ روز ڈرنک کرتے ہیں؟" مائدہ نے پریشانی سے بے ساختہ کہہ دیا تھا۔

"روز نہیں' بس جب اسے دیکھتا ہوں۔" وہ استہزائیہ ہنسا تھا۔

"تو آج کہاں دیکھ لیا اسے.....؟" حیرت تھی مائدہ سوال پہ سوال کر رہی تھی۔

"تمہارے اس روپ میں' اس کمرے میں' اس بیڈ پہ' ہر جگہ وہی تو نظر آ رہی ہے۔ دھوکے باز' جھوٹی اور مکار عورت..... دل چاہ رہا ہے' اس بیڈ اور کمرے سمیت تمہیں بھی آگ لگا دوں' تم سراپا وہی ہو۔"

افگن افروز نے اسے بالوں سے دبوچ لیا تھا اور مائدہ اپنے لبوں سے ابھرنے والی ہلکی سی آواز بھی دبا گئی تھی۔

"اگر آپ کے سینے میں جلنے والی آگ اسی طرح بجھتی ہے تو بجھا لیں' ماریں مجھے' ٹھنڈا کریں اپنے آپ کو۔" مائدہ نے اسے کھلی چھوٹ دی اور افگن افروز نے اس چھوٹ کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔ اسے اپنی درندگی اور وحشت کا نشانہ بنا کر وہ زیادہ تو نہیں لیکن چند لمحوں کے لیے پرسکون ہو گیا تھا.....!

☆ ☆ ☆

"السلام علیکم دادی بی!" مائدہ فجر کی نماز پڑھنے کے بعد سیدھی ان کے کمرے میں آئی تھی۔

"وعلیکم السلام! جیتی رہو' سہاگن رہو' اتنی جلدی کیوں اٹھ گئیں؟" وہ اس کے سر پہ ہاتھ پھیر کر ماتھے پہ بوسہ دیتے ہوئے بولی تھیں۔

"نماز کے لیے اٹھی ہوں اور مجھے پتا تھا آپ کی نماز اکثر قضا ہو جاتی ہے اس لیے سوچا آپ کو بھی وضو کروا دوں۔" مائدہ کا لہجہ پرسکون تھا۔ بے شک افگن افروز نے رات بھر اسے اذیت دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی لیکن پھر بھی آج زندگی کی نئی صبح کا آغاز کرتے ہوئے وہ مطمئن تھی وہ آزادی کی سانس لے رہی تھی۔ وہ عزت سے سر اٹھا کے چل رہی تھی۔ آج اس پہ کسی نے حق جتایا تھا تو وہ کوئی غیر اور نامحرم نہیں تھا۔ اس کا اپنا شوہر تھا۔

"عیشاں..... عیشاں.....! میرا ناشتا؟" افگن آفس جانے کے لیے تیار ہو کر نیچے آ چکا تھا اور عیشاں کو آوازیں دے رہا تھا مگر ہمیشہ کی طرح وہ سن ہی نہیں رہی تھی۔ اسی لیے اسے خود کچن میں جھانکنا پڑا لیکن وہاں موجود ہستی کو دیکھ کر اس کے الفاظ جامد ہو گئے تھے۔

"آپ بیٹھیں۔ میں ناشتا لے کر آ رہی ہوں۔" وہ پراٹھے بنانے کے بعد سلائس سینک رہی تھی۔ ٹوسٹر بند کرتے ہوئے افگن کی سمت پلٹی تھی۔

"علیشاں کہاں ہے.....؟" افگن نے بات بدل دی۔

"دادی بی کو لینے گئی ہے' وہ بھی ہمارے ساتھ ہی ناشتا کریں گی۔" مائدہ ٹرے اٹھا کر باہر جانے کے لیے آگے بڑھی لیکن دروازہ میں ایستادہ افگن کو دیکھ کر ٹھہرنا پڑا۔

"راستہ دیں پلیز۔" مائدہ نے اسے مخاطب کیا تو وہ یکدم چونک کر سامنے سے ہٹ گیا۔ اتنے میں عیشاں بھی دادی بی کی وہیل چیئر دھکیلتی ہوئی ڈائننگ روم میں لے آئی تھی۔

"گڈ مارننگ.....!" افگن نے آہستگی سے کہا۔

"خوش رہو بیٹا!" دادی بی جواباً" خوش دلی سے بولی تھیں۔

"اتنے تیار شیار ہو کر کہاں جا رہے ہو.....؟" دادی بی نے اسے نک سک سے تیار دیکھ کر فوراً" پوچھا تھا۔

"آفس....." اس کا مختصر سا جواب موصول ہوا۔

"آفس..... کیا آج بھی آفس ضروری ہے؟" وہ حیران ہوئیں۔

"کیوں' آج کیا ہے.....؟" افگن افروز نے یوں حیرانی ظاہر کی کہ دادی بی چاہتے ہوئے بھی کچھ نہ کہہ سکی تھیں۔

"یہ چائے لے لیں دادی بی!" مائدہ نے ان لوگوں کی خاموشی ختم کرنے کے لیے دادی بی کو مخاطب کیا تھا۔

"ہوں.....!" انہوں نے محض ہوں پہ اکتفا کیا اور تھوڑی دیر بعد افگن ناشتا ختم کرتے ہی اٹھ کر چلا گیا تھا دادی بی نے اسے گاڑی تک پیچھے بھیجا تھا لیکن وہ گاڑی نکال لے گیا تھا اور مائدہ سست قدموں سے واپس پلٹ آئی تھی۔

"مائدہ.....!"

"جی دادی جی.....؟"

"ادھر آؤ میری بات سنو۔" انہوں نے اسے اپنے قریب بلایا تھا۔

"رات کو افگن نے تمہیں کچھ کہا تو نہیں؟" وہ اسے کھوج رہی تھیں۔

"کہا ہے۔ کہتے ہیں مجھے افگن مت کہا کرو' کیونکہ وہ بھی افگن ہی کہتی تھی۔" مائدہ نے استہزائیہ انداز میں مسکرا کے کہا۔

"وہ بھی.....؟" دادی بی الجھیں۔

"جی ہاں! آپ بھی تو اسے اچھی طرح جانتی ہیں۔" مائدہ نے ان کے چہرے کی سمت دیکھتے ہوئے کہا اور پھر نظر جھکا کر اپنے ہاتھوں کے ناخنوں سے کھیلنے لگی۔

"ہاں جانتی ہوں۔ اچھی طرح جانتی ہوں اور جتنا میں اسے جانتی ہوں یہ بے وقوف نہیں جانتا' اگر جان لیتا تو اپنی زندگی کو اس طرح روگ لگا کے نہ پھر رہا ہوتا۔ وہ منحوس' کم بخت خود تو چلی گئی لیکن اپنے پیچھے اس کے لیے روگ چھوڑ گئی۔"

دادی بی کا خون کھول رہا تھا۔ چار سال ہو گئے تھے لیکن افگن افروز ان چار سالوں میں ذرا بھی آگے نہیں بڑھا تھا وہیں پہ کھڑا آج تک اس کا غم منا رہا ہے' جہاں وہ اسے چھوڑ کے گئی تھی۔

"کیا اس روگ کا کوئی علاج نہیں ہے دادی بی!؟" مائدہ نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

"ہے ناں علاج' اس دنیا میں ایسی کوئی چیز نہیں ہے۔ جس کا حل نہ ہو' جس کا علاج نہ ہو۔" وہ ذرا سا مسکرائیں۔

"کیا.....؟"

"تم..... اس مرض کا علاج تم ہو' صرف تم۔ تمہیں حوصلے' صبر اور برداشت سے کام لیتے ہوئے اسے اس عورت کے سحر سے نکالنا ہے۔ اسے اپنی طرف مائل کرنا ہے۔ ایک ایسی بیوی بن کے رہنا ہے جیسی وہ چاہتا تھا لیکن وہ نہیں بن سکی' اس لیے اب تمہیں اس کی خواہش پوری کرنی ہے اور مجھے پتا ہے کہ تم میں اچھی بیویوں والے سارے گن موجود ہیں۔" دادی بی اسے تسلی دے رہی تھیں۔

"لیکن دادی بی وہ کہہ رہے تھے کہ وہ بہت زیادہ خوب صورت تھی۔ میں تو اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہوں۔"

"ارے پاگل.....! خوب صورت تو لیلیٰ بھی نہیں تھی' پھر بھی قیس' مجنوں ہو کے رہ گیا تھا۔ تمہیں کس نے کہا کہ تم خوب صورت نہیں ہو۔ جتنی پیاری اور پرکشش تم ہو اتنی تو وہ بھی نہیں لگتی تھی۔"

انہوں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ سے تھپکتے ہوئے کہا تھا اور اس کی ہمت بندھائی تھی اور پھر دو ماہ اس

کے صبر و برداشت میں ہی گزر گئے۔ افگن افروز نے سفاکی اور سرد مہری کی حد کر ڈالی تھی۔ وہ ہر وہ کام کرتا تھا، جس سے مائدہ کو اذیت ہوتی لیکن وہ پھر بھی برداشت کر جاتی تھی، سب سہہ جاتی تھی لیکن آج افگن افروز کا بدلا ہوا رویہ اسے حیران کر رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

جب میرج ہال کے سامنے اس نے گاڑی کو بریک لگائے تو مائدہ نے ٹھٹک کر افگن کی سمت دیکھا مگر وہ اس کی طرف دیکھے بغیر گاڑی سے اتر گیا تھا۔ مجبوراً سر جھٹک کر مائدہ کو بھی اترنا پڑا۔ وہ پچھلی سیٹ سے گفٹ اٹھا کے گاڑی لاک کرتا ہوا ایک طرف آکھڑا ہوا تھا اور مائدہ اپنے چکراتے دماغ کو سنبھالتی ہوئی بمشکل اس کے قریب آئی تھی۔

"افگن......!" اس نے آگے بڑھتے افگن کو بے ساختہ پکارا تھا اور اس کے قدم تھم گئے تھے۔

"ہوں......؟"

"م...... مجھے چکر آرہے ہیں۔" اس نے ہاتھ میں پکڑے ٹشو سے اپنی پیشانی پہ آیا پسینہ پونچھا۔ اچانک گاڑی سے اترتے ہی اس کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔

"اندر چلو، میں ویٹر سے پانی منگواتا ہوں۔"

افگن پارکنگ میں نصب روشنیوں میں اس کے چہرے کی حالت نوٹ کر چکا تھا، اسی لیے کچھ سخت کہنے سے پرہیز کیا تھا۔

"لیکن افگن! میرا پورا جسم کانپ رہا ہے۔" مائدہ کی تو جیسے ٹانگوں میں جان ہی نہیں رہی تھی اور اوپر سے اس نے ہیل پہن رکھی تھی، جس کی وجہ سے چلنا بھی دشوار ہو رہا تھا۔ افگن نے بے اختیار آگے بڑھ کے اسے اپنے بازو میں تھام لیا تھا۔

"مائدہ! تم ٹھیک تو ہو......؟ کیا ہوا ہے تمہیں؟" افگن پریشان ہونے لگا۔

"مجھے پانی پلادیں پلیز......" مائدہ پوری کی پوری اس کے سہارے پہ کھڑی تھی یوں جیسے بے جان ہو چکی ہو۔

"چلو اندر......" افگن اسے سہارا دیے اندر کی طرف بڑھا۔ حسام انہیں دور سے ہی دیکھ کر لپک کے پاس آیا۔

"افگن! خیریت بھابھی کو کیا ہوا ہے......؟" وہ پریشانی سے پوچھ رہا تھا۔

"کچھ نہیں بس راستے میں ہی طبیعت خراب ہو گئی ہے۔" افگن نے ہاتھ میں پکڑا گفٹ حسام کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

"تم انہیں اندر لے آؤ۔ میں ڈاکٹر کو بلاتا ہوں۔"

اور پھر افگن اور حسام اسے میرج ہال کے میک اپ روم میں لے آئے۔ حسام کی امی بھی وہیں آگئی تھیں۔ ڈاکٹر اس میرج ہال میں ہی دستیاب ہو گیا تھا۔

"یہ شادی شدہ ہیں......؟" ڈاکٹر نے حسام کی امی کو دیکھا۔

"جی! یہ اس کے ہزبینڈ ہیں۔" انہوں نے سیاہ تھری پیس سوٹ میں ملبوس افگن افروز کی سمت اشارہ کیا۔

"تو پھر مبارک ہو آپ کو، آپ پاپا بننے والے ہیں۔" ڈاکٹر صاحب مائدہ کی نبض اور بلڈ پریشر چیک کرنے کے بعد کھڑے ہو گئے تھے اور افگن کو مبارک باد سے نوازا تھا۔

لیکن افگن تو جیسے گم صم سا ہو گیا تھا جبکہ حسام نے خوشی سے بھرپور نعرہ لگایا تھا۔

"اوئے مبارکاں یار مبارکاں! میں چاچا بننے والا ہوں...... آج تو ڈبل ڈبل خوشیاں منائی جائیں گی۔"

حسام، افگن کے گلے لگ گیا تھا۔ اس کی امی مائدہ کو مبارک دے رہی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب کے دیے ہوئے انجکشن اور پانی پینے کے بعد مائدہ کی طبیعت کچھ سنبھل گئی تھی اس کا بی پی لو ہو گیا تھا، اسی وجہ سے اس کا جسم اور ٹانگیں کانپ رہی تھیں لیکن اب طبیعت کافی بہتر ہو چکی تھی......

"حسام! تم باہر آؤ مہمان آرہے ہیں اور تمہارے ڈیڈی بھی تمہارا ہی پوچھ رہے ہیں۔" حسام کی امی اسے اشارہ کرتے ہوئے باہر نکل گئیں اور حسام اس کا کندھا تھپک کے ان کے پیچھے ہی نکل گیا۔

مائدہ کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور افگن کی نظریں اس پہ جمی ہوئی تھیں۔ اتنی بڑی خوشخبری سننے کے بعد بھی عجیب سی صورت حال تھی۔ وہ دونوں ہی خاموش سے ہو گئے تھے۔

"اٹھو ہم بھی نیچے چلیں......" افگن نے گہری سانس کھینچتے ہوئے سر جھٹکا اور قدم باہر کی سمت بڑھا دیے۔

"افگن......!" مائدہ نے ایک بار پھر اسے پکارا۔ اس کے قدم ٹھہر گئے۔

"آپ خوش نہیں ہیں ناں......؟" مائدہ کے سوال پہ افگن نے گردن موڑ کے اسے دیکھا، وہ ابھی تک نظریں جھکائے بیٹھی تھی۔

"مجھے ابھی خوشی اور ناخوشی کا کوئی احساس نہیں ہوا جب ہو گا تمہیں بتا دوں گا۔" اس نے دو ٹوک کہتے ہوئے بات ہی ختم کر ڈالی تھی اور مائدہ ایک بار پھر برداشت کرتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

اسے سیڑھیاں اتر کر نیچے آنے میں افگن کے سہارے کی ضرورت تھی اور وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر نیچے اتر رہا تھا۔ دونوں نے بلیک سوٹ پہن رکھے تھے حسام کے اشارے پہ کئی کیمرے الرٹ ہو گئے تھے اور کئی فلیش ایک ساتھ چمکے تھے۔ ان کا یہ خوب صورت اور محبوبانہ سا انداز کیمروں کی آنکھوں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گیا تھا۔ کیمروں کے فلیش کے دوران ہی عالیہ پیرزادہ نے بھی یکدم گردن موڑ کے سیڑھیوں کی سمت دیکھا تھا اور افگن افروز کے ہمراہ سیڑھیاں اترتی لڑکی کو دیکھتی رہ گئی تھی۔ ان دونوں کی جوڑی بلا کی خوب صورت لگ رہی تھی وہ جو کوئی بھی تھی، افگن افروز کے ساتھ خوب جچ رہی تھی۔ بہت سے لوگوں نے بے ساختہ سراہا تھا انہیں......

"ارے عالیہ! افگن افروز کی وائف کو دیکھا تم نے؟ یار! کتنی چارمنگ ہے وہ...... دونوں کی جوڑی کمال کی ہے یار!"

عالیہ کے ساتھ کھڑی شہرینہ نے برملا تعریف کی تھی اور ایک پل کے لیے تو عالیہ کے دل میں بھی حسد کی لہر دوڑ گئی تھی۔

"مجھ سے زیادہ خوب صورت ہے کیا......؟" عالیہ نے اترا کے کہا۔

"تم سے زیادہ خوب صورت ہے یا نہیں لیکن اس وقت محفل کی جان لگ رہی ہے دیکھو، کئی لوگوں کی نظریں اسی پہ ٹکی ہوئی ہیں۔" شہرینہ نے کوئی بھی لگی لپٹی رکھے بغیر مائدہ کو سراہا تھا۔

"اس نے شادی کب کی......؟" عالیہ کہے بغیر نہیں رہ سکی تھی اور پاس سے گزرتے حسام نے اس کی بات سن لی تھی، اسی لیے ٹھہر گیا تھا۔

"ارے مسز پیرزادہ! آپ کو افگن کی شادی کا نہیں پتا۔ اس کی شادی کو تو تین ماہ ہونے کو آئے ہیں اور اب تو وہ بابا بننے والا ہے، بہت لکی ثابت ہوئی ہیں مائدہ بھابھی۔ افگن کی زندگی میں خوشیاں لے کر آئی ہیں بہت خوش ہیں دونوں۔" حسام نے لگے ہاتھوں سب کچھ بتا دیا تاکہ اسے جلا سکے کہ اس کے بغیر بھی افگن افروز خوش باش زندگی گزار رہا ہے۔

"کل تو مسٹر افگن کی کوئی خوشی نظر نہیں آرہی تھی؟" عالیہ نے تیکھے انداز سے کہا۔

"ہوں! آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں دراصل کل مائدہ بھابھی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے وہ پریشان تھا اور اسی لیے جلدی چلا گیا تھا۔ وہ بھی اسی وجہ سے کل شادی کے فنکشن میں نہیں آسکی تھیں۔" حسام اطمینان اور سکون سے جھوٹ پہ جھوٹ بولے جا رہا تھا۔

"اوہ! تو یہ بات تھی......؟" عالیہ نے ہونٹ سکیڑتے ہوئے کہا۔

"تو آپ کیا سمجھی تھیں......؟" حسام اسے زچ کر رہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا، عالیہ کو اٹھا کر کہیں جنگل میں پھینک آئے۔ اس نے اس کے دوست کی زندگی برباد کر کے رکھ دی تھی۔

"کچھ نہیں......" اس نے نخوت سے سر جھٹک دیا

تھا۔

"اوکے، ایکسکیوزمی ....!" حسام وہاں سے ہٹ گیا تھا اور پھر اس نے اپنی اور عالیہ کی باتوں کی ریکارڈنگ جو اس نے اپنے موبائل فون سے کی تھی، وہ جا کر افگن افروز کو سنا دی۔ افگن کے دل کو نجانے کیوں سکون پہنچا تھا اور چہرے پہ خوشی کا احساس بکھر گیا تھا۔ عالیہ کو اس کی بیوی سے حسد محسوس ہوا تھا اور یہی تو وہ کرنا چاہتا تھا....

"اب بولو....؟" حسام اسے فتح مندی سے دیکھ رہا تھا۔

"گریٹ یار! تم بہت چالاک اور سمجھ دار ہو...." افگن نے اسے تھپکی دی۔

"اسی لیے تو تمہیں مشورہ دے رہا ہوں کہ مائدہ بھابھی کے ساتھ رہو، ان کا خیال رکھو، اسی میں تمہاری عزت اور بھلائی ہے۔" حسام اسے مشورہ دے کر خود اسٹیج کی سمت آ گیا جہاں اس کی اپنی دلہن براجمان تھی۔

"ہائے....!" عالیہ اور شہرینہ مائدہ کے قریب آ کر ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولیں۔

"السلام علیکم...." مائدہ نے ٹھٹک کر ان دونوں کو دیکھا۔ دونوں نے ساڑھیاں پہن رکھی تھیں کمر اور بازو برہنہ تھے ریشمی سلکی ساڑھیوں کے ڈھلکتے ہوئے پلو انہیں پلیٹ میں سجی ہوئی دعوت کا سا روپ دے رہے تھے وہ اس محفل میں موجود تمام مردوں کے لیے راحت بنی ہوئی تھیں۔

"آپ کون....؟" مائدہ نے حیرانی کے باعث پوچھ ہی لیا تھا کیونکہ اس فنکشن میں موجود تمام لوگ اس کے لیے اجنبی تھے سوائے حسام کی فیملی کے۔

"کیا افگن نے کبھی میرا ذکر نہیں کیا آپ سے؟" عالیہ کے انداز پہ مائدہ بری طرح چونک گئی تھی.... اور وہ لمحے کے ہزارویں حصے میں پہچان گئی کہ وہ عالیہ ہے لیکن مائدہ بے وقوف نہیں تھی جو اس خبیث عورت کو خوشی کا موقع فراہم کرتی یا پھر اسے شہ دیتی، اس لیے اس نے لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔

"آئی ایم سوری! میں یہاں پہلی بار آئی ہوں، مجھے نہیں پتا آپ کون ہیں، آپ اپنا تعارف خود کروا دیں۔"

"میں افگن افروز کی ایکس وائف ہوں عالیہ پیرزادہ....!" اس نے جیسے فخریہ انداز میں تعارف کروایا تھا۔

"اوہ اچھا! تو آپ ہیں عالیہ۔" مائدہ نے ذرا سا مسکرا کے اس سے ہاتھ ملایا تھا۔

"جی یہی ہے عالیہ! افگن افروز جیسے ہیرے کی قیمت نہ پہچاننے والی۔" شہرینہ طنزیہ بولی تھی اور عالیہ نے اسے گھور کے دیکھا۔

"ایکسکیوزمی! یہاں کیا ہو رہا ہے....؟" افگن افروز عالیہ کو مائدہ کی ٹیبل کے قریب کھڑے دیکھ کر فوراً" پاس چلا آیا۔

"آپ کی وائف کے ساتھ دعا سلام اور تعارف ہو رہا ہے۔" شہرینہ نے جواب دیا۔

"اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہیں کافی ہے۔"

افگن افروز ان چار سالوں میں پہلی مرتبہ عالیہ کے سامنے روبرو کھڑا ہوا تھا ورنہ وہ جہاں بھی اسے دیکھتا تھا محفل چھوڑ جاتا تھا۔

"ہوں یہ تو آپ ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں۔" شہرینہ نے سر ہلایا تھا۔

"آؤ مائدہ! حسام اسٹیج پہ بلا رہا ہے تصویریں بنوانے کے لیے۔" افگن نے اس کے گرد بازو پھیلاتے ہوئے کہا اور ان دونوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اسٹیج کی سمت بڑھ گیا۔ عالیہ کے ساتھ ساتھ مائدہ بھی دیکھتی رہ گئی تھی۔ اس نے افگن کے ایسے روپ کہاں دیکھے تھے بھلا....؟ اس نے تو آج تک مائدہ پہ ستم ہی ڈھائے تھے۔ ایسی کرم نوازیوں اور عنایتوں سے تو وہ انجان ہی تھی، اسی لیے اپنے ساتھ چلتے افگن کو حیرانی اور حسرت سے دیکھ رہی تھی۔ وہ اسے احتیاط سے صوفے پہ بٹھا کر خود بھی اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا تھا، عالیہ دور کھڑی دیکھ رہی تھی....!

☼ ☼ ☼

"آج تو آپ بہت خوش ہوں گے....؟" رات گئے جب مائدہ لباس چینج کر کے بستر پہ آئی تو افگن تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھا ابھی تک جاگ رہا تھا اور مائدہ جو دل میں تھا، کہے بغیر رہ نہ سکی تھی۔

"کس لحاظ سے کہہ رہی ہو....؟" افگن نے اس کی طرف کروٹ بدلتے ہوئے کہا اور نظریں اس کے چہرے پہ جما دیں۔ مائدہ بھی اس کی سمت دیکھ رہی تھی۔

"جس وجہ سے آپ مجھے فنکشن میں لے کر گئے تھے۔" مائدہ نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے برملا کہا اور افگن اس کی بات سن کر بے ساختہ مسکرا دیا تھا۔

"اس کا مطلب ہے کہ بہت ذہین اور سمجھ دار ہو تم۔"

"اگر آپ نے کسی کو جلا کر خوش ہونا تھا تو بہت پہلے ہو جاتے۔"

مائدہ کی بات پہ افگن نے لب بھینچ لیے تھے۔

"کیا بات ہے آپ چپ کیوں ہو گئے؟"

"کچھ نہیں، سو جاؤ۔" وہ کہہ کر کروٹ بدل گیا اور مائدہ اس کی چوڑی پشت کو گھورنے لگی لیکن دل ہی دل میں قدرے خوش ہو رہی تھی کہ آج اس نے ڈرنک نہیں کی تھی حالانکہ وہ جب بھی عالیہ کو کہیں دیکھتا تھا اس روز ڈرنک کر کر کے اپنا برا حال کر لیتا تھا لیکن آج....!

آج اگر افگن خوش ہوا تھا تو مائدہ بھی خوش ہو رہی تھی، اسے امید ہو چلی تھی کہ وہ بدل جائے گا، وہ بہتری کی طرف لوٹ آئے گا اور یہی احساس اس کی سکون بھری نیند کا باعث بن گیا تھا....!

☼ ☼ ☼

وہ ابھی آفس میں آ کر بیٹھا ہی تھا کہ اچانک حسام کی کال آ گئی۔

"آج کا اخبار پڑھا تم نے....؟"

"نہیں! ابھی تو آیا ہوں...."

"اوکے! تم اخبار پڑھو میں تمہیں پھر فون کرتا ہوں۔"

حسام نے کہہ کر فون بند کر دیا تھا اور افگن الجھ کے رہ گیا، پھر اپنی سیکریٹری کو اخبار بھیجنے کا کہا چند سیکنڈ بعد اخبار اس کے سامنے تھا۔ عالیہ کی طلاق کا پڑھ کے وہ ہکا بکا رہ گیا تھا۔ جمال پیرزادہ نے اسے طلاق دے دی تھی کیونکہ جمال پیرزادہ کے دل پر کوئی اور لڑکی چڑھ گئی تھی۔ عالیہ نے احتجاج کیا اور جمال پیرزادہ نے اسے طلاق دے کر فارغ کر دیا۔

افگن اخبار ٹیبل پہ رکھ کے چپ چاپ بیٹھ گیا تھا اس کے دل و دماغ میں جھکڑ سے چل رہے تھے اسے حیرت ہو رہی تھی کہ ایک غریب سے گھر میں رہنے والی عالیہ دولت کے لالچ میں کہاں جا پہنچی تھی۔ پہلے اس نے افگن افروز سے محبت کی پینگیں بڑھائیں۔ اسے شادی سے پہلے ترقی کی طرف راغب کیا اور وہ تو تھا ہی اس کا دیوانہ، اس کی خاطر دولت کمانے کے لیے اپنی دادی بی کو چھوڑ کے امریکا چلا گیا۔ واپس آیا تو کافی حد تک کامیاب ہو چکا تھا اور عالیہ سے شادی کرنے کے بعد تو وہ جیسے خود کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھنے لگا تھا لیکن پھر، عالیہ کو اس سے بھی زیادہ کامیاب آدمی مل گیا تھا۔

بیوروکریٹ جمال پیرزادہ اس کی خوب صورتی پہ فدا تھا اور عالیہ اس کی بے تحاشا دولت پہ.... اسی لیے عالیہ نے اسے چھوڑ کے جمال پیرزادہ کو ترجیح دی تھی۔

افگن نے اس عورت کی بے وفائی اور چالبازی کو اپنی ذات پہ طاری کر لیا تھا۔ اس نے چار سالوں میں اتنا کمایا تھا کہ اب وہ جمال پیرزادہ سے کہیں آگے تھا عالیہ بھی یہ بات جانتی تھی لیکن اب واپس پلٹنے کا کوئی راستہ نہیں تھا کیونکہ وہ اب اس سے نفرت کرتا تھا، بلکہ اس سے ہی نہیں تمام عورتوں سے نفرت کرتا تھا.... اور اسی نفرت نے اسے آج تک مائدہ کے قریب نہیں ہونے دیا تھا۔ ایک عورت کا بویا ہوا بیج دوسری عورت کاٹ رہی تھی۔

وہ یکدم کرسی دھکیل کے اٹھا اور اپنا موبائل، چابیاں وغیرہ اٹھا کر تیزی سے باہر نکل گیا اس کا رخ اپنے گھر کی جانب تھا وہ بہت رش ڈرائیو کرتا ہوا گھر پہنچا تھا۔

دادی بی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی مائدہ انہیں ناشتا کروا کے کچھ دیر سونے کا کہہ کے خود عیشاں کے ساتھ مل کر صفائی کرنے لگی تھی، حالانکہ ایسے کام کرتے ہوئے اسے کافی چکر اور ابکائیاں آتی تھیں لیکن پھر بھی وہ کام میں لگی رہتی۔ اس وقت بھی اسے بہت زور کی قے آئی تھی اور وہ اپنے بیڈ روم کی طرف بھاگی تھی۔ عیشاں اسے دیکھ کر مسکرا دی۔ اسے بھی پتا تھا کہ گھر میں ایک رونق آنے والی ہے۔ دادی بی کے ساتھ ساتھ عیشاں بھی بہت خوش تھی لیکن وہ خوش نہیں تھا جس کی وجہ سے یہ رونق آ رہی تھی۔

"مائدہ کہاں ہے؟" اس نے گھر میں داخل ہوتے ہی استفسار کیا تھا۔

"وہ تو اوپر اپنے کمرے میں ہیں صاحب جی!" عیشاں نے چونک کر جواب دیا تھا۔

"ہوں.....!" وہ سر ہلا کے لمبے لمبے ڈگ بھرتا سیڑھیاں چڑھ کے اوپر بیڈ روم میں چلا گیا تھا۔ باتھ روم کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور اندر سے اس کے ابکائیاں کرنے کی آواز آ رہی تھی۔

وہ کمرے میں ٹہلتے ہوئے اس کا انتظار کرنے لگا۔ اس کے انداز میں اضطراب تھا۔ وہ دائیں بائیں ٹہلتے ہوئے کافی مضطرب اور مشتعل لگ رہا تھا۔ مائدہ تھکی تھکی نڈھال سی باتھ روم سے باہر نکلی تھی تو افگن کو دیکھ کر ٹھٹک گئی تھی۔

"آپ کب آئے.....؟" وہ تولیے سے چہرہ پونچھ کر وہیں بیڈ پہ بیٹھ گئی۔ نقاہت کی وجہ سے اس کا پورا جسم لرز رہا تھا وہ بغیر دوپٹے کے بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ ایسی نڈھال ہو رہی تھی کہ دوپٹے کا بھی ہوش نہیں تھا۔

"میں تم سے کچھ کہنے آیا ہوں۔" افگن کا لب و لہجہ پہلے کی طرح سرد اور اجنبی ہو رہا تھا۔

"مجھ سے.....؟" مائدہ نے چونک کر دیکھا تھا۔

"دیکھو! اگر تم اس گھر میں رہنا چاہتی ہو تو تمہیں میری بات ماننی ہوگی، ورنہ تمہاری اس گھر میں کوئی گنجائش نہیں ہوگی۔" افگن نے بات شروع کرنے سے پہلے ہی صورت حال سنگین کر ڈالی تھی۔

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ.....؟" مائدہ اس کی بات پہ پریشان ہو اٹھی تھی۔

"میرے ساتھ ہسپتال چلو....." وہ اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے بولا تھا۔

"کیوں؟"

"میں بچہ نہیں چاہتا۔"

افگن کی بات پہ جیسے گھر کی چھت مائدہ کے سر پہ آن گری تھی۔ وہ ساکت و صامت سی دم بخود رہ گئی تھی۔

"افگن آپ..... آپ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟" وہ کہتے ہوئے رو پڑی تھی۔

"کیونکہ تم سب عورتیں ایک جیسی ہوتی ہو۔ اس نے بھی مجھ سے دولت کے لیے شادی کی۔ تم نے بھی میری دولت اور میرا گھر دیکھ کے شادی کی۔ اسے بھی کوئی اور مل گیا، تمہیں بھی کوئی اور مل جائے گا۔"

"شٹ اپ افگن..... جسٹ شٹ اپ! کس نے کہا آپ سے کہ ساری عورتیں ایک جیسی ہوتی ہیں؟ اگر ساری عورتیں ایک جیسی ہوتی ہیں تو سارے مرد بھی ایک جیسے ہوتے ہیں۔ ذلیل، کمینے، گھٹیا، ہوس زدہ اور نفس پرست۔"

"بکواس بند کرو اپنی....." افگن نے اسے ایک زناٹے دار تھپڑ دے مارا تھا۔

"یہ بکواس آپ کو سننی پڑے گی۔ میں نے آپ سے شادی آپ کی دولت اور گھر دیکھ کر نہیں کی تھی بلکہ ایک مضبوط چھت دیکھ کر کی تھی۔ ایسی چھت جو مجھے چھپا سکتی، جو مجھے پناہ دے سکتی کیونکہ میں ایک مرد کی ستائی ہوئی تھی اور مرد بھی وہ، جو میرا سوتیلا باپ ہونے کا اعزاز رکھتا تھا..... مجھے کیا پتا تھا کہ میں ایک مرد سے چھپ کے دوسرے کے پاس پناہ لے رہی ہوں تو وہ بھی کچھ کم اذیت نہیں دے گا مجھے۔ وہ بھی مجھے

عورت ہونے کی سزا دے گا..... طعنے دے گا، گھر سے نکالے گا، میرے سر سے چھت چھین لے گا..... مجھے پتا ہوتا تو میں کسی مرد کے پاس پناہ لینے کے بجائے خودکشی کر لیتی۔"

مائدہ کہتے ہوئے زار و قطار رو رہی تھی اور افگن ششدر سا اسے دیکھ رہا تھا۔ سوتیلا باپ.....؟ اس کے ذہن میں بس ایک ہی نام گردش کر رہا تھا۔

"ہاں! میرا سوتیلا باپ، آپ جیسا ایک اور مرد، مجھ پہ بری نظر رکھنے والا گھر میں ہی میرے لیے تاک لگائے بیٹھا رہتا تھا، اسی سے بچنے کے لیے میں نے نوکری کی، اسی لیے میں نے آپ سے کہا تھا کہ میرے لیے کام ضروری ہے، تنخواہ نہیں۔ آپ مجھے بے شک تنخواہ نہ دیں میں پھر بھی کام کر لوں گی کیونکہ میں اس خبیث آدمی کی نظروں سے اوجھل رہنا چاہتی تھی۔ اسی لیے میرا گھر واپس جانے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ میں دانستہ لیٹ ہونے کی کوششیں کرتی تھی تاکہ میرا اس سے سامنا نہ ہو اور اسی لیے میں نے سوچا کہ میری شادی ہو جائے۔ میرا خیال تھا کہ سارے مرد ایک جیسے نہیں ہوتے۔ ایک مرد کے کیے کا الزام میں دوسرے مرد کو کیوں دوں.....؟ دوسرا اچھا بھی تو ہو سکتا ہے اور اسی اچھے کے بھروسے پہ میں نے آپ پہ اعتبار کر لیا، میں نے تو آج تک آپ سے یہ نہیں کہا کہ سارے مرد ایک جیسے ہوتے ہیں.....؟ ایک سے بھاگ کے دوسرے کے پاس پناہ لی ہے تو وہ بھی مجھ پہ ستم ہی کر رہا ہے.....؟ میں تو صبر اور شکر سے آپ کے سارے ستم سہہ رہی ہوں، تو پھر..... تو پھر آپ کیوں الزام دیتے ہیں کہ ساری عورتیں ایک جیسی ہوتی ہیں.....؟

اور رہا میرا اور عالیہ کا فرق تو یہ فرق آپ سے بہتر کوئی نہیں جان سکتا..... اسے در، در پھرنے کی عادت ہوگی، لیکن مجھے ایک ہی گھر اور ایک ہی چھت تلے رہنے کی لگن ہے۔ آپ کے سوا کسی اور کا مجھے دیکھنا بھی گوارا نہیں..... اور ہاں، اس بچے کی آپ کی نظر میں کوئی اہمیت نہ سہی، لیکن میرے لیے یہ بہت اہم ہے۔ ایک یہی تو میرا اپنا ہوگا، آپ مجھے گھر سے نکالیں

گے تو نکل جاؤں گی' کیونکہ میرا..... میرا..... اور کوئی نہیں ہے اس کے سوا..... نہ میری ماں میری ہے' اور نہ آپ میرے ہیں' آپ تو صرف عالیہ کے روگی ہیں' صرف یہ میرا ہے..... اس کی خاطر چھوڑ دوں گی آپ کا گھر بھی اور آپ کو بھی.....''

وہ روتی بلکتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی تھی اور افگن افروز دم بخود سا کھڑا تھا.....!

☼ ☼ ☼

دروازے پہ خاصی زوردار قسم کی دستک ہوئی تھی اور دادی بی جان گئیں کہ دروازے پہ کون ہے.....؟ اسی لیے انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا اور خاموشی سے تسبیح پڑھتی رہیں..... وہ بھی جانتا تھا کہ اندر سے کوئی جواب موصول نہیں ہوگا اسی لیے دروازہ دھکیل کر خود ہی اندر آگیا تھا۔

''السلام علیکم دادی بی!''

''وعلیکم السلام.....!'' انہوں نے جیسے نہ چاہتے ہوئے جواب دیا تھا۔

''کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں.....؟'' وہ ان کے بیڈ کے قریب رکھی کرسی کی سمت اشارہ کرتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

''نہیں..... تمہاری اس کمرے میں کوئی گنجائش نہیں ہے' چلے جاؤ یہاں سے۔'' انہوں نے غصے سے کہا۔

''دادی بی پلیز! میری پوری بات تو سن لیں۔'' افگن نے لجاجت سے کہا۔

''مجھے کچھ نہیں سننا' میں اتنے سالوں سے سنتی ہی تو آرہی ہوں۔''

''دادی بی! ایم سوری' ایم رئیلی سوری! پلیز دادی بی! میں شرمندہ ہوں اپنی سوچ پہ.....''

افگن ان کے بیڈ پہ ان کے قریب ہی سر جھکائے بیٹھ گیا۔

''تم نے کبھی اچھا سوچا ہوتا تو تمہیں یوں شرمندہ نہ ہونا پڑتا اور تم نے یہ سوچ بھی کیسے لیا کہ مائدہ بھی عالیہ جیسی ہی ہے' تم شاید یہ بھول گئے تھے کہ وہ تمہاری پسند تھی اور مائدہ میری پسند ہے' وہ عالیہ جیسی ہوتی تو اپنی عزت بچانے کے لیے یوں پناہ نہ ڈھونڈ رہی ہوتی۔''

دادی بی کو افگن پہ غصہ آرہا تھا' وہ خوب دل کی بھڑاس نکال رہی تھیں۔

''جی! میں یہ فرق اچھی طرح جان گیا ہوں اسی لیے مائدہ کو لینے کے لیے آیا ہوں۔'' اس نے بالآخر اس حقیقت کو تسلیم کر ہی لیا تھا۔

''تم اب جو بھی کہہ لو' وہ تمہارے ساتھ نہیں جائے گی.....'' دادی بی نے سختی سے انکار کر دیا تھا۔

''دادی بی پلیز! آپ کو تو کم از کم میرا کچھ خیال کرنا چاہیے۔ ایک مدت کے بعد مجھے اپنی بیوی اچھی لگ رہی ہے تو آپ کیوں اسے مجھ سے دور رکھنا چاہتی ہیں؟'' وہ جھنجلا کے بولا تھا۔

''کیونکہ مجھے تم پہ اعتبار نہیں رہا' تم اپنے بچے کو کوئی بھی نقصان پہنچا سکتے ہو.....''

دادی بی کی بے اعتباری پہ افگن یکدم قہقہہ لگا کے ہنسا تھا اور ساتھ ہی دادی بی کے گلے میں دونوں بازو ڈالتے ہوئے انہیں اپنے ساتھ لگا لیا تھا۔

''کون کافر اپنے بچے کو نقصان پہنچا رہا ہے؟ وہ تو محض غصہ تھا' آپ کو نہیں پتا مجھے بچے کتنے پسند ہیں؟''

وہ خوش ہو کر کہہ رہا تھا اور دادی بی اپنے پوتے کے چہرے پہ سچی خوشی کے رنگ دیکھ کر مطمئن ہو گئی تھیں۔

''یہ لیٹی ہوئی ہے مائدہ' لے جاؤ اسے' اجازت ہے میری.....'' دادی بی نے اپنے بیڈ کی دوسری سائیڈ پہ اشارہ کیا تھا' جہاں مائدہ کافی دیر سے کمبل میں دبکی ہوئی نیند کا بہانہ کیے ان کی باتیں سن رہی تھی۔

''یہاں.....؟'' افگن کو حیرت ہوئی تھی اس نے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا تھا لیکن مائدہ یونہی پڑی رہی بے حس و حرکت۔

''اٹھائیں ناں اسے۔'' اس نے دادی بی کو کہا۔

''تم خود اٹھا لو.....'' دادی بی نے اسے کہا۔

''واقعی..... میں سچ مچ اٹھا کر لے جاؤں گا پھر۔''

''لے جاؤ.....'' وہ اجازت دے رہی تھیں۔

''دادی بی! یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟'' مائدہ یکدم کمبل پرے دھکیل کے اٹھ بیٹھی تھی اور افگن کے ساتھ ساتھ دادی بی بھی کھل کے ہنس دیں۔

''لو اٹھ گئی ہے۔'' انہوں نے اشارہ کیا۔

''تھینک یو.....!'' افگن ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اٹھا اور مائدہ کی طرف پہ آکر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ مائدہ دادی بی کے سامنے اس کی ایسی حرکت پہ جھینپ گئی تھی۔

''میرا ہاتھ چھوڑیں۔''

''چھوڑتا ہوں' چھوڑتا ہوں' پہلے تم اٹھو تو سہی۔'' افگن دروازے کی سمت بڑھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''اوکے دادی بی! گڈ نائٹ' صبح ملاقات ہوگی۔'' وہ انہیں گڈ نائٹ کہہ کر مائدہ کو ننگے پاؤں کھینچتا ہوا اپنے ساتھ اپنے کمرے میں لے آیا تھا۔

''پاگل ہو گئے ہیں آپ..... یہ کیا کر رہے ہیں؟ دادی بی کیا سوچیں گی؟''

مائدہ خفگی سے بولی تھی اور افگن نے بیڈ روم کا دروازہ بند کرتے ہوئے اسے مسکرا کے معنی خیز نظروں سے دیکھا تھا۔

''پہلے پاگل تھا' اب تو میں ہوش میں آیا ہوں۔ میرے ہوش و حواس سب تمہارے نام۔''

''آپ کے ہوش و حواس کا کیا اعتبار؟ نجانے کب آپ ڈرنک کر کے گنوا دیں.....!''

''تمہاری قسم! اب نہیں کروں گا۔'' اس نے کان پکڑے افگن کے جواب پہ مائدہ کا دل یکدم پرسکون ہو گیا تھا۔

''اور ہاں تمہارے لیے ایک خوش خبری ہے' آج کے اخبار میں' صرف عالیہ کی طلاق کا ہی نہیں بلکہ کچھ اور بھی لکھا ہوا تھا۔''

''کیا لکھا ہوا تھا.....؟'' مائدہ جلدی سے بولی۔

''شیخ زمان کو جیل ہو گئی ہے۔'' اس نے اطمینان سے بتایا۔

''شیخ زمان کو جیل.....؟'' مائدہ بری طرح چونکی تھی۔

''ہاں' اس نے محلے کی کسی لڑکی کو بہانے سے گھر میں بلا کر اس کے ساتھ زیادتی کرنے کی کوشش کی تھی وہیں تمہاری امی آگئیں اور شور مچا دیا' جن کی بیٹی تھی وہ پولیس لے آئے اور شیخ زمان کو جیل بھیج دیا۔''

''اوہ خدایا! پھر امی تو کافی غیر محفوظ ہوں گی؟ وہ اگر جیل سے آگیا تو امی کو نقصان پہنچائے گا۔'' مائدہ کو اب حلیمہ بی بی کی فکر ستا رہی تھی۔

''نہیں پہنچائے گا' کیونکہ میں کل ہی آنٹی کو اپنے گھر لے آؤں گا..... اور اس کمینے پہ ایسا کیس کروں گا کہ کبھی باہر کی ہوا بھی نہیں لے گا۔'' افگن نے جیسے اپنا فیصلہ سنایا اور مائدہ مارے خوشی اور تشکر کے بے ساختہ افگن کے سینے سے لگ گئی تھی۔

''تھینک یو افگن! تھینک یو سو مچ۔''

وہ رو رہی تھی اور افگن نے اسے اپنی پناہوں میں لے لیا تھا۔ اس کی خوشی بھرے آنسو افگن کے سینے میں جذب ہو رہے تھے اس نے مائدہ کے ماتھے پہ استحقاق بھرا بوسہ دیا تھا اور اپنا حصار اس کے گرد اور بھی مضبوط کر دیا تھا۔ جس پہ وہ اللہ کا شکر بجا لائی تھی۔

☼

اُمِ ثمامہ

"میرے سامنے والی کھڑکی میں ایک چاند کا ٹکڑا رہتا ہے۔"

جوگنگ سوٹ پہنے اپنے جوگرز کے لیس باندھتے ہوئے طیب ہمدانی کی گنگناہٹ اتنی واضح تھی کہ ان کے لیے چائے بناتے ہوئے آیان کے ہاتھ کیتلی پر دھرے رہ گئے۔ خطرہ کوکر کی گھنٹی کی طرح بج بج کر سر پر منڈلانے لگا۔ ویسے تو کل وقتی ملازمہ بھی تھی مگر صبح کی چائے آیان کو ہی بنانی پڑتی تھی۔ اسے یاد آیا کہ پرسوں ارشمان بتا رہا تھا کہ ڈیڈی زمزمہ سے ٹریک سوٹ خرید رہے تھے اور بریکنگ نیوز یہ تھی کہ پرفیومز کارنر کے اردگرد بھی منڈلاتے نظر آرہے تھے۔

آیان نے جلدی جلدی چائے کے کپ ٹرے میں رکھے اور ڈیڈی جی کے حضور حاضر ہو گیا۔ وہ گلاب کے پودوں کو محبت پاش نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

"ڈیڈی! چائے۔" آیان نے انہیں آواز دی۔

"ہاں ڈیر سن! ٹیبل پر رکھ دو۔ میں پی لوں گا۔" انہوں نے اسے ٹالنے کی کوشش کی۔

"ڈیڈی! آپ کو پتا ہے پھول توڑنا بہت غلط بات ہوتی ہے۔" وہ بھی آرام سے جان چھوڑنے والا نہیں تھا۔ اس نے ہوا میں ایک تیر چلایا۔

"آئی نو ویری ویل ڈیر سن! چلو چائے پیتے ہیں۔" وہ مسکراتے ہوئے لان میں رکھی کرسیوں کی طرف مڑ گئے۔

طیب ہمدانی کی معنی خیز مسکراہٹ نے آیان کو سوچنے پر مجبور کر دیا کہ ملک میں ریلیوں اور جلسوں سے کچھ ہو نہ ہو' ہمدانی ہاؤس میں ضرور کوئی انقلاب آنے والا ہے۔

ڈیڈی کے جوگنگ پر جاتے ہی آیان نے بیڈ روم کی طرف دوڑ لگادی۔ اس نے پہلے تو ارشمان اور فاران کو آوازیں دے کر اٹھانے کی کوشش کی۔ پھر ان کے اوپر سے کمبل کھینچ لیے اور جب ان دونوں چیزوں کا ان دونوں پر کوئی خاطر خواہ اثر نہیں ہوا تو اس نے لاتوں اور مکوں سے ان کی تواضع شروع کر دی' پھر دونوں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔

"کیا ہے' کیا مصیبت آگئی ہے' صبح صبح ڈرون حملے کر رہا ہے۔"

ارشمان نے چلا کر پوچھا۔ فاران نے نظر بچا کر صوفے پر پڑے کمبل کی طرف ہاتھ بڑھائے تو ڈریسنگ کے پاس کھڑے آیان نے وہیں سے تاک کر ہیر برش ہاتھ پر مارا' وہ بلبلا اٹھا۔

"بے جلاد کی فوٹو اسٹیٹ! صبح صبح ہم سے کیا قصور ہو گیا۔ قسم سے اتنا اچھا خواب دیکھ رہا تھا۔ چھمک چھلو مٹک مٹک کر میرے ساتھ ناچ رہی تھی اور مسٹر خان بیٹھے منہ دیکھ رہے تھے۔"

"گھامڑ کہیں کے! تمہیں سونے کی پڑی ہے اور یہاں اتنا بڑا طوفان آنے والا ہے ——— جو میری زیرک نگاہوں سے نہیں بچ سکا۔ اور اگر ایسا ہو گیا تو پھر میں دیکھوں گا کہ تم کہاں سے عیش کرواتے ہو' اپنی ہوتی سوتیوں کو۔ تم دونوں جلدی سے فریش ہو کر تکون میز کانفرنس کے لیے نیچے آجاؤ۔ میں تمہارا وہیں انتظار کر رہا ہوں۔" وہ حکم صادر کرتا واپس مڑ گیا۔

تینوں نے مارکیٹ سے ایک تکون میز اور تین

کرسیاں خریدی تھیں اور انہیں نیچے لاؤنج سے ملحقہ کمرے میں سیٹ کروا دیا تھا۔ کسی بھی ایمرجنسی کی صورت میں وہ تینوں وہاں اکٹھے ہوتے پھر اس مسئلے کے بارے میں غور و خوض کرتے تھے۔ تکون میز کانفرنس کے ایجنڈے بہت ہی اہم ہوتے تھے مثلاً" نئی کلاس فیلو کو پھنسانا گرل فرینڈ کو منانا لوگوں کو ستانا اور ڈیڈی جی کے عتاب سے ایک دوسرے کو بچانا وغیرہ وغیرہ.....

ایف ٹین سیکٹر میں پھولوں اور بیلوں سے ڈھکا سفید اینٹوں سے بنا ہمدانی ہاؤس ایک خاص وجہ سے سارے سیکٹر میں سب سے منفرد تھا اور وہ وجہ تھی کہ یہاں صرف چار عدد مرد رہتے تھے ایک طیب ہمدانی اور تین عدد ان کے بیٹے آیان فاران اور ارشمان یہ گھر عورت کی وجود سے آشنا ضرور تھا مگر اس آشنائی کو بیتے اب ایک عرصہ گزر چکا تھا۔ اب تو ہمدانی ہاؤس نسوانی رشتے کے لمس کو بھی بھول چکا تھا۔

طیب ہمدانی اور مریم طیب کی شادی کو نو سال ہو چکے تھے۔ یہ خالص ارینج میرج تھی۔ اماں نے مریم کو ان کے لیے پسند کیا تھا۔ مریم بیاہ کر ان کے گھر آ گئی تھی۔ ان دونوں نے ہمیشہ ایک دوسرے کا خیال رکھا۔ عزت دی ہر ضرورت کو پورا کیا مگر دونوں کے درمیان کہیں کوئی کمی تھی، جسے کبھی کبھی طیب ہمدانی بری طرح محسوس کرتے تھے پھر آیان کی پیدائش کے بعد اماں بھی اللہ کو پیاری ہو گئیں۔

طیب ہمدانی اکلوتے تھے انہوں نے اپنی زندگی کو بیوی اور بیٹے تک محدود کر لیا۔ وقت دھیرے دھیرے گزرنے لگا اور مریم جب ایک بار پھر امید سے ہوئی تو طیب ہمدانی کو بیٹی کی خواہش ہوئی مگر اس بار دو جڑواں بیٹے پیدا ہوئے جن کے نام انہوں نے ارشمان اور فاران رکھے، پھر جب آیان سات سال کا اور ارشمان اور فاران تین تین سال کے تھے تو مریم کے والدین حج کر کے واپس آئے۔ طیب ہمدانی بیوی بچوں کو لے کر بائی روڈ اسلام آباد سے لاہور ان سے ملنے گئے۔ واپسی پر ارشمان اور فاران ضد کر کے نانا نانی کے پاس ہی رک گئے۔

واپسی پر وہ حادثہ پیش آیا، جس نے طیب ہمدانی کی زندگی کے ہلکے رنگوں کو بالکل پھیکا کر دیا، اس کار ایکسیڈنٹ میں طیب ہمدانی اور آیان کو تو معمولی سی چوٹیں آئیں مگر مریم جانبر نہ ہو سکی۔ طیب ہمدانی کو مریم کے جانے کا دکھ تو تھا مگر زیادہ پریشان کن بات تین بچوں کی پرورش تھی۔ آیان تو پھر بھی سمجھ دار تھا مگر ارشمان اور فاران ابھی چھوٹے تھے۔ مریم کے اماں اور ابا نے بچے مانگے تو انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں اپنے بچے خود پال لوں گا۔ اب یہی میری زندگی کا مصرف ہیں۔ بچوں کے نانا نانی خود بھی بیمار اور بوڑھے تھے، وہ خاموش ہو گئے۔

طیب ہمدانی نے تینوں بچوں کی پرورش میں خود کو فراموش کر دیا، دن رات ایک کر دیے۔ انہوں نے ثابت کر دیا کہ صرف ماں ہی نہیں باپ بھی اپنی اولاد کے لیے قربانی دے سکتا ہے۔ انہوں نے اپنے اور بیٹوں کے درمیان روایتی باپ بیٹوں کے برخلاف ایک اچھے دوست والا رشتہ رکھا تھا، اس لیے وہ چاروں ایک دوسرے کے بے حد قریب تھے۔

آج آیان انجینئرنگ کے تھرڈ ایئر میں تھا اور فاران اور ارشمان اولیول کر رہے تھے۔ زندگی اپنے ڈھب سے گزر رہی تھی کہ زندگی میں ایک عجب موڑ آ گیا۔

✵ ✵ ✵

تکون میز کے ارد گرد تین افراد بیٹھے تھے۔ آیان کے ہاتھ میں چائے کا کپ تھا اور وہ دور کسی خلائی نقطے کو گھورتے ہوئے سوچ بچار کر رہا تھا۔ فاران کے ہاتھوں میں ٹوتھ برش تھا اور وہ اپنی دونوں آنکھوں کو بار بار بند ہونے سے زبردستی روک رہا تھا اور ارشمان گیلی زلفوں کو سنوارتا ہوا دونوں کی شکلیں تک رہا تھا۔

"او نیشا خورشید کی اولاد! اب پھوٹو بھی کون سے سونامی کے اندیشے کے تحت تم نے ہم کو صبح صبح اٹھایا ہے۔" فاران نے تپ کر خاموشی کو توڑا۔

"ارے، مجھے تو پہلے ہی شک تھا، یہ صبح شام جس طرح ہماری عزت افزائی کرتا ہے یہ پکا ہمارا سوتیلا بھائی ہے۔" اس نئے انکشاف پر آیان کی آنکھیں حیرت سے پھیلیں۔

"کیا مطلب؟" فاران نے بھی حیرت سے پوچھا۔

"ارے ابھی تو تُو نے کہا کہ آیان نیشا خورشید کی اولاد ہے، طیب ہمدانی کی نہیں۔" ارشمان نے اپنی عقل دانی کے مطابق بات کی۔

اور پھر اس سے پہلے کہ دونوں کی بکواس طویل ہوتی آیان نے صبح سویرے ڈیڈی کی گنگناہٹ، مسکراہٹ کا احوال سنایا۔ گلاب کی کیاریوں کے گرد منڈلانے والی بات بھی بتائی اور اس کے نزدیک یہ ساری باتیں اس وقت وقوع پزیر ہوتی ہیں جب بندے کے دماغ میں، عقل کی جگہ عشق ڈیرے جما لیتا ہے، اس لیے اب وہ پوری دل جمعی کے ساتھ اس معاملے کی چھان بین کریں اور تین دن بعد اسی تکون میز کانفرنس میں رپورٹ پیش کی جائے تاکہ اگر ایسی کوئی سازش ہمدانی ہاؤس میں پنپ رہی ہے تو اس کا قلع قمع کیا جا سکے۔

تین دن بعد جب تکون میز کانفرنس ہوئی تو ان تینوں کے پاس حیرت انگیز طور پر چونکا دینے والے انکشافات تھے۔ تحقیقات سے یہ ثابت ہو گیا تھا کہ ڈیڈی کو وہ ہو گیا ہے جو "میں نے پیار کیا" میں سلمان خان کو اور "کچھ کچھ ہوتا ہے" میں شاہ رخ کو ہو گیا تھا۔

رپورٹ کے مطابق چند ماہ پہلے سامنے والے بنگلے میں ایک ریٹائرڈ کرنل صاحب رہائش پذیر ہوئے تھے۔ واقعے کے سارے شواہد وہیں سے ملتے تھے۔ دراصل کرنل صاحب کی ایک غیر شادی شدہ بہن تھی۔ جوانی میں انہیں کوئی رشتہ پسند نہیں آیا اور اب وہ رشتے والوں کو پسند نہیں آتی تھیں۔ نام نازنین تھا، ایک بڑے کالج میں پروفیسر تھیں اور فاران کی رپورٹ کے مطابق محترمہ دیکھنے میں کافی گریس فل ہیں۔ عمر پینتالیس اور اڑتالیس کے درمیان ہے۔ اس عمر میں بھی کافی اسمارٹ اور پُر کشش تھیں۔

"مجھے لگتا ہے تُو خود متاثر ہو گیا ہے، جس طرح تُو میڈم نازنین کی تعریفیں کر رہا ہے۔" ارشمان نے جل کر کہا۔

"تم لوگ ککڑوں کی طرح آپس میں ہی لڑتے رہو اور ڈیڈی جی اپنا کام دکھا جائیں گے۔ مجھے تو یہ سوچ سوچ کر شرم آ رہی ہے کہ میں اپنی گرل فرینڈ کو کیا منہ دکھاؤں گا کہ میرے ڈیڈی اس عمر میں... اب ہمیں مل کر یہ سوچنا چاہیے کہ ڈیڈی کو روکنے کے لیے کیا اقدامات کرنے ہیں۔" آیان نے دونوں کا دھیان اصل معاملے کی طرف دلایا۔

"اللہ کرے مس نازنین کو ڈینگی بخار ہو جائے نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔"

فاران کی سوچنے اور کام کرنے سے جان جاتی تھی، اس لیے وہ عورتوں کی طرح بددعاؤں پر اتر آیا تھا۔

"ابے گھامڑ! پھر اسلام آباد کیسے آئے گا؟" آیان نے اس کی گدی پر ایک چپت رسید کی۔

"پھر کسی پلین، کار یا ڈائیوو میں بیٹھ کر اسلام آباد نہیں آ سکتا کیا، اسے کون سے ٹکٹ کی ضرورت ہو گی۔" فاران نے کھسیاتے ہوئے جواب دیا۔

اس سے پہلے کہ وہ کسی کارروائی کے لیے لائحہ عمل ترتیب دیتے، طیب ہمدانی نے انہیں اسٹڈی میں طلب کر لیا۔ وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو اشارے کرتے اسٹڈی کی طرف چل دیے۔

دستک دے کر وہ تینوں اندر داخل ہوئے، طیب ہمدانی مزے سے آرام کرسی پر جھول رہے تھے۔

"السلام علیکم ڈیڈی!" تینوں نے کورس کے انداز میں سلام کیا۔

"وعلیکم السلام! آؤ بیٹھو!" وہ تینوں دھپ سے سامنے والے صوفے میں دھنس گئے۔

"میرا تم لوگوں سے روایتی رشتہ نہیں ہے۔ ہم باپ بیٹوں سے زیادہ ایک دوسرے کے اچھے دوست ہیں، اس لیے میں نے سوچا یہ بات تم لوگوں سے ضرور شیئر کروں۔" انہوں نے اپنے ہاتھوں کی انگلیاں ایک

دوسرے میں پھنسائے ہوئے بات کا آغاز کیا۔

"اب... جبکہ میں عمر عزیز کی پانچویں دہائی میں ہوں تو مجھے خود سمجھ میں نہیں آرہا کہ میں اپنی فیلنگز کو کیا نام دوں۔ جب میں نے پہلی بار مس نازنین کو پارک میں دیکھا تو مجھے وہ اچھی لگی تھیں، نہایت مہذب اور پُروقار، ہمارے درمیان ٹین ایجرز کی طرح کچھ بھی نہیں ہے مگر اب میرا مسکرانے کو دل چاہتا ہے۔ ہمدانی ہاؤس پر برسوں سے پھیلی تنہائی سے اب مجھے وحشت ہونے لگی ہے، پارک میں گزرتے دو گھنٹے مجھے تمام دن کا حاصل لگنے لگے ہیں۔ میں خود بھی اپنی اس کیفیت سے پریشان ہوں۔ میں نے دل کو بارہا سمجھایا مگر اس کا کہنا یہی تھا کہ زندگی پر میرا بھی حق ہے، پھر میں نے تم تینوں سے بات کرنے کی ٹھان لی کیونکہ اب مجھے یقین ہونے لگا ہے کہ کیوپڈ کے تیر نے میرے بڑھاپے کو نظر انداز کرتے ہوئے میرا انتخاب کرلیا ہے، مگر مجھے دنیا والوں سے نہیں صرف اپنی اولاد سے فرق پڑتا ہے۔"

بات ختم کرکے طیب ہمدانی ان تینوں کے رد عمل کے منتظر تھے۔

☼ ☼ ☼

کھڑکی، دروازہ، سائیڈ ٹیبل، پائیدان، پردے کا کنارہ... بار بار ایک ہی منظر آنکھوں کے آگے سے گزرتا اور گم ہوجاتا۔ آیان ٹہل ٹہل کر تھک گیا تھا۔ تینوں کا بس نہیں چل رہا تھا کہ مس نازنین کا گلا دبا کر آجاتے دراصل وہ اپنے ڈیڈی سے بے انتہا پیار کرتے تھے ان کے علاوہ انہوں نے کوئی اور رشتہ دیکھا ہی نہیں تھا۔ وہ اس شراکت کو برداشت نہیں کرسکتے تھے۔ انہیں تو وہ نہایت سعادت مندی سے کہہ آئے تھے۔

"آپ بالکل فکر مت کریں، آپ نے تمام عمر ہمارا خیال رکھا، اب ہماری باری ہے۔ آپ کی بات ملاقات اور بارات ہر چیز کا انتظام ہم کردیں گے۔ آپ صدیقی انکل کو زحمت مت دیں۔"

ان کی یہ بات سن کر طیب ہمدانی کے سارے خدشے، وسوسے اور ڈر جو کئی دن سے ان پر حاوی تھے، ایک دم چھلانگ مار کر کہیں گم ہوگئے تھے۔ آرام کرسی پر ایک بار پھر مطمئن اور مسرور سے جھولتے ہوئے طیب ہمدانی کو ایک لمحے کے لیے بھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ محبتوں کے بیچ کہیں کوئی سازش بھی داخل ہوچکی ہے۔

چاروں باپ بیٹے لان میں رکھی کرسیوں پر بیٹھے شام کی چائے پی رہے تھے۔ آیان، طیب ہمدانی کو اس بات پر راضی کرنے کی کوشش کررہا تھا کہ آپ کو مس نازنین کو کوئی گفٹ وغیرہ دینا چاہیے، مگر طیب ہمدانی کا موقف تھا کہ اس عمر میں یہ چونچلے اچھے نہیں لگتے بس سیدھے طریقے سے کرنل صاحب کے یہاں رشتہ بھیجا جائے۔

"مگر ڈیڈی! آپ بات کو سمجھیے ناں کہ ایک بار لڑکی کی مرضی تو معلوم کرنی ہوتی ہے اور اگر وہ آپ کے ساتھ ہے تو آپ آدھی جنگ جیت جاتے ہیں۔"

"ابے بدھی بول بدھی لڑکی کس اینگل سے ہیں مس نازنین۔" ارشمان نے آیان کے کان میں سرگوشی کی۔ اس نے ارشمان کے پاؤں پر بڑے پیار سے اپنا پاؤں رکھ کر زور سے دبایا کیونکہ وہ کسی بھی بات سے ڈیڈی کو شک نہیں پڑوانا چاہ رہا تھا۔

"مگر بیٹا! میں نے تمام عمر بڑی سادہ سی زندگی گزاری ہے یہ سارے کام اور باتیں اس عمر میں میرے لیے بہت مشکل ہیں۔" وہ نیم رضامندی سے بولے۔

"آپ یہ مجھ پر چھوڑ دیں۔ میں خود سب کچھ خرید کر پیک کروالاؤں گا، بس آپ پارک میں جاکر انہیں دے دیجیے گا۔" فاران نے سارے مسئلے کا حل نکالا۔

"اچھا! جیسے تمہاری مرضی، مگر مس نازنین کی رضامندی کے بعد ہم کرنل صاحب سے صاف اور سیدھی بات کریں گے۔" وہ یہ کہتے ہوئے اسٹڈی میں چلے گئے اور فاران آیان اور ارشمان مارکیٹ کی طرف چل دیے۔

☼ ☼ ☼

مس نازنین سبز لیلن کا سوٹ پہنے، سیاہ شال اوڑھے سنہرے فریم کا چشمہ لگائے سنگی بینچ پر بیٹھی صبح کی تازہ ہوا سے لطف اندوز ہورہی تھیں کہ سامنے سے نک سک سے تیار ہوئے طیب ہمدانی نمودار ہوئے۔

انہوں نے سلام کے بعد وہاں بیٹھنے کی اجازت مانگی اور اپنا مدعا بیان کرکے سرخ کاغذ میں لپٹا تحفہ ان کی طرف بڑھا دیا۔ خلاف توقع مس نازنین نے ساری بات نہایت خاموشی سے سنی، پھر ایک نظر گفٹ کو اور ایک نظر طیب ہمدانی کو دیکھا اور کوئی جواب دیے بغیر اٹھ کر چل دیں۔ طیب ہمدانی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ انہیں روک سکتے مگر انہیں اتنی تسلی ضرور تھی کہ انہیں اس بات سے مکمل طور پر اعتراض نہیں تھا، ورنہ وہ چپ چاپ گفٹ لے کر چلی نہ جاتیں اگلے چوبیس گھنٹے کا انتظار ان کے لیے جاں گسل ثابت ہوا تھا۔

طیب ہمدانی صبح سویرے ہی اٹھ گئے بلکہ اصل میں تو ساری رات انہیں ٹھیک طرح سے نیند ہی نہیں آئی تھی۔ نماز فجر کے بعد ہی انہوں نے جوگنگ سوٹ پہن لیا تھا۔ آج اتنے سالوں میں پہلی بار انہوں نے صبح کی چائے بھی نہیں پی تھی آیان فاران اور ارشمان بھی اپنے کمرے کی کھڑکی سے یہ ساری نقل و حرکت دیکھ رہے تھے۔

بڑی مشکل سے گھڑی کی سوئیاں سات کے ہندسے تک پہنچیں اور طیب ہمدانی نے اپنے قدم پارک کی طرف بڑھا دیے۔

مس نازنین اسی بینچ پر بیٹھی تھیں۔ ہاتھ میں وہی سرخ کاغذ والا تحفہ موجود تھا۔ طیب ہمدانی ڈرتے ڈرتے ان کے پاس گئے اور پھر وہی ہوا، جس کا انتظار وہ تینوں ایک درخت کے پیچھے چھپے کررہے تھے۔

مس نازنین ناراض ناراض انداز میں طیب ہمدانی کو تحفہ دکھا کر کچھ کہہ رہی تھیں۔ شرمندہ شرمندہ سے طیب ہمدانی سن رہے تھے اور آیان فاران اور ارشمان کے چہروں پر فاتحانہ مسکراہٹ ناچ رہی تھی۔ تینوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر فتح کا نشان بنایا۔ کام ہوچکا تھا۔ اب ان کا رکنا فضول تھا۔ تینوں گھر جاکر گرم گرم کمبلوں میں سکھ اور چین کی نیند سونے چلے گئے تھے۔

طیب ہمدانی نے سرخ کاغذ کے اندر موجود چیزوں کی طرف دیکھا تو ان کا دماغ گھوم گیا۔ "موت کا منظر" کی ایک موٹی سی کتاب، سفید سوٹ، بیری کے پتے اور ایک گلاب کا پھول، جو یقیناً "ہمدانی ہاؤس کی کیاریوں کا ہی تھا اور پھر طیب ہمدانی نے مس نازنین کو ساری بات بتادی کہ کس طرح انہوں نے اپنے بچوں سے مشورہ کیا اور انہوں نے یہ شرارت کی۔ تھوڑی دیر میں مس نازنین اور طیب ہمدانی جانے کس بات پر مسکرا رہے تھے اور بینچ کے ساتھ رکھا سرخ کاغذ والا تحفہ سائیڈ میں پڑا اپنی قسمت پر رو رہا تھا اور مزے کی نیند سوتے تکون میز کانفرنس کے نمائندوں کو خبر ہی نہیں تھی کہ تقدیر نے ان کی سازش کو کسی کی دوستی کا ذریعہ بنا دیا ہے۔ درخت کی اوٹ میں کھڑی محبت ان دونوں کو دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"آیان! تو نے اس وقت ڈیڈی جی کا منہ دیکھا تھا، جب مس نازنین انہیں وہ قیمتی تحفہ دکھا رہی تھیں ویسے یار! تو ہے بڑا جینیئس تیرا بتایا ہوا پہلا تحفہ ہی لو اسٹوری کا آخری تحفہ ثابت ہوا۔"

ارشمان مزے لے لے کر چائے پی رہا تھا اور صبح والے واقعہ پر تبصرہ بھی کررہا تھا۔

"مگر مجھے تو بیچارے ڈیڈی کا حیران پریشان چہرہ دیکھ کر ان پر ترس آرہا تھا۔" فاران نے مسکین سی شکل بنا کر کہا۔

"ابے گھامڑ! اگر ہم یہ سب کچھ نہ کرتے تو سوچ! ڈیڈی مس نازنین کے ساتھ ہنی مون منانے جاتے اور ہم تین عدد جوان جہان لڑکے گھر میں بیٹھ کر ان کا انتظار کرتے۔ ہمارے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہوتا۔"

آیان نے فاران کے سر سے ہمدردی کا بھوت

اتارنے کے لیے مستقبل کا نقشہ کھینچا۔ ابھی وہ لوگ باتیں کرہی رہے تھے کہ نذیرن بوا نے آکر پیغام دیا کہ طیب ہمدانی اپنے بیڈ روم میں بلا رہے ہیں۔ چائے کے مگ تکون میز پر رکھ کر تینوں ہنسی خوشی اجتماعی بے عزتی کے لیے روانہ ہوگئے۔

جیسے ہی تینوں کمرے میں داخل ہوئے طیب ہمدانی کا روشن مسکراتا چہرہ دیکھ کر تینوں کو چار سو چالیس وولٹ کا کرنٹ لگا۔

"یار آیان! لگتا ہے ناکام محبت کے غم میں ڈیڈی کا اوپر والا سسٹم ذرا اپ سیٹ ہوگیا ہے۔" ارشمان نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

"جی ڈیڈی! آپ نے بلایا؟" اس نے معصومیت کے تمام ریکارڈ توڑتے ہوئے نہایت ادب سے پوچھا۔

"ہاں میرے بچو! مجھے تم تینوں پر بہت پیار آرہا ہے۔ تم تینوں کی شرارت نے بات بنادی۔ میں نے مس نازنین کو ساری تفصیل بتائی تو وہ مسکرانے لگیں اور وہ کہہ رہی تھیں کہ انہوں نے بھی اکثر مجھے پارک میں دیکھا ہے اور میری پرسنالٹی سے کافی امپریس ہیں سواب میں صدیقی کو بلوا رہا ہوں تاکہ وہ کرنل صاحب سے بات چیت کرسکے۔ بات تو میں بھی کرسکتا تھا مگر تھوڑا معیوب لگتا ہے۔ اوکے جینٹل مین! تھینک یو ویری مچ اور اب تم لوگ بھی تیاری کرلو۔"

انہوں نے اطمینان سے تینوں کے سر پر بم پھوڑا۔

☆ ☆ ☆

"بس بہت ہوگئی اب 'مسئلہ سیدھے راستے سے نہیں' الٹے رستے سے ہی حل ہوگا' چل فاران کاغذ قلم لا۔"

آیان نے غصے سے اِدھر اُدھر ٹہلتے ہوئے فاران سے کہا وہ جلدی سے اندر گیا۔

اتنے میں ڈور بیل بج اٹھی اور ارشمان باہر کی طرف روانہ ہوگیا۔

"سلام صاحب!" دروازہ کھولتے ہی اس کی نظر ایک پٹھان چوکیدار پر پڑی جس نے ہاتھ میں ایک ٹرے پکڑی ہوئی تھی جس کے اوپر نفیس سی کڑھائی والا کپڑے کا کور ڈھکا ہوا تھا۔

"جی فرمایئے۔"

"وہ سامنے والے کرنل صاحب کی بہن نے یہ طیب صاحب کے لیے بھیجا ہے۔" ارشمان نے پٹھان کے ہاتھ سے ٹرے پکڑی اور دھاڑ سے دروازہ بند کرکے اندر آگیا۔

"یہ اتنا باادب خوان کہاں سے آیا ہے۔ خوشبو تو بڑی زبردست آرہی ہے۔"

فاران نے جلدی سے ٹرے پر سے پھول دار کپڑا ہٹایا۔ براؤن براؤن شامی کباب سلیقے سے سجے ہوئے تھے اور جب تک ارشمان یہ بتاتا کہ یہ کس نے اور کہاں سے بھیجے ہیں فاران دو عدد کباب کھا بھی چکا تھا۔

ارشمان کے تفصیلات بتاتے ہی اس کا تیسرے کباب کی طرف بڑھتا ہاتھ ٹھٹک کر رک گیا۔

"اوئے اپھلے بتاتا' کیا پتا اس نے "محبوب آپ کے قدموں میں" والا تعویذ ڈالا ہو اس میں۔"

"اچھا تو اب دل کی منزل تک معدے کا بائی پاس استعمال کرکے شارٹ کٹ مارا جارہا ہے۔ اب تو بہت ہوگئی۔ رات ہی ممی میرے خواب میں آئی تھیں اور کہہ رہی تھیں کہ اگر تم نے اپنے ڈیڈی کو دوسری شادی سے نہیں روکا تو قیامت کے دن مِلک کمپنی تمہیں معاف نہیں کرے گی۔"

پھر وہ تینوں سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔

ارشمان نے بڑی مشکلوں سے موٹے دماغ والے پٹھان کو اس بات پر رضامند کیا کہ یہ خط وہ اندر کرنل صاحب کو ہی دے اور گھر کے اندر موجود خواتین کا سایہ بھی خط پر نہ پڑنے دے۔ کرنل صاحب کے یہاں دو ہی خواتین تھیں۔ ایک ان کی بیگم اور دوسری وہی بچھل پیری مس نازنین۔ ان کے بیٹا اور بیٹی انگلینڈ پڑھنے گئے ہوئے تھے۔

انہوں نے خط میں کرنل صاحب کو واضح طور پر لکھ دیا تھا کہ آپ کی بہن آپ کا نام خوب روشن کررہی ہے۔ اس سے پہلے کہ آپ کی اکڑی ہوئی گردن شرمندگی سے جھک جائے' لوگ آپ پر ہنسنے لگیں اور آپ کی بہن آپ کا کالا منہ مزید کالا کرکے کسی بڈھے کے ساتھ چلتی بنے۔ اپنے گھر کے محاذ پر دھیان دیں ورنہ آپ کو وہ شکست فاش ہوگی کہ تمام عمر آپ اپنے زخم چاٹتے رہیں گے۔"

اب انہیں قوی امید تھی کہ کرنل صاحب کا فوجی خون جوش مارے گا اور مس نازنین پر گھر سے نکلنے پہ پابندی لگ جائے گی اور وہ جلد ہی اسے کسی لنگڑے لولے کے ساتھ نکاح پڑھوا کر روانہ کردیں گے۔

اگلی صبح فاران پٹھان لالا کے پاس خط کے سلسلے میں ہونے والا ردعمل معلوم کرنے گیا تو اپنا سر پیٹ کر رہ گیا۔ جانے کیوں ان کی ساری چالیں الٹی پڑ رہی تھیں کرنل صاحب نے چوکیدار سے کہا تھا۔

"خط لانے والا یا کوئی بڈھا گھر کے آس پاس نظر آئے تو نہایت عزت اور احترام سے اسے اندر لایا جائے۔"

لگتا تھا کرنل پر تو بہن کی شادی یا اس عمر میں بہنوئی ملنے کی خبر سن کر شادیٔ مرگ کی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔ اور پھر میمو گیٹ والا خط کا منصوبہ بھی بری طرح فلاپ ہوگیا۔

☆ ☆ ☆

"طیب! کیا آپ کے بچے مجھے دل سے قبول کرلیں گے؟" نازنین نے کافی پیتے ہوئے سوال کیا۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔ میرے بچے بہت فرماں بردار اور فرینڈلی ہیں۔ تھوڑے سے شرارتی ضرور ہیں مگر مجھے لگتا ہے' ماں کی محبت کو ترسے بچے جلد ہی آپ کو اپنالیں گے۔"

انہوں نے تینوں کے روشن چہرے یاد کرکے مسکراتے ہوئے نازنین کو تسلی دی۔

"ہاں شاید میرے اندر بھی اپنے ایک گھر اور بچوں کا خلا ہے' وہ پورا ہوسکے۔ جانے کیوں ہمارے معاشرے کا المیہ ہے کہ اگر لڑکیاں اپنی بے وقوفیوں سے یا پھر نصیب کے ہاتھوں مجبور ہوکر بیاہی نہ جائیں اور ان کی عمر چالیس سے تجاوز کرجائے تو پھر گھر والے اور باقی لوگ یہ کیوں سمجھ لیتے ہیں کہ بس اب ان کی زندگی میں کوئی گنجائش باقی نہیں رہی' حالانکہ کتنی ہی عمر ہو' لڑکی کے اندر ایک چھوٹے سے گھر اور ایک پیار کرنے والے ساتھی کا خواب کہیں بکل مارے بیٹھا رہتا ہے۔" نازنین نے اداس ہوتے ہوئے کہا۔

"ارے ارے کیا ہوگیا بھئی' آپ اداس بالکل اچھی نہیں لگتیں' آپ تو رب کریم کا شکر ادا کریں کہ آپ کے اندر بیٹھا خواب تعبیر کی منزل تک پہنچنے والا ہے۔" طیب ہمدانی نے مسکرا کر نازنین کی طرف دیکھا اور دونوں پھولوں سے ڈھکی دورویہ سڑک پر چلتے ہوئے گھر کی طرف روانہ ہوگئے۔

☆ ☆ ☆

دسمبر کا آخری ہفتہ چل رہا تھا۔ لوگ کہتے ہیں دسمبر تو تنہائی اور اداسی کا استعارہ ہوتا ہے اور اس بار واقعی دسمبر ان تینوں کے لیے یہی سب کچھ لایا تھا۔ اور اب شاید ان کے عزیز از جان ڈیڈی ان سے بہت دور ہونے والے تھے۔ اس سے پہلے ہر دفعہ دسمبر شروع ہوتے ہی نیو ایئر پارٹی کی تیاریاں شروع ہوجاتی تھیں۔ طیب ہمدانی اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ سیکٹر کی سب سے گرینڈ پارٹی ہمدانی ہاؤس میں ہی ہوتی تھی مگر ایک مس نازنین کے آنے سے سب کچھ بدل گیا تھا۔

نیا سال آنے والا تھا مگر نہ کوئی تیاری تھی نہ خوشی۔ ان کے اور ڈیڈی کے درمیان ہمیشہ بڑا دوستانہ تعلق رہا۔ کبھی بھی انہیں ایک دوسرے کی کسی بات پر اعتراض نہیں ہوا تھا۔ کبھی انہوں نے نہیں سوچا تھا کہ وہ ان سے اونچی آواز میں بات کریں گے مگر کل شام وہ تینوں بڑے سخت لہجے میں ان سے کہہ آئے تھے کہ اگر انہوں نے مس نازنین سے شادی کرنے کی کوشش کی تو ہمارا آپ سے کوئی تعلق نہیں رہے گا۔ اور وہ انہیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلے جائیں گے۔

دسمبر کی آخری اداس شاموں میں ہمدانی ہاؤس کی تنہائی سوا ہوگئی تھی۔ کل سے طیب ہمدانی اپنے کمرے

سے باہر نہیں نکلے تھے۔ زندگی میں پہلی بار ان چاروں نے چوبیس گھنٹے ایک دوسرے سے بات نہیں کی تھی۔ تینوں یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ ڈیڈی غلط ہیں یا ان سے ہی کچھ غلط ہوگیا تھا۔ شام کی شفق کو رات کے اندھیرے نے اپنے اندر چھپانا شروع کردیا تھا۔ آیان بے چین ہو کر طیب ہمدانی کے کمرے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

☼ ☼ ☼

"نہیں نازنین! میں نے آپ سے کہا ناں کہ میں آپ کی چند ماہ کی محبت کے واسطے اپنے بچوں کی برسوں کی محبت سے دستبردار نہیں ہو سکتا۔ اس لیے براہ کرم ان چند لمحوں کے لیے میں آپ سے معافی چاہتا ہوں جن لمحوں میں میں نے آپ کے دل میں دبے خواب کو تعبیر دینے کا وعدہ کیا تھا۔" طیب ہمدانی کا لہجہ ٹوٹا ہوا تھا۔

"نازنین! جانے کیوں ہمارے بچے بے انتہا محبت پا کے سمجھتے ہیں کہ والدین کی محبتوں پر بس ان ہی کا حق ہے۔ آپ کو پتا ہے، جب یہ تینوں چھوٹے چھوٹے تھے تو مجھے ان کی باتیں، فرمائشیں ان کی زبان سمجھ میں نہیں آتی تھی مگر پھر بھی میں نے ان کی ہر ضرورت پوری کی بالکل اسی طرح میں سمجھا کہ اب وہ مجھ بوڑھے کی بات سمجھیں گے، مانیں گے اور یہیں میں غلط تھا۔"

دوسری طرف شاید صرف خاموشی تھی۔ ڈیڈی بولتے چلے گئے۔ وہ ایک دم بوڑھے لگنے لگے تھے۔

"آپ کو پتا ہے اکثر ہم لاؤنج میں بیٹھے ہوتے ہیں تو تھوڑی دیر میں آیان کو کسی فرینڈ سے ملنے جانا ہوتا ہے۔ ارشمان کو اپنے دوستوں سے نوٹس ڈسکس کرنے ہوتے ہیں۔ فاران کو نیا ہیر اسٹائل سیٹ کرنے جانا ہوتا ہے اور پھر تینوں ایک ایک کرکے اٹھ کر چلے جاتے ہیں اور میں ہمدانی ہاؤس میں اکیلا رہ جاتا ہوں رات گئے تک باہر ان کی اپنی مصروفیات ہوتی ہیں اور سردیوں کی لمبی شامیں میرے قدموں سے چمٹ جاتی ہیں تھوڑے دنوں بعد یہ اپنی ازدواجی زندگیوں میں مصروف ہو جائیں گے یا پھر ہائی اسٹڈی کے لیے باہر چلے جائیں گے تو ہمدانی ہاؤس میں، میں اکیلا بوڑھا انہیں یاد کرتا رہوں گا۔ ان کے البم دیکھتا رہوں گا۔ لیکن ان یادوں میں ایک یاد آپ کی بھی ہوگی۔"

یہ آخری بات تھی جس کے بعد طیب ہمدانی نے موبائل آف کردیا۔ کمرے کی مدھم روشنی میں اسے ڈیڈی کی آنکھوں میں نمی واضح طور پر محسوس ہوئی۔ وہ واپس پلٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد تین عدد سائے کرنل صاحب کے گیٹ سے اندر داخل ہو رہے تھے۔

آج اکتیس دسمبر تھی یعنی سال کا آخری دن اور اگلی بڑی روشن چمکیلی اور نئی صبح ہونی تھی۔ آیان ارشمان اور فاران حد درجہ مصروف تھے۔ انہیں نیو ایر کی پارٹی کے ساتھ ساتھ طیب ہمدانی اور مس نازنین کے نکاح کا بھی انتظام کرنا تھا۔

صدیقی صاحب اپنی فیملی کے ساتھ لاہور سے آگئے تھے۔ آنٹی ڈیڈی کے لیے بہت خوب صورت سفید شیروانی اور مس نازنین کے لیے کریم کلر اور ڈل گولڈن شلوار سوٹ لائی تھیں۔ سب کے چہروں پر خوشیاں رقصاں تھیں۔ طیب ہمدانی مسرور اور مطمئن سے اپنے بیٹوں کو دیکھ رہے تھے جنہوں نے ان کی محبتوں کا قرض ادا کردیا تھا اور جو نئے سال کے آغاز میں ایک نئی روایت ڈال کر بہت سارے تنہا بوڑھے لوگوں کے لیے خوشیوں کا ایک نیا در وا کر رہے تھے اور نئے سال کی پہلی صبح صحیح معنوں میں ان کے لیے ہیپی نیو ایر تھی۔

صوفیہ امجد

میرے گھر میں آج کل خوشیوں کی بارات سی اتری ہوئی ہے۔ میرے اکلوتے اور چہیتے بیٹے کی دلہن جو گھر میں آگئی ہے۔ میرا خواب حقیقت میں تبدیل ہو گیا ہے۔ ایسا خواب، جو شاید ہر ماں بچے کی پیدائش کے ساتھ ہی دیکھنا شروع کر دیتی ہے۔

سب کچھ بہت اچھا اچھا اور نیا نیا سا لگ رہا ہے۔ دلہن کی چوڑیوں کا جلترنگ دل میں پھول سے کھلا دیتا ہے۔ اپنے بیٹے کی مسکان دیکھ کر میں خود کو توانا محسوس کرنے لگی ہوں اور آپس کی بات ہے، ہفتہ بھر سے تو مجھے اپنی وٹامن کی گولیاں کھانا بھی یاد نہیں۔ ٹانگوں کا درد کہیں دور بھاگ گیا ہے اور اداسی شاید پچھلے دروازے سے باہر نکل گئی ہے۔ ارے! میں آپ کو اپنے دل کا احوال سنانے بیٹھ گئی اور بالکل بھول گئی کہ بچوں کے اٹھنے کا وقت ہو گیا ہے۔ میں کچن میں چلتی ہوں، کچھ خاص بنانے کے لیے۔

”امی! خالہ جان کے یہاں دعوت میں کون سا ڈریس پہنوں۔“ حریم ہینگ کیے ہوئے دو تین ڈریسز لیے کچن میں کھڑی تھی۔

”بیٹا کوئی سا بھی پہن لو جو مناسب سمجھو، بلکہ ایسا کرو شاہ میر سے مشورہ کر لو۔“ میں نے کریم کو پھینٹتے ہوئے مصروف انداز میں جواب دیا۔

”امی! انہیں کیا معلوم۔ آپ ہی بتا دیں۔ میری تو کچھ بھی سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔“

”اچھا اچھا! تم کچن سے باہر چلو۔ کہاں گرمی میں آ کر کھڑی ہو گئی ہو۔“ میں ہیٹر آف کر کے کچن سے باہر نکل آئی۔

”دیکھو بیٹا! شادی کے شروع شروع کے دن ہیں۔ بہتر ہو گا کہ تم جہیز یا بری میں سے کوئی بھی بھاری کام کا سوٹ نکال کر پہن لو۔ بعد میں تو یہ تمام کپڑے پڑے ہی رہتے ہیں۔ جیولری بھی اس کے حساب سے منتخب کر لینا لیکن شاہ میر کو ضرور دکھا دینا۔“

”امی! وہ کہتے ہیں، مجھے ان باتوں کا کچھ علم نہیں یہ خواتین کے جھنجھٹ ہیں۔“ حریم نے ہنستے ہوئے بتایا۔

”ارے بھئی! پوچھنے کا بھی طریقہ ہوتا ہے۔ اس سے پوچھا کرو، میں کون سے ڈریس اور کون سے کلر میں آپ کو سب سے زیادہ اچھی لگتی ہوں۔“

حریم نے انتہائی حیرت سے مجھے دیکھا، پھر ہم دونوں کے بے ساختہ نکلنے والے قہقہوں سے پوری لابی گونج اٹھی۔

☼ ☼ ☼

شجاع بھائی شادی میں شرکت کے بعد شارجہ واپس جانے کے لیے پر تول رہے تھے۔ ادھر شاہ میر کا بھی ہنی مون کا پروگرام تھا، لہٰذا میں نے سارے بہن بھائیوں اور کچھ دوست احباب کے ساتھ ایک گیٹ ٹوگیدر کا پروگرام بنا لیا۔

اس وقت میرے چھوٹے سے لان میں رونق کا سماں ہے۔ تمام قریبی عزیز مدعو ہیں۔ میں سب مہمانوں سے مل کر ایک ٹیبل پر آ بیٹھی ہوں۔ شاہ میر اور حریم باری باری تمام مہمانوں کے پاس جا کر ان سے مل رہے ہیں۔ دونوں کی جوڑی بہت خوب صورت لگ رہی ہے۔ میں بار بار منہ ہی منہ میں کچھ نہ کچھ پڑھ کر ان پر دم کر رہی ہوں۔ میرے دل سے دعائیں نکل رہی ہیں۔

”یا اللہ ان کی جوڑی کو سلامت رکھنا نظر بد سے بچانا۔“

”آپا! دلہن تو بہت چھانٹ کر لائی ہو۔“ میری چھوٹی بہن ارجمند اپنی پلیٹ لے کر میرے پاس آ بیٹھتی ہے۔ ”دیکھو تو دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کتنا جچ رہے

ناولٹ

ہیں' ماشاء اللہ۔" اس کے لہجے میں خوشی کی کھنک ہے۔ وہ ایسی ہی ہے سب کی خوشیوں میں خوش ہونے والی۔

"ہاں! اللہ کا احسان ہے۔ اسی نے جوڑی ملائی ہے۔" میں خوشی کے جذبات سے مغلوب ہو کر کہتی ہوں۔

کھانے پینے کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے۔ کھانے کی اشتہا انگیز خوشبو سے فضا معمور ہے۔ کبھی چمچوں کی جھنکار سنائی دیتی ہے تو کبھی کسی ہنسی کا جلترنگ فضا میں ارتعاش پیدا کر دیتا ہے اور پھر سب سے بڑھ کر بیٹے اور بہو کے چہروں پر پھیلے ہوئے مسرتوں کے رنگ' میرے اندر طمانیت کا نیا احساس جگا رہے ہیں۔ سارا منظر کتنا مکمل اور خوب صورت ہے۔ میں اسے نظروں میں سمو لینا چاہتی ہوں۔

میرے دائیں طرف کی ٹیبل پر شجاع بھائی اور شاہ زمان (شاہ میر کے ابو) بیٹھے ہیں۔ ان کے درمیان کسی موضوع پر زور و شور سے بحث جاری ہے۔ ان کے انداز سے تو یہی لگ رہا ہے۔ شجاع بھائی پانچ سال بعد پاکستان آئے ہیں۔ اب پتا نہیں کب ملاقات ہوتی ہے۔ میرے اندر اداسی گھر کرنے لگی تھی۔ اب وجاہت بھائی کو ہی دیکھ لو' امریکا کے ہی ہو رہے۔ آخری مرتبہ آٹھ سال پہلے ابا میاں کے انتقال پر شکل دکھائی تھی۔ اب وعدے کے باوجود نہیں آسکے تھے۔

زندگی بھی کیا چیز ہے۔ ایک ہی چھت تلے ہر دم ہر گھڑی ساتھ رہنے والے بہن بھائی جب اپنی اپنی دنیا بساتے ہیں تو اکثر اوقات ایک دوسرے کی شکلوں کو بھی ترس جاتے ہیں۔

"کیا مشینی زندگی ہو گئی ہے ہماری بھی۔" مجھ پر قنوطیت طاری ہونے لگی تھی۔

مجھے اپنے بچپن کا زمانہ یاد آنے لگا' جب گھروں میں کتنی رونق اور چہل پہل ہوا کرتی تھی۔ جوائنٹ فیملی سسٹم کا زمانہ تھا اور پھر اس وقت ہم نے اپنی باگ ڈور روپے پیسے اور مشینوں کے ہاتھ میں نہیں تھمائی تھی۔ سب ایک دوسرے کی خیر خبر رکھتے تھے۔ لاتعلقی اور بیگانگی کی بیماریاں عام نہیں ہوئی تھیں۔ رشتوں نے خود غرضی کا چولا نہیں پہنا تھا۔ دکھ سکھ سب کے سانجھے ہوتے تھے۔ خالہ' ماموں' تایا' چچا سب اہل خانہ ہی میں شمار ہوتے تھے۔ مل جل کر بیٹھنے کے سو بہانے تھے۔ کسی کے بیٹے کو ملازمت مل گئی تو میلاد و قرآن خوانی ہے۔ کسی کے گھر بچے کی ولادت کی خوشی منائی جا رہی ہے تو کہیں کسی بچے کے قرآن شریف ختم کرنے پر آمین کی رسم ہو رہی ہے اور مزے کی بات یہ تھی کہ نہ کوئی تکلف' نہ فضول خرچی۔ تائی اماں نے قورمہ پکا دیا۔ بڑی خالہ نے زردہ دم دے دیا۔ دستر خوان بچھایا گیا۔ سب چھوٹے بڑوں نے ساتھ کھانا کھا لیا۔ برتن کم پڑے تو پڑوس سے منگا لیے' اللہ اللہ خیر صلا۔ کتنی سادہ زندگی تھی اور کتنی زیادہ خوشیاں تھیں زندگی میں اور آج ہزاروں لاکھوں روپے خرچ کرنے کے بعد بھی وہ خوشی اور اطمینان حاصل نہیں ہوتا جو اس دور کا خاصہ تھا۔ میں لاشعوری طور پر ہی ماضی کے سفر پر روانہ ہو گئی تھی۔

"بہن! خوب صورت بہو تو لے آئی ہو۔ لیکن اب بیٹے کی طنابیں بھی ذرا کھینچ کر رکھنا۔ ایسا نہ ہو' بہو رانی دلہا میاں کو لے کر اڑن چھو ہو جائیں اور تم ہاتھ ملتی رہ جاؤ۔" مسز حبیب کی کرخت آواز نے مجھے ماضی سے حال میں لا پٹخا۔ وہ شاہ زمان کے دوست کی بیوی تھیں۔ اپنی بات کہہ کر اب وہ مرغی کی ٹانگ کو بے دردی سے نوچنے میں مصروف تھیں۔

میں نے ہڑبڑا کر ان کی طرف دیکھا۔ میں تو اپنے ہی خیالات میں غلطاں تھی اور وہ نہ جانے کب میری ٹیبل پر آ بیٹھی تھیں۔ ان کی باتوں سے ایک ناگواری کا احساس میرے اندر جاگا لیکن میں میزبان تھی' سو کچھ کہنے سے قاصر تھی۔

"ارے بہن! آپ نے تو کچھ لیا ہی نہیں۔ دیکھیں! تکلف سے کام نہ لیں۔" میں نے ان کی لبالب بھری ہوئی پلیٹ دیکھنے کے باوجود آداب میزبانی نبھائے۔

"بھئی یہ جو آج کل کی لڑکیاں ہوتی ہیں ناں! بڑی چلتر ہوتی ہیں۔ شوہروں کو انگلی کے اشاروں پر نچاتی ہیں اور ساس سسر کو جوتی کی نوک پر رکھتی ہیں اور اگر اللہ نے حسن بھی دے دیا ہو تو پھر تو الامان والحفیظ۔ ایشوریا سے کم سمجھنا تو اپنی شان کے خلاف سمجھتی ہیں۔" اب وہ چمچے بھر بھر کے بریانی منہ میں ڈال رہی تھیں لیکن ان کی سوئی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔

تقریب میں موجود تقریباً" سارے ہی مہمانوں نے حریم کی خوب صورتی اور اخلاق کی بہت تعریف کی تھی۔ وہ سب میرے بہو اور بیٹے کو ایک خوب صورت اور پرفیکٹ کپل قرار دے رہے تھے۔ کچھ دیر پہلے تک میں ان سب کی باتیں سن کر خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھی۔ سکون و اطمینان مجھے اپنے رگ و پے میں اترتا ہوا محسوس ہو رہا تھا لیکن ان خاتون کی ہرزہ سرائی نے میرا سارا موڈ غارت کر کے رکھ دیا۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے اوپر قابو پایا۔

دل تو چاہ رہا تھا پلیٹ میں بچی ہوئی باقی بوٹیاں ایک ساتھ ان کے منہ میں ڈال کر کچھ دیر کے لیے ان کا منہ بند کر دوں لیکن ہائے رے مجبوری' میں ایسا سوچ تو سکتی تھی' کر نہیں سکتی تھی۔

"میرا خیال ہے' آپ نے میٹھا نہیں لیا' ٹھہریے! میں ابھی بھجواتی ہوں۔" وہ غٹا غٹ کولڈ ڈرنک چڑھا رہی تھیں۔ میں نے موقع غنیمت جانا اور بہانے سے ٹیبل سے اٹھ کر دوسرے مہمانوں کی طرف رخ کیا۔

"امی! آپ اس آخری ٹیبل پر بیٹھی کیا کر رہی تھیں؟ تھکن تو محسوس نہیں ہو رہی۔" شاہ میر نے میرے سرد ہاتھ تھام لیے تھے۔ اس کے لہجے سے فکر مندی جھلک رہی تھی۔

"نہیں بیٹا! تھکن کیسی؟ میں نے کونسی دیگیں ہلائی ہیں۔ بس سب سے ملتے ملاتے یہاں تک پہنچی تو کچھ دیر کے لیے ستانے بیٹھ گئی۔" میں نے ہنس کر جواب دیا۔

"آپ ایسا کریں تھوڑی دیر کے لیے اندر جا کر آرام کر لیں۔ میں اور ابو مہمانوں کو دیکھ لیں گے۔" وہ ہنوز پریشان تھا۔ وہ ایسا ہی تھا' بہت محبت کرنے والا اور بہت خیال رکھنے والا۔

"بے وقوف! تھوڑی دیر کی ہی تو بات ہے پھر تو سب مہمان چلے جائیں گے دیکھو! پھر کس سے کب ملنا ہوتا ہے۔ میں تھوڑی دیر شجاع بھائی کے پاس بیٹھنا چاہوں گی۔" میں نے پیار سے اس کا شانہ تھپتھپایا اور آگے بڑھ گئی۔

☼ ☼ ☼

گھر میں آج کل سناٹے کا راج ہے۔ شاہ میر اور حریم کو ہنی مون پر گئے ہوئے دو ہفتے ہو چکے ہیں۔ میں سارے گھر میں اکیلی بولائی بولائی پھرتی رہتی ہوں' شاہ زمان تو آفس سے آکر اسٹڈی روم کے ہو رہتے ہیں۔ انہیں انسانوں سے زیادہ کتابوں کے ساتھ وقت گزارنا اچھا لگتا ہے۔

گھریلو معاملات میں ان کی دلچسپی نہ ہونے کے برابر ہے۔ کبھی کبھی میں زبردستی جا کر ان کے سر پر سوار ہو جاتی ہوں اور انہیں گھر کے اور خاندان کے حالات سے متعلق "اپ ڈیٹ" کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔ میری لمبی چوڑی باتوں کا جواب عموماً" "ہاں ہوں یا اچھا" ہوتا ہے اور بعض اوقات تو میں پوری رام کہانی سنا کر جب ان سے کوئی رائے طلب کرتی ہوں یا ان کے خیالات جاننے کی کوشش کرتی ہوں تو وہ حیرانی سے میری طرف دیکھتے ہیں۔

"میں نے صحیح سے سنا نہیں۔ تم کس کے متعلق بات کر رہی تھیں؟" میرا سر پیٹ لینے کو جی چاہتا ہے' میں ناراضی سے اٹھ کھڑی ہوتی ہوں۔ وہ دوبارہ اپنے ادھورے پیراگراف کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ دروازے تک پہنچ کر میں اس امید پر پلٹ کر دیکھتی

ہوں کہ شاید انہیں میری ناراضی کا احساس ہو گیا ہو اور وہ کتاب بند کر کے پوچھیں "اچھا بھئی! اب بتاؤ تم کیا کہہ رہی تھیں؟" لیکن نہیں جناب! ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ اس کے بجائے ایک دھیمی سے آواز میرے کان میں پڑتی ہے۔

"اگر ایک کپ چائے مل جائے اس وقت......"

میں ٹھنڈی سانس بھر کے باہر آجاتی ہوں اور کچن کا رخ کرتی ہوں، دو کپ چائے بنانے کیونکہ اب مجھے بھی نہ صرف چائے بلکہ ڈسپرین کی ضرورت بھی محسوس ہو رہی ہوتی ہے۔

☼ ☼ ☼

شاہ میر کا فون آیا ہے۔ وہ دونوں پرسوں واپس آ رہے ہیں۔ میری بیزاری اور اکتاہٹ ایک دم ہی ختم ہو گئی ہے اور اس کی جگہ خوشی اور جوش نے لے لی ہے۔ کبھی میں ماسی کو صفائی ستھرائی سے متعلق ہدایت دے رہی ہوں۔ کبھی کچن کے چکر لگا رہی ہوں۔ کبھی کچن کیبنٹ کھول کر جھانکتی ہوں تو کبھی فریزر کھنگالتی نظر آتی ہوں کہ مجھے کس کس چیز کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ بچے اتنے دن بعد آ رہے ہیں۔ مجھے ان کی پسند کی ڈشز جو تیار کرنی ہیں۔

ضروری سامان کی خریداری مجھے قریبی مارکیٹ سے خود ہی کرنی پڑے گی۔ یہ شاہ زمان کے بس کی بات نہیں ہے۔ اگر مارے باندھے کبھی چلے بھی جائیں تو دکانداروں کی عید ہو جاتی ہے۔ ان کے من چاہے داموں پر چیزیں خرید لی جاتی ہیں۔ آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ میں کتنی مصروفیت میں گھرنے والی ہوں اس لیے پھر بعد میں بات ہوتی ہے آپ سے۔

☼ ☼ ☼

زندگی اپنے لگے بندھے معمولات پر لوٹ آئی ہے لیکن ایک خوشگوار تبدیلی کے ساتھ۔ میری تنہائیوں کو شیئر کرنے والی جو آگئی ہے۔ حریم جلد گھل مل جانے والی باتونی سی لڑکی ہے۔ میری اس کے ساتھ اچھی خاصی انڈر اسٹینڈنگ ہو گئی ہے۔ پہلے دن گزارنا دشوار ہوتا تھا، اب وقت کا پتا ہی نہیں چلتا۔ حریم سارا دن میرے ساتھ ہی لگی رہتی ہے۔ کچن کے کاموں میں بھی میرا ہاتھ بٹانے کی کوشش کرتی ہے۔ لیکن میں ابھی اس پر زیادہ بوجھ نہیں ڈالنا چاہتی۔ اچھا ہے اپنی زندگی کو انجوائے کرے۔ کام کا کیا ہے، اس کے لیے تو ساری عمر پڑی ہے، کیوں ٹھیک کہہ رہی ہوں ناں میں؟

شام کو شاہ میر آفس سے اور شاہ زمان واک کر کے واپس آجاتے ہیں تو ہم سب چائے باہر لان میں ہی پی لیتے ہیں۔ ایک رونق کا احساس ہوتا ہے۔

"بھئی! مجھے تو صرف ایک کپ چائے ہی پینی ہے۔ کمرے میں ہی لا دو۔" پہلے شاہ زمان کے یہی ڈائیلاگ ہوتے تھے، لیکن اب حریم چائے کے لیے بلانے جاتی ہے تو شرما حضوری میں چلے آتے ہیں انکار نہیں کر پاتے۔ چلو! کچھ تو تبدیلی آئی۔

☼ ☼ ☼

وقت سبک رفتاری سے رواں ہے۔ شاہ میر کی شادی کو چار ماہ بیت گئے۔ پتا ہی نہیں چلا، لیکن آج کل میں اپنی طبیعت کی طرف سے پریشان ہوں۔ کچھ عجیب سی تبدیلی محسوس کر رہی ہوں خود میں۔ ایک نامعلوم سی بیزاری اور اکتاہٹ میرے وجود کے ساتھ چمٹ گئی ہے۔ کچھ اچھا نہیں لگ رہا۔ مزاج میں چڑچڑاہٹ کا عنصر شامل ہو گیا ہے جبکہ میں ایک خوش مزاج خاتون کے طور پر مشہور ہوں۔

اگر کبھی میرے مزاج کے خلاف کوئی بات ہو جائے تو میں الجھن کا شکار ہو جاتی ہوں اور ایسی کیفیات مجھ پر طاری ہو جاتی ہیں، لیکن ایسا تو شاذ و نادر ہی ہوتا ہے اور یہاں تو سب کچھ ٹھیک چل رہا ہے۔ نہ جانے پھر کیا بات ہے۔ گتھی کچھ سلجھ نہیں پا رہی ہے۔ خیر! اللہ مالک ہے۔

"امی! چکن کڑاہی بنالوں یا چکن جلفریزی؟" حریم فریزر سے چکن کا پیکٹ نکال کر پوچھ رہی ہے۔

"بھئی! کچھ بھی بنالو۔ میں کب تک تمہیں بتاؤں گی۔" میرے لہجے میں تلخی ہے، جس پر میں باوجود کوشش کے قابو نہیں پا سکی ہوں۔ حریم رک کر حیرت سے میری طرف دیکھتی ہے۔

"امی! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟ شاہ میر بتا رہے تھے، آپ کا بلڈ پریشر کبھی کبھی بہت لو ہو جاتا ہے۔ میں آپ کے لیے جوس بنا دوں۔"

"نہیں! میں ٹھیک ہوں۔ بس سر میں کچھ درد سا ہے۔" میں نے لہجے کو نارمل رکھنے کی کوشش کی۔ مجھے شرمندگی کا احساس ہو رہا تھا۔ اس ٹون میں تو میں کسی سے بھی بات نہیں کرتی ہوں۔

"اچھا! آپ کمرے میں جا کر لیٹ جائیں۔ میں آپ کے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں، بلکہ ایسا کریں لان میں بیٹھ جائیں۔ اچھا فیل کریں گی یا پھر ابو کے ساتھ گپ شپ لگانے کے بارے میں کیا خیال ہے؟ میں آپ دونوں کی چائے وہیں لے آتی ہوں۔" اس کی آنکھوں میں شرارت ہے۔ میں بالآخر مسکرا پڑتی ہوں۔

"دیکھا! میرا آخری آئیڈیا آپ کو زیادہ پسند آیا۔" وہ ہنستی ہوئی کچن میں چلی جاتی ہے۔

"بہت بولتی ہے یہ لڑکی۔" میں کرسی سے اٹھتے ہوئے بڑبڑاتی ہوں۔

☼ ☼ ☼

شاہ میر اور حریم کافی دیر سے شاپنگ کے لیے نکلے ہوئے ہیں۔ اب تو رات سر پر آگئی ہے۔ میں وال کلاک کی طرف دیکھتی ہوں۔ میری پریشانی دم بہ دم بڑھتی جا رہی ہے۔ آج تو شاہ زمان بھی گھر پر نہیں ہیں۔ وہ کسی دوست کے یہاں گئے ہوئے ہیں۔

میں ٹی وی کھول کر بیٹھ جاتی ہوں۔ نیوز چینل پر ساری ہی خبریں ہولناک اور پریشان کن ہیں۔

"ڈرون حملے میں بیس افراد ہلاک ہو گئے۔ پشاور میں ایک موٹر سائیکل میں لگا ہوا بم پھٹنے سے دو راہگیر زخمی ہو گئے۔ بجلی کی لوڈشیڈنگ کے خلاف لوگوں کا احتجاج، روڈ بلاک کر کے ٹائر جلائے گئے۔ شاہراہ فیصل پر بدترین ٹریفک جام۔ محکمہ صحت میں کروڑوں کے گھپلے کا انکشاف۔ دہشت گردوں کی فائرنگ سے دو میاں بیوی ہلاک بچوں کی آہ و بکا۔ مشتعل لوگوں نے پتھراؤ کر کے ٹریفک معطل کر دیا۔"

میں گھبرا کر ٹی وی بند کر دیتی ہوں اور اضطراری انداز میں ٹہلنے لگتی ہوں "اللہ! میرے بچوں کی حفاظت کرنا بلکہ ہر بچے کی حفاظت کرنا اور خیریت اور سلامتی کے ساتھ منزل مقصود پر پہنچانا۔" میں صدقِ دل سے دعا کرتی ہوں۔

اسی وقت گاڑی کا ہارن سنائی دیتا ہے۔ میں شکر کا سانس لیتی ہوں۔ حریم نے گیٹ کھول دیا ہے۔ اضافی چابی شاہ میر کے پاس ہوتی ہے۔ اب وہ لدے پھندے اندر داخل ہو رہے ہیں۔ میرا موڈ سخت آف ہو چکا ہے۔

"امی! ہم آگئے۔ بڑی زبردست شاپنگ کی ہے ہم

نے۔" حریم خوشی سے چہکتے ہوئے بتا رہی ہے۔

"بیٹا! وقت دیکھا ہے تم نے کیا ہوا ہے؟ خریداری میں ایسا گم ہوئے' ہوش ہی نہیں رہا کہ ماں گھر میں ہلکان ہو رہی ہو گی۔" میں حریم کو نظر انداز کر کے شاہ میر کو ڈانٹ رہی ہوں۔

"تمہیں فون کیا تو تمہارا سیل مسلسل آف جا رہا تھا اور تمہاری بیگم کو کیا تو رنگ ٹون گھر میں ہی سنائی دینے لگی۔ خیر سے وہ اپنا فون گھر پر ہی بھول گئی تھیں۔ حد ہوتی ہے غیر ذمہ داری کی۔" میرا غصہ کم نہیں ہو رہا ہے۔

حریم ریفریجریٹر سے بوتل نکالتے نکالتے مجھے چونک کر دیکھتی ہے۔ اس نے پہلی بار مجھے اس طرح غصہ کرتے ہوئے دیکھا ہے۔

"شہر کے حالات پتا ہیں ناں تمہیں' جب تک گھر نہ آجاؤ' جان حلق میں ہی اٹکی رہتی ہے اور آج تو تمہارے ابو بھی گھر پر نہیں ہیں' لیکن تمہیں کیا احساس کہ ماں تنہا ہے اور تمہارے انتظار میں بھوکی بیٹھی ہے۔" میری ناراضی کا سلسلہ جاری ہے۔

"امی سوری! وری سوری۔" شاہ میر محبت سے مجھے شانوں سے تھام کر صوفے پر بٹھا دیتا ہے "آپ تو جانتی ہیں کہ ایک تو شاپنگ کرتے ہوئے بالکل بھی وقت کا اندازہ نہیں ہوتا' دوسرے یہ ٹریفک جام۔ پورے ڈیڑھ گھنٹے میں واپسی کا سفر طے ہوا ہے اور یہ کھانا کیوں نہیں کھایا آپ نے اب تک؟" وہ نیچے کارپٹ پر بیٹھ کر ہولے ہولے میرے گھٹنے دبا رہا ہے۔ اسے میرا غصہ رفع کرنے کا ہنر اچھی طرح آتا ہے۔

"معلوم ہے تمہیں' تمہارے بغیر نوالہ میرے حلق سے نہیں اترتا۔" میں پھر تلخ ہو جاتی ہوں۔

"او کے' او کے ریلیکس مام! غلطی ہو گئی' معاف کر دیں۔ آئندہ ہم اپنی سویٹ ماما کو شکایت کا موقع نہیں دیں گے۔ کیوں حریم؟" وہ بیوی کی مدد طلب کرتا ہے۔

"ہاں امی! غصہ تھوک دیں۔ چلیں! کھانا کھاتے ہیں بہت بھوک لگی ہے' پھر آپ کو اپنی شاپنگ بھی تو دکھانی ہے۔" وہ کھانا نکالنے کچن میں چلی جاتی ہے۔

کھانے کے بعد وہ دونوں خوشی خوشی اپنی شاپنگ دکھا رہے ہیں۔

"امی! موسم بدل رہا ہے ناں اس لیے میں نے لون اور کاٹن کے سوٹ لے لیے۔" وہ یکے بعد دیگرے سوٹ نکال نکال کر مجھے دکھا رہی ہے۔ "امی! اس کا کپڑا دیکھیں۔ یہ پرنٹ کیسا ہے اور یہ کلر کنٹراسٹ کتنا زبردست ہے۔"

"ابھی تو شادی کو چند مہینے ہی ہوئے ہیں۔ جہیز اور بری کے ڈھیروں کپڑے ایسے ہی پڑے ہیں۔ تقریباً" سات کاٹن کے اسٹائلش سوٹ میں نے بھی بری میں رکھے تھے کہ گھر میں ریشمی کپڑے پہننا مشکل ہوتا ہے لیکن آج کل کی بیویوں کو تو شوہر کی کمائی لٹا کر ہی چین ملتا ہے۔" میں اندر ہی اندر جز بز ہو رہی ہوں۔

"ارے! وہ سوٹ بھی تو دکھاؤ جو امی کے لیے خریدے ہیں۔" شاہ میر اسے یاد دلاتا ہے۔

"یہ دیکھیں اور سچ سچ بتائیں! آپ کو پسند آئے یا نہیں۔" وہ بہت پرجوش ہو رہی ہے۔

"بیٹا! کیا ضرورت تھی فضول خرچی کرنے کی؟ میرے پاس تو پہلے ہی بہت سوٹ پڑے ہیں۔" بالآخر دل کی بات میری زبان پر آجاتی ہے' مگر وہ اپنی ہی دھن میں مگن ہیں۔ میرا موڈ اور تاثرات ان پر اثر انداز نہیں ہو رہے ہیں۔

"اور یہ دیکھیں! ابو کے لیے مجھے یہ کرتا بہت پسند آگیا تھا۔" وہ ڈبے میں سے لائٹ براؤن کرتا نکال کر مجھے دکھا رہا ہے۔ "ابو کو تو اب تک آجانا چاہیے تھا۔" اسے اچانک ہی وقت کا احساس ہوتا ہے۔

"جب وہ بیگ صاحب کے یہاں چلے جائیں تو دنیا زمانے سے بے نیاز ہو جاتے ہیں جانتے تو ہو تم۔" میرے لہجے میں بیزاری ہے۔

"میں فون کر کے پتا کرتا ہوں۔" وہ اپنا سیل اٹھا کر باہر چلا جاتا ہے۔

"اور امی دیکھیں! یہ پرفیوم میں نے اپنی چوائس سے لیا ہے آپ کے لیے۔ اس کی خوشبو بڑی سوفٹ ہے۔ یقیناً" آپ کو پسند آئے گی۔" وہ اپنے ہینڈ بیگ

سے پرفیوم نکال کر مجھے دکھا رہی ہے۔

"ہاں بھئی! میرے بیٹے کی کمائی دونوں ہاتھوں سے لٹاؤ۔" میں منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی ہوں۔ میرے اندر کی ساس پورے طور پر انگڑائی لے کر بیدار ہو چکی ہے۔

☼ ☼ ☼

میں نے کچن میں قدم رکھا تو پورا کچن ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلا پڑا تھا۔ گوشت کا پیکٹ جو غالباً" حریم نے پکانے کے لیے نکالا تھا سنک میں پڑا تھا۔ ناشتے کے برتن' مکھن' جیم سب شیلف پر دھرے تھے۔ ایک برتن میں پانی جو نہ جانے کس مقصد کے لیے چولہے پر رکھا تھا' پک کر آدھا رہ گیا تھا۔ حریم لابی میں فون پر مصروف تھی۔

میری نفاست پسند طبیعت پر یہ منظر گراں تو گزرنا ہی تھا۔ میرا پارہ ہائی ہونا شروع ہو گیا۔ میں نے گوشت نکال کر چھلنی میں ڈالا۔ برتن سمیٹ کر سنک میں رکھے ناشتے کا سامان ٹھکانے پر رکھا اور اپنے لیے چائے کا پانی چڑھا دیا۔ صبح ناشتے کے بعد ہی حریم نے کہہ دیا تھا کہ کھانا وہ بنا لے گی' اسی لیے میں جا کر کمرے میں لیٹ گئی تھی۔ کھٹ پٹ کی آواز سن کر وہ کچن میں آگئی۔

"یہ کچن کا کیا حال بنا رکھا ہے تم نے؟ مجھے تو پھیلا ہوا کچن دیکھ کر ہی چکر آنا شروع ہو جاتے ہیں۔" میں نے ناگواری سے کہا۔

"امی! میری دوست کا فون آگیا تھا۔ وہ امریکا گئی ہوئی تھی شادی میں شریک نہیں ہو سکی تھی۔ اب واپس آئی ہے تو میری جان ہی نہیں چھوڑ رہی تھی۔" وہ مجھے وضاحت دینے لگی۔

"ہر کام کا ایک وقت اور طریقہ ہوتا ہے۔ میکے اور سسرال کی زندگی میں فرق ہوتا ہے۔ شادی کے بعد لڑکی کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرنا چاہیے۔ تمہاری دوست کو بھی عقل ہونی چاہیے کہ اب تم میکے میں نہیں سسرال میں ہو اور صبح کا وقت ویسے بھی کام کاج اور مصروفیت کا ہوتا ہے۔" میں نے اچھی خاصی تقریر کر ڈالی۔ آج کل میرا یہی مشغلہ تھا' بات بے بات اعتراض کرنا اور باتیں سنانا اور آج تو اس نے مجھے خود ہی موقع فراہم کر دیا تھا۔

میں اپنا چائے کا کپ لے کر لابی میں آبیٹھی اور اخبار اٹھا لیا۔ چائے پینے کے ساتھ ساتھ میں نے اخبار کی سرخیوں پر سرسری نظر ڈالی اور پھر اسے سائیڈ میں رکھ دیا۔

حریم میرا خالی کپ اٹھانے آئی تو میری نگاہ اس کے چہرے پر پڑی۔ وہ مجھے کچھ خاموش اور ناراض سی محسوس ہوئی' ورنہ اسے تو چلتے پھرتے بولنے کی عادت تھی۔ مجھے تاسف نے آگھیرا۔ کیا ضرورت تھی مجھے اتنا تلخ ہونے کی۔ بچی ہی تو ہے رفتہ رفتہ سمجھ جائے گی اور گھر ہی تو ہے جلد یا بدیر کام ہو ہی جائے گا۔ کون سا ابھی کوئی کھانے کے انتظار میں بیٹھا ہے۔ میں اسے پیار سے سمجھا دیتی ہوں کہ میری بات کا برا نہ مانے۔ مجھے اس کا افسردہ چہرہ ذرا بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا اور پھر میرا مزاج بھی ایسا ہی تھا کسی کو میری ذات سے تکلیف پہنچے' یہ مجھے کسی صورت گوارا نہیں تھا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے اس کو جا کر پچکارنے کی اور سر پر چڑھ جائے گی۔ تم نے سمجھایا ہی تو ہے کون سے تیر بھالے مارے ہیں۔" میرے اندر کی ساس تن کر کھڑی ہو گئی تھی۔

"کون سا ظلم ہو رہا ہے اس پر یہاں؟ اپنی نیند سوتی ہے' اپنی نیند جاگتی ہے۔ کھانے پینے' پہننے اوڑھنے' آنے جانے پر کیا کوئی پابندی لگائی ہے تم نے؟ باقی رہی گھرداری تو لے دے کر ایک کھانا پکانا ہی ہے' باقی کے کام تو ماسی کے سپرد ہیں۔ اپنا وقت بھول گئیں' کیسے سسرال میں گزارا کیا تھا۔"

"ہاں۔" میں سرد آہ بھر کر واپس بیٹھ جاتی ہوں۔ کیسے بھول سکتی ہوں میں وہ تکلیف دہ ماہ و سال۔ بھرا پرا سسرال تھا میرا' جیٹھ جٹھانیاں' ان کی آل اولاد' دیور' کنواری نندیں' شادی شدہ نندیں جو اکثر و بیشتر میکے میں ہی قیام پذیر ہوتی تھیں۔ پھر سب کے الگ الگ

موڈ اور مزاج اور سب سے بڑھ کر ساس صاحبہ جو انتہائی سنگدل اور سخت گیر عورت تھیں۔ اللہ کی بندی نے کبھی زندگی میں سکون کا سانس نہیں لینے دیا۔

میں نے ساری زندگی پھونک پھونک کر قدم رکھا اور زندگی ایسے گزاری جیسے بتیس دانتوں کے درمیان زبان۔ پھر بھی ناقدری اور نارسائی ہی مقدر بنی۔ سسرال والے محبت اور خدمت حق سمجھ کر وصول کرتے رہے اور شوہر خیر سے ایسے ماں کے فرمانبردار' تابع دار اور اطاعت گزار تھے' جیسے بیوی کے حق میں ایک آواز بھی بلند کی تو فوراً' ہی گردن سے پکڑ کر دوزخ میں ڈال دیا جائے گا۔

وقت اچھا ہو یا برا' بیت ہی جاتا ہے۔ دامن سے خالی یادیں لپٹی رہ جاتی ہیں اور میرے پاس تو سوائے تلخ یادوں کے اور کچھ بھی نہیں۔ میں ان باتوں اور یادوں کو دہرانا نہیں چاہتی پھر بھی کوئی بات کوئی جملہ یا کوئی واقعہ ان کو دہرانے کا سبب بن جاتا ہے اور ماضی کی فلم آنکھوں کی اسکرین پر چلنا شروع ہو جاتی ہے۔

☼ ☼ ☼

ہم سب رات کے کھانے کے لیے ٹیبل پر جمع ہیں۔ کھانا خوشگوار ماحول میں کھایا جا رہا ہے۔ شاہ میر اپنے کسی کولیگ کے قصے مزے لے لے کر سنا رہا ہے۔ حریم نے دم کا قیمہ اور بنانا سوفلے بنایا ہوا ہے۔ سب رغبت سے کھا رہے ہیں۔

"بھئی شاہ میر! اپنی امی سے کہو' اب وہ ریٹائر ہو جائیں۔ ان کی بہو آ گئی ہے کچن سنبھالنے کے لیے۔" شاہ زمان سویٹ ڈش پیالی میں نکالتے ہوئے مشورہ دیتے ہیں۔

"ہاں امی! ابو ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ آپ بتاتی ہیں ناں آپ کی نانی دادی کے زمانے میں گھر اور الماریوں کی چابیاں بڑی بہو کے سپرد کی جاتی تھیں۔ آپ الماریوں کی چابیاں نہ سہی' کچن کا چارج اپنی بہو کے ہاتھ میں دے دیں اور موج کریں۔" شاہ میر مجھے چھیڑنے کے انداز میں کہہ رہا ہے۔ سب ہنس رہے ہیں۔ میری نظر حریم کے چہرے پر پڑتی ہے۔ مجھے اس کا ہنسنا ایک آنکھ نہیں بھا رہا ہے۔

"ہاں! تم سب تو یہی چاہتے ہو کہ میں سب چھوڑ چھاڑ کر ایک کونے کی ہو رہوں۔ بس اللہ اللہ کروں۔"

میں بظاہر ہنس کر لیکن درحقیقت جل کر کہتی ہوں۔

"بھئی آئیڈیا تو برا نہیں ہے۔ اصولاً" بڑھاپے میں یہی کچھ کرنا چاہیے۔ ایسا کرو بیڈ روم میں جو سامنے والی کھڑکی ہے وہیں مصلیٰ بچھا لو۔ ہوا بھی اچھی آتی ہے اور سامنے کا ویو بھی اچھا ہے۔" شاہ زمان کی رگ ظرافت بھی آج پھڑک رہی ہے۔

سب یہی چاہتے ہیں کہ میں اپنی سلطنت کسی اور کو سونپ دوں۔ گھر ایک عورت کی سلطنت ہی تو ہوتا ہے جس کی وہ بلا شرکت غیرے مالک رہنا چاہتی ہے اور اس میں کسی اور کی مداخلت اسے برداشت نہیں ہوتی اور یہی حال رشتوں کا بھی ہے۔ بہت سے رشتے عورت سے شیئر نہیں ہوتے۔ ان میں کسی اور کی شرکت وہ ذہنی طور پر قبول نہیں کر پاتی۔ شاید میرے ساتھ بھی یہی ہو رہا ہے۔ میرے دم بدم بدلتے ہوئے رویے اس بات کی غمازی کر رہے ہیں۔ مجھ پر سوچ کا در وا ہو جاتا ہے۔ ایک گرہ ہے جو شاید کھل رہی ہے۔

بادشاہوں کے زمانے میں کئی بیٹوں نے باپ کو معزول کر کے زنداں میں ڈال دیا اور خود اقتدار پر قابض ہو گئے۔ تاریخ کے کئی اوراق میرے ذہن کے پردے پر سرسرانے لگے اور منفی خیالات مجھ پر غالب آنے لگے۔ میں نے حریم کی طرف دیکھا یہ بھی میرے اقتدار پر قابض ہونا چاہتی ہے شاید!

☼ ☼ ☼

گھر کی فضا میں ایک عجیب بوجھل پن کا احساس در آیا ہے۔ اداسی اور ویرانی سی در و دیوار سے لپٹی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ پتا نہیں ایسا ہے یا میں ہی ایسا محسوس کر رہی ہوں۔ شاعر نے صحیح کہا ہے۔

کیا ہوتا ہے خزاں بہار کے آنے جانے سے
سب موسم ہیں دل کھلنے اور دل مرجھانے سے

میرے دل کی کلی بھی مرجھا سی گئی ہے۔ ابھی چند مہینوں پہلے ہی کی تو بات ہے' میں کتنی خوش اور مطمئن تھی۔ خدا کا شکر ادا کرتے میری زبان نہیں تھکتی تھی۔ مجھے گھر کے در و بام مسکراتے نظر آتے تھے۔ سارے منظر کتنے مکمل اور خوش کن تھے۔ حریم کی کھنکھناتی ہوئی ہنسی' شاہ میر کی چھیڑ چھاڑ اور شاہ زماں کی زیر لب مسکراہٹ۔

"امی! مجھے لگتا ہے گوشت صحیح سے گلایا نہیں آپ کی بہو نے۔" شاہ میر مجھے ورغلانے کی کوشش کرتا ہے۔

"نہیں بیٹا! گوشت تو بالکل گلا ہوا ہے۔" میں حیرانی سے اسے دیکھتی ہوں۔

"بھئی! میرے پاس جو بوٹی آئی ہے' وہ تو بالکل سخت ہے۔" وہ سر کھجاتے ہوئے کہتا ہے۔

"امی! چاولوں میں وہ ذائقہ نہیں ہے جو ہونا چاہیے۔" وہ دوسری مرتبہ چاول کی پلیٹ بھرتے ہوئے کہہ رہا ہے۔ میں اس کی شرارت سمجھ جاتی ہوں۔

"ذائقہ نہیں ہے تو اتنا کھا رہے ہو اور جو مزیدار ہوتے تو کیا کرتے۔ کیوں زچ کرتے ہو میری بہو کو۔" میں حریم کی طرف پیار سے دیکھتے ہوئے کہتی ہوں۔ کبھی وہ کہہ رہا ہوتا۔

"امی! ویسے ایک بات ہے' جیسا کھانا آپ بناتی ہیں' ویسا آپ کی بہو نہیں بنا سکتی۔" وہ مریم کی بنائی ہوئی فرائی چانپیں بہت رغبت سے کھاتے ہوئے کہہ رہا ہے۔

"نہیں بھئی! میری بیٹی کھانا بہت اچھا بناتی ہے اور اگر کچھ کمی بیشی ہے تو وقت کے ساتھ ساتھ دور ہو جائے گی۔ ویسے بھی میرے تیس سالہ تجربے کے ساتھ اس کے چند ماہ کے تجربے کا موازنہ کرنا تو سراسر زیادتی ہے۔" میں ہمیشہ مثبت رہنے ہی کی کوشش کرتی ہوں۔

"دال نہیں گلی جناب!" حریم شرارت سے شاہ میر کو انگوٹھا دکھاتی ہے اور وہ گنگناتے ہوئے ہاتھ دھونے کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔

اے میرے ہم نشین چل کہیں اور چل
اس چمن میں اب اپنا گزارا نہیں

یہ سارے منظر کہیں کھو گئے ہیں' دھندلا گئے ہیں یا تبدیل ہو گئے ہیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔

"بیٹا! شام میں حریم کو کہیں آؤٹنگ پر ہی لے جایا کرو۔ سارا دن بور ہوتی ہے۔" یہ پہلے کا منظر ہے۔

"امی! ہم ذرا آئس کریم پارلر تک جا رہے ہیں۔" شام کو وہ دونوں تیار کھڑے ہیں۔ میرا موڈ آف ہو جاتا ہے۔ میں صرف اثبات میں سر ہلا دیتی ہوں۔ یہ بعد کا منظر ہے۔

"کتنے دن ہو گئے ہیں حریم کو میکے گئے ہوئے۔ بیٹا! اگر وہ خود کچھ نہ کہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم بھی ان باتوں کا خیال نہ رکھیں۔" میں شاہ میر کو سمجھا رہی ہوں۔

"امی! آفس میں گزشتہ دنوں بہت مصروفیت رہی اور شام میں آ کر بالکل ہمت نہیں ہوتی کہیں آنے جانے کی' ویسے آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں میں ایک دو روز میں لے جاؤں گا۔"

"ہاں بیٹا! ماں باپ اور بہن بھائیوں کو ایک آس اور انتظار سا رہتا ہے بیٹی کے میکے آنے کا' وقت نکال کر ضرور لے جانا۔ اگر وہ اپنی امی کے یہاں رکنا چاہے تو دو چار روز کے لیے چھوڑ دینا۔" یہ میرے پہلے کے خیالات تھے۔ اب اگر وہ میکے جانے کا ارادہ ظاہر کرے تو میری تیوریوں پر بل پڑ جاتے ہیں۔

"کچھ زیادہ جلدی جلدی نہیں جانے لگی یہ اپنے میکے؟" کیا میں ذہنی طور پر بیمار ہو گئی ہوں۔ میں اپنے آپ سے سوال پوچھنے پر مجبور ہوں۔

☼ ☼ ☼

کچھ بے کیف دن اور سرک گئے ہیں۔ گھر میں خاموشی کا راج ہے۔ حریم چپ چاپ اپنے کاموں میں لگی رہتی ہے۔ اب تو مجھے شاہ میر بھی کچھ بجھا بجھا سا نظر آنے لگا ہے۔ اس کی شوخی و شرارت سنجیدگی میں

بدل گئی ہے۔ کیا میرے بدلتے رویے اس پر اثر انداز ہو رہے ہیں؟ کیا وہ مجھ سے نالاں ہے یا ناراض ہے؟..... یا وہ بھی بدل رہا ہے جیسے دوسروں کے بیٹے شادی کے بعد ماں باپ سے آنکھیں پھیر لیتے ہیں۔ کوئی کچھ کہتا کیوں نہیں؟ بتاتا کیوں نہیں؟ خاموشی سے میرا دم گھٹنے لگا ہے۔

کھانے کے بعد ہم سب ٹی وی لاؤنج میں جمع ہیں۔ یہ بات ہمارے معمولات میں شامل ہے۔ پہلے سب ساتھ بیٹھتے تھے تو ماحول بڑا خوشگوار ہوتا تھا۔ کبھی شاہ میر اپنے پورے دن کی روداد سناتا۔ کبھی حریم اپنے کالج کا کوئی قصہ لے بیٹھتی اور کبھی میں اپنا کوئی ایکسپیرئنس شیئر کر رہی ہوتی۔ شاہ زمان موجود تو ہوتے لیکن ان کی نظریں کبھی تو ٹی وی پر مرکوز ہوتیں یا کسی کتاب کے صفحات پر۔ موسم کے لحاظ سے چائے کافی یا آئس کریم کا دور چلتا۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے ساتھ گزارنے کے بعد ہم اپنے کمروں کا رخ کرتے۔

آج بھی منظر ویسا ہی ہے۔ سب جمع ہیں مگر کچھ اس طرح جیسے کوئی فرض "مجبوراً" ادا کر رہے ہوں۔ شاہ میر چینل سرچنگ میں مصروف ہے۔ اس کے ابو کتاب میں گم ہیں۔ میں اور حریم بالکل خاموش ہیں جیسے الفاظ اور موضوع بالکل ختم ہو گئے ہوں۔ ماحول میں ایک ان دیکھا تناؤ ہے۔ بظاہر سب کچھ معمول کے مطابق ہے لیکن میں جانتی ہوں کہ کہیں بہت کچھ غلط بھی ہے۔

آج صبح بھی میں نے حریم کو دیر سے اٹھنے پر بری طرح لتاڑ دیا تھا۔ میری آواز خاصی بلند تھی حالانکہ یہ بات میرے مزاج کے بالکل خلاف تھی۔ شاہ میر کی ضروری میٹنگ تھی اور اسے آفس کے لیے دیر ہو گئی تھی۔ شاہ میر نے ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ صرف ایک نظر مجھ پر ڈالی تھی۔ مجھے لگا اس کی حیران نظر میں ایک سوال تھا جیسے وہ پوچھ رہا ہو۔

"امی! یہ آپ ہیں؟ آپ؟ میری سویٹ مام؟" سوال صرف ایک نظر کا تھا لیکن میں سارا دن بے کل پھر پھر کر اس کا جواب ڈھونڈتی رہی تھی۔

میں نے باری باری سب کی طرف دیکھا۔ میرا دم گھٹ رہا ہے۔ میں اچانک اٹھ کھڑی ہوتی ہوں۔ اپنے کمرے میں جانا چاہتی ہوں لیکن تھوڑا لڑکھڑا جاتی ہوں۔ شاہ میر جلدی سے کھڑا ہو کر مجھے تھام لیتا ہے۔ حریم بھی لپکتی ہے۔

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے امی؟" وہ فکر مندی سے میری طرف دیکھ رہا ہے۔

"میں نے آپ کی ٹیبلٹس کمرے میں سائیڈ ٹیبل پر رکھ دی ہیں۔ کل دیکھا تھا، دو تین ہی رہ گئی تھیں۔ آپ نے بتایا بھی نہیں۔"

اسے اب بھی میرا خیال ہے، دھیان ہے، فکر ہے۔ میرے دل کو تقویت سی محسوس ہونے لگی۔

"میں ٹھیک ہوں۔ بس اب لیٹنا چاہتی ہوں۔" میں اس کا شانہ تھپتھپا کر کمرے کی طرف بڑھ جاتی ہوں۔

اب میں ہوں، میرا کمرا ہے، تنہائی ہے اور ڈپریشن ہے۔ میں عشاء کی نماز کے بعد بہت دیر تک اپنے ذہنی سکون کے لیے دعا کرتی رہی ہوں۔ زندگی میں مجھ پر بارہا ڈپریشن کے دورے پڑے۔ جب جب احباب کے رویے میرے لیے ایذا رسانی کا باعث بنے یا جب جب حالات سے مجبور ہو کر مجھے اپنے مزاج کے خلاف کچھ کرنا پڑا یا جب جب میری انا کو مجروح کیا گیا... ڈپریشن ہمیشہ مجھے ماضی کے دھندلکوں میں دھکیل دیتا ہے، جہاں میں زندگی کی کچھ خوب صورت یادوں سے ہمت طاقت، حوصلہ اور توانائی حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔ کیا ہوا جو آج غم ہے، پریشانی ہے، ناکامی ہے، نامرادی ہے۔ میں نے اپنے دامن میں بہت سی کامرانیاں بھی تو سمیٹی ہیں۔ خوشیوں کے ان گنت لمحے بھی تو میری زندگی کا حصہ رہے ہیں۔ کسی شاعر نے خوب کہا ہے۔

ماضی کی محفلوں کو سجا کر شعور میں
دیتے ہیں زندگی کو سہارا کبھی کبھی

جس طرح کچھ لوگوں کو نوادرات جمع کرنے کا شوق ہوتا ہے، کچھ سکے جمع کرتے ہیں، کچھ ٹکٹ اسی طرح

میں نے اپنی زندگی کی انمول یادوں کو بڑے پیار سے سینت کر رکھا ہوا ہے۔ کچھ یادیں تو میرے ذہن کے میموری کارڈ میں محفوظ ہیں اور کچھ ایک فائل میں بند ہیں، جس میں میری دوستوں کے آٹو گرافس ہیں، کچھ آرٹیکل ہیں، کچھ سرٹیفکیٹس، کچھ ادھوری نظمیں، کچھ غزلیں، کچھ اور یادداشتیں۔

میں الماری سے اپنی قیمتی فائل نکال کر بیڈ پر آ بیٹھتی ہوں اور اس خزانے سے موتی چن چن کر اپنے دامن میں بھرنے کی کوشش کرتی ہوں۔ میرے ہاتھ میں کچھ آٹو گراف بکس ہیں۔ میں ایک ایک صفحہ پلٹتی ہوں اور یادیں مجھے اپنے بیڈ روم سے اٹھا کر کالج کے احاطے میں لے جاتی ہیں۔

فائنل ایر اختتام پذیر ہے۔ جگہ جگہ جذباتی مناظر دیکھنے میں آ رہے ہیں۔ اداسی کا موسم چھایا ہوا ہے۔ کبھی نہ بھولنے کی یقین دہانیاں ہیں۔ ہمیشہ رابطے میں رہنے کے وعدے ہیں۔ تحائف کے تبادلے بھی جاری ہیں۔

اب میرے ہاتھ میں ایک ڈائری ہے جس میں میرے پسندیدہ اشعار اور اقوال کی کلیکشن ہے۔ کچھ میری اپنی نظمیں ہیں، کچھ غزلیں، کچھ مکمل، کچھ نامکمل اور یہ میری فائل ہے جس میں کچھ آرٹیکلز ہیں جو میں نے کالج میگزین کے لیے لکھے اور شائع بھی ہوئے۔ کچھ یادگار تقریریں ہیں جن پر میں نے انعام حاصل کیا اور انہیں محفوظ کر لیا۔ میں پیار سے ایک ایک صفحہ پلٹ رہی ہوں۔ اس ایک صفحے پر آ کر میرے ہاتھ تھم جاتے ہیں اور ہونٹ بے ساختہ مسکرا اٹھتے ہیں۔

"ساس ہو پھانس نہ ہو۔" تقریر کا موضوع انتہائی دلچسپ تھا۔ سب نے بڑے جوش و خروش کا مظاہرہ کیا۔ زوردار تقریریں سننے کو ملیں۔ میں نے بھی ایک زبردست سی تقریر کی اور فرسٹ پرائز کی حقدار ٹھہری۔ کتنی ہی خوشگوار اور انمول یادیں اس سے وابستہ تھیں۔ مجھ پر یادوں کے در وا ہوتے چلے گئے۔

"تم میں سے کس نے میرا نام تقریری مقابلے کے لیے لکھوایا ہے؟" میں اپنی دوستوں پر برس رہی تھی۔

"یہ جو تم سارا دن تقریریں کر کر کے ہمارا بھیجہ پکاتی ہو، یہ اس کی سزا ہے۔ اب ڈائس پر جا کر اپنا شوق پورا کرنا۔" عریشہ نے کمر پر ہاتھ رکھ کر لڑاکا عورتوں کے انداز میں جواب دیا تھا۔

"ہاں! اخلاقیات، اسلامیات اور انسانی نفسیات پر تمہارے لیکچر سن سن کر ہم تنگ آ چکے ہیں۔ اب بھگتو۔" اریبہ نے بھی دل کے پھپھولے پھوڑے۔

"یار! لیکن موضوع تو دیکھو۔ میں کیسے تیار کروں گی؟" میں نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا تھا۔

"ہم ہیں ناں۔" سب نے با آواز بلند نعرہ لگایا اور پھر ایسے ایسے پوائنٹس بتائے جنہیں سن کر میرے چودہ طبق روشن ہو گئے اور ہنس ہنس کر سب کے پیٹ میں بل پڑ گئے تھے۔

"کم بختو! اگر تمہاری ہونے والی ساسوں کو تمہارے زریں خیالات کا علم ہو جائے تو کبھی بھی اپنے بیٹوں کی شادیاں تم سے نہیں کریں گی۔ کنواری مر جاؤ گی تم سب۔" ہنسی کا طوفان تھما تو میں بمشکل بولی تھی۔

"خبردار! جو اپنی کالی زبان سے مزید کچھ کہا۔ جاؤ جا کر تقریر کی تیاری کرو۔" نمرہ نے شاہانہ انداز میں مجھے حکم دیا اور مزید گویا ہوئی۔

"ہمارا مستقبل تو بہت روشن ہے بچہ! ہماری ساس تو اتنی پیاری ہوں گی کہ ہماری شادی سے پہلے ہی اللہ کو پیاری ہو چکی ہوں گی۔ تو اپنی ننھی سی جان کو ہماری فکر میں مت گھلا۔" اب وہ وجد کے عالم میں آنکھیں بند کر کے پیش گوئیاں کر رہی تھی۔ ہنسی کسی فوارے کی صورت سب کے ہونٹوں سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا تھا۔

☼ ☼ ☼

ہمارے معاشرے میں ساس ایک ایسا کردار ہے جس کے بارے میں ہمارا طرز فکر خاصا منفی ہے اور بہت سی ساسوں نے اپنے غیر مناسب رویوں سے اس

منفی سوچ کو مزید تقویت دی ہے۔ اب نقصان تو سراسر مثبت سوچ رکھنے والی ساسوں کا ہی ہوا ناں۔ اب ساس خواہ کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو' ہمارے خیالات اس کے بارے میں کچھ زیادہ اچھے نہیں ہوتے۔

میں نے تو بہت سی خواتین کو ساس کے انتقال پر بہو سے تعزیت کے بجائے مبارکباد دیتے ہوئے دیکھا ہے "چلو اچھا ہے تمہاری جان چھوٹی" اب لاکھ بہو آگے سے من من کرتی رہے کہ "نہیں نہیں' میری ساس تو بہت اچھی تھیں۔ میرا بہت خیال رکھتی تھیں' لیکن یقین کون کرتا ہے؟

شاید یہی منفی رجحان ہے' جس کے باعث مقابلے میں شامل تمام تقریروں میں ساسوں کے خوب خوب بخیے ادھیڑے گئے۔ اچھی خاصی گوشمالی ہوئی۔ تقریب میں موجود ساسیں اپنی نشستوں پر پہلو بدلتی پائی گئیں۔

میں نے اپنی تقریر میں مثبت طرز فکر اپنانے کی کوشش کی اور اس بات پر خاصا زور دیا کہ جب ایک لڑکی ساس کا ایک خاص امیج لے کر نئے گھر میں قدم رکھتی ہے تو اسے ساس کی سیدھی باتیں بھی ٹیڑھی محسوس ہوتی ہیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے شیشے پر بال آجائے تو تصویر آڑھی ترچھی سی نظر آتی ہے' تو ضرورت شیشہ دل کو صاف اور سالم رکھنے کی ٹھہری۔

میں نے بیٹے کی ماں ہونے کے ناتے ایک ساس کی خواہشات اور خدشات سے بھی بحث کی اور کچھ اس کے اندر پیدا ہو جانے والی نفسیاتی الجھنوں کو بھی اپنے موضوع کا حصہ بنایا۔ آخر مجھے سائیکالوجی پڑھنے کا کچھ تو فائدہ اٹھانا ہی تھا۔

میری تقریر بہت پسند کی گئی پنڈال دیر تک تالیوں سے گونجتا رہا اور بعد میں بھی کئی دن تک تقریر کی بازگشت کالج کے کوریڈورز اور کینٹین کی ٹیبلوں پر سنائی دیتی رہی۔

"ارے بھئی عفت! اتنے زبردست پوائنٹس تمہارے ذہن میں آئے کیسے؟ پچھلے جنم میں تم ساس واس تو نہیں تھیں؟ ساسوں کی نفسیات پر کیا کیا نکات بیان کیے تم نے۔ بھئی واہ!" صبوحی نے کولڈ ڈرنک کا سپ لیتے ہوئے مجھے داد دی تھی۔

ہمارا گروپ کینٹین میں براجمان تھا اور تبصرے زور و شور سے جاری تھے۔

"دیکھیے جناب! میں اسی معاشرے کا حصہ ہوں۔ تجربہ ہونا ضروری نہیں۔ مشاہدہ بھی کوئی چیز ہوتی ہے اور پھر ساس بہو کا رشتہ تو ہر گھر میں موجود ہے۔ ہم کس طرح اس رشتے کی نزاکتوں سے لاعلم رہ سکتے ہیں۔ بات صرف نکتہ نظر کی ہے کہ آپ کس چیز کو کس زاویے سے دیکھ رہے ہیں۔" میں نے فلسفہ جھاڑنے کی کوشش کی تھی۔

"سچ پوچھو تو مجھے تمہاری تقریر کا یہ حصہ بہت پسند آیا۔" مونا جو کافی دیر سے میری فائل میں سر کھپا رہی تھی۔ کچھ سطروں کو انڈر لائن کرتے ہوئے بولی۔

"جب کوئی بہو گھر میں آنے والی ہوتی ہے تو اس کے استقبال کی زبردست تیاریاں کی جاتی ہیں۔ پورے گھر کو سجایا اور سنوارا جاتا ہے۔ اس کے لیے ایک کمرا مخصوص کر کے اسے پھولوں سے لاد دیا جاتا ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ سسرال والے اپنے دل میں بھی اس کے لیے تھوڑی جگہ بنالیں اور اسے محبت کی خوشبو سے سجالیں۔" وہ جھوم جھوم کر سنا رہی تھی۔

"مجھے تو ان الفاظ نے متاثر کیا۔ کتنی بڑی حقیقت پوشیدہ ہے ان میں۔" اب فائل عریشہ کے ہاتھ میں تھی اور وہ انڈر لائن کرنے کے ساتھ ساتھ بلند آواز میں پڑھ کر سنا بھی رہی تھی۔

"مائیں عموماً" بیٹوں کو اپنی جاگیر اور جائیداد تصور کرلیتی ہیں اور بہو انہیں ایک غاصب محسوس ہوتی ہے' جو ان کی عمر بھر کی کمائی اور اثاثہ ان سے چھین لینے کے درپے ہو۔ یہی سوچ بعد میں' بہت سے مسائل کو جنم دیتی ہے اور گھر میں بے سکونی و بے اطمینانی اور رسّا کشی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔"

"اور آخری پیراگراف کی تو کیا بات تھی۔ میلہ لوٹ لیا ظالم نے۔" حرا بھی کہاں پیچھے رہنے والی تھی۔ اب وہ اپنی پاٹ دار آواز میں تقریر کا آخری حصہ سنا رہی تھی۔

"لڑکیاں تو پودوں کی مانند ہوتی ہیں۔ جب آپ کسی پودے کو ایک جگہ سے اکھاڑ کر دوسری جگہ لگاتے ہیں تو اگر پودے کو نئی جگہ کی مٹی اور آب و ہوا راس آجاتی ہے تو وہ پھلتا پھولتا ہے اور پھول پھل دیتا ہے ورنہ مرجھا جاتا ہے اور کبھی تو جل کر ختم ہو جاتا ہے۔

میں تمام ساسوں کو یہ پیغام دینا چاہتی ہوں کہ بہو کی صورت میں' جو نیا پودا آپ نے اپنے گھر کے آنگن میں لگایا ہے اگر آپ محبت کے پانی سے اس کی آبیاری کریں گی خلوص کی کھاد اور توجہ کی دھوپ فراہم کریں گی تو یہ پودا ضرور پھلے پھولے گا آپ کے آنگن کو خوشبو سے مہکائے اور خوش رنگ پھولوں کا تحفہ دے گا۔

چونکہ گھر کی کرتا دھرتا ایک ماں ہی ہوتی ہے لہٰذا ساس بننے کے بعد اس کا رویہ گھر کے ماحول کو بنانے اور بگاڑنے میں بہت اہم کردار ادا کرتا ہے اگر ساس بہو کو طنز کے تیر اور طعنوں کے برسٹ مارنے کے بجائے پیار کی زنجیر میں جکڑ لے تو یقین کریں۔ بہو کو یہ غلامی آزادی سے زیادہ عزیز ہو گی اور کوئی بہو یہ نہیں کہے گی کہ "ساس ہو پھانس نہ ہو۔"

"سب اچھی طرح کان کھول کر سن لو اور خبردار جو کسی نے رخنہ ڈالنے کی کوشش کی۔" حمنیٰ اچانک ہی کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور وارننگ دینے کے انداز میں سب سے مخاطب تھی۔

"میں نے اپنی بیٹی کا رشتہ عفت کے بیٹے سے طے کر دیا ہے۔ اس سے زیادہ ستھرے خیالات والی سمجھ دار اور حقیقت پسند ساس مجھے اپنی بیٹی کے لیے اور کہاں میسر آئے گی۔"

ہم سب ہونقوں کی طرح اس کا منہ تک رہے تھے اور جب بات ہماری سمجھ میں آئی تو یوں لگا جیسے دوستوں کے قہقہوں سے کینٹین کی چھت اڑ جائے گی۔ میں اپنی فائل سنبھال کر اس کو مارنے کو لپکی لیکن وہ کہاں ہاتھ میں آنے والی تھی' میری "سمدھن۔"

ہنستے ہنستے میری آنکھوں سے پانی بہہ نکلا تھا۔ میں کتنی دیر تک یادوں کی پگڈنڈیوں پر سرپٹ دوڑتی رہی تھی۔ مجھے احساس بھی نہیں ہوا لیکن پھر اچانک' بالکل اچانک میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ "کیا پڑھا ہے میں نے ابھی؟ کیا کہہ رہی تھی حمنیٰ؟"

"میرے جیسے ستھرے خیالات والی سمجھ دار اور حقیقت پسند ساس اور کہاں میسر آئے گی۔" ہاں' یہی الفاظ تھے۔ میرے دل میں ایک ٹیس سی اٹھی اور شرمندگی کا پسینہ میری پیشانی پر نمودار ہونا شروع ہو گیا۔

آج میں بھی ایک ساس ہوں حمنیٰ کی بیٹی کی نہ سہی' کسی اور کی سہی' لیکن کیا آج میری شخصیت بحیثیت ساس میرے خیالات کی عکاس ہے؟ کیا میں ان خصوصیات سے متصف ہوں' جن کا ذکر میں نے اپنی تقریر میں بڑے زور و شور سے کیا تھا؟ کیا میرا رویہ اس سوچ کا آئینہ دار ہے' جس کا پرچار کرنے کی میں نے بڑی شدومد سے کوشش کی تھی؟

اچانک ہی' بہت سارے سوال' ہتھوڑے بن بن کر میرے سر پر برسنے لگے تھے۔ میرے سارے سابقہ خیالات مجسم ہو کر میرے سامنے آکھڑے ہوئے تھے۔ وہ میرے چاروں طرف گول گول ناچ رہے تھے۔ میرا مضحکہ اڑا رہے تھے۔ شاید وہ کہہ رہے تھے۔

"دیکھو! ایک انیس سال کی لڑکی اس پچاس سال کی عورت سے زیادہ میچور اور سمجھ دار تھی۔"

جب تک ماں تھی تو آئیڈیل تھی "سویٹ مام" لیکن جب ساس بنی تو ساری وضع داری اور سمجھ داری بھاپ بن کر اڑ گئی۔

"کیا ہوا! ساری تھیوریز اوراق کی زینت بنی رہ گئیں اور جب پریکٹیکل کا وقت آیا تو رولز اور فارمولے ہی تبدیل ہو گئے۔ فیل تو ہونا ہی تھا۔" وہ مجھ پر پھبتیاں کس رہے تھے۔

"بس کرو' خدا کے لیے بس کرو۔" میں نے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لیے تھے۔ سچ سننے کی تاب نہیں تھی مجھ میں' لیکن وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہے تھے۔ کہنے اور

کرنے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ چند ہی مہینوں میں میری سمجھ داری اور وضع داری کے غبارے سے ہوا نکل گئی تھی۔

مثبت خیالات کو منفی احساسات کی سنڈیوں نے نگل لیا تھا اولاد کی خوشیوں کو مقدم رکھنے اور ہمیشہ مثبت رہنے کا دعوا دھرے کا دھرا رہ گیا تھا۔ میں پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ ایک محبت کرنے والی ماں روایتی ساس سے ہار گئی تھی۔

کتنی شرمناک شکست تھی یہ۔ ایک پچاس سالہ ماں کو چھ مہینے کی ساس نے چت کر دیا تھا۔ میرے اندر صف ماتم بچھی ہوئی تھی۔

☼ ☼ ☼

اس رات کی صبح بڑی خوشگوار تھی۔ میں سو کر اٹھی تو اپنے آپ کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔ میں نے کھڑکیوں سے پردے ہٹائے تو سامنے لان کا منظر تھا۔ لگتا ہے رات برکھا کھل کر برسی ہے۔ مجھے ہر چیز اجلی اجلی اور نکھری نکھری محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے کمرے میں نظر دوڑائی۔ شاہ زمان موجود نہیں تھے۔ لگتا ہے کل اسٹڈی روم میں ہی سو گئے تھے۔ کبھی کبھار ایسا ہو جاتا تھا۔ ایک صوفہ کم بیڈ اسی مقصد سے وہاں رکھا ہوا تھا۔

میں کمرے سے باہر نکل آئی۔ آج اتوار تھا۔ بچے ابھی سو رہے تھے۔ میں نے کچن کا رخ کیا۔

"آج میں بچوں کو اپنے ہاتھ سے ان کی پسند کا ناشتا بنا کر کھلاؤں گی۔" میں نے فریج میں سے سامان نکالتے ہوئے سوچا۔

آپ حیران نہ ہوں۔ میری کل کی آنکھوں کی برسات دل کا سارا میل کچیل اور کثافت بہا کر لے گئی ہے۔ ساس نے اپنے داؤ پیچ آزما کر کچھ دیر کے لیے ماں کو زیر ضرور کر لیا تھا لیکن ماں آخر ماں تھی غالب آ ہی گئی۔

میں اپنے آپ میں ہی مگن تھی۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا شاہ زمان نہ جانے کب کچن میں آ کر کھڑے ہوئے وہ فریج سے جوس کا پیکٹ نکال رہے تھے۔

"کل رات آپ اسٹڈی میں ہی سو گئے تھے؟" میں نے پراٹھوں کے لیے آٹا گوندھتے ہوئے ان سے پوچھا۔

"رات میں آیا تھا لیکن کمرے میں بہت جل تھل تھی۔ میں نے اسٹڈی میں سونا مناسب سمجھا۔" میں نے نہایت حیرانی سے ان کی طرف دیکھا۔

"آج کچھ خاص تیاری ہے؟" انہوں نے بکھرے ہوئے سامان کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

"ہاں! آج چھٹی کا دن ہے میں شاہ میر اور حریم کو اپنے ہاتھ سے ناشتا بنا کر کھلانا چاہتی ہوں۔" میرے لہجے میں محبت بھی تھی اور سرشاری بھی!

"لگتا ہے جو گھٹا کئی دن سے چھائی ہوئی تھی' وہ کھل کر برس گئی ہے۔ اب مطلع صاف لگتا ہے۔" انہوں نے میری آنکھوں کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے جوس کا ایک گلاس خود لیا' دوسرا مجھے تھما دیا۔ میں نے نا سمجھی کے انداز میں ان کی طرف دیکھا۔ کتابیں پڑھ پڑھ کر ان کے بولنے کا انداز بھی کتابی ہو گیا تھا۔

"رشتے بن تو جاتے ہیں لیکن بعض اوقات ان کو نبھانے میں ہمیں دقت کا سامنا ہوتا ہے۔" وہ اپنا خالی گلاس دھو کر ریک میں رکھ رہے تھے۔

گھریلو معاملات میں ان کی لاتعلقی اور بے خبری کا مجھے ہمیشہ ہی گلہ رہا لیکن یہاں تو ان کی زیرک نگاہی مجھے حیران کیے دے رہی تھی۔

"اگر آپ اتنے ہی باخبر تھے تو مجھے سمجھایا کیوں نہیں؟" میں نے بھی ان ہی کے جیسا مبہم انداز اپنایا۔ اب میں سوچ بھون رہی تھی۔

"سمجھایا تو ان کو جاتا ہے جو نا سمجھ ہوں اور پھر مجھے پورا یقین تھا کہ تمہاری نیا جو بھنور میں پھنس گئی ہے' اسے تم بہت جلد پار لگا لو گی۔"

"اور جو میں ڈوب جاتی تو؟" میں نے ان کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھا۔

"آپ کو ڈوبنے کون دیتا جناب!" شاہ زمان نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور بیل کی آواز پر گیٹ کی طرف بڑھ گئے۔ شاید اخبار والا آ گیا تھا۔

میں نے ایک گہرا سانس لیا۔ طمانیت دور دور تک میرے اندر اتر گئی تھی۔

کھٹ پٹ کی آواز سن کر حریم کی آنکھ کھل گئی تھی اور وہ کچن میں حیران پریشان کھڑی تھی۔

"امی! مجھے وقت کا اندازہ ہی نہیں ہوا۔ کمرے کا وال کلاک شاید بند ہو گیا ہے۔ آپ ہٹیے! میں ناشتہ بنا لیتی ہوں۔" اس نے عجلت میں اپنے بالوں کو سمیٹ کر کیچر میں قید کیا اور انڈوں کا پیالا میرے ہاتھ سے لے لیا۔

"نہیں! ایسی کچھ دیر نہیں ہوئی۔ میں ہی کچھ جلدی اٹھ گئی تھی۔" میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کا چہرہ تھام کر اس کی پیشانی کو بوسہ دیا۔ جیسا میں شادی کے بعد ابتدائی دنوں میں کیا کرتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ابھرنے والی حیرانی اور پھر خوشی کی چمک بہت واضح تھی۔ میں نے پیالا اس کے ہاتھ سے لے کر شیلف پر رکھ دیا اور نرمی سے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

"شاہ میر کو بھی اٹھا دو۔ دیکھو! آج میں نے تم دونوں کے لیے خاص اہتمام کیا ہے۔"

مجھے مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میرے محبت بھرے لمس نے اس کو بہت کچھ سمجھا دیا تھا۔ تب ہی وہ پلٹی۔ اس نے میرے گال پر پیار کیا اور تقریباً" بھاگتی ہوئی اپنے کمرے میں گھس گئی۔

ہنسی بے اختیار میرے لبوں کو چھو گئی۔

"بالکل بچی ہے یہ حریم بھی۔"

"واہ واہ! کیا خوشبوئیں اٹھ رہی ہیں کچن سے۔ میری تو آنکھ ہی ان کی وجہ سے کھلی ہے۔ امی! کیا پکا رہی ہیں آپ؟" شاہ میر کچن میں آ کھڑا ہوا ہے۔

میں محبت سے اس کی پیشانی چومتی ہوں۔ وہ لاڈ سے مجھے اپنے آپ سے لپٹا لیتا ہے۔ مجھے محسوس ہو رہا ہے میں کافی عرصے بچھڑے رہنے کے بعد اپنے بچوں سے مل رہی ہوں۔

حریم ٹیبل پر برتن لگا رہی ہے۔ میں نے ناشتا تیار کر لیا ہے۔ اب چائے دم دے رہی ہوں۔ سوجی کے حلوے' چیز آملیٹ اور پراٹھوں کی ملی جلی اشتہا انگیز خوشبو سے پورا ڈائننگ روم مہک رہا ہے' لیکن اصل خوشبو تو محبت کی خوشبو ہے، جو میری روح کو سرشار کر رہی ہے۔

ناشتا شروع ہو چکا ہے۔ مریم چیز آملیٹ بڑی رغبت سے کھا رہی ہے۔ اس کا پسندیدہ جو ہے۔ شاہ میر حلوے پر ہاتھ صاف کر رہا ہے۔ ساتھ ساتھ اس کا تبصرہ بھی جاری ہے۔

"حریم! شرط لگا لو تم میری مام کے جیسا حلوہ نہیں بنا سکتیں۔"

"دیکھو بھئی! قبل از وقت کچھ کہنا مناسب نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے' کچھ عرصے بعد تمہارے بچے یہاں بیٹھ کر یہی الفاظ اپنی اماں کے بارے میں کہہ رہے ہوں۔" شاہ زمان نے اخبار چہرے سے ہٹا کر لقمہ دیا۔

میں بے ساختہ ہنس رہی ہوں۔ حریم جھینپ کر مسکرا رہی ہے۔ شاہ میر کھسیا کر سر کھجا رہا ہے اور شاہ زمان..... وہ یقیناً" اخبار کے پیچھے زیر لب مسکرا رہے ہیں۔

جی ہاں! یہ سب میرے گھر کے تازہ مناظر ہیں۔ میں نے اپنے گھر کو باہمی رنجش' رسا کشی اور نفرت کی آگ میں جھلسنے سے بچا لیا ہے۔ آپ بھی ایسا کر سکتی ہیں۔ بات صرف اپنے آپ کو سمجھانے کی ہے۔ رشتوں کی خوب صورتی محض ان کو بنانے سے نہیں، بلکہ ان کو دل سے تسلیم کرنے اور نبھانے میں ہے۔

میں نے یہ راز پا لیا ہے آپ کو بھی بتائے دے رہی ہوں۔ اگر آپ بھی میری طرح ایسی کسی غلطی کی مرتکب ہو رہی ہوں تو میرے تجربے سے فائدہ اٹھائیں۔ جلدی کریں' کہیں دیر نہ ہو جائے۔

کنیز نبوی

روشنی کی خواہشیں

مکمل ناول

محبت کے اولین جذبے نے صرف ہواؤں کو ہم سفر ہی نہیں بنایا۔ بلکہ حیرتوں کے در بھی کھول دیے۔ دل کے دروازے محبت کے کھل جا سم سم کے طلسم پر صرف وا ہی نہیں ہوئے بلکہ خوشیوں کے پھول بھی بچھا دیے۔

زندگی میں پہلی بار اک نئی سحر طلوع ہوئی جس میں سب سے نمایاں، سب سے منفرد مجھے گوہر علی گھمسی کی ذات لگی۔ گوہر میری زندگی کا گوہر مقصود بن گیا، اور میں نے اس کی ذات سے اپنی ساری خوشیاں، اپنے سارے جذبے وابستہ کر دیے۔ سندھ یونیورسٹی کی فضاؤں میں زیر لب سرگوشیاں گونجنے لگیں جن میں ہمارا نام ساتھ لیا جانے لگا۔

لوگوں کے نزدیک یہ ایک ایسا وقتی جذبہ تھا، جو کہ اکثر یونیورسٹی کے دور میں شروع ہو کر وقت کے ساتھ ساتھ خود بخود ختم ہو جاتا ہے، مگر میں جانتی تھی یہ جذبہ سطحی نہیں تھا، میں نے اس کو پوری شدتوں سے چاہا تھا اور اس نے بھی پورے دل سے میری تمنا کی تھی۔ مجھے اس کے وعدوں اور باتوں پر بھرپور اعتماد تھا۔

ہمارے دن سندھ یونیورسٹی میں اور شامیں المنظر پر گزرنے لگیں۔

کبھی کشتی میں سیر کے دوران ڈھیروں باتیں ہوتیں، کبھی کنارے بیٹھے بھٹے کھاتے رہتے، تو کبھی جام شورو کے پل پر کھڑے ہو کر دور روشنیوں کے ٹمٹماتے دیوں کو دیکھ کر اپنے دل میں محبت کے دیے جلاتے۔ سندھیالوجی کی تقریبات ہوں، یا ممتاز مرزا

آڈیٹوریم میں ہونے والی ادبی کانفرنس، ہمارا وہاں پر ساتھ موجود ہونا ضروری و لازم ٹھہرتا۔ کبھی شاہ لطیف کی آفاقی شاعری پر بحث چھڑتی تو کبھی شکار پور کے شیخ ایاز کی شاعری سے دل کے تار چھیڑے جاتے۔

کبھی استاد بخاری کی شاعری میں بولتے درد کا جادو جکڑ لیتا، تو کبھی خیر پور میں بسنے والے تنویر عباسی کے الفاظ اس کے لبوں پر مچلتے تھے۔

ہم ساری دوریاں پھلانگ کر اتنے قریب آچکے تھے کہ اب الگ راستے پر چلنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہو گیا تھا، ہماری ذہنی سطح اور فکری سوچ میں کوئی فرق نہ تھا۔ ہم ایک کشتی کے سوار، ایک ہی پتوار اٹھائے ہوئے تھے۔ ہم دونوں کا یقین ایمان کے درجہ پر پہنچ چکا تھا۔ اب الگ ہونا ایمان گنوانے کے مترادف تھا مگر اماں.... جو حیدر آباد کے گورنمنٹ کالج میں لیکچرر تھیں جان کر کہ گوہر سردار کا بیٹا ہے، اس کی مخالف ہو گئیں۔

"اماں! وہ بہت اچھا اور نفیس انسان ہے۔" میں نے احتجاج کیا۔

"بیٹا! لگتا ہے مگر ہے نہیں۔" اس سے ملنے کے بعد بھی اماں کے خیالات تبدیل نہ ہوئے تھے۔ اماں نے اسے کھانے پر بلایا تھا۔ وہ کھانا کھا کر جا چکا تھا اور اب رات کے گیارہ بجے ہماری بحث جاری تھی۔

"موسل میری بچی! وہ سردار ہے اور سردار کے لیے محبت اہم ہوتی ہے نہ شادی، وہ صرف سردار ہوتا ہے۔"

"نہیں اماں! وہ بہت کھلے دماغ کا ہے۔" میں نے پورے یقین سے تردید کی تھی۔

"سردار کبھی کھلے دماغ کا نہیں ہوتا۔ وہ کتنا ہی پڑھ لکھ لے۔ اندر سے وہی سردار رہے گا۔" اماں کی آواز میں ماضی کا کرب تھا۔ وہ شہر محبت کی ایسی باسی تھی جس نے دھوکے کو محبت سے جیتتے ہوئے دیکھا تھا اور اس دن سے ان کا محبت سے یقین اٹھا، تو پھر کبھی واپس نہ مل سکا۔

سردار نصیر خان مہران دنوں اس کی زلفوں کے اسیر ہوئے تھے، جب مارشل لا کے اندھیروں نے پورے ملک کو لپیٹ میں لیا ہوا تھا۔ نصیر خان اس کے پڑوس میں آکر آباد ہوا۔ شمالی سندھ کے ایک جاگیردار خاندان کا چشم و چراغ، ساری مردانہ خوب صورتیوں اور سردارانہ بدصورتیوں سے مزین نصیر خان مہر کے آگے چند ملاقاتوں میں ہی وہ اپنا دل ہار گئی اور اس کی دوسری بیوی بن کر یہ سمجھ بیٹھی کہ یہ مالی، جسمانی اور روحانی آسودگی ہمیشہ ساتھ رہے گی، مگر تقدیر کوئی اور ہی کھیل کھیل رہی تھی۔

جب ہم اپنے تئیں جیت کے نشے میں سرشار ہوتے ہیں تو تقدیر کے وار سے غافل ہو جاتے ہیں۔

نصیر خان نے ہر طرح اس کا خیال رکھا۔ ہر خوشی دی۔ جب موسل پیدا ہوئی تو اس دن اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی، اس وقت نصیر خان کی چپ اسے بہت کھلی۔

"ہماری محبت کی نشانی دنیا میں آنے سے آپ کو خوشی نہیں ہوئی؟" اس نے بڑے مان سے شکوہ کیا۔

"سردار کے گھر بیٹی اگر خاندانی بیوی کی کوکھ سے جنم لے تو بھی خوش بختی کی علامت نہیں سمجھی جاتی۔ تم تو غیر خاندان کی عورت ہو۔"

اس کے تعلیم یافتہ وجود سے سردار باہر نکل آیا تھا۔ وہ چکرا کر رہ گئی۔

"کیا کہہ رہے ہو نصیر خان! بیٹی تو اللہ کی رحمت ہوتی ہے۔"

"سردار کے گھر اس سے بڑی زحمت کوئی نہیں۔" اس کا دل سرد الفاظ کی مٹھی میں جکڑ گیا۔

"نصیر خان! اولاد پیدا کرنے اور بیٹی یا بیٹے کے انتخاب کا اختیار اللہ نے انسان کو نہیں دیا۔" اس نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

"بیٹیاں ہمیں کمزور کر دیتی ہیں اور بیٹے مضبوط۔ بھاگوان ہوتی ہیں وہ عورتیں جو بیٹوں کو جنم دیتی ہیں۔" مہر نصیر اسے منحوس کہہ رہا تھا، وہ چند لمحوں کے لیے ساکت رہ گئی پھر جوش سے بولی۔

"میں تو صرف کھیتی ہوں نصیر خان کھیتی! اس میں جو بویا جاتا ہے، وہی کاٹا جاتا ہے۔ فصل خراب نکلے تو اس میں بونے والے کا قصور ہوتا ہے، دھرتی کا نہیں۔" وہ پورے قد کے ساتھ اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

وہ سردار تھا اور پورے قد کی عورتیں اسے پسند نہیں تھیں۔

"تم پڑھی لکھی عورتیں انتہائی بدتمیز اور خود سر ہوتی ہو۔ اپنے نام نہاد علم کے گھمنڈ کا شکار، ہر بات میں بحث کرنے کی عادی، صحیح نہ ہوتے ہوئے بھی خود کو صحیح ثابت کرنے پر مصر..... مگر تمہاری حیثیت کیا ہے۔ ہر قدم پر مرد کی محتاج اور مرد کا سہارا لینے والی خالی برتنوں کی طرح ہو جو صرف بجتے ہیں۔"

شادی کے دو سال بعد ہی نصیر خان مہر کی محبت کا جادو اتر گیا تھا۔ ان کے درمیان تلخی کی جو دیوار کھڑی ہوئی، ان دونوں میں سے کوئی اس دیوار کو نہ پار کر سکا۔

وہ شہری بیوی شہر میں تنہا رہ گئی اور وہ گاؤں کا وڈیرا اپنے چار بیٹوں کی ماں خاندانی بیوی کے پاس چلا گیا۔

اس کے دل میں نصیر خان کے لیے وہ پہلے والی محبت و عزت نہ رہی اور نصیر خان کے لیے بھی وہ پرانی اہمیت کھو چکی تھی۔ ان دیکھی سرد مہری کی لہر نے ان دونوں کو لپیٹ میں لے لیا۔ جیسے تیسے چند سال کے بھدے ٹانکے زندگی کے چولے میں لگے۔ موسل پانچ سال کی ہوئی تو اس نے تعلق کی ساری سلائی ادھیڑ کر زندگی کے اس چولے کو لیرو لیر کر دیا۔

"میں مجبور ہوں۔ مجھے اپنی بیٹی بیاہنی ہے۔ تم جانتی ہو، ہمارے ادلے بدلے کے رشتے ہیں، اور میرے کزن نے یہ شرط رکھی ہے کہ جب تک میں اس کی بہن کے سر سے سوکن کا سایہ نہیں ہٹاؤں گا۔ وہ میری بہن سے شادی نہیں کرے گا۔"

وہ دکھ کی شدت سے کچھ بول ہی نہ سکی۔ سکتہ کی کیفیت میں آ گئی۔

"میں مانتا ہوں کہ میں نے تم سے وعدے کیے تھے عمر بھر اکھٹے رہنے، ساتھ نباہنے کے، اور سردار اپنے وعدے سے پھرتے بھی نہیں۔ لیکن یہاں تو سوال ہی سرداری کا ہے۔ تمہیں طلاق نہ دینے کی صورت میں مجھ سے جائیداد، سرداری اور موروثی الیکشن کی سیٹ چھن جائے گی۔ وہ میرے دوسرے بھائی کو دے دی جائے گی۔ اس لیے میں تمہیں طلاق دینے پر مجبور ہو گیا ہوں۔" جلاد لفظوں نے اس کا جیسے گلا گھونٹ دیا۔

"موسل میری بیٹی ہے۔ اسے میرے حوالے کر دو۔ حویلی میں اس کی تربیت بہتر طور پر ہو سکے گی۔"

"خدا کے لیے میرے جینے کا کوئی ایک راستہ تو چھوڑ دو۔ موسل میری زندگی ہے۔ مجھ سے زندگی تو نہ چھینو۔" اس نے جینے کے لیے آخری بار ہاتھ پاؤں مارے۔ وہ پھانسی گھاٹ پر لٹکی تھی۔

"میں تم سے اس زندگی کی بھیک مانگتی ہوں، اس محبت کے صدقے جس نے ہماری زندگی کے کچھ سالوں کو خوب صورت بنایا۔ تمہیں ان خوابوں کا واسطہ جن کی تعبیروں نے وقتی طور پر ہی سہی مگر خوشی کے رنگ ضرور بھرے تھے۔" اس نے درد بھری التجا کی مگر وہ منصف نہیں تھا کہ زندگی کی آخری خواہش پوری کر دیتا۔

"یہ فیصلہ تب ہو گا، جب تمہیں طلاق کے کاغذات ملیں گے۔ اس وقت میں جلدی میں ہوں۔"

اس نے موقع غنیمت جانا اور موسل کو لے کر کراچی سے حیدر آباد اپنی دوست کے ہاں چلی گئی۔ اسے پتا تھا کہ سردار نصیر خان کبھی بھی موسل کو اس کے پاس نہیں چھوڑے گا اور لڑنے کی طاقت اس میں تھی نہیں سو روپوشی کو ہی بہتر سمجھا۔

دو سال تک اس نے اپنی دوست نسیم کے گھر سے قدم بھی باہر نہ نکالا۔ میکے کی طرف سے صرف ایک بھائی ہی تھا، جو باہر ہوتا تھا۔ سو وہ کسی بھی پریشانی سے محفوظ رہی، مگر کب تک زندگی دوسروں کے سہارے گزارتی.... گو کہ نسیم اور اس کے گھر والوں نے اس کا بے حد خیال رکھا تھا۔ مگر وہ اب ان پر مزید بوجھ نہیں بننا چاہتی تھی، سو نسیم کے باپ کی کوششوں سے اسے

اسکول میں ملازمت مل گئی۔ زندگی اپنی ڈگر پر چل پڑی۔

نصیر خان سے پھر زندگی بھر ملاقات نہ ہوئی۔ شاید وہ اسے ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک ہار کر بیٹھ گیا تھا۔

اور آج پھر موہل ایک سردار کے دام الفت کی اسیر ہو کر اسی راستہ پر قدم رکھ رہی تھی۔

ماضی کے سارے سلے ہوئے زخم ایک ایک کر کے ادھڑنے لگے۔ یاد کی گھڑولی سے محبت کے سارے لمحے قطرہ قطرہ دل پر ٹپکنے لگے۔

ذہن کے مدفن سے سوچیں نکل کر دل ناصبور کے ناسور کو تازہ کر گئیں۔ روح کے اندر کرب کی چنگاریاں اڑنے لگیں۔

محبت کیسا مجبور کرنے والا جذبہ ہے۔ اس جذبے نے سب کچھ چھین کر تہی دامن کر دیا۔ قرب کے خواب، کرب بن کر ساری عمر پر محیط ہوئے۔ جانتی تھی یہ جذبہ کسی بند سے نہیں تھمتا، مگر پھر بھی ماں تھی بیٹی کو کرب ناک سفر سے بچانے کی سعی تو کرنا ہی تھی ماں بیٹی کے بیچ خاموش ضد کافی دنوں تک چپ کی چھایا میں چلتی رہی۔ مگر کب تک.....

"اماں! پلیز راضی ہو جائیں۔ گوہر کو بہت جلدی ہے۔ وہ کہتا ہے، اب زیادہ انتظار نہیں کر سکتا۔" موہل سراپا التجا بن کر اس کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

"موہل! میری بچی! یہ راستہ کانٹوں بھرا ہے۔ تیرے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔"

"اماں! خدا کے لیے سارے وہم و شکوک نکال پھینکیں، ضروری نہیں کہ جو آپ کے ساتھ ہوا ہو، وہ میرے ساتھ بھی ہو۔"

"موہل! میں اپنا دکھ سہ گئی مگر تیرا دکھ مجھے مار ڈالے گا۔"

"اماں! گوہر کے بغیر میرے لیے زندگی صرف دکھ ہی ہو گی۔"

"تیری رگوں میں ایک سردار کا ہی خون دوڑ رہا ہے۔ تو بھی اپنی ضد کی پکی ہے مگر بیٹا! میں چاہتی تھی کہ میرے تجربے سے سیکھ لے، مگر تو خود تجربے سے گزرنا چاہتی ہے تو تیری مرضی۔ میں تیرے نصیب سے تو لڑ نہیں سکتی۔"

"اماں! پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔ سارے سردار ایک جیسے نہیں ہوتے۔" اس نے دلاسا دیا۔

"نوالہ اٹھاتے ہوئے ساری انگلیاں برابر ہو جاتی ہیں۔ سردار سارے برابر ہوتے ہیں، ایک ہی جبلت، ایک ہی فطرت رکھنے والے۔"

گئے دنوں کا نوحہ اس کے لہجے سے مترشح تھا۔ جبکہ وہ محبت کی سرشاری سے مسکرائی۔ ماں کے گلے میں بازو ڈال کے پریقین لہجے میں گویا ہوئی۔ "آپ پریشان نہ ہوں، کچھ نہیں ہو گا۔ سارے وسوسے، واہمے دل سے نکال پھینکیے۔"

اور نہ چاہتے ہوئے بھی اسے بیٹی کی خوشیوں کے لیے ہتھیار ڈالنا پڑے مگر ہمہ وقت دعا اس کے لبوں پر مچلتی رہتی۔

"یا اللہ، میری بیٹی کا نصیب اچھا بنا دے۔"

موہل مہر رخصت ہو کر گوہر تمکسی کے گوٹھ پہنچی، جہاں وسیع و عریض حویلی میں ان کی شادی کی تقریب دھوم دھام سے منائی گئی۔ وہ نازاں تھی گوہر کو پانے پر۔ اس سے بڑا ثبوت کیا ہو گا گوہر علی تمکسی کی محبت کا کہ وہ اس کی پہلی بیوی بنی تھی۔

اور حویلی میں اس شادی کی تقریب میں گوٹھ راج والوں نے ہی نہیں، دوست احباب نے بھی بھرپور شرکت کی۔ وہ محبت کے لمحوں میں سرشار کتنے ہی دن اپنے اردگرد کے ماحول سے بے خبر رہی۔ شہر آکر گوہر کے ساتھ رہتی تو گھومنا پھرنا، ہوٹلنگ کرنا، شاپنگ کرنا، گاؤں جاتی تو کبھی فارم ہاؤس چلی جاتی، کبھی گوہر کی بنائی ہوئی مصنوعی جھیل میں مچھلی کا شکار کرتی، گوہر کی سنگت نے اسے حسین سے حسین تر بنا دیا۔ پہلے سال کا تو اسے پتا ہی نہ چلا کیسے گزر گیا، ایک بار پریگننٹ ہوئی مگر بے احتیاطی میں ضائع ہو گیا، وہ خود تو زیادہ رنجیدہ نہیں ہوئی، مگر گوہر کی ماں نے کچھ زیادہ ہی سوگ منایا۔

"آپ کو دکھ نہیں ہوا۔" اس نے سرہانے بیٹھے گوہر سے استفسار کیا۔

"نہیں ہم بوڑھے تھوڑا ہی ہو گئے ہیں۔ زندگی پڑی ہے بچے پیدا کرنے اور پالنے کے لیے۔" اس کی مسکراہٹ نے ہمت و محبت میں کئی گنا اضافہ کیا۔

☼ ☼ ☼

وہ پندرہ دن کے لیے اسلام آباد گیا تھا، اور وہ اس کی غیر موجودگی میں بور ہو رہی تھی۔ اسی بوریت نے اسے کمرے کے مصنوعی ماحول سے نکال کر قدرتی ماحول میں لا کھڑا کیا۔

صحن کی وسعت نے درختوں کی لمبی قطار کو گود میں لے رکھا تھا۔ وہ ہر درخت کی سرگوشی سنتی آگے بڑھتی رہی۔ سرسبز درختوں کے بیچ پھولوں کے مختلف پودوں نے ماحول کو مہکا رکھا تھا۔ محبت بھی کی خوشبو کی طرح ذات سے لپٹ کر وجود کا حصہ بن جاتی ہے۔ جسے ہم چھو نہیں سکتے، پکڑ نہیں سکتے ہیں، محسوس کر سکتے ہیں۔ وہ روح کی طرح زندہ رکھتی ہے۔ مگر دکھتی نہیں پر نہ دکھنے کے باوجود زندگی کا احساس اور اپنے ہونے کی پہچان ہوتی ہے۔

پھولوں کے جھرمٹ نے سوچ کے در وا کیے۔ مسکراہٹ نے لبوں کو نرمی سے چھوا۔

"گوہر! تم میرے پاس نہ ہو کر بھی میرے پاس ہو، کتنا طاقتور احساس محبت ہے۔ یہ محبت کا احسان ہے کہ وہ ہمارے دلوں پر راج کرتی ہے۔"

فوراً دل نے چاہا یہ احساس اسے لکھ بھیجے اردگرد نظر دوڑائی کہ کوئی ملازمہ ہو تو اس سے کہے کمرے سے فون لا دے۔

اس کی نظر اس نوعمر لڑکی پر پڑی جو حویلی میں یقیناً نووارد تھی۔ اس سے پہلے کبھی نظر نہ آئی تھی۔

گول چہرے پر بھنورا سی سیاہ آنکھیں سجائے، پلکوں کی لمبی باڑھ جھکائے، رلی گھٹنوں پر رکھ کر کڑھائی کے کام میں منہمک تھی۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" وہ عین سر کے اوپر کھڑی ہو کر پوچھنے لگی۔

اس نے چونک کر سر اٹھایا، سوئی انگلی میں چبھ گئی۔

"میرل!" گلاب جیسے لب آہستہ سے وا ہوئے۔ اس کے ڈرے ڈرے انداز پر موہل مسکرا دی۔ وہ بلاشبہ اتنی خوب صورت تھی جس پر نظر غیر ارادی اٹھ جائے تو واپس نہ آئے۔

"تمہیں پتا ہے تم کتنی سوہنی ہو۔"

وہ اس تعریف پر شرمائی تو خون کی لالی شام کی شفق کی طرح اس کے رخساروں پر سمٹ آئی۔ اس نے بہت دلچسپی سے اس دلکش منظر کو دیکھا۔

"آج سے پہلے تمہیں حویلی میں نہیں دیکھا، ابھی آئی ہو؟"

"جی دو دن ہوئے ہیں۔" وہ زور سے سر ہلا کے بولی۔ اس کے اس بے ساختہ انداز پہ وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔ "اکیلی آئی ہو؟"

"جی میرا پیو (باپ) چھوڑ گیا ہے۔"

"موہل کنوار! (دلہن) بڑے سردار اور چھوٹے سردار اسلام آباد سے آئیں گے تو اس کا نکاح پڑھوا کر سنگ چٹی (رشتہ خون بہا) میں دیں گے۔" اس کی ملازمہ نے اس کو میرل سے بات کرتے دیکھا تو آکر بتایا۔

"کیا مطلب سنگ چٹی کا؟" اسے درحقیقت دھچکا لگا۔

"موہل کنوار! میرل کے باپ نے پانی کی باری پر امان اللہ تیغانی کے بیٹے کو قتل کر دیا تھا، پھر جرگہ ہوا، اور اس میں خون بخشی کے عوض بیٹی کا رشتہ دے کر اپنی اور اپنے بیٹے کی گردن چھڑائی۔ اگر وہ سنگ چٹی (رشتے کا جرمانہ) نہ بھرتا تو بدلے میں بیٹے کو حوالے کرنا پڑتا قتل ہونے کے لیے۔ امان اللہ تیغانی نے یہی شرط رکھی تھی۔"

"کیا عمر ہو گی اس لڑکے کی؟" اس نے مسلسل میرل کو مرکز نگاہ رکھ کر پوچھا۔

"موہل کنوار! وہ لڑکا تھوڑا ہی ہے، وہ تو بڈھا کھوسٹ ہے۔ ساٹھ ستر کا تو ہو گا۔ دو شادیاں کی تھیں،

جس سے سات بیٹیاں چھ بیٹے ہیں۔ ایک بیٹے کا قتل ہو گیا۔ باقیوں کی بھی دو دو شادیاں ہیں۔"

اس کا سر چکرا گیا۔ بے چینی سے پلک جھپکتی اس نوخیز حسینہ پر اس کو بے تحاشا رحم آیا۔ خوف کی پیلاہٹ نے چہرے کی گلابیوں کو دھکیل کر اپنے لیے رستہ بنایا تھا۔

"موہل کنوار! وہ موگا مڑھا (مرا ہوا بڈھا) تو اسے نوچ کھائے گا' پورا درندہ ہے درندہ۔" اس کے دل میں درد کی ایک لمبی ٹیس اٹھی۔

"بس کنوار! اللہ ایسے نصیب سے سب کی نیانیوں (بیٹیوں) کو بچائے۔" اس کی ملازمہ اس کی اور موہل کی دلی کیفیت سے بے خبر تبصرہ کیے جا رہی تھی۔

"تم .... فکر نہ کرو۔ میں گوہر سے بات کروں گی۔" اس نے ایک ٹوٹا ہوا دلاسا روایتوں کی چکی میں پستی اس معصوم لڑکی کے چھید چھید پلو سے باندھنے کی کوشش کی۔

"کنوار! کچھ نہیں ہو سکتا اب تو فیصلہ ہو گیا' تب ہی تو اس کا باپ اسے حویلی میں چھوڑ گیا ہے۔ بڑے سردار اپنے فیصلے نہیں بدلتے۔" ملازمہ نے وہ دلاسا بھی اس کے پلو سے نکال پھینکا۔

اور موہل کے اندر امر جلیل کی ساری کہانیوں کی تلخی جاگ اٹھی تھی۔

٭ ٭ ٭

سردار کی سنگت میں سانس لینے والی موہل نے بے حسی کے پیراہن کو تار تار کر دیا۔ ذاتی خوشیوں کے خمار سے نکل کر ارد گرد نگاہ ڈالی تو معاشرے کے اندر عورت کے ساتھ ہونے والی ناانصافی پر تڑپ کر رہ گئی۔ پڑھی لکھی اعلا خیالات والی موہل اس کے اندر سے نکل آئی۔

پتا نہیں اس نے خود کو دریافت کیا تھا۔ یا وہ خود بخود دریافت ہو گئی۔ اس کی یادداشت میں محنتی استاد ماں کے حق و سچ کے سبق تازہ ہو گئے۔ ضمیر کی عدالت نے ببانگ دہل سنانے کا حکم صادر فرما دیا۔

"عورت ایک جیتا جاگتا' سانس لیتا ہوا وجود ہے۔ وہ وجود نہ ہو تو مرد کا وجود ہی ختم ہو جاتا ہے گوہر!"

"ہاں بھئی اس سے کب انکار ہے مجھے۔" اسلام آباد واپسی پر اس کا موڈ خوش گوار تھا۔

"عورت بے جان ملکیت نہیں کہ سنگ چٹی میں دی جائے۔" وہ سراپا سوال بن کر اس کے سامنے ایستادہ تھی۔

"دیکھو جانم! بعض اوقات ہمیں نہ چاہتے ہوئے بھی ایسے فیصلے کرنے پڑتے ہیں۔ یہ ہماری روایات ہیں۔"

"پھر ہماری تعلیم اور ہمارے شعور کا کیا فائدہ جو ہم ایسی گھٹیا روایات کی پاس داری کرتے رہیں۔"

"ہم مجبور ہیں' صدیوں سے رائج جرگہ قوانین نہیں بدل سکتے۔"

"جن کے ہاتھوں میں فیصلوں کا اختیار ہو' وہ مجبور نہیں ہوتے نہ ہی بے اختیار۔ میں جانتی ہوں تم بااختیار ہو' اور فیصلہ بدلنے کی طاقت بھی رکھتے ہو اگر چاہو تو...."

"یہ روایات' فیصلے' جرگے' یہ تمہارا مسئلہ نہیں موہل! تم کیوں پڑ رہی ہو ان فضول باتوں میں۔ کیا ہو گیا ہے' خواہ مخواہ بحث کیے جا رہی ہو۔ میں اتنی شاپنگ کر کے آیا ہوں تمہارے لیے' بجائے وہ دیکھنے کے بے کار باتیں لیے بیٹھی ہو۔" وہ جھنجلا اٹھا۔

"اچھا اچھا' غصہ کرنے کی ضرورت نہیں' مگر ایک بات ہے' میں میرل کو اس بڈھے کے حوالے کرنے کی اجازت نہیں دوں گی۔" بڑے مان سے کہہ کر وہ سامان نکالنے لگی۔

"یہ تو بڑا خوب صورت سیٹ ہے۔" جیولری بکس کھولتے ہی ڈائمنڈ کے لاکٹ سیٹ نے اسے خوش کر دیا۔

"تم پہنو گی تو اور خوب صورت لگے گا۔" گوہر ہنستے ہوئے اسے پہنانے لگا۔

"تم یہ فیصلہ رکوا نہیں سکتے؟" مضمحل انداز میں پوچھا۔

"نہیں!" واسکٹ پہنتے ہوئے اتنی ہی سختی سے جواب آیا۔ جو جاگیرداروں کے رویے اور عمل میں ہمیشہ سے موجود رہی ہے۔

اس نے نڈھال ہو کر آنکھیں موند لیں۔

"کتنی بے بس ہوں میں۔ بہت مان تھا مجھے گوہر کی محبت پر۔ کیا پتا تھا اندر سے اتنا سخت ہے۔ خوامخواہ میرل کو دلاسے دیے۔" آس بندھائی۔

کتنی ہی دیر گزر گئی سوچ سوچ کر اس کا ذہن تھک گیا۔ وہ اٹھ کر کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی۔

نیچے میرل سرخ جوڑے میں ملازمہ کی سنگت میں باہر جاتی نظر آئی۔

آنسوؤں کے سارے پنچھی اس کی آنکھوں سے اڑان بھر رہے تھے۔ میرل کی اداس نظروں میں ان کہا گلہ اس کو بھی ایک سردار کی بیوی ثابت کر رہا تھا۔ ان دیکھا بوجھ آ پڑا۔ وہ ہل بھی نہ سکی۔ پتھر کی ہو گئی۔

اور میرل آنسو بہائے خوف سے سیاہ پڑتے وجود کے ساتھ رخصت ہو گئی۔

٭ ٭ ٭

حوا نے جب آدم کی پسلی سے جنم لیا تو وہ اس کی زوج بنی' وہ جوڑا بن کر نسل انسانی کی افزائش کے شرف سے باریاب ہوئی' بڑے عرصے تک وہ آدم کے برابر رہی' اس کے دکھوں سکھوں کی بیلی' اس کی محنت مشقت کی ساتھی۔

جنت و زمین کے اولین جوڑے نے برابری' محبت و عزت کی بنیاد رکھی' اسی بنیاد پر زندگی کا آغاز کیا۔

ان کی طرز زندگی میں نہ کوئی برتر تھا نہ کم تر' وہ اللہ کے حکم کے مطابق صرف ایک ایسا اشرف المخلوقات کا اولین جوڑا تھا۔ جس نے نسل انسانی کی پیدائش اور زمین پر اللہ کی خلافت قائم کرنے کے مقصد کو آگے بڑھایا۔

آہستہ آہستہ اس جوڑے کے ایک فرد نے طاقت پکڑی' قتل کیا' جھگڑا کیا' فساد پھیلایا' جب تک زندہ رہا' تب ماں کی کوکھ سے جنم لینے کا احساس حاوی رہا' جب خدائی کا دعوے دار بنا۔ تب وہ صرف مرد رہا اور عورت پر برتر' عورت سے بہتر اور حاکم اعلا بن بیٹھا۔

اس گھمنڈ اور تکبر میں جنم دینے والی ماں کو بھی نہیں بخشا گیا۔ کہا گیا

آدم تو بے گناہ تھا' شجر ممنوعہ کھلانے' ورغلانے والی صرف حوا تھی۔ عورت تو صرف دل بہلانے' خوشیاں حاصل کرنے ذریعہ ہے۔

راہبوں اور پادریوں نے حوا کے جرم پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ حوا تب سے آج تک کٹہرے میں کھڑی ہے۔

گزرتے وقت نے بوجھ کم کیا تو اک بار پھر میرل آ گئی۔ اس کے سارے رنگ اڑ گئے تھے۔ اور وہ پژمردگی کا عنوان بن چکی تھی' اس کی آنکھیں ویران کھنڈر اور جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ ہو چکا تھا۔

"تم.... تم خوش تو ہو نا میرل؟" کئی بار لبوں پر رکنے والے جملے کو اس نے ڈھیروں ہمت مجتمع کر کے ادا کیا۔

صدیوں سے جھکا ہوا سر اک لمحے کو اٹھا۔ دکھ کی لہر نظر کی برق بن کر اس کے دل سے چمٹ گئی۔

"میرے پاس آؤ میرل۔"

"کام کرتی ہو گھر میں؟"

"جی مگر وہ میرے ہاتھ سے کچھ کھاتے پیتے نہیں ہیں۔ صبح اٹھ کر جھاڑو دیتی ہوں' سارے گھر اور باڑے کی' پھر چارہ کاٹتی ہوں مشین پر' روزانہ کپڑے دھوتی ہوں۔ برتن مانجھتی ہوں۔ سوکن کی ٹانگیں دباتی ہوں' پھر یہی کام شام کو بھی کرتی ہوں' سارا دن ایسے ہی گزرتا ہے۔"

وہ کسی روبوٹ کی طرح روزمرہ کی تفصیل بتا گئی۔

اس نے پیٹھ پر سے قمیص ہٹ دی۔ نیلوں نیل جسم دیکھ کر وہ دکھ کی کیفیت میں گھر گئی۔

"وہ مطلب براری کے بعد جانوروں کی طرح پیٹتا ہے میرا باپ مجھے خود ہی مار کر دفن کر دیتا تو بہتر تھا۔ روز روز تو نہ مرتی۔"

اس کی ہچکیوں میں گندھے ہوئے آنسوؤں نے

اس کے اندر غم و غصہ اور نفرت بھردی۔

"چل میل! گھر بھی چلنا ہے یا یہیں بیٹھی رہے گی؟"

اس کی سوکن نے اندر داخل ہوتے ہوئے اکھڑ لہجے میں کہا۔

"تم باہر جاؤ' یہ آرہی ہے۔" مومل نے رکھائی سے کہا۔

میل نے سرعت سے آنسو پونچھے اور چل دی۔

رات کو کھانے پر بھی وہ بے دلی سے کھا رہی تھی۔

"کیا بات ہے۔ طبیعت ٹھیک ہے؟" بالآخر گوہر نے پوچھ ہی ڈالا۔

"وہ بڈھا اسے مارتا ہے' تم اسے بلا کر منع کیوں نہیں کرتے کہ اسے نہ مارے۔" وہ پھٹ پڑی۔

"کس کی بات کررہی ہو؟"

"میل کی"

"تمہارا دماغ خراب ہوا ہے' اب ہمارے لیے یہی فیصلے رہ گئے ہیں کرنے کو کہ لوگوں کو بلا کر کہیں اپنی عورتوں کو نہ مارا کریں۔" اس نے جھنجلا کر کہا۔

"یہ فیصلہ تم لوگوں نے کیا تھا۔ اس پر ظلم کے ذمہ دار بھی تم لوگ ہو۔"

"یہ فیصلہ اس کے باپ کے جرم کی وجہ سے ہوا تھا' سمجھیں تم! اور وہ اس کا شوہر ہے' مارے یا محبت کرے' یہ ان کا ذاتی معاملہ ہے۔ دوسروں کے لیے اپنی زندگی عذاب مت بناؤ مومل!" اس نے غصے سے چیخ کر کہا۔

"تم مرد ہو نا اس لیے مردوں کا ہی ساتھ دو گے۔ عورت پستی رہے' مرتی رہے اور مردوں کے جرم کے بدلے سزا پاتی رہے......"

"چلاؤ مت۔ اگر میں تمہیں مارنے لگوں تو کون روک سکتا ہے مجھے۔ وہ بھی اس کی بیوی ہے۔ ملکیت ہے اس کی۔ روندے' بھیلے' یا بنجر چھوڑ دے۔ میل کے وارثوں نے بہ رضا و خوشی اس کو تیغانی کے حوالے کیا ہے۔"

"تم سارے مرد بے حس ہوتے ہو۔" وہ روتے ہوئے بولی۔

"تم بھی تو عورت ہونے کے ناتے اس کی طرف داری کررہی ہو۔"

"وہ مظلوم ہے گوہر!"

"شکر کرو کہ تم نہیں ہو۔"

☼ ☼ ☼

گوہر اپنے باپ کے ساتھ کراچی گیا ہوا تھا۔ وہ ملازمہ کو لے کر باہر نکل آئی۔ وہ گاؤں کے سرکاری اسکول کی عمارت دیکھنا چاہتی تھی۔

"مومل کنوار! اگر سردارنی جی کو پتا چل گیا تو وہ بہت غصہ ہوں گی۔" اس کی ٹانگوں کے ساتھ آواز بھی لرز رہی تھی۔

"اچھا' تم مجھے پتا سمجھاؤ' کس طرف اسکول بنا ہوا ہے' پھر چلی جاؤ حویلی۔" اسے ملازمہ کی حالت پر رحم آگیا۔

"مومل کنوار! نہر کے کنارے جہاں آموں کے درخت کا جھنڈ ہے' ان کے پیچھے ہی ہے۔" اس نے اجرک کو اچھی طرح لپیٹ کر خود کو چھپایا۔ منہ ڈھانپ کر نہر کے کنارے چلنے لگی۔

اسکول کی عمارت خستہ حال تھی۔ چاردیواری کبھی تھی مگر اب جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھی۔ پلاسٹر اکھڑ چکا تھا۔ رنگ و روغن کی باقیات بھی نہیں بچی تھی۔

ٹوٹی ہوئی کھڑکیوں سے اس نے اندر جھانکا' ایک کمرے میں گندم کی بوریاں' دوسرے میں گھاس پھوس تیسرے کمرے میں کھاد کی بوریاں چوتھے کمرے میں جھولا اور چارپائی پر ایک آدمی دھوتی باندھے بے خبر سو رہا تھا۔ پاس ہی پانی کا گھڑا اور کچھ لوہے کے اوزار درانتی وغیرہ پڑے تھے۔

وہ باہر نکل آئی۔ اسکول کے صحن میں کھڑی بھینسیں ڈکارنے لگیں۔ نہر کے کنارے چلتے ہوئے گرمی کی کڑی دھوپ نے اس کو پسینے میں شرابور کردیا۔

"کیا ایرکنڈیشنڈ کمروں سے نکل کر دھوپ و گرمی سہ پاؤں گی؟" ایک لمحے کو اس نے خود سے سوال کیا۔

"اگر اپنے مقصد کو پانا ہے تو سکھ چین آرام کو تیاگنا لازم ہے۔" اندر سے جواب موصول ہوا۔

گھر میں داخل ہوئی تو اماں جی ابھی تک سو رہی تھیں۔

اس نے شکر کا سانس لیا کہ کسی کو پتا نہ چلا تھا کہ وہ اسکول کی سرکاری عمارت دیکھ آئی تھی۔ جس کو اس کے سسر نے ذاتی گودام بنا رکھا تھا۔

رات تک گوہر کراچی سے آچکا تھا۔

☼ ☼ ☼

"اس گاؤں میں اسکول نہیں ہے' دوسرے دن ناشتہ کرتے ہوئے اس نے مکمل انجان بن کر پوچھا۔

گوہر نے ایک نظر اس کو دیکھا پھر نفی میں سر کو جنبش دے کر توجہ ناشتے پر مرکوز کردی۔

"آپ کے ہوتے ہوئے بھی؟" چھنجبے سے کہا۔

"اسکول تو کافی عرصے پہلے سے بنا ہے۔ مگر کوئی ٹیچر گاؤں میں آئی نہیں' اس لیے پڑھائی کا سلسلہ چل نہیں پایا۔"

"چلو' کوئی لیڈی ٹیچر نہیں آئی مگر یہاں بوائز اسکول کا بھی یہی حال ہے' کیا آپ کا فرض نہیں بنتا تھا۔ اپنے گاؤں کے لڑکے اور لڑکیوں کو پڑھانا۔ ان کے لیے خود ذاتی کوشش سے ٹیچر ارینج کرنا۔" اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں چبھتا سوال کیا۔

"یہاں کے لوگ عورت کی پڑھائی کو اچھا نہیں سمجھتے۔ ان کا خیال ہے کہ تعلیم عورت کو خود سر بنادیتی ہے۔" وہ لاپروائی سے بولا۔

"آپ پڑھے لکھے تھے۔ باشعور تھے۔ اپنے عمل اور طاقت سے یہ سوچ تبدیل کرسکتے تھے۔"

"مگر کیوں؟" اس نے پلیٹ کھسکا کر دونوں ہاتھ ٹیبل پر رکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سختی سے کہا۔

"اس لیے کہ علم ہی ہے۔ جو معاشرے کو متحرک رکھتا ہے۔ غربت کی ذلت سے بچاتا ہے' جہالت کی تاریکی اور غلامانہ ذہنیت کو ختم کرتا ہے۔"

اس نے اسی کی طرح مکمل اعتماد سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مگر دھیمے لہجے میں کہا۔

"میں نے معاشرے کو سدھارنے کا ٹھیکہ نہیں لے رکھا مومل مہر!" وہ چبا چبا کر بولا۔ پھر ناشتا چھوڑ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

"پلیز گوہر! اس میں اتنی ناراضی والی کیا بات ہے؟" اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر روکتے ہوئے تحمل سے کہا۔

"زہر لگتی ہیں مجھے بحث کرنے والی عورتیں۔" اکتاہٹ اور بے زاری اس کے لہجے سے عیاں تھی۔

"اتنی محبت کے بعد ہم ایک دوسرے پر اتنا بھی حق نہیں رکھتے کہ کھل کر بات کرسکیں۔" اس کی آواز بھرا گئی۔

"دیکھو مومل! تم نے جب مجھے قبول کیا تو اس نظام کو بھی دل سے قبول کرو' جس کا میں حصہ ہوں۔"

"میں تو صرف بنیادی انسانی حقوق کی بات کرتی ہوں۔ گوہر! آپ کے پاس طاقت ہے' دولت ہے' ہمت ہے' حوصلہ ہے۔ چاہیں تو بہت کچھ کرسکتے ہیں۔ آپ نے مجھے میرے شعور سمیت قبول کیا ہے۔"

"اچھا بس' آنسو پونچھ لو' تماشہ مت بناؤ اپنا بھی اور میرا بھی۔" اس نے ملازماؤں کو سر جھکا کر کام کرتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

"سب کے کان ادھر ہی لگے ہوں گے۔" کھڑکی سے خشمگیں نظروں سے اماں کو گھورتے دیکھ کر اسے ایک بار پھر غصہ آگیا۔ اس کو یاد نہیں پڑتا تھا کہ اس کی ماں نے کبھی سر اٹھا کر اس کے باپ سے بات کی ہو۔ وہ تیز تیز قدم اٹھا کر باہر نکل گیا۔

☼ ☼ ☼

محبت کی حسینہ بہت خوب صورت تھی۔ اس کی دوشیزگی کے عجیب رنگ تھے۔ جلوے پر جلوہ' جھلسا دینے والا' موہ کر اپنا رنگ چڑھا دیتی۔

اس کے وجود میں ٹھنڈک تھی تو تپش بھی، وہ آگ اور پانی کا ملاپ، سمندر اور سورج کے وصل کی مانند رکھتی۔ اس کے گرد خوشبوؤں کا ہالہ۔ اور کسک کی جلن رکھتی، وہ رگوں کو جھنجوڑتے اور دل کو اپنے گرد محورِ رقص رکھنے کے گُر سے آشنا اور سارے ماحول پر چھا جانے کے ہنر میں ماہر رہی تھی۔

ازل سے اب تک اس کے داؤ پیچ پر خلقِ خدا حیران و پریشان افتاں و خیزاں اندھا دھند بھاگتے رہنے پر مجبور کر دی گئی۔ وہ کبھی صوفیوں کے سلوک میں چھپتی۔ کبھی دلوں میں پردہ پوش ہوتی۔

حسیناؤں کی آنکھوں میں کاجل کی طرح سجتی، پازیب کی طرح بجتی، جہاں دم لینے کو رکتی، ایسا زخم چھوڑتی جس کا مرہم نہ ملتا۔ ایسا غم لگاتی جس کا مداوا نہ ہوتا۔ وہ جہاں قیام کرتی، اس زمینِ دل کو زرخیز بنا دیتی، وجود کو ہر بوجھ سے آزاد کر کے ہواؤں کا راہی بنا دیتی۔ سیرِ کائنات کا سیاح بنا کر یادوں کے انبار لگا دیتی۔ خوابوں کا ہم سفر بنا کر دشت جنوں سے ذات کو دریافت کراتی دورانِ ذلت تحیر کا میلہ سجتا، ذہن کے دریچے کھلتے، سوچ کا ساگر چھلکتا، احساسات کا جہان بنتا، موج در موج وجدان وارد ہوتے گوہر کی سنگت پر اسے بڑا مان تھا۔

اور اپنی ذات پر بے تحاشا اعتماد تھا کہ وہ بڑے سردار کے پاس چلی آئی۔

"السلام علیکم بابا جان!"

"وعلیکم السلام۔ کیسی ہو بابا، کوئی تکلیف تو نہیں نا یہاں پر۔" سردار بہادر خان نگسی! اخبار چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

"جی بابا جان! کوئی تکلیف تو نہیں مگر آج میں آپ کو آپ کا وعدہ یاد دلانے آئی ہوں۔" وہ ساتھ والے صوفے پر بیٹھ گئی۔

"اچھا! بھلا کون سا وعدہ؟" وہ چشمہ کے اوپر سے اسے دیکھتے خوش دلی سے مسکرائے۔

"یاد ہے، آپ نے شادی کے دوسرے دن کہا تھا، جو مانگنا ہے مانگو، جو بھی خواہش ہو گی، وہ پوری کروں گا تب میں نے کہا تھا جب ضرورت ہوئی، آپ ہی سے مانگوں گی۔"

"ہاں ہاں بالکل یاد ہے۔ بولو کیا چاہیے، نئے ماڈل کی گاڑی، یا بنگلہ، زیور، زمین؟"

"پہلے آپ وعدہ کریں گے، پھر بتاؤں گی۔"

"ہاں بھئی ہم اپنی زبان سے نہیں پھرتے۔"

"آپ کی اجازت اور تعاون چاہیے؟"

"کس بات کے لیے؟"

"گاؤں میں اسکول کھولنے کے لیے۔ بابا جان! میں چاہتی ہوں اسکول کی عمارت سے غیر ضروری چیزیں سامان اٹھوالیں اور فرنیچر ڈلوا دیں تاکہ میں ٹیچر ارینج کر کے اپنی نگرانی میں تعلیم آغاز کروں۔"

بابا جان کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔

"بابا، اسکول کھولنے کا کیا فائدہ، عورتیں پڑھ لکھ کر بغاوت کریں گی۔" انہوں نے چشمہ اتار کر ٹیبل پر رکھا۔

"نہیں بابا جان! وہ بغاوت نہیں کریں گی۔ وہ باشعور ہو کر آپ کی احسان مند ہوں گی۔ وہ اپنے مردوں کا بازو بنیں گی۔"

بڑے سردار کے ماتھے کی شکنیں بہت واضح تھیں۔

"بابا جان! آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔" اس نے لجاجت سے کہا۔

"ہاں بابا! ہم اپنی زبان سے نہیں پھریں گے، لیکن یہاں لوگ لڑکیوں کی تعلیم کو اچھا نہیں سمجھتے۔ وہ نہیں مانیں گے۔" انہوں نے گلا کھنکار کر جواباً کہا۔

"بابا جان! عورت اور مرد مل کر بہترین سماج کی بنیاد رکھ سکتے ہیں۔ تربیت تو ماں کرتی ہے، اگر وہ ان پڑھ رہے تو معاشرے میں سدھار نہیں آسکتا۔ قائداعظم نے کہا تھا کہ مجھے پڑھی لکھی مائیں دو، میں تمہیں پڑھی لکھی قوم دوں گا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر یہاں کے لوگ ایسی باتیں نہیں مانتے۔" اس کے دلائل پر وہ جھنجلا گئے۔ ایک لمحہ کے لیے وہ خاموش ہو گئی۔

"میں صرف اتنا جانتی ہوں بابا جان! کہ یہاں کے لوگ آپ کی نافرمانی اور حکم عدولی کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ جبکہ ان کو یہ بھی پتا چل جائے کہ اسکول چلانے والی آپ کی بہو ہے۔ بابا! میں بہت مان سے آپ کے پاس آئی ہوں۔"

وہ اس کے التجائیہ انداز پر کچھ دیر تک سوچتے رہے، پھر بے دلی سے بولے۔

"ٹھیک ہے... اگر تم لوگوں کو رضامند کر سکتی ہو تو ہم اسکول خالی کرا دیں گے۔"

"تھینک یو بابا جان، تھینک یو۔" وہ خوش ہو کر بولی تھی۔

اک بھونچال تھا، جس نے سب کو پریشان کر دیا۔ کسی کو یقین نہ آتا تھا کہ بڑے سردار کی بہو، چھوٹے سردار کی شہری بیوی یوں باہر نکل کر اسکول بنائے گی اور گاؤں کے گھروں میں گھس گھس کر لڑکیوں کو اسکول میں داخل کر لے گی۔ اس کے تو صرف آنے پر ہی ان غریبوں کے سر جھک جاتے، انکار کی تو مجال ہی نہ تھی۔ وہ تو عزت سے بات کرنے پر ہی شکر گزار تھے۔

٭ ٭ ٭

"تم روز گھر سے نکل جاتی ہو، برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔"

جھنجلاتے گوہر کو دیکھتے اسے خوف زدہ عائشہ یاد آئی۔

"بی بی! اگر آپ روزانہ آئیں گی۔ تو یہ اسکول چلے گا۔ سرداروں کے لوگ آ کر پہلے دن ہی بند کروا دیں گے۔ پہلے بھی یہاں ایسا ہوتا آرہا ہے۔ یہ نہ ہو کہ مجھے ہی جان کے لالے پڑ جائیں۔"

عائشہ کے خدشات اس کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔

"دیکھو گوہر! اسکول میں لڑکیوں کی تعداد ڈیڑھ سو سے زیادہ ہو چکی ہے۔ انہیں ایک عائشہ نہیں پڑھا سکتی۔ گاؤں میں کوئی اور لڑکی پڑھی لکھی نہیں ہے، جو میں اس کی مدد کے لیے رکھوں، ہم دونوں مل کر پڑھاتے ہیں۔"

"تو شہر کی رکھ لو۔"

"ہاں... اس بار آپ کے ساتھ چلوں گی تو ٹیچر کو بھی لے آؤں گی، مگر پھر بھی میرا جانا تو ضروری ہے ناں۔" کسی ادارے میں چیک اینڈ بیلنس نہ ہو وہ ادارہ ڈوب جاتا ہے۔

"تم نے ٹھیکہ لے رکھا ہے کیا سماج میں تبدیلی کا؟" وہ غصے سے بولا۔

"میں پہلے ہی کہتی تھی پت! حویلی کے اندر شہری عورت کا کیا کام، مگر تو مانا نہیں، آج وہ تجھ سے ٹکرا رہی ہے۔" اس کی ساس نے طنز کیا۔

"اماں! مجھے نہیں پتا تھا کہ یہ اتنی بڑی بے وقوفی کرے گی کہ بابا کے سامنے جا کر کھڑی ہو جائے گی۔"

٭ ٭ ٭

وہ بہت پریشان تھی۔ اک طرف گوہر کا بدلتا رویہ، دوسری طرف ان غریب عورتوں کے دکھ جو کسی پل چین سے نہ رہنے دیتے۔ وہ عجیب دوراہے پر کھڑی ہو جاتی جیسے پانی اور آگ کے بیچ۔ گوہر اور اس کے درمیان انسانیت کی لمبی خلیج تھی، جو وہ صرف محبت سے نہیں پاٹ سکتی تھی۔

وہ تیار ہو کر ناشتے کی میز پر آئی تو گوہر اٹھ رہا تھا۔ اس کی ذاتی ملازمہ نے اس کو واسکٹ پہنائی، پھر لیپ ٹاپ اٹھا کر اس کو گاڑی تک چھوڑنے گئی۔

ڈرائیور نے مستعدی سے دروازہ کھولا اور گوہر سے لیپ ٹاپ لے کر سائیڈ پر رکھا۔ گلشن سے کچھ کہا۔ وہ سر ہلاتی مسکراتی ہوئی پیچھے ہٹی۔ جب تک گاڑی گیٹ سے نکل نہ گئی، وہ وہیں کھڑی رہی۔ پھر لاابالی پن سے پراندہ ہاتھ سے جھلاتی لان کی طرف چلی گئی۔ شیشے کی دیوار سے نظر آنے والے منظر پر اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔

"کیا گوہر گلشن کو میرے مقابلے پر لا رہا ہے؟"

پہلی بار جب اس نے گلشن کو گوہر کے کپڑے نکالنے سے منع کیا تو گوہر نے کہا۔ "تمہاری آسانی کے

لیے رکھی ہے' تم خود تیار ہو کر اسکول جاتی ہو' یہ میرا کام کر دیتی ہے۔"

"نہیں گوہر! میں تمہارے جانے کے بعد چلی جاؤں گی۔ تمہاری چیزیں سنبھالنے' رکھنے' اٹھا کر دینے میں مجھے کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔" اس نے ہنس کر کہتے ہوئے گلشن کے ہاتھوں سے کوٹ لے لیا تھا۔

"مگر آج کے بعد میرا ہر کام گلشن ہی کرے گی۔" گوہر کے تلخ اور اٹل لہجے نے اسے حیران کیا تھا۔ اس دن کی بحث کے بعد گوہر اس سے بہت اکھڑا اکھڑا تھا۔

پاس کھڑی نئی ٹیچر روزینہ نے' جسے اس نے اپنے ساتھ حویلی میں ٹھہرایا تھا' اس کی نظروں کے تعاقب میں سارا منظر دیکھا۔ اور آنکھوں کی نمی پر پر تاسف ہوئی تھی۔

"تم نے ناشتا کیا؟" وہ اسے دیکھ کر بولی۔

"جی ہاں..... ابھی کر کے ہی آ رہی ہوں' ملازمہ کمرے میں ناشتا دے جاتی ہے۔"

"اچھا چلو..... دیر ہو رہی ہے۔ عائشہ انتظار کر رہی ہو گی۔"

"آپ ناشتا نہیں کریں گی؟"

"نہیں بھوک نہیں ہے۔ اسکول میں چائے پی لوں گی۔ تمہیں یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟" اس نے بات بدلنے کے لیے پوچھا۔

"نہیں' بالکل بھی نہیں۔" وہ مسکرائی۔

عائشہ گاؤں کی واحد انٹر پاس لڑکی تھی۔ وہ بھی اس گاؤں کی نہ تھی۔ قریبی شہر سے اپنی ماسی کے بیٹے سے بیاہ کر اس گاؤں میں آئی تھی۔ جب اس نے گاؤں میں کسی بھی طرح کی تعلیم کا رجحان نہ دیکھا تو وہ گھر میں کمہاروں کے مٹی میں کھیلنے والے بچوں کو پکڑ کر گھر میں پڑھانے لگی۔ یہ سلسلہ دو ماہ ہی چلا ہو گا کہ سردار کا کمدار آ گیا۔ بڑے سردار نے بلاوا بھیجا تھا۔ "شام کو سارے کمہار سردار کی اوطاق پر جمع ہوں۔"

پیرو' بخشو' مالکو' جی سائیں' حاضر سائیں!" کہتے وہ صدیوں سے بندھے ہاتھ اور جھکے سر اٹھا کر کھڑے ہو گئے۔

"سنا ہے تمہارے گھر میں اک نیا فساد پیدا ہوا ہے۔ اب وہ پیرو کی بہو' بچوں کو پڑھا رہی ہے۔ اور شہر کے اسکول میں نام بھی داخل کروا آئی ہے۔" سردار نے تیوری چڑھا کر پوچھا۔

"تم لوگ اپنے بچوں کا مستقبل کیوں اندھیر کرتے ہو' اپنا آبائی دھندہ دہاڑی سکھاؤ' یہاں تو اچھے گھروں کے نوجوانوں کو نوکریاں نہیں ملتیں' پڑھ لکھ کر بے کار بیٹھے ہوئے ہیں' تو تمہارے بچے کون سے افسر لگ جائیں گے۔ ارے نویں' دسویں جماعت کا خرچہ بھرنے کی تو تم لوگوں میں سکت نہیں' یونیورسٹی تک کیسے پڑھاؤ گے' ہنر سکھاؤ' ہنر جو پیٹ بھرے۔"

"ہا سائیں ہا..... ہنر تو بادشاہ ہے' کبھی بھوکا نہیں مرتا ہنر مند۔"

مالکو نے اجرک کے پلّو سے پیشانی سے پسینہ پوچھا اور تائید کی۔

"ہا..... بھوتار سائیں آپ ہمارے سجن ہیں بھلا چاہتے ہیں' تب ہی نصیحت کر رہے ہیں۔" بخشو نے بھی ڈرتے ڈرتے زبان کھولی۔

"پیرو! تم نے شہر میں بیٹے کا رشتہ کرتے وقت ہم سے اجازت لی تھی؟" ان کی گھورتی نگاہوں نے پیرو کی جان نکال دی۔

"سائیں! بھوتار سائیں! آپ کو اللہ سائیں زندگی دے۔ ان دنوں طبیعت کچھ ناساز تھی' علاج کرانے لندن گئے تھے۔ چھوٹے سردار سے اجازت لی تھی' پھر رشتہ کیا تھا۔"

"میرے آنے کا انتظار نہیں کر سکتے تھے۔ کوئی بھگدڑ مچی تھی' یا لڑکی گھر سے بھاگ جاتی جو اتنی جلدی مچائی۔ میں آتا' دیکھ بھال کراتا' لڑکی کیسی ہے' کس خاندان کی ہے' پھر رشتہ کرتے۔"

"بھوتار سائیں! آپ کی بیماری کا بھی خیال نہیں آیا۔ ڈھول باجے بجا دیے۔" کمدار نے جلتی پر تیل ڈالا۔

"نہیں سائیں نہیں۔ آپ کی صحت یابی کی خوش خبری ملی تھی۔ حویلی سے میری بیوی اجازت لے کر آئی تھی' پھر میں نے بیٹے کی شادی کی۔ لڑکی بھی دیکھی بھالی تھی۔ میری سالی کی بیٹی ہے سائیں!" پیرو ہاتھ جوڑ کر صفائی پیش کرنے لگا۔

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے' جو ہونا تھا وہ ہو چکا' مگر اب اپنے بچوں کو آبائی پیشہ سکھاؤ اور یہ پڑھائی شڑھائی کا کھڑاک بند کرو۔"

بڑے سردار کے چہرے پر پڑے بلوں نے اپنا فیصلہ صادر کر دیا اور ان سب لوگوں نے "حاضر سائیں" کہہ کر ہمیشہ کی طرح سر جھکا دیا۔

☼ ☼ ☼

ان ہی کمہاروں کے گھر کے باہر ایک دن چھوٹے سردار کی بہو کو دیکھ کر اپلے تھاپتی عورتوں کے ہاتھ رک گئے۔ گھڑوں سے پانی نکال کر لال صابن سے ہاتھ مل مل کر ہاتھ دھو کر عائشہ کی ساس اسے پکارتے آگے بڑھی۔

"ارے عائشہ! بستر بچھا' بڑے سردار کی بہو آئی ہے۔" عائشہ نے فوراً "رلی" بچھائی۔

"سومل بی بی! یہاں بیٹھیے۔"

"عائشہ! میں تم سے ملنے آئی ہوں' مجھے اسکول کے لیے ٹیچر چاہیے۔"

"بڑے سردار نے گھر میں تو پڑھانے کی اجازت نہ دی' اسکول میں کیسے دے گا؟"

"بڑے سردار سے میں نے اجازت لے لی ہے' اس کی تم پروا نہ کرو۔"

"آپ بڑے سردار کی بہو ہیں' اس لیے اعتبار کر رہی ہوں' ورنہ اب تو اعتبار کرنے کو دل نہیں چاہتا۔"

بڑے اعتماد کے ساتھ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے عائشہ نے کہا تھا۔ ایسی ہی مضبوط لڑکی کی ضرورت تھی۔

سومل بی بی! دراصل اس کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم بڑے سردار کے آدمی ہیں۔ ان کے ہر حکم کی تعمیل کرتے ہیں۔

اس کی ساس' بہو کے اعتماد سے ڈر گئی۔

"اصل میں ہم جھکے سروں والے کبڑے لوگ ہیں' ہمارے کبھی نہ سر اٹھیں گے نہ کمریں سیدھی ہوں گی۔"

عائشہ کی ذو معنی بات اسے سوچ میں ڈال گئی

"مجھے تمہاری یہ خود اعتمادی اچھی' مگر یہ بتاؤ بونوں کے معاشرے میں تمہارا قد کیسے بلند ہو گیا؟"

"اس لیے کہ خوش قسمتی سے میں یہاں کی رہنے والی نہیں۔ میرا باپ شہر میں نوکری کرتا تھا۔"

☼ ☼ ☼

"ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ اک آئیڈیل معاشرہ کیسا ہونا چاہیے..... وہ معاشرہ جہاں ہر فرد کو زندگی کی بنیادی سہولیات مہیا ہوں۔ غلامی کا شکار معاشرہ فرد کی صلاحیتوں کو مردہ کر دیتا ہے۔"

اسکول سے آتے ہوئے گاڑی میں چلنے والے ایف ایم ریڈیو اسٹیشن پر گوہر علی مگسی کو سندھی ادبی سنگت کی تقریب میں ادیبوں سے خطاب کرتے ہوئے سنا تو اس کے دل میں مبہم سی امید پھر سے زندہ ہو گئی۔ گوہر کے اندر انسانیت مری نہیں ہے۔

یہ وہی خواب دیکھنے والا تو اسٹوڈنٹ تھا جس کی باتوں نے سندھ یونیورسٹی میں اس کے نظریات کو پختہ اور محبت کی امر بیل میں جکڑ دیا۔ پھر وہ اس امر بیل میں ایسی جکڑی کہ پھر فرار کا کوئی رستہ نہ بچا۔

"سومل بی بی! سردار گوہر خان کے خیالات و نظریات تو بہت اعلا ہیں۔" روزینہ نے کہا۔ اس نے مسکرا کر روزینہ کو دیکھا۔

"ہاں' اس کے ایسے ہی خیالات نے تو مجھے اس کا اسیر بنایا تھا' مگر یہاں آ کر مجھے پتا چلا کہ اس کی ذات تو بہت تضادات کا شکار ہے۔ پیسے کی افراط اور طاقت کا نشہ بہت بری چیز ہے۔ بہت کم لوگ تاریخ انسانی میں ان دو چیزوں کو سنبھال پاتے ہیں۔"

"آپ ٹھیک کہتی ہیں مومل بی بی! اگر آج کی گوہر علی خان کی تقریر بہت شان دار تھی۔" روزینہ نے حویلی میں اندر داخل ہوتے ہوئے تعریف کی۔

"ہاں اس نے میرے اندر بھی پھر سے امید کی کرن زندہ کردی ہے۔"

وہ سارا دن اس کے انتظار اور بیتی یادوں کی نذر ہوا۔ اس کو گوہر کے کپڑے استری کر کے رکھتی ہوئی گلشن بھی بری نہیں لگی۔ شاید میری توجہ کم ہوگئی تھی' جب ہی وہ گلشن کی طرف متوجہ ہوا ہے۔ مردوں سے ایسی چھوٹی موٹی غلطیاں تو ہوتی رہتی ہیں۔

وہ اسے ہر جرم سے بری الذمہ قرار دیتی رہی۔

رات کو وہ بہت دیر سے آیا تھا۔ وہ اس کے انتظار میں جاگ رہی تھی۔

"اتنی دیر کردی؟" گوہر کی اتاری ہوئی واسکٹ اپنے بازو پر رکھتے ہوئے وہ محبت سے بولی۔

"میرے خیال میں کافی عرصے سے میرے آنے کا یہی ٹائم ہے۔" اس نے چبھتے لہجے میں کہتے ہوئے بغور اس کو دیکھا۔

"ہاں... لیکن آج تمہارا انتظار بہت شدت سے تھا' شاید اس لیے ایسا محسوس ہوا۔"

"کیوں خیریت؟ پھر کوئی نیا مطالبہ کرنا ہے؟"

اس نے گوہر کے طنزیہ لہجے کو یکسر نظر انداز کردیا۔

"آپ کی آج کی تقریر نے یونیورسٹی کی بیتی یادیں تازہ کردیں۔ وہ آدرش' اعلا قدروں کی جوشیلی باتیں جو آنکھوں میں تبدیلی کے خواب سجادیتی' لہو کو گرمادیتی تھیں۔ گزرتے وقت کے ساتھ مجھے لگا کہ سرداری نظام نے وہ خواب تمہاری آنکھوں سے چھین لیے ہیں' مگر آج لگا تمہارے اندر ابھی بھی انسانیت زندہ ہے۔"

اس کی ملائمت سے کہی گئی باتوں پر وہ خوش گوار انداز میں ہنسا اور اس کی کمر میں بازو حمائل کرتے ہوئے بولا۔

"شکر ہے مجھے تم انسان تو تسلیم کرتی ہو۔"

"صرف انسان نہیں' اپنا محبوب اور شوہر بھی۔" وہ شرارتی لہجے میں بولی۔

اس نے اس کے سر پر ہلکی سی چپت لگا کر سینے کے قریب کیا۔ مومل نے چند لمحے بعد اس کے سینے سے سر اٹھا کر کہا۔

"صرف سردار تسلیم نہیں کرتی۔"

"وہ تو میں ہوں۔" اسی شرارت سے جواب آیا۔

کتنے ہی عرصے بعد اس نے محبت کی ننھی ننھی بوندیں سمیٹ کر اپنی تشنگی کو سیرابی دے کر پیاس بجھائی تھی۔

☆ ☆ ☆

"اگر لوگوں کا ذوق وشوق اور آپ کی لگن یہ ہی رہی تو اسکول کی یہ عمارت تنگ پڑجائے گی۔" چھٹی کے وقت بچوں کو گیٹ سے نکلتے دیکھ کر عائشہ نے خوش دلی سے تجزیہ کیا۔

"تنگ پڑجائے گی تو وسیع کرلیں گے۔ پھر یہاں ہائی اسکول بنوانے کا بھی ارادہ ہے۔ اگر زندگی رہی تو۔" وہ مسکراتے نیم کی چھاؤں تلے آگئی۔

"کیسی باتیں کرتی ہیں۔ اللہ آپ کو زندگی دے۔" روزینہ نے فوراً دعا دی۔

"مومل بی بی! آپ تو ہم اندھوں کی بیساکھی ہیں۔ آپ کے بغیر ہم بالکل معذور ہیں۔" عائشہ نے اپنائیت سے کہا۔ وہ تینوں چلتی ہوئی باہر آئیں۔ اس کو دیکھ کر ڈرائیور نے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ اس نے عائشہ اور روزینہ کو ساتھ بٹھایا۔

راستے میں ملنے والے لوگوں میں کسی نے ہاتھ جوڑے' کسی نے سلام کیا' کسی نے سردار کی حویلی کی گاڑی دیکھ کر خوف سے سر جھکا دیا۔

ببول کی چھاؤں میں اس نے تہمینہ اور ثمینہ کو کھڑے دیکھا تو گاڑی رکوالی۔

"یہاں پر کیوں کھڑی ہو؟"

"مومل بی بی! بابا کا انتظار کررہے ہیں' پتا نہیں لینے کیوں نہیں آیا۔" تہمینہ نے وضاحت دی۔

"آجاؤ میں چھوڑ دیتی ہوں۔"

روزینہ اتر کر فرنٹ سیٹ پر جا بیٹھی اور وہ دونوں لڑکیاں پیچھے اس کے ساتھ بیٹھ گئیں۔

"ہوسکتا ہے دکان پر گاہک زیادہ ہوگئے ہوں۔ تب ہی بابا کو دیر ہوگئی ہو۔" ثمینہ نے قیاس آرائی کی۔

"پہلے ان کو چھوڑتے ہیں' پھر عائشہ کو' اور بعد میں گھر چلتے ہیں۔" اس نے ڈرائیور سے کہا۔ تہمینہ اور ثمینہ پسینے میں شرابور تھیں۔ انہیں دیکھ کر اسے عائشہ کی بات یاد آگئی۔

"یہ بہنیں اتنی خوب صورت ہیں کہ انہیں سب کی نظروں سے چھپا کر رکھنے کو جی چاہتا ہے۔" اور اس نے تائید کی تھی۔ واقعی حسن اور ذہانت کم ہی یکجا ہوتے ہیں۔

آج سنسان چلچلاتی دھوپ میں ان کو اکیلے کھڑے دیکھ کر اس کے دل میں خوف جاگا تھا۔

کاکا نورل کا گھر گاؤں کے آخری کونے پر تھا۔ سرداروں کی جاگیر شروع ہوچکی تھی۔

تہمینہ اور ثمینہ کو گھر کے دروازے پر چھوڑ کر وہ واپس جارہی تھی تو دو نوجوان ہاریوں کے پیروں میں بیڑیاں دیکھ کر وہ ٹھٹکی۔ اس نے ڈرائیور سے گاڑی روکنے کو کہا اور نیچے اتر آئی۔

وہ دونوں ساتھ ساتھ کام کررہے تھے۔ اک نے رک کر اسے دیکھا۔ دوسرے نے یہ زحمت بھی گوارا نہ کی' کام میں جتا رہا۔

"تمہارے پاؤں میں بیڑیاں کس نے ڈالی ہیں؟" اس نے غم وغصے سے استفسار کیا۔ مگر اسے جواب نہیں ملا۔

سیاہ بخت والے نے اک نظر دیکھا' پھر کام میں منہمک ہوگیا۔ اس کی پشت سے پسینے کی لہریں بہہ کر شلوار میں جذب ہوتی رہیں۔ جیسے وہ سننے' سمجھنے' سوچنے' جواب دینے کی صلاحیتوں سے محروم ہوچکے ہوں۔

"غلامی شاید انسان کو گونگا' بہرا کردیتی ہے۔" اس نے پاؤں میں بیڑیوں کی جگہ سرخ زخموں کے نشان دیکھتے افسردگی سے سوچا۔ جلتی دھوپ نے چند منٹ میں اسے پسینے سے شرابور کردیا تھا مگر وہ ہاری گدھوں کی طرح کام میں جتے تھے۔

اسے وہاں کھڑا دیکھ کر آہستہ آہستہ عورتیں اور بچے کام چھوڑ کر اس کے گرد اکٹھے ہونے لگے۔ وہ بڑے سردار کی بہو کو یوں دھوپ میں کھڑے اچنبھے سے دیکھتے رہے۔ ان کی زبانیں تالو سے چپکی ہوئی تھیں۔ پھٹے ہوئے گھاگھروں پر جگہ جگہ پیوند لگے ہوئے تھے۔

"یہ بچے پڑھتے نہیں؟" جواب ندارد۔

"تم سب لوگ یہیں پر کام کرتے ہو؟" کسی نے زبان نہیں کھولی۔ ارد گرد خوف زدہ نظریں گھماتے رہے۔

"اوئے ہڈحرامو! سارے ایک جگہ کھڑے ہو کام چھوڑ کر' مفت کے ٹکر توڑتے ہو' دانا پانی بند کردوں گا۔ خبیثوں! جہاں کوئی حسین لڑکی دیکھی آنکھ مٹکا کرنے کھڑے ہوگئے۔" اس نے بکتے ہوئے چھڑی چند لوگوں کو ماری۔

اس کی لوویں جلنے لگی۔ عورت کتنی ہی طاقت ور ہوجائے۔ مردانہ معاشرے میں اسے صرف ایک نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

"زبان سنبھال کر بات کر کمدار! یہ سردار گوہر علی خان کی بیگم ہیں۔" ڈرائیور نے غصے سے کہا۔ کمدار ٹھٹک گیا۔ فوراً ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"اماں سائیں! معاف کردیں' آپ کو پہچانا نہیں۔"

"ان کے پاؤں میں بیڑیاں کیوں ہیں؟"

"سائیں بھگوڑے ہیں' کئی بار بھاگ چکے ہیں' اس لیے مجبوراً ڈالنی پڑیں۔"

"یہ کیوں بھاگتے ہیں؟ کیا وجہ ہے؟ کیا تم ان کا حساب نہیں چکاتے ٹھیک سے؟"

وہ نوجوان جو سر جھکائے کام میں مگن تھا۔ اس نے اپنے حق میں اٹھنے والی آواز پر کمر سیدھی کرکے پہلی بار دیکھا۔ اس کی سیاہ آنکھوں میں بغاوت کا غصہ چمکتا

تھا۔

"سائیں..... ان کے اوپر تو اتنا قرضہ ہے کہ ان کی سات پشتیں کمائیں تو بھی نہ اترے۔ ان کو تو دو وقت کا کھانا بھی اپنے پلے سے کھلاتے ہیں۔" وہ خوشامدی لہجے میں بولا۔

اس نے مٹی کے برتنوں میں سفید چاولوں کے بھت کو دیکھا جس میں برائے نام مرچیں تھیں اور کچھ نہیں۔

اس کا تنفس غصے میں تیز ہو رہا تھا۔ "ان کو ان کی اجرت دے دیا کرو۔ ان کے قرضوں کا حساب کتاب میں خود چھوٹے سردار سے پوچھ لوں گی۔ اور ہاں! کل سے یہ سارے بچے کھیتوں میں کام نہیں کریں گے۔ ان کو اسکول بھیجنا تمہاری ذمہ داری ہے۔"

"سائیں! یہ بھیل ہیں بھیل۔" کمدار نے دونوں ہاتھوں سے ان کی طرف اشارہ کر کے حیرت سے کہا۔

"کیوں..... بھیل انسان نہیں ہوتے؟" اس نے غصے سے سوال کیا، کمدار تھوک نگلنے لگا۔

اسی وقت کسی شیر خوار بچے کے زور، زور سے رونے پر اس نے آواز کا تعاقب کیا۔ ببول کے درخت کے نیچے ایک میلی کچیلی رلی کے ٹکڑے پر ایک بچہ بھوک اور گرمی سے بلبلا رہا تھا۔ وہ چلتی ہوئی بچے کے پاس آئی۔

"کہاں ہے اس کی ماں؟"

گندم کی کٹائی کرتی، درانتی رکھ کر ایک لڑکی خوف زدہ نظروں سے کمدار کو دیکھتی اٹھی اور آ کر بچے کو گود میں اٹھایا۔

"آج سے کوئی بھی شیر خوار بچے کی ماں فصلوں میں کام نہیں کرے گی۔ کمدار! تم میری باتیں سمجھ رہے ہو نا؟" اس نے غصے سے کہا۔ دل تو کر رہا تھا کہ کمدار کو گولی مار دے۔

"جی..... جی..... جو حکم سائیں!" کمدار نے خوشامدی لہجے میں کہتے ہاتھ جوڑے۔

"کہاں ہے تمہارا گھر، لے جاؤ اس بچے کو مر جائے گا اس دھوپ میں۔"

وہ لڑکی تشکر آمیز نظروں سے دیکھتے چلی گئی۔

"ان کے گھر نہیں ہوتے بڑے سے چھپر ہوتے ہیں، جہاں ان کو قید کیا جاتا ہے اور علی الصباح ہانک کر لایا جاتا ہے۔ یہ معمول کے کمّی ہیں۔ مگر جن دنوں میں زمینوں پر کام زیادہ ہو تو گاؤں کے لوگ بھی مفت میں بیگار بھرنے آتے ہیں۔ سردار کی ناراضی مول لینے کی کسی میں بھی ہمت نہیں۔ کیا مسلمان کیا ہندو۔" عائشہ اسے تفصیلات بتانے لگی۔

ویا موری بھنبھ نہ رہیو ہیکڑو

اچی ڈھنڈ بھری کوڑن کانئیھ سان

(مور اب مر گئے ہنس ایک بھی نہ رہا

اب جھیل جھوٹے کوؤں سے بھر چکی ہے۔)

عائشہ نے شاہ لطیف کا بہت ٹھنڈی سانسوں سے پڑھا تھا

مومل آج کے دن کے بعد تمام واقعات پر سخت صدمے میں تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کیا کر ڈالے۔ بہت مضمحل سی گھر پہنچی۔ دوپہر کے واقعات سے ابھی تک ملول تھی۔ نہانے اور نیند لینے کے بعد اس کی طبیعت کا اضمحلال کم نہیں ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

"تم ہمیں ذلیل کرنے پر تلی ہوئی ہو مومل! تمہیں ضرورت کیا تھی بھیلوں سے بات کرنے کی۔" گوہر غصے سے پیچ و تاب کھا رہا تھا۔

"سیانے سچ کہتے ہیں، عورت کو کبھی بھی علم و عشق سے غرض نہیں ہونی چاہیے۔"

"تم بھول رہے ہو کہ مجھے عشق کی پر پیچ راہوں پر تم نے چلایا ہے، اور میرے علم کی وجہ سے ہی مجھے اپنایا۔" ہزاروں دکھوں سے راستہ بناتے وہ بمشکل بول سکی۔

"ہاں، وہ میری غلطی تھی۔ بھیانک غلطی جس پر میں پچھتا رہا ہوں۔"

حبس و گھٹن نے اس کے سانس لینے کے عمل میں دشواری پیدا کی۔

"آج سے تم کہیں نہیں جاؤ گی اور یہ اسکول، ڈھونگ بند کر دو تو بہتر ہے۔" اس کے تحکمانہ حتمی لہجے پر وہ حیران ہوئی۔

"گوہر! تم میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتے۔" وہ بے یقینی سے گویا ہوئی۔ "میں اپنے خاندانی وقار کے آگے مجبور ہوں۔"

"خاندانی وقار کا تب کیوں نہیں سوچا، جب ایک یونیورسٹی کی پڑھی لکھی ڈیشنگ سوشل ورکر کو شریک سفر بنایا۔"

"بھاڑ میں جائے تمہارا سوشل ورک، ڈیبیٹنگ سوسائٹی اور حلقہ دانش، تمہاری اب جو بھی پہچان ہے سردار گوہر علی خان کی بیوی کی حیثیت سے ہے۔"

"اس حیثیت کے بوجھ نے ہی تو شل کر رکھا ہے ورنہ میں چاہوں تو بہت کچھ کر سکتی ہوں۔" وہ تدبر سے بولی۔

"مجھے باغی اور بغاوت، دونوں سے نفرت ہے۔ میں کسی صورت باغی بیوی قبول نہیں کر سکتا۔"

"بغاوت کو روکنا چاہیے مگر ارتقا کو نہیں۔ آپ لوگ بغاوت تک معاملات کو جانے ہی کیوں دیتے ہیں؟" اس نے ناصحانہ انداز اختیار کیا۔

"تم یہ ہی چاہتی ہو نا کہ مومل! ہمارے کمی کمین ہم سے باغی ہو جائیں۔ ان کے جھکے ہوئے سر ہمارے آگے اٹھ جائیں۔ تم ہماری سلطنت کے لیے خطرات پیدا کر رہی ہو۔ ہماری بادشاہی چھیننا چاہتی ہو۔ یہ جو لوگ تمہارے آگے پھرتے ہیں نا یہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جائیں گے، تو ہمیں گھاس بھی نہیں ڈالیں گے۔ تھوکیں گے تمہارے منہ پر۔ یہ جو اتنا تن کر چلتی ہو، یہ صرف ہماری طاقت و سلطنت کے مرہون منت ہے۔"

گوہر کے سخت لہجے اور آواز کی سختی نے اس کے دل کی دنیا کو تہ و بالا کر دیا۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

"مجھے ایسا لگتا ہے گوہر! جیسے تم مجھے گنوا رہے ہو۔" اس کے اندر مری محبت کراہی۔

"میں تمہیں گنوا رہا ہوں؟ تم مجھے نہیں گنوا رہیں؟" بھنویں سکیڑتے طنزیہ سوال کیا۔

"نہیں۔ تم تو میرے تھے ہی نہیں، تم تو اپنے خول میں بند ایک وڈیرے ہی تھے بس۔"

"اور میں وڈیرا ہی رہوں گا، یہ بات کبھی نہ بھولنا۔" وہ برہمی سے کہتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گیا۔

زندگی کتنی مشکل ناہموار اور رنجیدہ ہو گئی ہے۔

مایوسی موت کی صورت اس کے سامنے تھی۔

اسے لگ رہا تھا اس کے پاس شاید انمول خوابوں، اعلا خیالوں اور اونچے آدرشوں کے علاوہ کچھ بھی نہیں رہنا تھا۔

اس رات بہت حبس تھا۔ معاشرے کے حبس کی طرح، اور گھٹن ظلم کے اندھیرے کی طرح، پھر لائٹ چلی گئی تھی۔ وہ پسینے میں نہا گئی۔

کروٹ بدل کر دیکھا خالی بستر اس کو منہ چڑا رہا تھا۔ وہ یقیناً غصے میں گھر نہیں آیا، یا تو فارم ہاؤس چلا گیا یا باہر اوطاق میں سو گیا ہو گا۔ اس نے سائیڈ ٹیبل سے سیل فون اٹھا کر آن کیا۔ اس کی روشنی میں اٹھ کر کھڑکی کھولی۔ تاروں کے جھرمٹ میں چاند دولہا بنا مسکرا رہا تھا۔

مدھم چاندنی چوری چھپے اندر آ گئی، اس کے شل اعصاب کو کچھ سکون ہوا کہ اچانک نسوانی چیخ نے فضا میں ارتعاش پیدا کیا۔

اسے صرف ایک لمحہ لگا پہچاننے میں، دوسرے لمحے اس نے روزینہ کے کمرے کی طرف دوڑ لگا دی۔

"کیا ہوا روزینہ! دروازہ کھولو۔" وہ مسلسل دروازہ پیٹ رہی تھی۔ مگر اندر سے کوئی جواب موصول نہ ہوا۔ وہ فوراً گھوم کر پچھلی طرف آئی۔ کھڑکی سے کودنے والے بڑے سردار کو اس نے چاندنی میں اچھی طرح پہچان لیا تھا۔ وہ سرعت سے بیرونی گیٹ کھول کر باہر چلے گئے۔ اس کی سانس سینے میں اٹک گئی۔ دم رکنے سا لگا تھا۔

مردہ قدموں سے چلتے ہوئے کھلی کھڑکی کی طرف سے اندر آئی۔ اسے دیکھ کر ڈری سہمی روزینہ کی جان میں جان آئی۔ وہ ہچکیوں سے روتے ہوئے اس کے

گلے آ گئی۔ ان دونوں کے دل کی دھڑکن خوف سے احتجاج کر رہی تھی۔

"سب.... خیریت.... ہوئی نا؟" ٹوٹے لفظوں سے استفسار کیا۔

"اللہ کا لاکھ لاکھ شکر کہ آپ بروقت پہنچ گئیں، ورنہ میں اپنی سب سے قیمتی متاع گنوا بیٹھتی۔" وہ سسکتے ہوئے بولی۔ اس کی سینے میں اٹکی سانس بحال ہوئی۔

"موول! میں اب یہاں نہیں رہوں گی۔ پلیز! مجھے صبح ہی واپس بھیج دیں۔" اس نے پلّو سے اس کے آنسو پونچھے۔

"میں سمجھتی ہوں اس سازش کو۔ تمہارا یہاں رہنا اب واقعی محال ہے۔ میں تمہیں صبح حیدر آباد بھیج دوں گی۔ ابھی چلو میرے کمرے میں۔"

وہ باہر نکلیں تو شور پر آنے والی ملازمائیں ان کو دیکھ کر سر جھکا کر اپنے اپنے ٹھکانوں کی طرف چلی گئیں۔

وہ ایسے واقعات و حادثات سے انجان نہیں تھیں۔

طویل برآمدے کے آخری کونے میں بنے اپنے کمرے کے آگے کھڑی اس کی ساس نے ان کو دیکھ کر منہ بنایا۔

"کہا بھی تھا پرائی چھوریوں کو مت لا کر بٹھا، مگر مجال ہے جو کسی کی بات مان لے، آج پتا چل گیا نا۔" وہ بڑبڑاتی اندر چلی گئیں۔

اسے سخت ہتک محسوس ہوئی، مگر یہ وقت جواب دینے کا نہیں تھا۔ وہ روزینہ کو لے کر اندر اپنے کمرے میں چلی آئی۔ اس نے کمرے کے دروازے اور کھڑکی کی کنڈی مضبوطی سے بند کر دی۔ روزینہ کے لہجے سے ابھی بھی خوف ٹپک رہا تھا۔ وہ اس کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

☼ ☼ ☼

"کب تک یہ بلا گلے لگائے رکھو گے گوہر خان! ایسا نہ ہو کہ یہ ہماری سانس ہی لے جائے۔" وہ سگار کا کش لگا کر بیٹے سے مخاطب ہوئے۔ "گھر کا بھیدی ہی لنکا ڈھاتا ہے۔ گھر کو گھر کے چراغ سے ہی آگ لگتی ہے۔"

"جی بابا سائیں! کچھ کرنا ہی پڑے گا۔" گوہر پرسوچ انداز میں بولا۔

"اپنی پتوار مضبوطی سے پکڑے رہو اور چراغ کو باد مخالف سے بچاؤ۔ سوار کے پاس سواری نہ رہے تو پیادہ اور سوار کا امتیاز ختم ہو جاتا ہے۔ پھر سب برابر ہو جاتے ہیں۔ سب پیادہ.... ساری اونچ نیچ ختم۔" وہ لان میں ٹہلتے اضطراب و غصے سے بول رہے تھے۔

"بابا سائیں! مجھے اندازہ ہے۔"

"ہمیشہ ہوا میں گھوڑے چلاتے ہو اور اندھیرے میں تیر پھینکتے ہو۔ ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھانا ہی دانش مندی ہے بیٹا!"

"جی مانتا ہوں۔" وہ کچھ پریشان ہو کر بولا۔

"ایسا نہ ہو کہ ہمارے ہی گھر سے اٹھنے والی طاقت ور آواز ہماری ہی آوازوں کو پست اور اونچے قد کو نیچا کر دے۔" انہوں نے تیر نشانے پر بیٹھتے دیکھ کر بیٹے کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

"یاد رکھو میں نے روایات پر کبھی سمجھوتا نہیں کیا۔ سردار اپنے اصولوں سے ہٹ جائیں تو ان کی سرداری ان کے پاس نہیں رہتی۔"

"میں حکمت عملی بنا رہا ہوں بابا سائیں! جلد ہی اس سانپ کو کچلنا پڑے گا۔" اس نے ہاتھ پشت پر باندھ کر کہا۔

"صرف کچلنا نہیں بیٹا! اس کی آنکھوں سے اپنا عکس بھی نوچ لو۔ یاد رکھو اگر عکس آنکھوں میں ٹھہر جائے تو وہ سب سے بڑے انتقام کی نشاندہی اور ثبوت بن جاتا ہے۔"

گوہر نے لب بھینچ کر اثبات میں سر ہلایا۔

"آپ فکر نہ کریں۔"

"شاباش بیٹا۔" انہوں نے خوش ہو کر اس کے کندھے تھپتھپائے۔

"ہمارے خاص مہمانوں کے میزبان کے انتظامات مکمل ہو گئے۔"

"جی بابا جان! ان کے شکار کے لیے تیتر بھی تاڑ لیے ہیں اور تیتریاں بھی۔"

وہ دونوں دل کھول کر ہنسے۔

☼ ☼ ☼

روزینہ کے چلے جانے سے بہت فرق پڑا تھا۔ اسکول میں بچوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کو سنبھالنا ان دونوں کے لیے دشوار ہو رہا تھا۔ اس دن وہ اسکول پہنچی تو پتا چلا آج کاکا نورل کی دونوں بیٹیاں اسکول نہیں آئیں۔

"گھر میں کوئی کام کاج ہو گیا ہو گا، تب ہی نہیں آئی ہوں گی۔" اس نے پریشان بیٹھی عائشہ کو دلاسا دیا۔

"اللہ کرے ایسا ہی ہو۔" اس نے دل سے دعا کی، مگر ایسا نہیں تھا۔ گیارہ بجے کے قریب کاکا نورل روتا سر پیٹتا بیٹیوں کا پتا کرنے آیا۔

"وہ دونوں اسکول نہیں پہنچیں۔" عائشہ نے کاکا نورل کے تن سے رہی سہی جان بھی نکال دی۔ وہ سر پکڑ کر زمین پر بیٹھ گیا۔

وہ اسکول بند کروا کے کاکا نورل کے گھر پہنچی تو اس کی بیوی کی دہائیوں نے دل پکڑ لیا۔

"حوصلہ کرو ماسی! حوصلہ کرو۔" عائشہ نے اسے پانی پلاتے کہا۔

"ارے کیسے حوصلہ کروں۔ غریب کے پاس سوائے عزّت کے اور ہوتا ہی کیا ہے۔ میری کیاری کے پھولوں نے تو ابھی خوشبو پکڑی تھی۔ ابھی تو...."

وہ سینہ پیٹتے ہوئے رو رہی تھی۔

چارپائی پر بیٹھی ہوئی موول نے دونوں ہاتھوں پر سر گرا لیا۔

"تمہارے ساتھ کیا ہوا تھا؟"

"بس بی بی جی! تہمینہ کے ابا کو بخار تھا، کہنے لگا لڑکیوں کو اسکول چھوڑنے جاؤ۔ ہم جیسے ہی گنے کے کھیت کے قریب پہنچے۔ ایک آدمی نے کھیت سے نکل کر کلہاڑی کا دستہ میرے سر پر دے مارا۔ میں لڑکھڑا کر گری، تب ہی جیپ سے نقاب پوش دو آدمی اترے۔ دونوں لڑکیوں کے منہ پر ہاتھ رکھ کر گھسیٹ کر جیپ میں ڈالا، پھر مجھے نہیں پتا میں بے ہوش ہو گئی۔ مجھے ہوش گھر میں آیا ہے، نہ آیا ہوتا مر گئی ہوتی تو اس درد سے ہمیشہ کے لیے جان چھوٹ جاتی، مر کیوں نہ گئی۔"

اس کے پاس الفاظ نہ تھے کہ وہ اسے دلاسا دیتی۔

گاؤں کی کئی عورتیں وہاں جمع ہو رہی تھیں۔ کھسر پھسر، دبے لفظوں میں سردار کے کم دار کا نام لیا جا رہا تھا۔

اس سے پہلے بھی ایسے حادثات ہو چکے تھے۔ جب بھی فارم ہاؤس پر غیر ملکی مہمان آتے ان دنوں اکثر گاؤں کی خوب صورت کم عمر لڑکیاں اغوا ہو جاتیں۔ جو آٹھ دس دن بعد بے ہوشی کی حالت میں گاؤں کے آس پاس کسی کھیت میں پڑی ملتیں۔ اور ایک ماہ بعد پرادو بطور گفٹ سردار کو مل جاتی، جو گاؤں کے روڈ پر

فراٹے بھرتی گاڑیوں کی ایک لمبی لائن تھی' جو خان ہاؤس پر لگی ہوتی۔ جب بھی فارم ہاؤس پر تیاریاں زور وشور سے شروع ہوتیں گاؤں کے لوگوں کی جان خوف سے نکل جاتی کہ پتا نہیں اس بار کس کی باری آجائے گی۔ آنکھوں سے نیند اڑ جاتی مگر لڑکیاں گھروں سے بھی اغوا ہو جاتیں اور بدنامی ہمیشہ کے لیے ان کی چوکھٹ پر بیٹھ جاتی۔ سب کو پتا تھا مگر سب بے بس و لاچار تھے۔

"آپ کو پتا ہے میں اپنی بچیوں کو اسکول بھیجنے کی مخالفت میں تھی مگر لڑکیوں کے شوق نے مجبور اور آپ کے دلاسے آسرے نے دل بڑا کر دیا۔ تہمینہ کا ابا کہتا تھا' سردار کی بیگم نے اسکول کھولا ہے تو اب ہمیں کیا ڈر۔" وہ اس کا بازو پکڑ کر بولی۔ "خدا کے لیے میری بیٹیوں کو بچالیں۔"

"تم فکر نہ کرو میں اپنی پوری کوشش کروں گی۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

☼ ☼ ☼

وہ عائشہ کو لے کر کئی سال پہلے اغوا ہونے والی لڑکی کے گھر پہنچی۔ وہ جوان تھی مگر ادھیڑ عمر لگ رہی تھی۔ اس کے جاذب نظر نقوش اس کے گئے حسن کے گواہ تھے۔ عائشہ اس لڑکی کو خود پر بیتی روداد بتانے پر اکساتی رہی۔

وہ لڑکی بار بار انکار میں سر ہلاتی رہی۔

"اغوا کے بعد تم سے کیا سلوک کیا گیا؟" سوال کا کوئی جواب نہیں آیا۔ "کیا وہاں کسی گھر میں تمہیں رکھا گیا تھا؟"

لڑکی کی آنکھوں میں خوف زدہ دنوں کا عکس آنسوؤں کی صورت لہرایا۔

"نجی جیل کی سلاخوں کے پیچھے اور کون کون قید ہے؟"

خوف آسیب کی طرح گھر کے کونوں کھدروں میں پھیل گیا۔

"ہمیں معاف کر دیں خدا کے لیے۔" لڑکی کی ساس نے اپنا دوپٹہ اتار کر مومل کے پاؤں میں رکھ دیا' وہ فوراً" بدک کر پیچھے ہٹی۔

"یہ۔ یہ کیا کر رہی ہیں آپ بزرگ ہیں۔ کیوں گناہ گار بنا رہی ہیں مجھے۔" مومل ششدر ہو کر بولی۔

"اگر بڑے سردار جی کو پتا چل گیا تو وہ ہمیں جان سے ماردیں گے بی بی! جو ہوا سو ہوا' یہ گئے دنوں کا قصہ ہے۔ ہماری زبانوں کے قفل نہیں کھلیں گے۔ اگر کھل گئے تو موت کے قفل بھی ساتھ کھلیں گے۔ ہم غریبوں کے پاس ایک حیا ہی تو ہے۔ کیوں اس کے پیچھے پڑ گئی ہیں آپ۔" مومل کے پکڑائے دوپٹے سے آنسو پونچھتے ملتجی ہوئی۔

وہ لڑکی روٹیاں پکاتی رہی' اس کی ہر روٹی جل رہی تھی۔ وہ ذہنی طور پر وہاں حاضر نہیں تھی۔

وہ عائشہ کو لے کر تیسری لڑکی کے پاس آئی' جس کے منگیتر کے احتجاج پر چند دنوں بعد اس کی لاش نہر سے برآمد ہو گئی۔ اس لڑکی کا نام بانو تھا وہ اپنے منگیتر کے نام بیٹھی رہ گئی۔

بانو تو صبح سے بے کل تھی بھٹکی ہوئی روح کی طرح کہیں بھی اسے سکون نہیں مل رہا تھا۔ کاکا نور لی کی دو حسین کلیاں مسلنے کے لیے اغوا کی گئیں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پورے گاؤں میں پھیل گئی۔ پورا گاؤں سراپا احتجاج ہونے کے باوجود سر جھکانے پر مجبور تھا کیونکہ سب کو اپنے گھروں کی عزتوں اور جانوں کی پڑی تھی۔

"بانو! یہ بڑے سردار کی بہو ہیں' تم پر گزری قیامت کا احوال دریافت کرنے آئی ہیں۔" عائشہ کے تعارف پر بانو کی آنکھوں میں بیک وقت کئی احساس لہرائے' غصہ' بے چارگی' نفرت' حیرانی۔

"میں فارم ہاؤس جانا چاہتی ہوں' تم سے پوری تفصیل لے کر۔ شاید میں ان دو لڑکیوں کو بچالوں۔" مومل نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا' وہ چند لمحے بے یقینی سے اسے دیکھتی رہی۔

"آم' چیکو' کھجور اور ناریل کے درختوں کے بیچ سے ایک راستہ فارم ہاؤس تک جاتا ہے۔ ظلمت کی طرح

سیاہ گیٹ سے گاڑی داخل ہوتی ہے تو بائیں طرف مصنوعی نہر ہے۔ نہر کے بالکل کنارے پر خوب صورت ہٹیں ہیں اور مسلح پہریدار' غیر ملکی شہزادے اس ہٹ میں رہتے ہیں۔ پہلے پل سے گزر کر نہر کے بیچوں بیچ خوب صورت کمروں میں اغوا شدہ نوخیز لڑکیاں پہنچائی جاتی ہیں۔"

وہ خاموش ہو گئی مگر اس کی آنکھوں سے نفرت کے کوندے لپک رہے تھے۔ "لڑکیوں کو کس طرف رکھا جاتا ہے؟"

"اندر داخل ہوتے ہی جو سامنے ہٹ ہے' اس میں سردار کا بیڈ روم بھی ہے اور لڑکیوں کے کمرے اور تہہ خانے میں نجی جیل بھی' جہاں سردار کی نہ ماننے والے لوگ قید ہیں۔ وہاں ایک موٹی سی عورت ہے۔ جس کے ذمہ لڑکیوں کو سجانا سنوارنا اور راضی کرنا ہوتا ہے۔ جو لڑکی زیادہ مزاحمت کرتی ہے' اسے پہلے نجی جیل دکھایا جاتا ہے۔ سر پھری لڑکیوں کو ذہنی و جسمانی تشدد کر کے راستے پر لاتے ہیں۔ لڑکیاں بہت مجبور کر دی جاتی ہیں۔

انہیں سمجھایا جاتا ہے کہ مزاحمت یا ان لوگوں سے بدتمیزی کا بھیانک انجام ہو سکتا ہے۔ بس چند دن تکلیف کے گزار کر پھر اپنے گھروں کو لوٹنے کے آسرے پر وہ اپنی زبانیں بند رکھتی ہیں پھر۔

وہ سراپا انتقام بانو سے ساری معلومات سے لے کر کسی حد تک مطمئن تھی کہ ٹھیک جگہ پہنچ گئی۔ عائشہ کو اس نے وہیں چھوڑا فون پر ساری بات اپنی ماں کو بتائی اور گاڑی میں آبیٹھی۔

☼ ☼ ☼

"بی بی جی! میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں' وہ اگر سردار کے عتاب سے بچ بھی گئے تو میرے بعد بھوک سے مر جائیں گے۔" اس کا ڈرائیور فارم ہاؤس جانے سے انکاری تھا۔

نو کلو میٹر پر پھیلے ہوئے فارم ہاؤس اور باغات و کھیتوں کے درمیان اس فارم ہاؤس پر وہ کبھی نہیں گئی تھی۔ جس میں خاص مہمان ہر سال شرکت کے لیے آتے تھے۔ وہ چند لمحے سوچتی رہی۔

"تم ایسا کرو' منہ چھپا کر پچھلی سیٹ پر بیٹھ جاؤ' میں خود ڈرائیونگ کروں گی' مگر تم راستہ بتاتے رہنا۔ فارم ہاؤس کے قریب پہنچنے سے پہلے میں تمہیں اتار دوں گی۔ تم کھیتوں میں چھپ کر چلے جانا۔"

"ٹھیک ہے بی بی! جیسا آپ کہیں' مگر میرے آپ کے ساتھ جانے کا کسی کو پتا نہ چلے۔" وہ سخت مجبوری کے عالم میں بولا۔

"اس کی تم فکر نہ کرو۔" اس نے فارم ہاؤس کے رستے پر گاڑی ڈال دی۔

سارا راستہ خاموشی سے ڈرائیونگ کرتی رہی۔

اسے فارم ہاؤس پہنچنے میں کوئی دشواری اس لیے بھی نہ ہوئی اس راستے پر صرف سردار کے فارم ہاؤس اور کھیت تھے۔ اس نے پروگرام کے تحت ڈرائیور کو کھیتوں میں اتار دیا اور گاڑی سیاہ گیٹ کے پاس لا کر روک دی۔ دو گارڈ اس کی طرف آئے۔

"گیٹ کھولو۔" اس نے رعب سے کہا۔

"سردار سائیں کی بغیر اجازت کسی کے لیے بھی گیٹ نہیں کھلتا۔" گارڈ کے تیڑھے جواب پر وہ گاڑی سے باہر نکل آئی۔

"تمہیں نہیں پتا کہ میں کون ہوں۔ سردار گوہر علی خان کی بیگم!" اس نے غصے سے اپنے راستے میں آنے والے گارڈ کو مخاطب کیا۔

"ہٹو میرے راستے سے۔" وہ کنڈی کھول کر پیدل ہی اندر داخل ہوئی۔

گارڈ فوراً" اس کی آمد کی اطلاع فون پر دینے لگا۔ وہ روش پر سیدھا چلتے ہوئے ارد گرد نگاہ ڈالتی جا رہی تھی۔

گوہر کا گارڈ پیچھے اس کی منتیں کرتا ہوا آ رہا تھا۔

"بی بی جی! آپ کیا کر رہی ہیں' واپس چلیں۔" مگر وہ سنی ان سنی کر کے تقریباً" دوڑنے والے انداز میں ہٹ میں داخل ہوئی۔

اسی وقت ایک موٹی عورت بیرونی کمرے سے برآمد ہوئی۔

"تمینہ اور ثمینہ کہاں ہیں؟"
"تم کون ہو پوچھنے والی۔" اس نے نخوت سے پوچھا۔
"مومل گوہر۔" وہ طیش سے بولی "فوراً" دونوں لڑکیاں میرے حوالے کرو۔"
"جی... جی!" وہ سہاگ کمرے کی طرف بڑھی۔
"کیوں آئی ہو تم یہاں؟" گوہر طوفانی انداز میں اندر داخل ہوا اور غصے سے چیختے ہوئے پوچھنے لگا۔
"اس لیے کہ میرے اسکول کی لڑکیاں ہیں یہاں پر۔" اس نے پلٹ کر ترکی بہ ترکی جواب دیا۔
"تمہیں شرم نہیں آئی یہاں آکر میری عزّت خاک میں ملاتے۔"
"میرا یہاں آنا' لوگوں کا صرف نظر اٹھا کے مجھے دیکھنا بھی تمہیں گوارا نہیں اور تم جو اپنے گاؤں کی بچیوں کی عزّت ملیامیٹ کر رہے ہو۔ تمہیں شرم آتی ہے؟"
"بند کرو اپنی بکواس اور نکل جاؤ یہاں سے۔"
"نہیں جاؤں گی جب تک تمینہ اور ثمینہ میرے حوالے نہیں کرو گے۔"
"کیسے نہیں جاؤ گی تمہارا تو باپ بھی جائے گا۔" اس کا بھاری ہاتھ اس کے نازک رخسار پر نشان چھوڑ گیا۔
اتنی تذلیل اتنی ہتک..... وہ نوکروں کے سامنے مار کھا رہی تھی۔
"درندے' ظالم! لڑکیاں واپس کرو۔" وہ چیخی' گوہر نے بازو سے پکڑ کر اسے گھسیٹا اور ہٹ کے دروازے کے قریب کھڑی پراڈو میں ڈالا۔ اور خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کر دی۔
آج احساس ہوا کہ عورت کتنی ہی طاقت ور ہو جائے مگر مرد کے آگے مجبور ہی رہتی ہے۔
چاہے کھیت میں کام کرنے والی بے اختیار عورت ہو۔ یا وزیر اعظم کی کرسی پر بیٹھنے والی بااختیار عورت مردوں کا معاشرہ کہیں نہ کہیں' اسے بے بس ضرور بناتا ہے۔

وہ اسے گھسیٹتا' مارتا ہوا حویلی چھوڑ گیا قدم باہر نہ نکالنے کے احکامات جاری کر کے۔

☼ ☼ ☼

کڑی دھوپ کا احساس قوی ہوا۔ ٹھنڈی چھاؤں اب میسّر نہ ہو گی۔ اسے لگتا بھیلوں کی پایہ زنجیر غلامی اس کا مقدر ہو گئی ہے۔ وہ اب سانسوں کا بیگار بھر رہی تھی۔
اس نے بیڈ کے نیچے سے اپنا خفیہ لیپ ٹاپ نکالا۔ خود پر بیتی روداد ماں کو ای میل کر رہی تھی' اس نے ہر بات لکھی۔
اس کا دروازہ بجنے لگا۔
اس نے فوراً" لیپ ٹاپ بند کر کے بیڈ کے نیچے چھپایا۔ دروازے پر اس کی ساس کھڑی تھیں۔
"اماں آپ...؟" وہ حیران ہوئی۔ "اندر آجائیں۔" اس نے راستہ دیا۔
بہو سے کبھی ان کی نہیں بنی' نہ ہی مومل ان سے زیادہ بات چیت کرتی' مگر کل کے واقعے کے بعد مومل سے ان کو ہمدردی محسوس ہوئی۔ وہ شہری آزاد عورت انہیں اپنی طرح ہی مجبور لگی' اس کے چہرے کا داغ انہیں دکھی کر رہا تھا۔
پہلی بار اسے گلے لگا کر پیشانی چومی' اور مڑا تڑا کاغذ نکال کر اس کو تھمایا۔
"یہ شہریار کا نمبر ہے۔ تم میری اس سے بات کراؤ گی۔"
"شہریار کون؟" وہ حیرت سے گویا ہوئی۔
"میرا بیٹا جسے سردار نے پسند کی شادی کرنے پر عاق کر دیا تھا' وہ بھی بالکل تمہاری طرح کی باتیں کرتا تھا۔ بڑے سردار نے بالآخر اسے گھر سے نکال دیا۔ کراچی میں رہتا ہے۔ بینک میں ملازمت کرتا ہے۔ گوہر سے تمہاری شادی پر سردار نے اس خوف کی وجہ سے اعتراض نہ کیا کہ کہیں وہ بھی شہریار کی طرح ضد میں نہ آجائے۔ اور دوسرا بیٹا بھی گنوا دے۔"
وہ آہستہ آہستہ سے حقیقت سے پردہ اٹھا رہی

تھیں۔
"گوہر نے تو کبھی مجھے نہیں بتایا۔"
"کیسے بتاتا' سردار نے جو منع کیا تھا۔"
اسے اپنی ساس پر بے تحاشا رحم آیا' اس کی ممتا کی تڑپ' آنکھوں کا خالی پن اور عمر قید جس نے اسے چڑچڑا بنا دیا تھا۔
"مجھے آج لگا ہے۔ تم بھی میری طرح ہی ہو' تب ہی تم پر اعتبار کر کے نمبر دیا ہے۔ تمہارے پاس فون ہے ناں' تم میری اس سے بات کروا دو۔ وہ مجھے فون کرتا تھا مگر سردار نے فون کٹوا دیا۔ اس نے موبائل بھیجا' وہ بھی سردار کے ہاتھ لگ گیا۔ پورے دو سالوں سے میں نے اس کی آواز نہیں سنی۔ تم... تم مجھے سنواؤ گی ناں اس کی آواز۔"
وہ بے ساختہ رو پڑیں۔
"ہاں کیوں نہیں اماں! آپ مجھے پہلے ہی کہتیں' کیوں تڑپتی رہیں ہمیں کسی کو بھی نہیں بتاتی۔ میں بھی تو آپ کی طرح عورت ہوں۔ آپ کا دکھ سمجھ سکتی ہوں۔" اس نے سیل فون اٹھا کر نمبر ملایا اور ان کو دیا۔
"ہیلو.... ہیلو میرا شہریار' میرا بیٹا!" وہ روتے ہوئے بے ربط جملے بولتی رہیں۔
"اماں کیسی ہو۔ کس کے فون سے بات کر رہی ہو۔" وہ بے تابی سے خوش ہوتے ہوئے پوچھنے لگا۔
"بیٹا! تیری بھابھی کے فون سے۔ تو بتا کیسا ہے۔ تیری بیوی ٹھیک ہے؟"
"اماں! شکر ہے اللہ کا' دعا ہے آپ کی۔"
"بس بیٹا! تیری بہت فکر رہتی ہے۔ سوچتی ہوں پتا نہیں کہاں کہاں روزی روٹی کے لیے دھکے کھا رہا ہے۔ پتا نہیں گزارا کس طرح ہوتا ہو گا۔ ظالم نے اپنی جائیداد سے بھی تجھے عاق کر دیا اور میری جائیداد سے بھی حصہ نہیں دیا۔"
وہ روہانسی ہو کر رو پڑیں۔
"اماں! فکر نہ کرو' میں بہت خوش ہوں اور گزارا بھی بہت اچھا ہو رہا ہے۔ کم از کم ضمیر پر بوجھ تو نہیں کہ مظلوموں کا خون چوس کر عیش کر رہا ہوں۔ بہت مطمئن ہوں' آپ بھی خوش رہا کریں۔" وہ مضبوط لہجے میں بولتا رہا۔
"اللہ سائیں کا شکر ہے تو خوش ہے ورنہ مجھے تو بس تیرا غم کھائے جا رہا ہے۔"
"بس اماں صرف آپ کی دعائیں چاہئیں۔"
فون بند ہو گیا اس نے مومل کو گلے لگا لیا۔
"اللہ تجھے خوش رکھے بیٹا! میرے دل میں ٹھنڈ پڑ گئی۔" وہ دل پر ہاتھ رکھ کر دعائیں دیتی کمرے سے باہر نکل گئیں۔

☼ ☼ ☼

"کیا آپ اپنی ماں سے ملاقات کے لیے نہیں آسکتے۔ وہ آپ کے لیے تڑپتی ہیں۔" اس نے شہریار کو رات ایک بجے فون کیا۔
"نہیں آسکتا بھابھی! ایک بار ایسی جرات کی تھی۔ میں تو وہاں سے نکل آیا مگر بابا اسلام آباد سے واپس آئے تو ان کے جاسوسوں نے بتا دیا اور پھر میری ماں نے اس عمر میں مار کھائی۔ میں اپنی ماں کو اس عمر میں بے عزّت ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔" وہ بستر سے اٹھ کر گیلری میں آکھڑا ہوا مبادا اس کی بیوی کی آنکھ نہ کھل جائے۔
"کیا آپ کا جرم پوچھ سکتی ہوں؟"
"ہاں' پسند کی شادی۔"
"تو پھر گوہر کو اجازت کیسے ملی؟"
"اس لیے کہ بابا کو ایک وارث تو لازمی چاہیے تھا' سو اس کی مرضی بھی رکھنی تھی' دوسرا وہ بابا پر گیا تھا' بظاہر انقلابی مگر اندر سے بابا جیسا سخت سردار۔ یہ حقیقت بابا جان گئے تھے۔"
"مجھے یقین نہیں آتا شہریار! کہ تم گوہر سے کیسے مختلف ہو پسند کی شادی تو ہم نے بھی کی' مگر انجام تمہارے سامنے ہے۔" اس کے لہجے میں دکھ کرلانے لگے۔
"بھابھی! ہماری منگنی کے بعد بابا کے بھیجے غنڈوں نے سائرہ کو قتل کرنے کی کوشش کی' مگر اتفاق سے

گولیاں اس کی ماں کو لگیں اور ان کی ڈیتھ ہو گئی۔ اس خوف اور دہشت نے اس کو ذہنی مریضہ بنا دیا۔ اب بھی کبھی کبھار اس کو دورے پڑتے ہیں۔ زندگی کا یہ ادھورا پن اسے میری محبت کی سزا کے طور پر ملا ہے۔ یہ سزا مجھے اس کے ساتھ بھگتنا ہے ساری عمر کیونکہ میں اس سے بے تحاشا محبت کرتا ہوں۔" وہ محبت سے چور لہجے میں بولا۔

"میری دلی دعا ہے کہ خدا تمہاری محبت قائم رکھے۔" اس نے کروٹ بدل کر ٹھنڈی سانس لی۔

"آپ کو میری ماں کی ای میلز مل چکی ہیں۔" اس نے بمشکل لہجے کو دکھ کے بوجھ سے آزاد کر کے نارمل بنانے کی سعی کی۔

"ہاں بھابھی! مجھے بے تحاشہ دکھ ہوا' آپ کی محبت کی ناکامی پر مگر ساتھ ساتھ خوشی بھی ہوئی مقصد کے حصول اور ہمت پر۔ میں واقعی آپ کو سلام پیش کرتا ہوں۔"

"مجھے تمہارے سلام کی نہیں مدد کی ضرورت ہے۔ چند دن سے اسکول بند ہے۔ میرا باہر نکلنا منع ہے۔ عائشہ کا اندر آنا منع ہے۔ فون پر رابطہ ہے۔ ابھی تہمینہ اور ثمینہ گھر نہیں لوٹیں۔ دل ہر وقت پریشان رہتا ہے۔ عائشہ کا سسر بہو بیٹے سے کہتا ہے "تم نکل جاؤ یہاں پیچھے جو ہو گا ہم بھگت لیں گے۔" ظلم کے عادی ہیں۔ ہماری پروا نہ کرو' مگر وہ دونوں نہیں مانتے۔" اس نے تفصیل بتائی۔

"میرے خیال سے ان کے سسران کو صحیح مشورہ دے رہے ہیں۔"

"کیا تم میرا ساتھ دے سکتے ہو شہریار؟"

"بھابھی! بہت مشکل ہے۔ میں مائرہ کو چھوڑ کر وہاں نہیں آسکتا۔"

"اچھا بھائی! کوئی بات نہیں۔" وہ دھیمے سے ہنسی "پتا نہیں موبائل کتنے وقت ساتھ دیتا ہے۔"

اس نے خدا حافظ کہہ کر فون بند کیا۔ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ ساری رات کروٹیں بدلتے بدلتے گزری۔ مستقبل کے اندیشے' واہمے' وسوسے' پھن نکال کے ڈستے رہے۔ وہ صرف خدا کی ذات پر بھروسا توکل کیے ہوئے تھی۔

✡ ✡ ✡

پتا چلا کہ گوہر مہمانوں کے ساتھ کوہستان اور تھر کے دورے پر گیا ہے۔ جہاں نایاب نسل کے پرندے اور جانور ___ شکار کیے جاتے ہیں۔ ان کچھ دنوں میں اس کی ساس اس کے انتہائی قریب آچکی تھیں۔ اس کی رازدار سہیلی بن گئی تھیں۔ عائشہ کا فون آیا تو وہ اس کے پاس بیٹھی تھیں۔

"میں ہر حال میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں مومل بی بی!"

"مگر کیسے عائشہ! باہر گوہر نے گارڈ کھڑے کر دیے ہیں۔ گیٹ پر تالا ہے' کوئی اندر نہیں آسکتا۔"

"مومل بی بی! میں آرہی ہوں آپ کی طرف۔" اس نے سر جھٹک کر ایک عزم سے کہا۔

"میں گیٹ کھلوانے کی کوشش کرتی ہوں۔" وہ بھی تیزی سے گیٹ پر آئی۔

"علی نواز! گیٹ کھولو۔" وہ پرانے چوکیدار کو آوازیں دینے لگی۔

"علی نواز! میں تمہیں حکم دیتی ہوں تالا کھولنے کا۔" اس کی ساس اس کے پاس آکر غصے سے بولی۔

بڑی سائیں! میں مجبور ہوں' بڑے اور چھوٹے سردار کا حکم ہے کہ حویلی کے اندر کوئی انسان تو کیا کوئی پرندہ بھی داخل نہیں ہونا چاہیے۔ نہ ہی کسی کو باہر نکلنے دینا ہے۔ جب تک وہ نہ آجائیں۔" وہ عاجز لہجے میں بولا۔

"میں تمہیں پھر بھی حکم دیتی ہوں کہ دروازہ کھول کر عائشہ کو اندر آنے دو۔"

"بڑی سائیں! سردار نے چار نئے گارڈ کھڑے کر دیے ہیں۔ میں جیسے ہی تالا کھولوں گا' وہ مجھے گولی ماردیں گے۔" وہ گیٹ کے دوسری طرف سے کانپتے ہوئے بولا۔

ایک گارڈ نے سردار سے فون پر رابطہ کیا' پھر ملنے والی ہدایات پر عائشہ سے موبائل چھینا اور تن کر کھڑا ہو گیا۔

"اگر پانچ منٹ کے اندر یہاں سے نہ گئی تو گولی ماردوں گا۔"

وہ لوٹ گئی۔ گھر جا کر اس نے منتھار کے فون سے فون کیا۔ "کل صبح میں ہر حال میں اسکول کھولوں گی۔ لوگوں کا خوف دور کرنے کے لیے اس سے بہتر کوئی حل نہیں۔"

"خیال سے عائشہ! اب بات پہلے والی نہیں' ہماری زندگی کی شاخیں برہنہ ہیں' ان پر اب کوئی سائبان نہیں' کوئی سبزہ نہیں۔ ہم دھوپ میں کھڑے ہیں۔"

"ہمارا مقصد نیک اور یقین کامل ہے۔ ہم باطل نہیں۔ حق کی صفوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ حق بھی جھکنے اور بکنے نہیں دیتا۔" اس کی آواز بھی بھرا گئی۔

"میں تمہیں اللہ سائیں کے حوالے کرتی ہوں' عائشہ!"

"اور میں بھی آپ کو اللہ کی امان میں دیتی ہوں مومل بی بی!"

✡ ✡ ✡

اس رات ہوائیں بہت آہستہ آہستہ چل رہی تھیں۔ ہواؤں کی لے پُر سوز تھی۔ فضا پر ان دیکھا سوگ طاری تھا۔ رات اس کی آنکھوں میں ٹھہر گئی۔ بار بار نم آنکھوں سے کروٹ بدل کر منتھار کو دیکھتی جس کے چہرے پر نیند میں بھی پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔

مومل کی نظر بندی کے بعد سے وہ بے حد متفکر رہنے لگا تھا۔ شام سے اس کی پریشانی میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا' جب عائشہ کو مومل سے ملنے نہیں دیا گیا اور عائشہ نے آج صبح ہر حال میں اسکول کھولنے کا فیصلہ سنایا تھا۔ منتھار کو بہت دیر میں نیند آئی تھی مگر اس کی آنکھوں سے تو نیند نے بہت دور جا کر بسیرا کیا۔ وہ کھلی آنکھیں اس پر گاڑے چند گھنٹوں بعد درپیش حالات کو سوچتی رہی۔

بوجھل صبح بے کل رات کے دہانے سے نمودار ہوئی۔ اس کا سسر بھینس دوہنے لگا۔ ساس نماز پڑھ کر رات کے بچے کھچے روٹی کے ٹکڑے پرندوں کے آگے ڈال کر چولہا جلانے میں مصروف تھی۔ اس نے سستی سے کروٹ لے کر دوسری چارپائی پر اپنے سوئے ہوئے بچے کو دیکھا۔

"کیا میرے بچے کا مستقبل اندھیر ہے۔" وہ بھی غلامی کی' جہالت کی زندگی گزارے گا؟ نہیں... میں نے اسے آزاد پیدا کیا ہے۔ کوئی اسے غلام نہیں بنا سکتا۔" شدید غصہ رگ و پے میں بھر گیا۔ اس نے جھک کر اسے چوما اور بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

"بچے کی نیند کیوں خراب کر رہی ہو؟" چارپائی سے نیچے پاؤں لٹکائے ___ بیٹھے منتھار نے متبسم ہو کہا۔

"سنو' اسے کبھی غلام نہیں بننے دینا۔" وہ بے تابی سے اٹھ کر اس کے پاس آکھڑی ہوئی۔

"ہم دونوں اپنی نسل کو غلامی سے بچائیں گے۔ چاہے لمبی جنگ کیوں نہ لڑنی پڑے۔" منتھار کے مضبوط لہجے نے اس کی ہمت میں اضافہ کر دیا۔

"ہاں' چاہے ہمیں کتنی ہی بڑی قربانی کیوں نہ دینی پڑے۔"

آج اس کو اپنی کیفیت سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ ناشتہ کرتے ہوئے ایک بے کلی سی گردش کر رہی تھی۔ وہ نہا کر سبز رنگ کا سوٹ پہن کر آئی۔

"سدا سہاگن ہری بھری رہو۔" اس کی ساس نے پیار سے دعا دی۔ اس نے منتھار کو دیکھتے ہوئے مسکرا کر آمین کہا۔

الماری سے اسکول کی چابیاں نکال کر پرس میں ڈالیں اور گھر گھر جا کر بچوں کو نکالا کچھ ساتھ آئے' کچھ کو ان کی خوف زدہ ماؤں نے نہیں چھوڑا۔ وہ بیس پچیس بچوں کو لے کر آئی جن میں زیادہ تر لڑکے تھے۔ ان کو غنیمت جانا اور تالا کھول کر پڑھانا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر میں سردار کا کمدار آیا۔

"سردار کی فارم والی زمین پر ٹریکٹر لے کر پہنچ جاؤ'

ہل چلاتا ہے۔ سردار اس میں گندم کے نئے بیج کا تجربہ کرنا چاہتے ہیں۔" منتھار اس کے ساتھ آیا تھا۔

"تم چلو میں چند گھنٹوں میں آجاؤں گا۔" وہ عائشہ کو اسکول میں تنہا نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔

"تم چلے جاؤ منتھار! جیسے یہ تین گھنٹے بخیرو خوبی گزر گئے۔ ویسے دو گھنٹے بھی گزر جائیں گے۔" عائشہ نے اسے دلاسا دیا۔

"ہاں... ہاں منتھار! بھاجائی کا کوئی بھی نام نہیں لے گا۔ تم بے فکر رہو۔" کمہار نے اسے یقین دلایا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے وہاں سے اٹھنا پڑا۔

"اپنا خیال رکھنا۔" اس نے سرگوشی کی۔

"بے فکر رہو۔" عائشہ نے اثبات میں سر ہلا کر جواب دیا۔ پھر دو گھنٹے بھی خیریت سے گزر گئے۔ وہ خوش تھی، بچوں کو چھٹی دے کر کلاس روم کو تالا لگایا اور بیرونی گیٹ پر آئی۔

اسی وقت دو نقاب پوش افراد اس کے سامنے آگئے اور ہتھیاروں کے منہ اس پر کھول دیے۔

فائرنگ کی آواز پر پرندے درختوں سے چیخیں مار کر اڑنے لگے۔

کھیتوں میں کام کرنے والے ہاری، راہگیر، دکان دار، نادانستہ اسکول کی طرف بھاگے، جہاں خون میں لت پت عائشہ زندگی سے منہ موڑ کر بغاوت کے لہو کا تحفہ سجائے زمین پر اوندھے منہ پڑی۔ خالق حقیقی کو سجدے میں اپنی فریاد سناتے دم توڑ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

ایک دم شور اٹھا۔ وہ گھبرا کر باہر نکلی۔

"یا الٰہی خیر! کیا ہوا اماں؟"

"پتا نہیں بیٹا میرا دل گھبرا رہا ہے۔" باہر رونے کی آوازیں آرہی ہیں۔

آہستہ آہستہ سب گیٹ کے پاس جمع ہوگئیں۔

"گلشن! تم گیٹ کے اوپر سے جھانک کر دیکھو کیا ماجرا ہے۔"

"نا چھوٹی بی بی! چھوٹے سردار کی حکم عدولی نہیں کرسکتی۔" وہ آنکھیں گھما کر پراندہ جھلاتے بولی۔

"ماسی! تم اوپر چڑھ کر دیکھو۔"

"بی بی جی! نہیں چوکیدار مجھے گولی نہ مار دے۔" وہ ڈرتے ہوئے بولی۔

"کوئی نہیں مارتا تمہیں گولی، اسٹول لاؤ میں خود دیکھتی ہوں۔" وہ غصے سے اسٹول پر چڑھ گئی۔

دنیا کا میلہ ہو۔ یا قبر کا اندھیرا تنہائی انسان کی ذات سے منسلک ہے۔ شاید اس لیے کہ خالق خود تنہا ہے۔ اور مخلوق کے اندر بھی تنہائی کا احساس رکھ دیا ہے۔

اس تنہائی سے بھاگنے کے لیے انسان جیون بھر دوڑ دھوپ کرتا ہے۔ رشتے نبھاتا ہے۔ دوست بناتا ہے فریب زندگی میں مبتلا رہتا ہے۔ مگر تنہا ہی دنیا سے اٹھا لیا جاتا ہے۔

سامنے کے منظر نے چند لمحوں کے لیے اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفلوج کردی۔

"میں نہیں چھوڑوں گا ان سرداروں کو جنہوں نے میرا گھر اجاڑا ہے۔ میرے بچے کو یتیم کیا ہے۔ میری محبت مجھ سے چھین لی۔" منتھار روتے ہوئے چیخ رہا تھا۔

"اب نہیں جھکیں گے ہم ان سرداروں کے آگے۔ بہت کرچکے غلامی ان بھیڑیوں کی، جو گوٹھ کی عزتوں کو پامال کرتے ہیں۔ بولنے والوں کی زبانیں ہمیشہ کے لیے خاموش کردیتے ہیں۔ اب ہم چپ نہیں رہیں گے۔ کتنوں کو مارے گا وڈیرا! کیا پورے گاؤں کا قتل عام کردے گا۔"

گاؤں کے لوگوں کے غم و غصہ سے قطع نظر وہ رنج و غم کے دریا میں ڈوب رہی تھی۔ آنسو اس کے گالوں پر قطار در قطار بہہ رہے تھے۔

اسی وقت منتھار نے سر اٹھا کر — روتی ہوئی مومل کو دیکھا۔

"دیکھو بی بی! دیکھو تمہارے تبدیلی کے خواب کی لاش پڑی ہے۔"

کہتے ہوئے وہ یوں چیخ کر رویا جیسے دو بچھڑے ہوئے درد مشترکہ پر روتے ہیں۔

آگے بڑھ کر اس نے عائشہ کے منہ سے کپڑا ہٹایا اور خود چارپائی پر سر رکھ کر رونے لگا۔ مومل کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔ نفرت و غصے کی شدید لہر اس کے رگ و پے میں سرایت کر گئی۔

"تم اس حد تک گر سکتے ہو گوہر! مجھے اندازہ نہیں تھا۔"

اسی وقت گارڈز نے ہوائی فائرنگ کردی۔ مجمع منتشر ہونے لگا۔ چند لوگوں نے چارپائی اٹھائی اور کمہاروں کے گھر کے راستے پر چل دیے۔ ایک آدمی منتھار کو سہارا دے کر لے جانے لگا۔

عائشہ کا لہو رنگ چہرہ اس کے تصور سے چپک گیا۔ حویلی میں اس دن نہ کسی نے کھانا کھایا نہ پکایا۔ سارا دن افسردہ، بے کلی سے گزرا۔ رات کو اس کی ساس چائے بنوا کر اس کے کمرے میں آبیٹھیں۔

"اماں مومل! چائے پی لے۔ رو رو کر سر درد ہوگیا ہوگا۔" وہ اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔

"اماں! میں نے سوچا تھا کہ گوہر ہیرا ہے مگر وہ تو پتھر نکلا۔" دکھ اس کے لہجے کے زیروبم میں اتر آیا۔

"ہاں مومل دھی! تھا تو وہ واقعی ہیرا مگر جوہری کے بجائے لوہار کے ہاتھ لگ گیا، جس نے اسے چمکانے کے بجائے سیاہ کردیا۔ اس میں اس کا قصور نہیں اس کے باپ کے رعب و داب جاگیرو جائیداد کا قصور ہے۔ وہ لالچی بن کر انسانیت سے گر گیا ہے۔ ورنہ پہلے شہریار سے اس کے خیالات بہت ملتے تھے۔" وہ گہری دکھ بھرے سانس لیتے ہوئے بولیں۔

"تب ہی تو میں بھی دھوکہ کھا گئی۔ گھن آتی ہے مجھے اس زندگی سے، جو ظالم کی ہم سفری میں گزری ہے۔ شرمندہ ہوں میں اپنے آپ سے اپنے محبت کے جذبے سے۔" چائے کا گھونٹ اس کے حلق میں پھنس گیا۔ "اماں! اب میں گوہر کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔" وہ رو پڑی۔

"نا بیٹا نا۔ ایسی بات پھر منہ سے نہ نکالنا۔ اگر اس کی بیوی رہیں تو زندہ بھی رہو گی، ورنہ پتا نہیں وہ تمہارے ساتھ کیا سلوک کرے۔" خوف ان کے چہرے سے عیاں تھا۔

"تو کیا وہ مجھے قتل کردے گا؟" اس نے بے خوف لہجے میں پوچھا۔

"سردار سانپ کی مثل ہوتے ہیں، جو اپنے ہی بچے کھا جاتے ہیں۔"

"مگر میں کسی سے نہیں ڈروں گی، سوائے اس ذات پاک کے جس کے آگے روز قیامت مجھے جواب دہ ہونا ہے۔" وہ نڈر پن سے گویا ہوئی۔

"تجھے نہیں پتا مومل! ان دیواروں میں کئی انار کلیاں چنوا دی گئیں۔ کنویں کے اندر موت کے نشان بھی گم کر بیٹھیں تو کسی کو عمر قید کی کال کوٹھڑی کی خوراک بنا دیا گیا۔ تو کیا سمجھتی ہے، اس حویلی میں صرف میں اکیلی ہی تھی؟ نہیں۔ مجھے تو تنہا کردیا گیا۔ اور سب کو لمبی نیند سلا دیا گیا۔ نہ جنازہ نہ فاتحہ نہ ہی کانوں کان کسی کو خبر ہوئی۔ نہ کسی کو پوچھنے کی ہمت ہوئی۔ تو بھی کوئی ایسی غلطی نہ کرنا مومل! کہ تیرا پتا دیواروں سے پوچھنا پڑے۔ مت کرنا احتجاج۔ کوئی بحث نہیں، خاموش رہنا۔ اور خاموشی کو ہی اپنا احتجاج بنائے رکھنا۔"

وہ ساری حقیقت بیان کرکے بعد میں امڈتی یادوں سے نڈھال ہو کر کمرے سے باہر چلی گئیں۔

☼ ☼ ☼

گوہر نے آتے ہی گھر میں بھونچال مچا دیا۔

"فسادن! سارا فساد تمہارا پھیلایا ہوا ہے۔ تم نے باغی کیا ہے لوگوں کو، ورنہ ان کمی کمین کی کیا ہمت کہ بغاوت پر اتر آئیں۔ صدیاں گزر گئیں کبھی کوئی ہمارے خلاف تھانے میں رپورٹ درج کرانے نہیں گیا۔ اس کمہار کی یہ ہمت کہ ہم پر فریادی بن جائے۔"

"وہ تو اس کا شوہر ہے گوہر! مگر عائشہ کے قتل پہ تو

میں بھی عمر بھر تمہیں معاف نہیں کروں گی۔" گوہر کے طیش اور عائشہ کی یاد نے اس کی گوہر سے نہ لڑنے کی مصلحت پر پانی پھیر دیا۔

"تم۔ تم مجھے معاف نہیں کرو گی؟" وہ تمسخر سے ہنسنے لگا۔ "حیثیت کیا ہے تمہاری۔ میں تمہاری معافی کا محتاج نہیں۔ میں سردار گوہر علی خان ہوں' تمہارا کوئی کمی نہیں۔" اس نے اسے بالوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔

"میں تمہاری عزت ہوں گوہر! سب کے سامنے یوں بے عزت نہ کرو" وہ ہتک کے احساس سے رو پڑی۔

"عزت؟ وہ عزت جو کمی کمین کے گھروں میں جاتی ہے۔ فارم ہاؤس پر سینکڑوں ملازموں کے سامنے مجھے ذلیل کرنے آتی ہے۔ چھوڑا کیا ہے تم نے مجھ میں' سارے گاؤں میں بدنام ہو گیا ہوں میں۔" چبا چبا کر بولا۔

"گوہر! تم مجھ سے محبت کے دعوے دار تھے۔" اس نے ہچکی لی۔

"ہاں تم سے۔ مگر تمہاری اوٹ پٹانگ حرکتوں اور تمہارے غلیظ نظریوں سے نہیں۔" اس کا طیش اور سوا ہوا۔

"یہ آپ کی محبت کا مان ہی تھا' جو مجھ سے سب کچھ کروا رہا تھا۔" وہ روتے روتے بولی۔

"نہیں۔ یہ میری ڈھیل تھی جس کی وجہ سے تم نے یہ ہمت کی کہ میرے ساتھ' میرے باپ کے ساتھ بغاوت کی۔ ہمارے نظام کے خلاف بغاوت کی۔ اکسایا دو دو ٹکے کے لوگوں کو ہمارے خلاف۔ اگر میں چاہتا تو اس جرم میں تمہیں قتل بھی کروا سکتا تھا مگر..." وہ سخت غصہ میں دانت پیس کر بولا۔

"مومل مہر! یہ مت سمجھنا کہ تمہاری محبت میں تمہیں چھوڑا ہے۔ جب میرے نام دولت و طاقت کے بغیر دنیا سے ٹکراؤ گی تو تمہیں اپنی اصلیت کا علم ہو جائے گا۔ میں تمہیں زندہ چھوڑ کر صرف اس لیے دنیا کی ٹھوکروں میں رکھنا چاہتا ہوں تاکہ تم اپنی انفرادی حیثیت پہچان سکو۔"

"مجھے چھوڑو گوہر!" دونوں ہاتھ پیچھے کر کے اس نے اپنے بال چھڑانے کی سعی کی۔

اس کی گرفت مزاحمت پر اور مضبوط ہوئی۔

"اس لیے میں تمہیں اپنی زندگی سے نکالتا ہوں۔ میں تمہیں طلاق دیتا ہوں مومل مہر! طلاق دیتا ہوں... طلاق دیتا ہوں..."

"نہیں گوہر نہیں..." نیند سے اٹھ کر آنے والی اس کی ساس بے ساختہ چلائیں۔ "بیٹا! خدا کے لیے اپنا گھر نہ اجاڑو۔"

"اماں! یہ گھر میں رہی تو ہمارے رسم و رواج' سرداری' بادشاہی پگ' سب کچھ چھین لے گی' سب اجڑ جائے گا۔ اسی لیے یہ آج سے میری بیوی نہیں ہے۔ باندی ہے۔" وہ اسے بازو سے گھسیٹ کر باہر لے جانے لگا۔

"نہیں نہیں۔ خدا کے لیے۔ خدا کا واسطہ گوہر! اسے کہیں مت لے جاؤ۔"

"اماں! یہ آزاد چھوڑنے کے قابل نہیں۔ یہ آزاد رہی تو ہمیں اندر کرا دے گی۔" وہ پیچ و تاب کھاتے بولا۔

"دیکھ میں تجھے اپنا دودھ نہیں بخشوں گی' اگر تو نے اسے فارم ہاؤس پر قید کیا تو۔" وہ چٹان بن کر اس کے سامنے کھڑی ہو گئیں۔ گوہر نے اس کا موبائل اٹھایا۔

لیپ ٹاپ اٹھا کر دروازے کو باہر سے لاک لگایا۔ "گلشن او گلشن...!"

وہ اس کی پکار پر دوڑتی آئی۔

"کھانا لے جانے کے علاوہ کوئی بھی اس کمرے میں نہیں جائے گا۔ نہ ہی یہ کمرے سے باہر آئے گی۔"

وہ گلشن کو چوکیداری سونپ کر خود اسی تکبر سے چلتا ہوا باہر کی طرف نکل گیا۔ گھر کی ملازماؤں کو ملال نے آگھیرا۔

ایک گلشن تھی جسے کوئی رنج و فکر نہ تھی۔ اس کا تو

جیسے راستہ صاف ہو گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"سردار گوہر! تم نے مجھے دھوکہ دیا۔ بے وقوف بنا کر ذلیل و خوار کیا ہے۔" وہ روتے روتے نڈھال ہوئی۔ پیاس سے گلا خشک ہوا تو اٹھ کر فریج سے پانی کی بوتل نکال لائی۔ حلق تر ہونے کے بعد وہ قریب پڑی کرسی پر ٹک گئی۔ اس کا گلنار چہرہ ان تین دنوں میں کملا کر زرد ہو گیا تھا۔

مومل میرے تجربے ناکامی اور تنہائی سے سبق حاصل کر لینا بیٹا۔"

ماں کے الفاظ دل کے گنبد سے ٹکراتے رہے۔ کتنے مان سے اس نے جواب دیا تھا۔ "اماں! کوئی کسی کے تجربے میں شامل نہیں ہوتا۔ مجھے یہ تجربے خود کر لینے دیں۔"

اور اب تجربہ کرنے کے بعد وہ تہی دامن تھی۔ تنہا تھی اور شاید ہر انسان اپنی ذات میں تنہا ہے۔

☼ ☼ ☼

وہ اپنے کمرے میں تھی' ملازمہ دودھ ٹیبل پر چھوڑ گئی۔ سونے سے پہلے عادتاً اس نے دودھ کا گلاس اٹھا کر لبوں سے لگا لیا تھا۔ پورا گلاس پی گئی۔ دودھ حلق سے اترنے کے ساتھ ہی اسے چکر آ گیا۔ کیا اس میں نشہ تھا اس سوچ کے ساتھ اس کو قے آ گئی۔ وہ لڑکھڑاتی واش روم کی طرف بڑھی۔

الٹی کرنے کے بعد کلی کر کے وہ بند ہوتی آنکھوں سے بمشکل گھسیٹ کر بیڈ تک پہنچی۔ وہ بے ہوش نہیں ہونا چاہتی تھی۔ مگر بیڈ پر لیٹنے سے پہلے ہی بیڈ کی سائیڈ پر نیچے گر گئی۔ اس نے آنکھیں گھما کر ارد گرد کا منظر دیکھا۔

کالے پانی کی اسیر عورتیں موجود تھیں۔ نظر سامنے اٹھی تو سلاخیں نظر آئیں۔

سردار کی محبت کا انجام آخر جیل خانہ تھا۔

اب آزادی کا کوئی آسرا نہ تھا۔ اس کال کوٹھڑی

میں آئے اسے چار دن ہوئے تھے کہ وہ موٹی عورت اس کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

"او لڑکی! تیرا بلاوا ہے۔"

وہ قیدی تھی جسے بولنے کا کوئی حق نہ تھا۔ وہ اسیر زنداں سے نکل کر اس موٹی وحشی عورت کی معیت میں اس کمرے تک آئی جہاں محبت کے راج کو تاراج کرنے والا اس کا سابقہ شوہر نشے میں مست صوفے پر لیٹا ہوا تھا۔ اسے آتے دیکھ کر طنزیہ مسکرایا۔

"کیوں تبدیلی کی علمبردار! ہو گیا شوق پورا۔" تمسخرانہ لہجے میں پوچھا۔

"اب پتا چلا ہماری طاقت کا؟" وہ کہتے اٹھا۔ "ہم چاہیں تو سر کا تاج بنا دیں۔ بگڑیں تو پیر کی جوتی۔" اس کے بالوں کو مٹھی میں جکڑتے ہوئے بڑے تفاخر سے بولا۔

اس نے دھندلی آنکھوں سے اس کے مسکراتے متکبر چہرے کو دیکھا اور پھر اپنے دل کو جو مرگ محبت پر سیاہ حزن میں ملبوس سوز خوانی میں مصروف تھا۔

وہ اک ہی دھکے پر بیڈ پر چاروں شانے چت ہوئی۔ گوہر کی آنکھوں میں ہوس دیکھ کر اس کی گنگ زبان کھلی۔

"تم اب میرے لئے نامحرم ہو۔"

"تم میری باندی ہو اور باندی کے لیے کوئی محرم نامحرم نہیں ہوتا۔ باندی صرف باندی ہوتی ہے۔" زہریلی ہنسی ہنس کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھا۔ وہ قفس میں پھڑپھڑا کر بے دم ہوئی۔ وہ کرب کے اک عجیب سفر سے گزری۔

☼ ☼ ☼

"کیا آپ اب بھی اس کی مدد نہیں کریں گے؟" مائرہ سراپا سوال بن کر شہریار کے سامنے کھڑی تھی۔

مومل کی ماں آکر اس کو سارے حالات سے آگاہ کر گئی تھی۔ تصدیق کے لیے اس نے اپنی ماں کا سیل نمبر ملایا جو کہ حسب معمول بند تھا۔ اس نے حتمی الامکان کوشش کا آسرا دے کر مومل کی ماں کو واپس بھیج دیا اور خود ہاتھ پر ہاتھ دھر کے بیٹھ گیا۔

"میں کچھ نہیں کر سکتا، اگر کچھ کر سکتا تو اپنا حق نہ لیتا؟"

مگر چند دن بعد اس کی ماں نے پوشیدہ سیل فون آن کیا۔ اور اس سے مومل کو چھڑانے کی درخواست کر دی۔

ماں کے حکم کے بوجھ نے اسے کمر کس لینے پر مجبور کر دیا۔

اسی شام اس نے اپنے کلاس فیلو ڈی ایس پی کو کھانے پر مدعو کیا۔

ساری بات چیت ڈائننگ ٹیبل پر ہوئی۔

"دو دن بعد ڈی آئی جی کے پاس میٹنگ ہے۔ میں اس علاقے میں اپنے تبادلے کی درخواست دے دیتا ہوں۔" ڈی ایس پی حسن علی نے اپنے جگری یار سے وفاداری نبھانے کو جو کہا، وہ کر بھی دکھایا۔

ایک ہفتے کے اندر اس کے پوسٹنگ آرڈر آ گئے۔

وہ باپ بیٹا اپنی آدھی وزارت بچانے یا پوری وزارت لینے کی کوشش میں اسلام آباد بھاگے۔ اور اسی رات ڈی ایس پی حسن علی نے شہریار کے ساتھ فارم ہاؤس پر دھاوا بول دیا۔

چاروں جانب پولیس موبائل دیکھ کر فارم ہاؤس کے سیکورٹی گارڈز نے ہتھیار پھینک دیے۔ وہ با آسانی نجی جیل کھول کر سارے قیدیوں کو نکال لائے۔

"مومل مہر کہاں ہے؟" اس نے موٹی عورت سے پوچھا۔

وہ قطار میں کھڑی عورتوں کو چھوڑ کر اک طرف کھڑی حیرت سے اس معجزے کو دیکھتی مومل کی طرف آیا۔

"میں شہریار ہوں۔ آپ میرے ساتھ آجائیں۔"

وہ گاڑی میں آبیٹھی۔ دوسرے قیدیوں کو پولیس موبائل میں حسن علی تھانے لے گیا۔ جن کو میڈیا کے آگے پیش کر کے حکومتی مشینری پر دباؤ ڈالنا تھا کہ اس کے خلاف کوئی ایکشن نہ لیا جا سکے۔

"بہت دکھ ہوا۔ بھابھی...." کہتے ہوئے اس نے

زبان کو روکا۔

"سوری مومل! آپ کو اس حال میں دیکھ کر۔"

اس نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے شہریار کو دیکھا۔ وہ دکھ سے مسکرائی۔

"آپ کے دل پر محبت کی تحریر بجی تھی۔ جس کے ہر لفظ میں ظاہری و باطنی حسن چھپا تھا۔ بھائی گوہر ہی کور چشم تھا جو نا کچھ پڑھ سکا نہ دیکھ سکا۔ افسوس! اس نے آپ کی قدر نہیں کی اور ظلمت کے اندھیرے میں بھٹکتا رہا۔ مجھے اپنے بھائی کی بدنصیبی پر نہایت افسوس ہے۔"

☼ ☼ ☼

وہ جو ناک پر مکھی بیٹھنے نہیں دیتا تھا۔ اس کے لیے مشہور تھا کہ پرندہ بھی اس کے ممنوعہ علاقہ میں پر نہیں مار سکتا، اس کے علاقے میں فارم ہاؤس پر پولیس نے اتنی دیدہ دلیری سے چھاپہ مارا جبکہ وہ حکومتی مشینری کا اہم پرزہ سمجھا جاتا تھا۔ اپنے ہی دور حکومت میں بدنام اور ناکام ہو رہا تھا۔ یہ بات اس کے حلق میں اٹک گئی۔ تھانے دار ہاتھ باندھے اس کے سامنے کھڑا تھا۔

"میرا کوئی قصور نہیں سرکار! اچانک ڈی ایس پی کا آرڈر آگیا اور مجھے تو یہ بھی پتا نہیں تھا یہ ریڈ آپ کے فارم ہاؤس پر کیا گیا ہے۔ مجھے تو اس وقت پتا چلا جب آپ کے صاحبزادے شہریار خان کو گوہر خان کی بیوی کو ساتھ لے جاتے دیکھا۔ ورنہ آپ کو تو پتا ہے میں آپ کا پرانا نمک خوار ہوں۔ آپ کو پہلے ہی اطلاع دے دیتا، اگر پتا ہوتا۔" تھانے دار کی گھگھی بندھی ہوئی تھی۔

"ٹھیک ہے، یہ بات مخفی رکھی گئی تم سے، مگر فارم ہاؤس پہنچ کر تو اطلاع دے سکتے تھے۔" بڑے سردار مونچھوں کو تاؤ دیتے برہم ہوئے۔

"سائیں! آپ تو بادشاہ ہیں، کیسی باتیں کرتے ہیں، ریڈ اچانک مار کیا گیا تھا اس کے سامنے بھلا کیسے میں یا میرے عملے کا کوئی آدمی آپ کو فون کرتا۔ وہ تو فوراً ہمیں لائن حاضر کر دیتا۔" ایس ایچ او عاجزی سے بولا۔

بڑے سردار نے آپے سے باہر ہو کر کرسٹل کی ایش ٹرے اٹھا کر ایل سی ڈی پر دے ماری۔

"پلیتوں نے تو شرفا کا ستیاناس مار دیا ہے۔ جس کی پگڑی چاہیں اچھال دیں۔ کوئی پوچھنے والا نہیں"، معززین کو بلا کر دو کوڑی کا کر دیتے ہیں۔"

اسی وقت سیل فون پر گوہر کا نام آنے لگا۔ انہوں نے کال ریسیو کی۔

"شہریار تک پہنچ گیا ہوں، اب اس ڈائن تک بھی پہنچ جاؤں گا۔"

"شاباش میرے دلیر بیٹے! تم سے یہ ہی امید تھی مجھے۔ ہے نالائق، نافرمان بیٹا، پھر بھی اسے پریشرائز کرنا مگر دیکھنا کوئی الٹی سیدھی گولی نہ چلا بیٹھنا۔"

"بے فکر رہیں بابا! پتا ہے مجھے، وہ بچپن سے آپ کا لاڈلا رہا ہے۔ میرا بھی بھائی ہے، لاکھ شکوے سہی پر جان کبھی بھی نہیں لوں گا اس کی۔" وہ سیدھا شہریار کے بینک آیا۔

"کہاں چھپایا ہے اس منحوس عورت کو؟" وہ اس کی میز پر جھکتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

"مجھے نہیں پتا، اپنی ماں کے پاس ہو گی۔" وہ اس کے طیش کو نظر انداز کر کے بولا۔

"نہیں ہے وہ اپنی ماں کے پاس، اس بڑھیا نے اپنا گھر تبدیل کر لیا ہے۔ تمہیں تو یقیناً پتا ہو گا اس کے ٹھکانے کا۔"

"وہ راستے میں ہی اتر گئی تھی، مجھے نہیں پتا کہاں گئی۔"

"بڑا درد اٹھا تھا اس کا، اسی کی خاطر باپ کو بھی رسوا کر دیا زمانے بھر میں۔" وہ دانت پیستے بولا۔

"میں قطعاً" لاعلم تھا کہ یہ خبر میڈیا پر آجائے گی۔ ہاں اتنا ضرور مانتا ہوں کہ مومل کو چھڑانے کے لیے میں خود آیا تھا۔"

"کیا لگتی تھی تمہاری، بیوی میری اور تعلقات......"

"زبان سنبھال کر بات کریں۔" شہریار نے غصہ سے بات کاٹی۔ "میں آپ جیسا بے غیرت نہیں، جو

اپنی ہی عزت کو اتار پھینکوں۔ اک ایسی ہستی کا حکم تھا' جسے میں نہیں ٹال سکتا تھا۔"

"کون ہے وہ ہستی۔"

"جن کے پیروں تلے جنت ہے جانئیے' اب کھڑا کیجیے' اسے بابا کی بندوق کی نال کے سامنے اور بن جائیے جہنمی۔"

"اماں سے رابطہ کیسے ہوا تمہارا؟" وہ کچھ نرم پڑا۔

"آپ کی سابق بیوی کی مرہون منت — جس کو اگر طلاق دے کر نکال دیتے تو شاید اتنا بڑا اسکینڈل نہ بنتا۔"

"چھوڑ دیتا اس ناگن کو دودھ پلا کر جیتا جاگتا' تاکہ وہ مجھے ڈستی رہے۔"

"محبت کی تھی بھائی! تو نبھانا بھی سیکھتے۔" وہ افسوس سے بولا۔

گوہر چند لمحوں تک اسے غصے سے گھورتا رہا۔

"ڈھونڈ نکالوں گا اسے' چاہے زمین کی تہہ میں ہو یا آسمان کی وسعتوں میں۔" وہ چبا چبا کر بولا۔ اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

٭ ٭ ٭

"مجھے تمہارے انجام کا پتا تھا۔ جب ہی گھر چینج کیا۔" وہ اس کو چائے کا کپ تھماتے بولی۔

"اب کیا سوچا ہے' کیا یوں ہی اس مردہ محبت کا ماتم کرتی رہو گی' یا اٹھ کر زندگی میں پھر سے حصہ لو گی؟"

"نہیں اماں۔۔۔ مجھے دل کو محبت کے دھوکے سے نکالنے میں کچھ وقت تو چاہیے ناں۔ پھر اتنی جلدی باہر نکلنے سے گوہر کا مجھ تک پہنچنے کا بھی خطرہ ہے۔" اس نے چھوٹے چھوٹے سپ لیتے ہوئے ماں کو دیکھا۔

"ویسے میں نے نوال کی این جی او میں جاب کی آفر کو قبول کرلیا ہے۔ وہ عورتوں کے لیے صحت و تعلیم کے لیے کام کررہی ہے۔ ایک مہینے بعد اسلام آباد میں کل پاکستان سیمینار منعقد ہونے والا ہے۔ اس این جی او کی طرف سے میں نمائندگی کرنے جاؤں گی۔"

"خیال سے بیٹا! یوں اسلام آباد جانا اک بڑے سیمینار میں شرکت کرنا خطرے سے خالی نہیں۔" ماں کی ازلی تشویش عود کر آئی۔

"فکر نہ کریں اماں! اس بڑی این جی او کا نام سن کر وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا' جبکہ میرے ماضی سے ہماری این جی او اور انسانی حقوق کمیشن والے واقف ہیں۔ وہاں کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے وہ سو بار سوچے گا۔" وہ پرعزم ہوئی۔

"اللہ تمہیں کامیاب کرے اور ظالموں کے ظلم سے محفوظ رکھے۔" وہ دل سے دعا گو ہوئی۔

٭ ٭ ٭

وہ بہت سوچ سمجھ کر وار کرنا چاہتا تھا۔ میڈیا پر رسوائی اور این جی او کی طرف سے بار' بار یہ بیان دینا کہ موحل مہر کی جان کو اس کے سابقہ شوہر سے خطرہ ہے۔ وہ اس لیے محفوظ حکمت عملی بنانا چاہتا تھا۔ تاکہ اس پر شک نہ کیا جائے اور لوگ موحل کو بھول جائیں۔ روزانہ ایسی عورتوں کے بیان دیکھ کر لوگ عادی ہوگئے ہیں۔ موحل کو قتل کروانا یا اغوا کروانا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

اس نے تین مختلف لوگوں کو اس کو نگرانی پر رکھا ہوا تھا۔ ایک آدمی اس کے فلیٹ والی گلی میں کھوکھا لگا کے بیٹھا تھا۔ دوسرا اس این جی او کے دفتر کے سامنے والی بلڈنگ کا چوکیدار تھا۔ تیسرا اس مین روڈ کی ایک دکان پر بیٹھا رہتا' وہ جب بھی کہیں جاتی تو وہ مناسب فاصلے پر کبھی موٹر سائیکل کبھی گاڑی پر اس کا پیچھا کرتا۔ وہ اس کے لمحے لمحے کی حرکات سے آگاہ رہتا تھا۔ اسے فون پر ساری اطلاعات ملتی رہتیں۔ وہ ہر بات باپ کو بتاتا تھا۔

"آج وہ یونیورسٹی میں دیہاتی عورتوں پر مقالہ پڑھے گی۔ بہت تیزی سے مقبول ہو رہی ہے' اپنے سوشل سرکل میں۔" اس نے پیچ و تاب کھاتے باپ کو بتایا۔

"اگر اس کو پہلے ہی ٹھکانے لگا دیتے تو آج یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔" بڑے سردار نے بددلی سے کہا۔

"میرا خون کھول رہا ہے بابا! اس وقت کو کوس رہا ہوں جب آپ کا کہنا نہ مانا' سوچا تھا اذیتیں دے' دے کر ماروں گا' مگر کم بخت کی قسمت اچھی نکلی ورنہ سالوں ہماری قید سے کوئی پنچھی آزاد نہیں ہوا' مگر یہاں تو گھر کا بھیدی ہی دشمن نکلا۔" وہ تپا ہوا۔

"خبردار! اس کا نام نہ لینا۔ میں تو باپ کے ساتھ ایک سردار بھی ہوں' شاید برداشت کرجاؤں' مگر تمہاری ماں جیتے جی مرجائے گی۔" انہوں نے فوراً" ٹوکا۔

"آپ لوگوں کی وجہ سے ہی تو چھوڑ کر رکھا ہوا ہے۔ ورنہ موحل کے ساتھ اس کی بھی بوٹیاں کرنے کا ارادہ تھا۔" تب ہی فون کی گھنٹی بجی تو گوہر نے اٹھایا۔ اس کے ایم این اے دوست کا فون تھا۔

"گوہر! جتنی جلد ہوسکے ملک سے باہر نکل جاؤ۔"

"پاگل تو نہیں ہوگئے ہو۔" وہ ہنسا۔ "مذاق وہ بھی اتنا بھیانک۔"

یار گوہر! یہ مذاق نہیں ہے۔ میں خود لندن کی فلائٹ لے کر نکل رہا ہوں' تم بھی فوراً" نکلو' ایسا نہ ہو کہ تمہارا ایگزٹ کنٹرول لسٹ میں نام آجائے۔ بہت جلدی میں ہیں' پھر ملیں گے کسی دوسرے ملک میں۔" اس نے تیزی سے بات کرکے فون بند کردیا گوہر باپ کی طرف گھوما۔

"بابا! مجھے فوری طور پر نکلنا ہوگا۔" اس نے بڑے سردار کو بتا کر فوراً" اپنے سیکریٹری کو بلایا۔ فوراً" ایجنسی والے کو فون کرو۔ قطر' ابوظہبی' دبئی' جہاں کی بھی پہلی فلائٹ ملے' سیٹ بک کرواؤ۔"

حکومت جانے کی باتیں تو گردش میں تھیں' مگر اتنا اچانک ہوجائے گا بڑے سردار کو دھچکا لگا۔ رنج میں چائے بھی ختم نہ کرپائے۔"

"سر! ایجنسی کے مالک کا فون ہے' وہ کہہ رہا ہے شام کی فلائٹ میں سیٹ کنفرم ہوگی۔"

"دو مجھے۔" اس نے سیل فون سیکریٹری سے لے لیا۔ "یار! اتنی پرانی جان پہچان والوں کو فوری فلائٹ کی رعایت تو دینی چاہیے۔ مجھے دو گھنٹے میں جو فلائٹ جارہی ہے' اسی میں سیٹ چاہیے۔" "سردار صاحب دو گھنٹے میں جا تو رہی ہیں' مگر قطر' ابوظہبی کی سیٹیں کنفرم ہیں اور آپ کا تو ویزا بھی نہیں لگا ہوا ہے' کیسے جائیں گے؟" ایجنسی کے مالک نے جواز دیا۔

"ویزا آپ کا مسئلہ نہیں۔ ان ملکوں میں میرے عرب مہربان دوست ہیں۔ اترتے ہی ویزا جاری ہوجائے گا۔ آپ کسی بھی پیسنجر کی سیٹ کینسل کردیں۔ یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں' مجھے صرف یہ بتائیں کتنا کیش بھیجوں؟" اس نے دو ٹوک بات کی۔

"سردار صاحب مروا نہ دینا۔" ایجنسی کا مالک نیم رضامندی سے بولا۔

"میں آدھے گھنٹے میں ایرپورٹ کے لیے نکل رہا ہوں اور پانچ لاکھ آپ کو بھیج رہا ہوں۔ اتنے پیسے لینے کے بعد میرے خیال میں کوئی بھی کام کرنا مشکل نہیں ہوگا۔" اس نے بات ختم کردی۔

"اوکے سردار صاحب! آپ کے لیے تو جان بھی حاضر ہے۔" پیسوں نے اس کے لہجے کو خوشامدی بنا دیا۔

اس نے جھک کر باپ کے پیروں کو چھوا۔ "جیسے ہی حالات موافق ہوں گے' میں لوٹ آؤں گا۔"

"میں بھی کچھ عرصے میں چکر لگاؤں گا۔"

وہ پے در پے شکستگی کے احساس سے دوچار بولے۔

"فکر نہ کریں بابا! میں باہر رہ کر بھی اپنے دشمنوں کا قلع قمع کرواسکتا ہوں۔" وہ ایک بار پھر باپ سے بغل گیر ہوا۔

"مجھے پتا ہے تو واقعی سردار ہے۔" وہ بیٹے کی پیٹھ تھپکتے ہوئے بولے۔

ایرپورٹ جاتے ہوئے اس نے ایک نمبر پریس کیا۔

"سنو! آج جب وہ دفتر سے نکلے تو دوسرے لمحے دنیا میں موجود نہ ہو۔" اس نے حکم صادر کیا۔

"موحل مہر! ہمیشہ کے لیے خدا حافظ!" اس کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ آگئی۔

☼ ☼ ☼

وہ بھاگ گیا بیرون ملک بینکوں میں کروڑوں ڈالرز کے اثاثوں کے بل بوتے پر وہ ساری زندگی عیش سے گزار سکتا تھا۔ بڑے سردار واپس گوٹھ چلے گئے۔

گوہر کے جانے سے وہ آدھے رہ گئے تھے' مگر اس دن تو جیتے جی مر گئے' جب امریکہ میں دھند کے باعث گوہر کے ایکسیڈنٹ کی خبر آئی۔

شہریار ماں کے بلانے پر انہیں دیکھنے آیا۔ وہ باپ تھے' اسے دیکھ کر کمزور پڑ گئے۔ "گھر واپس چلو اور اپنی جاگیریں سنبھالو۔"

"آپ کی شرائط پر یا اپنی شرائط پر۔"

"تمہاری مرضی' جو جی میں آئے کرنا۔" شیر مردہ ہو چکا تھا۔ اس کی آواز میں نہ دہشت تھی' نہ دھاڑ۔ صرف وحشت ان کی آنکھوں میں ناچ رہی تھی۔ یہ احساس ہی روح فرسا تھا کہ وہ جوان بیٹے کی لاش کو کیسے کاندھا دیں گے۔

☼ ☼ ☼

شہریار امتحان میں پڑ گیا تھا۔ مائرہ کو ساری صورت حال بتائی تو وہ بکھر گئی۔

"نہیں ہرگز نہیں' نہ تم جاؤ گے نہ میں' وہ ظلم کی فصل کاٹنے جو تمہارے باپ' بھائی نے بوئی ہے۔" وہ یک دم چیخی۔

"میں مجبور ہوں مائرہ! مجھے اپنے باپ سے زیادہ ماں کا خیال ہے۔ میں اس گاؤں کو اب اس حالت میں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ بابا کو چپ لگ گئی ہے۔ اگر وہ ٹھیک ہوتے تو میں کبھی نہ جاتا۔" اس نے ناصحانہ انداز اختیار کیا۔

"تو تم مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ گے۔" خوف اس کی آنکھوں سے چھلکا۔ "تم بھی سردار' ظالم وڈیرے بن جاؤ گے' گوہر کی طرح محبت کرنا بھول جاؤ گے اور میں اکیلی رہ جاؤں گی۔" وہ ہذیانی انداز میں بولتے ہوئے غنودگی میں چلی گئی۔

"ہوش میں آؤ مائرہ!" وہ پریشانی سے اسے جھنجوڑتے بولا۔

سارا علاج' محنت اکارت چلی گئی۔ وہ دورہ جو کافی عرصے سے نہیں پڑا تھا۔ اس کا جانے کا سن کر پھر پڑ گیا۔ وہ ہاتھ کے دباؤ سے اس کے بھنچے ہوئے دانتوں کو کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔

اس دن کے بعد اس نے مائرہ سے کوئی بات نہ کی۔ باپ کو ماں کے ساتھ واپس گاؤں بھجوا دیا۔ جاتے ہوئے ماں کے آنسوؤں سے کی گئی التجا چین سے بیٹھنے نہ دیتی۔

"بیٹا اب لوٹ آنا۔ میں اب تمہاری جدائی نہیں سہہ سکتی۔"

ایک طرف آگ' دوسری طرف پانی' وہ کس سے بچتا' کیا کرتا' دفتر جاتا تو مائرہ کی آنکھوں کی بے یقینی اسے مار دیتی۔

ادھر سادہ دل ماں کے فون پر فون۔

وہ ہر بار مائرہ کی طبیعت کا بہانا کر دیتا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مائرہ کا اعتماد کس طرح بحال کرے۔

ایک دن اس نے مومل کو ٹی وی پر کسی کانفرنس میں شرکت کے بعد تاثرات دیتے دیکھا تو اسے روشنی کی کرن دکھائی دی۔

وہ مومل سے اس دن کے بعد سے نہیں ملا تھا۔ وہ پہلی فرصت میں اس کے پاس پہنچا۔ جب وہ اس کے ساتھ دفتر سے نکلا تو سامنے ڈھاٹا باندھے پستول والے شخص کو ٹھٹکتے دیکھا۔

"شہریار سائیں آپ!" اس شخص کو وہ دن یاد آیا جب دردِ زہ میں مبتلا اس کی بیوی کو شہریار ——— اپنی گاڑی میں اٹھا کر شہر کے اسپتال لے گیا اور سارا خرچہ خود برداشت کیا۔ بچہ تو ماں کے پیٹ میں ہی مر گیا تھا' مگر بیوی کی جان بچ گئی تھی۔

شہریار نے اسے پہچان لیا۔

"کس کو مارنے آئے تھے۔ مومل کو یا مجھے؟"

"سائیں! آپ کو نہیں۔" اس نے مومل کی طرف

دیکھا۔ "میں حکم کا بندہ ہوں بھلا کیا کر سکتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے آئندہ کبھی ایسی کوشش نہیں کرنا اور گوہر کو بھی بتانہ چلے کہ ہمیں یہ پتا چل گیا ہے؟"

شہریار نے بعد میں ان دونوں کو گرفتار کروا دیا۔ اور مومل کو گھر تبدیل کر کے آفس چھوڑنا پڑا۔ شہریار نے مائرہ کے بارے میں مومل سے بات کی۔ مومل اور مائرہ کی اب بہت اچھی دوستی ہو گئی تھی۔

"مائرہ! تمہیں شہریار پر اعتماد ہونا چاہیے۔ جسے دولت کی کمی نہ ڈگمگا سکی' اسے فراوانی کیا بگاڑے گی۔" مومل نے مائرہ کو سمجھایا تھا۔

وہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔

☼ ☼ ☼

"میں نے مائرہ کو راضی کر لیا ہے۔ اور ہم اپنی این جی او 'روشنی' کے نام سے اس علاقے میں کھولیں گے۔" مومل نے کہا۔

"تو کیا تم راضی ہو؟" حیرت سے استفسار کیا۔

مائرہ مسکرائی۔ "ہاں۔"

"کیا یہ رسک نہیں ہو گا مومل؟" شہریار نے کہا۔

"اگر یہ رسک ہے تو میں لینے کو تیار ہوں۔"

"ٹھیک ہے... اگر تم اتنے دکھ سہ کر بھی یہ رسک لینے پر تیار ہو تو میں بھی وہاں چلنے کو تیار ہوں۔ ہم مل کر کام کریں گے۔"

"مگر تم ہمارے معاملات میں ٹانگ نہیں اڑاؤ گے۔" اس نے خوش گوار لہجے میں کہتے شہریار کو وارننگ دی۔

"توبہ توبہ! دو عورتوں کے آگے میری کیا چلے گی۔ میں تو اقلیت میں شمار ہوں گا۔" شہریار ہنسا۔

"دو نہیں تین ووٹ ہیں ہمارے' اماں کو بھول گئے۔" مومل نے ہنس کر کہا۔

"میرے خیال میں پیکنگ کر لینی چاہیے۔ ہم کل ہی جائیں گے۔ اب دیر کرنا بے سود ہے۔" شہریار نے کہا تو مومل اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ٹھیک ہے' میں بھی چلتی ہوں' اب کل ملیں گے۔"

☼ ☼ ☼

حویلی ان کی منتظر تھی۔ خوشی و غم کی ملی جلی کیفیت میں گھری اماں ان دونوں کو بازوؤں میں لے کر بیٹھی تھیں۔ شہریار ان کے قدموں میں بیٹھا تھا۔

"کاش! گوہر تمہیں طلاق نہ دیتا۔" وہ آبدیدہ ہوئیں۔

"اماں کوئی فرق نہیں پڑتا طلاق سے۔ دولت کی ہوس مجھے نہیں رہی' خدمت تو میں تب بھی کرتی تھی اب بھی کرنے آئی ہوں' یہ میرے لیے اپنے لوگ ہیں' ان کی خوشیاں اور غم' دکھ سکھ سب میرے ہیں۔" اس نے دلاسا دیا۔

"چلو بڑے سردار کو دیکھ آئیں۔"

وہ اٹھیں' اک طرف شہریار' دوسری طرف مائرہ تھی۔ چند قدم چلنے کے بعد اس نے مڑ کر مومل کو دیکھا' جو وہیں رکی ہوئی تھی۔

"پتا نہیں مجھے دیکھ کر وہ کیا محسوس کریں۔" مومل نے دھیرے سے کہا۔

"آجاؤ... وہ کچھ محسوس کرنے سے قاصر ہیں۔" کوما میں پڑے ہوئے سردار کو دیکھ کر اسے دھچکا لگا تھا۔ کتنا کروفر تھا اس شخص میں۔ جس کا نام سنتے ہی لوگ کانپ اٹھتے تھے۔ جس کو دل ہی دل میں بددعا دیتے بھی خوف زدہ ہو جاتے تھے۔ آج وہ کتنا بے بس تھا۔ کتنا لاچار' دوسروں کے رحم و کرم پر پڑا ہوا......

مومل بے تحاشا رنجیدہ ہوئی۔

"کاش بڑے سائیں! آپ ناانصافی سے گریز کرتے۔" وہ چپ تھی۔ مائرہ ہراساں اور شہریار کی آنکھوں میں نمی آ ٹھہری تھی۔

"جس دن انہوں نے گوہر کے جنازے کو کاندھا دیا' اس دن قبرستان سے آنے کے بعد انہوں نے آنکھ کھول کر دنیا کو نہیں دیکھا ہے۔" گوہر کے ذکر پر اماں کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوئے۔

"اگر میں تم لوگوں کو نہ بلاتی تو ملکیت پر تمہارا کوئی چچازاد یا ماموں زاد قبضہ کر لیتے اور یہ اتنا جابرانہ طریقہ

برقرار رکھتے بیٹا! اسی لیے میں نے تم لوگوں کو بلایا ہے۔" انہوں نے مائرہ کے ہاتھ تھامتے کہا۔ "تم لوگ فکر مند مت ہونا۔ اب سیاہ سفید کے مالک تم لوگ ہو۔"

"اماں ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ شہریار! خدا کرے، تم اس آزمائش میں پورے اترو۔"

"آمین۔" وہ زیر لب بولا۔

جس دن اس نے سرداری کی پگ باندھی۔ اس دن صرف اپنے راج والوں کو بلایا اور اپنے قبیلے والوں کو۔ لوگوں کے دل آس و نراس کا شکار تھے۔ کیا پتا یہ بھی اپنے باپ اور بھائی جیسا نکلے۔ شروع میں تو گوہر علی بھی اچھے تھے، مگر جب سرداری معاملات ہاتھ میں لیے تو اس کے اندر سے سردارانہ سرشت نمودار ہوگئی۔ مختلف چہ مگوئیاں چاروں طرف پھیلی ہوئی تھیں۔

اسٹیج پر اس کے ساتھ پٹواری کو دیکھ کر لوگ حیران تھے۔

"میں امیروں کا سردار نہیں، غریبوں کا سردار ہوں، اس لیے میری پگڑی کے بل امیر نہیں، غریب دیں گے۔" اس اعلان پر ڈرتے ڈرتے بخشو کمہار اٹھا، پھر جمن لوہار، بخشو بڑھئی، آہستہ آہستہ غریبوں نے ہمت پکڑی اور پگڑی کے بل باندھتے گئے۔

یہ پہلی بار ہوا تھا، ایسا کبھی نہیں ہوا، ہمیشہ بڑے بڑے سردار، جاگیردار پگڑی کے بل باندھتے تھے۔

اس نے نجی جیل خانے کے ساتھ جو فارم ہاؤس تھا، وہ مسمار کرادیا۔ آزادی کے اعلان کے باوجود اس گوٹھ سے کوئی نہیں گیا۔

اس بار جب فصل آئی تو صرف سردار کے گھر نہیں، وہاں رہنے والے لوگوں کے گھروں میں بھی خوش حالی آئی۔

رویوں میں آئی تبدیلی نے پورے گاؤں کو تبدیل کردیا۔ گوٹھ کی ساری گلیاں پکی ہوگئیں۔ لوگوں کے گھر پکے ہونے لگے۔ لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے الگ الگ پرائمری و ہائی اسکول تعمیر ہوگئے۔ پانی کے ہینڈ پمپ ہر محلے میں لگا دیے گئے جہاں زیر زمین پانی نمکین تھا۔ وہاں لائن بچھا کر میٹھے پانی سہولت پہنچائی گئی تھی۔

شہریار، مائرہ اور موول کے تکون نے ہر مسئلے کا حل نکالا تھا۔ وہ سر جوڑ کے بیٹھتے اور مسئلہ حل ہوجاتا۔

وہ کسی کو بھی نہیں بھولی تھی۔ ساری لڑکیاں، سارے ساتھی اس کے ساتھ تھے۔ اسکول کی پرنسپل اس کی ماں تھی اور دوسری ٹیچرز کے ساتھ تمینہ اور ثمینہ بھی پرائمری کے بچوں کو پڑھاتی تھیں۔

وہ تینوں جنون عشق کے تم گشتہ کھوجی تھے۔ جس کام کی دھن سوار ہوتی، وہ کرکے رہتے۔ ظلم کی طویل بھیانک کالی رات کے بعد عدل کی روشن چمکیلی صبح نمودار ہوچکی تھی۔ اس لیے کہ تبدیلی دلانے والے کرپٹ نہیں تھے اور انہیں اپنے کام سے عشق تھا۔

وہ صبح بہت اجلی، بے داغ تھی۔ جب اس نے اس جگہ گلاب کا پودا لگایا، جہاں عائشہ کے خون نے تبدیلی کی فصل بوئی تھی۔

اس یادگار تختی کی تقریب میں گاؤں کے سارے افراد موجود تھے، کیا عورتیں، کیا مرد، کیا بوڑھے، کیا جوان، بچے سب۔ اور عائشہ کے بیٹے نے جیسے ہی ڈوری کھینچی، تالیوں کی گونج نے ہر آواز کو ختم کردیا۔ مسکراتے ہونٹ، نم آنکھیں اس کے خون اور بہادری کو سلام پیش کررہے تھے۔

اس تختی پر کندہ تھا۔

"انقلاب کے راستے میں بہنے والے عائشہ کے خون کو عقیدت و محبت بھرا سلام۔

اللہ اس کو اپنی رحمت کے سائے تلے رکھے، جس کی ہمت نے ہم جیسے بے ہمتوں کو بہادر بنادیا۔"

اس نے نم آنکھوں سے مسکاتے ہونٹوں سے دعا کی اور مائرہ اور شہریار نے آمین کہا۔

سائرہ

راحت وفا

اس بوڑھے آدمی کو میں نے سب سے پہلے سائرہ کی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے دیکھا تھا۔ اس کی گود میں سائرہ کا دو سال کا بیٹا تھا۔

میری گھر میں پہننے والی چپل ٹوٹ گئی تھی۔ میں گھسیٹ گھسیٹ کر کام چلا رہی تھی مگر جب بالکل ہی جواب دے گئی تو اتوار کے دن ڈھیروں کام سمیٹ کر بچوں کو ان کے باپ کے حوالے کرکے انار کلی چلی آئی۔

بابر مارکیٹ کے سامنے رکشے سے اتری تو قریب کھڑی گاڑی سے ایک ماڈرن عورت کو برآمد ہوتے دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ بلاشبہ وہ سائرہ ہی تھی۔ کالج میں دو سال تک ہم کلاس فیلو تھے۔ پھر اس کے والدین چند وجوہ کی بنا پر لاہور سے چلے گئے ایک دوسرے کے ایڈریس لینے کے باوجود نہ اس کی طرف سے کوئی خط آیا اور نہ ہی میں نے رابطہ کیا۔

بی اے کرتے ہی میری شادی ہو گئی۔ یکے بعد دیگرے دو بچوں کی آمد نے مجھے بوکھلا کر رکھ دیا۔ راشد ایک محبت کرنے والے شوہر تھے۔ میری ساس فوت ہو چکی تھیں، البتہ سسر ہمارے ساتھ رہتے تھے۔ گورنمنٹ سروس سے ریٹائرڈ تھے۔ میری دو نندیں تھیں جو اسی شہر میں بیاہی گئی تھیں۔

بہت زیادہ آسائشیں نہ ہونے کے باوجود ہم مطمئن زندگی گزار رہے تھے اس میں زیادہ ہاتھ میری قناعت پسند طبیعت کا تھا اور راشد بھی حلال روزی کمانے کے حق میں تھے۔ یوں وقت اچھا بھلا گزر رہا تھا۔

پانچ سال کے بعد اچانک سائرہ کو دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ وہ جو کسی شاعر نے کہا ہے ناکہ "کسی ہمدم دیرینہ کا ملنا خضر اور مسیحا کی ملاقات سے بہتر اور بڑھ کر ہے" سو ایسا ہی لگا۔ سائرہ نے بھی مجھے پہچان لیا۔ بہت گرم جوشی سے ملی۔ اپنے بہترین لباس، گاڑی اور زیورات سے وہ امیر عورت لگ رہی تھی۔ حالانکہ اس کے والدین مڈل کلاس لوگ تھے۔

کافی دیر ہم وہیں کھڑے باتیں کرتے رہے تب ہی میری نظر اس بوڑھے آدمی پر پڑی جو شاید سائرہ کا ملازم تھا۔ سائرہ نے مجھے اپنا ایڈریس سمجھایا اور اپنے گھر آنے کی پُر زور دعوت دے کر گاڑی میں جا بیٹھی۔ چپل خریدتے ہوئے، پھر گھر واپس آتے ہوئے بھی میرا دھیان اسی کی طرف رہا۔ گھر آکر میں نے راشد کو بتایا اور ان سے وعدہ لیا کہ وہ بہت جلد مجھے سائرہ کے گھر لے چلیں گے۔

☼ ☼ ☼

دوسری بار اس بوڑھے آدمی کو میں نے سائرہ کے گھر پر دیکھا۔

کافی دنوں سے راشد آفس سے لیٹ آرہے تھے۔ میرے بار بار یاد دلانے پر بھی وہ وقت نہ نکال سکے۔ وہ اوور ٹائم لگا رہے تھے۔ پھر ایک دن میں ان سے اجازت لے کر خود ہی سائرہ کے گھر پہنچ گئی۔ بچے دادا کے پاس چھوڑ دیے۔

بیل دینے پر دروازہ اسی بوڑھے آدمی نے کھولا۔

"جی بیٹا فرمایئے!" اس کا لہجہ اس کے حلیے سے میل نہیں کھاتا تھا۔ وہ ہلکے سے رنگ کا ملگجا سا شلوار قمیص پہنے ہوئے تھے مگر اس کا لہجہ نہایت اچھا اور مہذب تھا۔

"مجھے سائرہ سے ملنا ہے۔" میں نے کہا۔ "میں اس کی دوست ہوں۔"

"اندر آجائیں۔" وہ دروازے کے ایک طرف ہوگیا میں اندر آگئی۔

باہر سے گھر جتنا شاندار نظر آتا تھا اندر سے اس سے زیادہ خوب صورت تھا۔ میں رشک سے دیکھتی رہی۔ وہ مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر چلا گیا۔

چند لمحوں بعد سائرہ میرے سامنے تھی۔ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ میرے قریب بیٹھ کر باتیں کرنے لگی۔ ملازمہ کولڈ ڈرنک لے آئی۔ سائرہ نے اسے جلدی سے کھانا تیار کرنے کو کہا۔ میں نے انکار کیا کہ میں زیادہ دیر کے لیے نہیں آئی مگر وہ نہ مانی۔

باتوں کے دوران میں نے بارہا اس بوڑھے آدمی کو ادھر ادھر کام کرتے، سائرہ کے بیٹے کو کھلاتے دیکھا۔ میرا احساس دل بچوں کو مزدوری اور بوڑھے لوگوں کو کام کرتے دیکھ کر بہت دکھتا تھا۔

میں سوچ رہی تھی کہ نہ جانے کون سی مجبوری اس عمر میں اسے کام کرنے پر مجبور کر رہی تھی۔

سائرہ کا بیٹا بہت شرارتی تھا۔ بوڑھے آدمی کو ایک لمحے کے لیے بھی سکون سے بیٹھنے نہیں دے رہا تھا اور وہ بے چارہ اس کے پیچھے بھاگ بھاگ کر ہانپ رہا تھا۔ آخر بچہ کھیلتے کھیلتے سو گیا۔ وہ اسے کندھے سے لگائے اندر چلا گیا۔

میں جتنی دیر سائرہ کے پاس بیٹھی رہی، اس کی باتوں کا موضوع "میرا شوہر" اور "میرا اسٹینڈرڈ" تھا۔ اس نے بتایا اس کا شوہر بے حد خوب صورت ہے اور کسٹم میں اعلا عہدے پر فائز ہے۔ اسے اپنے شوہر پر ناز ہے۔ اس کی باتوں میں بے حد غرور آچکا تھا۔ میں کچھ بددل سی ہو گئی۔ وہ شاید مجھے مرعوب کر رہی تھی۔ اسی وقت ملازمہ نے اندر آکر کہا۔

"بی بی جی! بابا جی کھانا مانگ رہے ہیں۔"

سائرہ نے برا سا منہ بنایا اور بولی۔ "ایک تو بڈھے کو بھوک بڑی لگتی ہے۔ نہ کام نہ کاج فارغ بیٹھے روٹیاں توڑنے کے سوا کوئی اور کام ہی نہیں۔ فریج میں رات کا سالن پڑا ہوگا گرم کرکے دے دو اور دو روٹیاں پکا دو۔"

ملازمہ چلی گئی۔ سائرہ کا امیج میری نظر میں اور خراب ہوا۔ وہ بے چارہ بوڑھا آدمی، جسے چھوٹے سے بچے نے ہی تھکا ڈالا تھا اور اب شام کے چھ بج رہے تھے۔ بوڑھے لوگوں کو ویسے بھی بھوک جلدی لگ جاتی ہے۔ پتا نہیں اس نے صبح ناشتہ کیا تھا یا نہیں۔ مجھے الگ ہی فکر لاحق ہونے لگی۔

میں نے سائرہ سے جانے کی اجازت مانگی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی، باہر کسی گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔

"ٹھہرو! عامر آگئے ہیں۔ ان سے مل کر جانا۔"

تھوڑی دیر بعد ایک شاندار پرسنالٹی والا شخص اندر آیا۔ سائرہ ٹھیک کہہ رہی تھی وہ واقعی بہت خوب صورت تھا۔ ایسے شاندار شوہر پر بجا طور پر فخر کیا جا سکتا ہے۔

"عامر! یہ میری دوست رابعہ ہے۔" سائرہ نے میرا تعارف کرایا۔

اس نے سلام دعا کے بعد حال احوال پوچھا پھر معذرت کرکے چینج کرنے کے لیے چلا گیا۔ میں نے

اجازت چاہی۔ سائرہ میرے ساتھ باہر تک آئی۔

لاؤنج میں کارپٹ پر وہی بوڑھا آدمی بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ میرا دل پھر ہمدردی سے بھر گیا۔

"ادھر بیٹھ کے کیوں کھا رہے ہو، کچن میں کھا لیتے۔" سائرہ نے اسے بڑی سختی سے مخاطب کیا۔

"بیٹا! حمیدہ کچن دھو رہی تھی' اس لیے میں ادھر بیٹھ گیا۔" وہ لجاجت سے بولا۔ اس سے پہلے کہ سائرہ اسے کچھ اور کہتی اندر سے عامر نکل آیا۔

"کیا بات ہے سائرہ! کیوں ناراض ہو رہی ہو؟" پھر اس کی نظر بوڑھے پر پڑی۔

"کیا بات ہے ابا جی! آپ یہاں کیوں کھانا کھا رہے ہیں؟" وہ بھی سخت لہجے میں بولا۔ اور مجھے یوں لگا جیسے سائرہ کا گھر میرے اوپر گر پڑا ہو۔

وہ بوڑھا آدمی جو حلیے سے ملازم لگتا تھا۔ جو ملازموں کی طرح کام کر رہا تھا۔ جو خادموں کی طرح مالکوں کے بچے کو بہلا رہا تھا... وہ عامر کا باپ اور سائرہ کا سسر تھا۔ جو سر جھکائے بیٹے اور بہو کے سامنے کھڑا تھا' وہ اس گھر کے مالک کا باپ تھا۔

میں نے ایک نظر عامر پر ڈالی۔

شاندار شخصیت' اعلا عہدہ' گھر' گاڑی' معاشرے میں عزت وقار... ان سب کے لیے اسی بوڑھے نے نہ جانے کتنے برس محنت کی ہوگی۔ نہ جانے کتنی خواہشات کو مار کر اپنے بیٹے کو اعلا افسر بنانے کے لیے مشقت کی ہوگی۔ شاید کئی بار خود بھوکا رہ کر بیٹے کو کھلایا ہوگا اور آج وہی باپ اسی افسر بیٹے کی بیوی سے دو روٹیاں مانگتے ڈرتا ہے۔

اسی لمحے وہ افسر' وہ شاندار شخصیت کا مالک عامر میری نظر میں بہت حقیر ہو گیا۔

باہر کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے میں نے رک کر سائرہ اور عامر کو دیکھا۔

"سائرہ! تم میری دوست ہو۔ اتنے برسوں بعد تم سے مل کر بہت اچھا لگا تھا مگر اب مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ میں تم سے ملنے کیوں آ گئی۔

چھوٹی کلاس میں سائنس کی کتاب میں پودے کے حصوں کے بارے میں پڑھتے ہوئے پتا چلا تھا کہ پودے کے سارے حصے بہت اہم ہیں مگر تنا' پودے کو سہارا دیتا ہے اور اسی سہارے کی وجہ سے پودا پھلتا پھولتا ہے۔ اس پر پتے پھول اور پھل لگتے ہیں۔ اگر تنا پودے کو سہارا نہ دے تو پودا کبھی تناور درخت نہیں بن پائے گا' ڈھے جائے گا... باپ بھی تنے کی حیثیت رکھتا ہے۔

تم جس شوہر کی شاندار شخصیت' اس کے عہدے پر فخر کر رہی تھیں' اسے اس مقام تک اسی بوڑھے شخص نے پہنچایا ہے' جو کسی مجرم کی طرح سر جھکائے کھڑا ہے۔ وہ تمہارا اور تمہارے شوہر کا سائبان ہے مگر افسوس..." بولتے بولتے میرا گلا رندھ گیا۔

"اس وقت سے ڈرو سائرہ! جب اسی جگہ پر تمہارا شوہر یا تم کھڑی ہوگی اور تمہارا بیٹا اسی طرح تم سے سوال کر رہا ہوگا... وقت گزرتے دیر نہیں لگتی سائرہ تم..."

آنسوؤں نے میری بات مکمل نہیں ہونے دی۔ میں اپنی بات ادھوری چھوڑ کر اس شاندار گھر سے نکل آئی۔

☼ ☼ ☼

بجھے ہوئے دل کے ساتھ میں اپنے گھر میں داخل ہوئی مگر سامنے کا منظر دیکھ کر میں جیسے زندہ ہو گئی۔

میرے سسر سامنے ہی صوفے پر لیٹے تھے اور راشد حسب معمول ان کی ٹانگیں دبا رہے تھے۔ میرے دونوں بچے دادا کے ارد گرد بیٹھے اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے اپنے دادا کا سر دبانے کی کوشش کرتے رہے۔ میرا دل خوشی اور فخر سے معمور ہو گیا۔

میرے شوہر اپنے والد کی بے انتہا عزت کرتے تھے اور میرے بچے بھی اپنے باپ کے نقش قدم پر چل رہے تھے اور رہی میں... تو جس شخص نے راشد کو تعلیم دلائی' اپنے پیروں پر کھڑا کیا' حلال روزی کی ترغیب دی اور پھر وہ قابل شخص مجھے سونپ دیا تو بھلا بتایئے! وہ مجھے برا کیسے لگ سکتا ہے۔ وہ تو ہمارا سائبان ہیں۔

☼

راحت جبین

ساری بھول ہماری تھی

ناولٹ

کالج وین عین دروازے کے سامنے رکی۔ وین میں ایک ہی لڑکی تھی، جو فائل اور بیگ تھامے باہر آگئی۔ اس کے گھر تک آتے آتے وین پوری خالی ہوجاتی تھی اور آج تو مریم نے بھی چھٹی کی تھی۔ سفید یونیفارم پر میرون جرسی اور سفید دوپٹہ اوڑھے، جس کے چاروں طرف میرون گوٹ لگی تھی۔ عریشہ کے ہر انداز میں الھڑپن اور لاپروائی نمایاں تھی۔

"اوں.... امی ابھی تک نہیں آئیں۔" دروازے پر لگا تالا دیکھ کر عریشہ نے بے زاری سے سوچا.... وین فراٹے بھرتی چلی گئی۔ عام طور پر عادلہ اس کے آنے سے قبل گھر پہنچ جاتی تھیں، مگر کبھی کبھار دیر ہو جاتی تو اضافی چابی عریشہ کے پاس بھی موجود ہوتی تھی۔ اس نے بیگ کھنگال کر چابی نکالی اور دروازہ کھول کر اندر آگئی۔ عادلہ صبح صفائی کرکے جاتی تھیں۔ سو سارا گھر صاف ستھرا تھا۔ بیگ رکھ کر ہاتھ منہ دھو کر وہ کچن میں آگئی۔ پتیلی کا ڈھکن اٹھایا تو سامنے بینگن منہ چڑا رہے تھے۔

"موسم بدل گیا، مگر یہ سبزی جان نہیں چھوڑے گی۔" اس نے منہ بنایا اور کچن بند کرکے باہر آگئی۔ دیوار کے دوسری طرف سے تایا کی گونج دار آواز ابھری۔

"میں نے کہا، آج رات کا کھانا ملے گا یا نہیں۔" عریشہ کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ دوسری طرف صحن میں بیٹھی ناشپاتی کھاتی تائی جی بھر کے بدمزا

ہوئیں۔

"ان کی تو مت ہی ماری گئی ہے۔ دوپہر کے وقت رات کا کھانا یاد کر رہے ہیں۔"

"اس بڈھی کا بس چلے تو میری زبان ہی کاٹ دے۔" وہ تلملائے۔

"ہاں... کسی دن اپنا نام برکت حسین کی جگہ برکت بی بی بتانا۔" وہ اپنی بات پر خود ہی ہنسیں اور دیر تک ہنستی ہی چلی گئیں۔ تایا کو گویا پتنگے لگ گئے۔

"تجھ جیسی نابنجار عورتیں جہنم میں جائیں گی' جو شوہروں کی سرعام بے عزتی کرتی ہیں۔"

"ارے... میں نے کون سا ڈانگ ماردی۔"

"اچھا... یہ حسرت بھی ہے' یا اللہ! مجھے اٹھالے یا اس عورت کو۔"

"ہائے' ہائے... صرف اپنی بات کرو۔ مجھے تو ابھی زندگی میں بہت کچھ دیکھنا ہے۔" تائی بدکیں۔

"ہاں... تیری تو یہی خواہش ہے کہ میں کسی دن سوتا ہی نہ اٹھوں' ننھی بچی بنتی ہے۔"

ڈیوڑھی میں موجود دوسرا دروازہ کھول کر عریشہ اندر آئی تو ہنستے ہنستے بے حال ہو رہی تھی۔ گویا ساری مہذب گفتگو دیوار کے دوسری طرف بھی سنائی دی تھی۔ عین سامنے بیٹھک کا دروازہ کھلا تھا اور تایا حقے کی نے منہ میں دبائے پلنگ پر دراز تائی پر جوابی حملے کر رہے تھے۔

"تایا جی! اتنا غصہ صحت کے لیے اچھا نہیں ہے۔"

"چپ کر' استانی کی اولاد! آجاتی ہے سبق پڑھانے۔" انہوں نے ڈپٹا تو وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنس دی۔

"استانی کی اولاد تو ہوں۔"

"اچھا... اچھا' تمہاری ماں نے پکایا کیا ہے؟"

"بینگن۔" اس نے برا سا منہ بنایا۔

"تیری ماں تو ہے ہی سدا کی کنجوس۔"

"تایا! اسی لیے تو ادھر آئی ہوں۔"

"ہاں' ہاں' ادھر کچن میں جا' کوفتے بنے ہیں' خود بھی کھا اور میرے لیے بھی لے آ۔" انہوں نے اپنے تئیں سرگوشی کی تھی' جو اڑتی ہوئی تائی تک پہنچ گئی۔

"ہاں... تمہارا چٹوراپن نہ گیا' اپنی بھوکی نیت ہر کسی کو دکھایا کرو۔"

"زبان کھینچ لوں گا... زیادہ بک بک کی تو ایک کوفتہ تیرے منہ میں بھی ٹھونس دوں گا۔" عریشہ ہنستی ہوئی صحن میں آگئی۔

"تائی صدقے' میری بچی ابھی تک بھوکی پھر رہی ہے' ماں نہیں آئی؟"

"اوں ہوں۔" وہ پاس بیٹھ کر ناشپاتی کھانے لگی' جبکہ تائی گرما کاٹنے لگی تھیں۔

"فریج میں رکھ آؤ' ٹھنڈا ہو جائے' کھانے کے بعد کھالینا' میں روٹی بناتی ہوں۔" انہوں نے گرما عرشی کی طرف بڑھایا۔

"تایا کے لیے بھی بنایئے گا۔"

"ہاں..." انہوں نے برا سا منہ بنایا۔

"نہ... نہ میری روٹی پکاتے تو تیرے ہاتھ ٹوٹتے ہیں۔ رہنے دے۔" تایا صحن میں وارد ہوئے اور اونچی اونچی آوازیں دینے لگے۔ "فرید اُف... فرید!"

بارہ' تیرہ سال کا فرید' اس گھر کا سب سے چھوٹا بچہ تھا۔ اوپر سے دوڑا آیا۔

"جی ابا!"

"ابا کے بچے' تو اوپر کیا کر رہا تھا' پتنگ بازی؟" انہوں نے کان پکڑا۔

"قسم لے لو ابا! میں نے تو پتنگ دیکھی ہی نہیں۔"

"ہاں' تو تو آج ہی پیدا ہوا ہے' پورے کا پورا اپنی ماں پر گیا ہے۔"

تایا کے اس جملے پر تائی نے گھور کر دیکھا' مگر کہا کچھ نہیں کیونکہ منہ میں گرمے کا ٹکڑا تھا۔

"چل بھاگ کر جا' ایک کلو گرم گرم دودھ میں آدھ کلو جلیبی ڈلوالا۔"

عریشہ پاس پڑا شاپر دیکھنے لگی' جس میں جاپانی پھل بھی تھے۔ لگتا تھا آج دل کھول کے فروٹ منگوایا تھا۔

تایا کے گھر کے حالات ہمیشہ سے ایسے ہی تھے۔ جب پیسہ آتا دل کھول کے خرچ ہوتا اور مہینے کے آخر میں ادھار مانگتے پھرتے۔

"دودھ جلیبی سے جسم میں طاقت آتی ہے۔ ورنہ یہاں تو مجھے بھوکا مارنے کا ارادہ ہے۔" انہوں نے تائی کو قہربار نگاہوں سے گھورا۔

"ہاں انہوں نے پہلوانی جو کرنی ہے۔" تائی بڑبڑائیں۔

"نہیں' تیرا گلا دبانا ہے' پھوہڑ عورت!"

"ہا... تایا جی! ایسے تو نہ کہیں۔" عریشہ نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھا۔ تایا بڑبڑاتے ہوئے دوبارہ بیٹھک میں چلے گئے۔

"تو کھڑا منہ کیا دیکھ رہا ہے' چل جا دودھ جلیبی لے آ۔" انہوں نے فرید کو گھرکا۔ وہ تیزی سے باہر بھاگ گیا۔

"میری تو ساری عمر ہی ان کی گالیاں کھاتے گزر گئی عرشی! یہ فروٹ سنبھال کر فریج میں رکھ دے' میں روٹی بنالوں۔"

"مریم اور فاطمہ آپی کہاں ہیں؟"

"فاطمہ تو نہا رہی ہے اور مریم کو سوائے رسالے پڑھنے اور سونے کے اور کون سا کام ہے۔ اب روٹی کی خوشبو سونگھ کر آجائے گی۔ سارا سکھ تو فاطمہ کی وجہ سے ہے' ورنہ اس عمر میں بھی ہڈیاں گھساتی پھرتی۔" وہ گھٹنوں پر زور دے کر کھڑی ہو گئیں۔ عریشہ نے سارا فروٹ سنبھال کر فریج میں رکھا اور تائی کے پاس ہی آگئی۔ وہ پیڑے بنا رہی تھیں۔

"اماں! ہو گئیں میری برائیاں؟"

"دیکھا... کھانے کی خوشبو کھینچ لائی۔" تائی نے عریشہ سے کہا' تو وہ مسکرا کر مریم کو دیکھنے لگی۔ مریم دبلی پتلی' لمبی سی تھی۔ نقش اچھے تھے' مگر رنگت زیادہ صاف نہ تھی۔ چہرے پر کہیں کہیں سیاہ تل بھی تھے۔ وہ اور عریشہ کالج فیلو بھی تھیں' مگر مریم کا دھیان پڑھائی کی طرف زیادہ نہ تھا۔ اس کی نسبت عریشہ ہمیشہ اچھی پوزیشن لیتی۔ شاید اس کی وجہ عادلہ کی سختی تھی کہ وہ سارے لاڈ اٹھاتیں' مگر پڑھائی کے معاملے میں ایک نہیں سنتی تھیں۔

"اور جو محترمہ کو کوفتوں کی خوشبو دیوار پار پہنچی وہ..." مریم نے طنز کیا تو عریشہ کھسیانی سی ہو گئی۔

"کیسی فضول بات کر رہی ہو؟ اس کا اور ہمارا گھر الگ تو نہیں ہے۔ جاؤ عرشی! اوپر سے ثوبان کو بلالاؤ۔" تائی نے عریشہ کے لیے سالن نکالتے ہوئے کہا۔

"ثوبان بھائی گھر پر ہیں؟" وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

"ہاں! آج یونیورسٹی سے جلدی آگیا تھا۔"

"میں ابھی بلا کر لاتی ہوں۔" عریشہ باہر نکلی۔ مریم نے اس کی جگہ بیٹھ کر سالن کا پیالا سامنے کیا۔

"اوں ہوں... یہ عریشہ کے لیے ہے۔" تائی نے ٹوکا۔

"سارے کوفتے اسی کی پلیٹ میں بھر دیے۔" مریم نے ہمیشہ کی طرح حسد سے کہا۔

"ہر وقت بکواس نہ کیا کرو' ہانڈی بھری ہوئی ہے۔" تائی نے گھرکا۔

"آج کی بات نہیں ہے' آپ ہمیشہ فرق کرتی ہیں۔" مریم کے اپنے ہی گلے تھے۔

"یہ سارا سامان اس کے باپ کے اسٹور سے آتا ہے۔" تائی نے جتایا۔

"کیوں محنت تو نعمان بھائی کرتے ہیں۔"

"تیرا چاچا جما جمایا کاروبار چھوڑ کر گیا تھا۔"

"امی! آپ کیوں شروع ہو گئیں' میں نہا کر بنا ہی دیتی۔" فاطمہ اندر آئی۔

گندمی رنگت والی فاطمہ کے چہرے پر بلا کی ملاحت تھی تو انداز و اطوار میں سبھاؤ اور ٹھہراؤ۔ ایف اے کے بعد اسے پڑھنے کی اجازت نہیں ملی تو اس نے گھرداری سنبھال لی۔ بچپن ہی سے وہ اپنی چاچی عادلہ کے زیادہ قریب رہی تھی' سو اسی جیسی پیاری عادات کی مالک رہی۔ کم از کم حمیدہ خاتون کی بیٹی نہیں لگتی تھی۔

"تو جا کر اپنے بال سکھالے۔ سارا دن تو لگی ہی

رہتی ہے' یہاں تو مر بھکوں نے جان کھائی ہوئی تھی۔"

"اماں! ہر وقت باتیں ہی سناتی رہا کریں۔" مریم چڑ کر بولی۔

"تیری حرکتیں ہی ایسی ہیں۔" وہ بھی حمیدہ خاتون تھیں۔

☼ ☼ ☼

ثوبان اپنے کمپیوٹر پر مصروف تھا۔ ثوبان کا کمرا پورے گھر سے الگ تھلگ پُرسکون اور خوب صورت تھا۔ کمرے میں وہ کسی اور کو آنے بھی نہیں دیتا تھا۔ انجینئرنگ پڑھ رہا تھا' سو تائی کے خاندان میں اس کی پڑھائی کی خاصی دھاک تھی' کیونکہ ان کے خاندان میں زیادہ تر دکان دار ہی تھے۔ وہ تو اب آکر لوگوں نے اپنے بچوں کو پڑھانا شروع کیا تھا۔ ان میں سے بھی زیادہ تر میٹرک' ایف اے سے آگے نہ نکلتے' ایسے میں حمیدہ خاتون کا فخر تو بنتا تھا۔

دروازہ کھلا تھا۔ عریشہ کچھ لمحے دروازے پر ہاتھ رکھے ثوبان کو دیکھتی رہی۔

ابھی کچھ زیادہ دن نہیں گزرے تھے' جب دل کی سرزمین پر محبت کی پہلی کونپل پھوٹی تھی۔ اسے ثوبان اچھا نہیں' بہت اچھا لگنے لگا تھا۔ وہ اسے کتنوں سوچتی' اس کی ایک جھلک کے لیے تائی کے گھر کئی چکر لگا لیتی۔ ثوبان انجان تھا یا انجان بن رہا تھا بہر حال ثوبان کی طرف سے ابھی تک کوئی پذیرائی نہیں ہوئی تھی۔ حالانکہ کم عمر اور الھڑ سی عریشہ نے زبان سے ایک لفظ نہیں کہا تھا مگر چہرہ کھلی کتاب بن گیا تھا۔

"ارے۔۔۔ عرشی! تم کب آئیں؟" ثوبان کی آواز پر وہ بری طرح چونکی۔

"وہ۔۔۔ تائی جان کہہ رہی ہیں' آکر کھانا کھالیں۔"

"یہ پیغام اتنا مشکل تو نہیں کہ اس کے لیے پندرہ منٹ کھڑے ہو کر سوچنا پڑے۔" ثوبان مسکرایا اور کمپیوٹر بند کرنے لگا۔ عریشہ بری طرح خجل ہو گئی۔

"تمہارا کالج کیسا جا رہا ہے؟"

"کہیں نہیں جا رہا' وہیں کھڑا ہے۔" عریشہ ہنسی۔

"اور تم؟" ثوبان بھی مسکرا دیا۔

"میں۔۔۔ میں تو بہت آگے نکل گئی ہوں۔" اس نے بے ساختہ کہا۔

"مطلب؟" ثوبان نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"کچھ نہیں۔۔۔ جلدی آجائیں' کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔" عریشہ نظریں چرا کر نیچے اتر گئی۔ وہاں فاطمہ دودھ کے پیالے میں جلیبیاں ڈال رہی تھیں۔

"عرشی! یہ تو ابا کو دے آؤ۔"

عریشہ' فاطمہ کے ہاتھ سے پیالا لے کر بیٹھک میں گئی تو تایا دیکھتے ہی بولے۔

"ساری ڈالی ہیں' یا تمہاری تائی نے اپنے لیے بھی سنبھال لیں؟"

"پتا نہیں' کھانے سے پہلے تول لیجیے گا۔" عریشہ نے پیالا ان کے سامنے میز پر رکھا۔

"دیکھو۔۔۔ ان بے ہدایتوں کے کرتوت' خود تو کوفتے کھائیں گے اور مجھے دودھ جلیبی پر ٹرخا دیا۔"

"ارے' آپ نے تو۔۔۔" حیرت سے عریشہ کا منہ کھل گیا' پھر کچھ بھی کہنا بے فائدہ جانتے ہوئے جملہ ادھورا چھوڑ کر کچن میں آگئی' ڈٹ کر کھانا کھانے کے بعد ہاتھ جھاڑتے ہوئے کہا۔

"تائی! اب تو میں بھی لمبی تان کے سوؤں گی۔"

"ارے۔۔۔ یہ برتن کون دھوئے گا؟" مریم نے لڑاکا انداز میں پوچھا۔

"جس نے آج چھٹی کی تھی۔" وہ مریم کا گال کھینچ کر بھاگ لی۔ پیچھے مریم بڑبڑاتی رہ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

وین نے اسے حسب معمول سڑک پر اتارا تھا۔ سامنے سرسبز کھیتوں کا سلسلہ تھا۔ کھیتوں کے درمیان نکلتی پگڈنڈیاں اور وہ ٹوٹی پھوٹی سڑک' جو روز اسے گاؤں تک لے جاتی تھی۔ یہاں سے اگرچہ گاؤں کے خدوخال واضح ہو رہے تھے' مگر گاؤں کے آخری کونے تک پہنچتے پہنچتے اچھا خاصا فاصلہ بن جاتا تھا۔ اگر کوئی سائیکل سوار یا ریڑھی والا ملتا تو وہ آرام سے اس کے چارے پر بیٹھ کر گاؤں تک پہنچ جاتا تھا۔ نہ ملتا تو چلتے چلتے پاؤں شل ہو جاتے۔ اس نے تھکے تھکے انداز میں دور تک جاتی سڑک کو دیکھا۔ بھوک سے پیٹ میں اینٹھن پڑ رہی تھی۔ آج کالج میں اتنا وقت کہاں ملا کہ دوستوں سے نظر بچا کر ماں کا بیگ میں رکھا اچار پراٹھا ہی کھا لیتا۔ حالانکہ اس کے دوست بھی متوسط گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے' مگر شاید ان کے گھر کبریٰ نہیں ہوتی تھی۔

کبریٰ چچی کا خیال آتے ہی اس کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔

"چل بیٹا ابرار! ماں کا اچار پراٹھا یہیں کھا لے' ورنہ گھر جا کر تو کچھ نہیں ملنے والا۔"

وہ نالہ پھلانگ کر شہتوت کے درخت تلے آبیٹھا اور بیگ سے ٹفن نکال لیا۔ پراٹھا ٹھنڈا تھا' مگر چونکہ مکھن سے بنا تھا' اس لیے نرم تھا اور پھر بھوک کہاں دیکھتی ہے کہ کھانا گرم ہے یا ٹھنڈا۔

خوراک پیٹ میں جاتے ہی پپوٹے بوجھل ہونے لگے۔ اس نے اکتاہٹ سے اس فاصلے کو دیکھا۔ روز کا معمول تھا' مگر آج ٹوٹتے بدن پر تھکاوٹ کا غلبہ کچھ زیادہ ہی تھا۔

"لگتا ہے بخار ہونے والا ہے۔" اس نے اپنا ماتھا چھو کر دیکھا' پھر بیگ سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا۔ خیال تھا کہ تھوڑی دیر ستا کر جائے گا' مگر لیٹتے ہی نیند کا غلبہ ہو گیا۔ آخری خیال جو ذہن میں آیا۔ وہ یہ ہی تھا کہ ماں انتظار کر رہی ہو گی۔

☼ ☼ ☼

جمیلہ نے سارا گوبر سمیٹ کر ایک طرف ڈھیر کیا۔ نلکا چلا چلا کر ساری بھینسوں کو پانی پلایا' تب ہی کبریٰ بالٹیاں اٹھائے آگئی۔ دونوں بھینسوں کو پچکار کر دودھ دھونا شروع کر دیا' مگر اس سارے کام کے دوران بھی جمیلہ کا سارا دھیان گھر کے دروازے کی طرف تھا۔ ابرار جس وقت آتا تھا' اس سے ایک گھنٹہ اوپر ہو گیا تھا۔

"سلام آپاں۔"

"آ بھائی اکرم۔۔۔ بس تھوڑا کام ہی رہتا ہے۔" اکرم اس پورے گاؤں سے دودھ اکٹھا کر کے شہر لے جاتا تھا۔

"کبریٰ بہن! جلدی کر' تجھے پتا بھی ہے' مجھے شہر پہنچتے پہنچتے دیر ہو جاتی ہے۔"

کبریٰ بھری ہوئی بالٹیاں اٹھا کر اس کے قریب چلی گئی۔ اس نے ناپ کر دودھ اپنے ڈرم میں ڈالنا شروع کیا۔ جمیلہ نے بے چینی سے اسے دیکھا۔

"بھائی اکرم! تجھے آتے ہوئے میرا بلو نظر نہیں آیا؟"

کبریٰ نے کھا جانے والی نظروں سے جیٹھانی کو

دیکھا۔
"اس ویلے آوارہ کو کوئی کم ہے، جو گھر واپسی کی جلدی ہو۔ صبح صبح دو پراٹھے ڈکار کے بستہ لٹکا کر چلتا بنتا ہے۔ تو تو شہر بھیج کے بے فکر ہو جاتی ہے کہ پتر کالج جا رہا ہے۔ اب وہاں نہ جانے کیا کیا گل کھلا رہا ہو گا۔"
"کبریٰ! تو میرے پتر کے معاملے میں نہ بولا کر، تیری بڑی مہربانی۔" جمیلہ نے کھٹاک سے دونوں ہاتھ اس کے سامنے جوڑے۔ کبریٰ کا منہ بن گیا۔
"ہاں چنگی گل تجھے ماڑی ہی لگتی ہے۔ ادھر شہر کے لڑکے ایک نمبر کے آوارہ ہوتے ہیں۔ چھپ چھپ کر پتا نہیں کیا کیا پیتے ہیں۔ اللہ جانے یہ بھی پڑھنے جاتا ہے یا...."
"تو کیا ادھر پنڈ میں بھٹی نہیں لگی.... ادھر کے لڑکے سارا دن گلیوں میں گولیاں نہیں کھیلتے۔ ادھر سارے فرشتے جمے ہیں؟ دیکھ کبریٰ! میں تیری ساری کڑوی بات چپ کر کے سن لیتی ہوں۔ پر میرے پتر کے خلاف بات نہ کیا کر۔ اس جیسا پورے پنڈ میں کوئی نہیں، جا کے ماسٹر صاحب سے پوچھ کون ہے، جو شہر کے کالج جا کر پڑھتا ہو۔"
"اتنا مان بھی اچھا نہیں جمیلہ! جب کوئی دھیلا کما کے تیرے ہاتھ پر رکھے گا تب اچھلنا۔ ابھی تو کام کا نہ کاج کا، دشمن اناج کا۔"
"او بھنو! بیبیو!.... پہلے مجھے فارغ کر دو۔ میں نے دودھ لے کر شہر جانا ہے۔" اکرم نے اپنا سر پیٹ لیا۔
کبریٰ نے غصے سے جمیلہ کو دیکھا۔
"یہ ہی اپنے پتر کا صفحہ کھول کر بیٹھ گئی۔ بڑا ہی انوکھا پتر جنا ہے۔ دودھ ڈال کر جلدی آنا۔ ہانڈی چڑھانی ہے۔" کبریٰ نخوت سے کہہ کر احاطے سے نکل گئی۔
جمیلہ نے بڑبڑاتے ہوئے باقی دودھ اکرم کو دیا اور ساتھ ہی اپنا سوال دہرایا۔
"رستے میں کہیں بلّو نظر نہیں آیا؟"
"نہ.... ادھر سے ہی آیا ہوں، مجھے تو کہیں نظر نہیں آیا۔"
"آج تو بڑی دیر لگا دی، کیا ویلا ہو گیا ہے۔" جمیلہ کے لہجے میں تشویش ہی تشویش تھی۔
"آ جائے گا، جوان جہان سمجھ دار پتر ہے تیرا، ایویں فکریں نہ پال۔"
"کیا کروں بھائی! بلّو کے سوا میرا ہے ہی کون؟" جمیلہ نے آہ بھری۔ پھر ایک ہاتھ میں خالی بالٹیاں اور دوسرے میں بھری بالٹی اٹھا کر اندر چلی گئی۔ فضا میں اکرم کے موٹر سائیکل کی گڑگڑاہٹ ابھری اور معدوم ہو گئی۔ جمیلہ نے اپلوں کی آگ جلا کر دودھ ابالنے کے لیے رکھا اور خود چپکے سے باہر نکل آئی۔ ماں کے دل کو قرار کہاں تھا؟ تیز تیز قدموں اور پھولی سانس کے ساتھ سڑک تک پہنچی۔ دور دور تک سڑک خالی تھی۔ جمیلہ اچھی طرح جانتی تھی۔ اس وقت تک شہر سے آنے والی آخری ویگن بھی جا چکی تھی۔
"کہاں رہ گیا میرا بلو۔" اس کا دل ڈوبنے لگا۔ کچھ لمحے یوں ہی کھڑی رہنے کے بعد پلٹی۔ اس کے سامنے کپاس کے وسیع کھیتوں پر پھیلی شام کی زردی سرمئی رنگ میں گھل رہی تھی۔ آسمان پر پرندوں کی واپسی کا سفر شروع تھا۔ اسے لگا وہ اس پوری کائنات میں اکیلی ہے۔ بالکل قبرستان کے کنارے ایستادہ ٹنڈ منڈ درخت کی طرح ویران اور تنہا۔ تنہائی کا یہ احساس اتنا جان لیوا تھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ تب ہی اس کی بھٹکتی نگاہیں شہتوت کے درخت سے ٹکرا کر جھک گئیں۔
"ہائے میرا بلو۔" وہ کلیجے پر ہاتھ رکھ کر اس کی طرف لپکی، جو گھٹنے سکوڑے اپنے بیگ پر سر رکھے سو رہا تھا۔ جمیلہ نے اسے جھنجوڑ دیا۔
"وے.... بلو! اٹھ.... ادھر کیوں سو رہا ہے۔ ہائے میں مر گئی، تجھے تو بہت تیز تاپ ہے۔"
"اماں! تو یہاں کیا کر رہی ہے۔" وہ اٹھ بیٹھا۔
"ماں صدقے.... ماں واری، تجھے دیکھنے آئی تھی، تیری آنکھیں کتنی سرخ ہیں اور پنڈا آگ بنا ہوا ہے۔ میرا دل اسی لیے تڑپ رہا تھا، چل اٹھ، تجھے گھر لے جاؤں۔"
"ارے اماں! میں چل سکتا ہوں۔" اگرچہ اس کا

جسم ٹوٹ رہا تھا، مگر وہ ماں کی تسلی کے لیے ہنس کر کھڑا ہو گیا۔ جمیلہ نے اس کا بیگ اور دوسرے ہاتھ سے بازو پکڑ لیا۔ گویا وہ ابھی گر جائے گا۔
تھوڑی دور آگے جا کر اسے فضلو اپنی ریڑھی کے ساتھ مل گیا۔ جو کھیتوں سے واپس جا رہا تھا۔ دونوں ماں، بیٹا ریڑھی پر سوار ہو گئے۔ جمیلہ نے اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا اور پڑھ پڑھ کر پھونکنے لگی۔

☼ ☼ ☼

عادلہ نے آٹا اور بچا ہوا سالن فریج میں رکھا۔ برتن دھو کر ریک میں لگائے۔ اگرچہ وہ دو ہی جی تھے، پھر بھی کام نکلتے رہتے۔ سلیب صاف کرتے ہوئے خیال آیا کہ اب یہ چھوٹے موٹے کچن کے کام انہیں عریشہ کے ذمے لگانے چاہئیں تاکہ وہ بھی تھوڑی بہت گھرداری سیکھ لے۔ کام کر تو لیتی تھی مگر اکلوتی ہونے کی بنا پر لاڈلی اور نخریلی بہت تھی۔
وہ سلیب صاف کر کے کمرے میں آئیں تو عریشہ ہاتھ میں کتاب تھامے کسی غیر مرئی نقطے پر نظریں جمائے بیڈ پر نیم دراز کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔
"عرشی! چائے پیو گی؟" انہوں نے بستر ٹھیک کرتے ہوئے پوچھا۔
"جی.... آج تو ٹھنڈ بھی بہت ہے۔" وہ چونکی پھر کتاب رکھ کر کھڑی ہوئی۔ "میں بنا لیتی ہوں۔"
وہ دو کپ بنا کر لائی تو عادلہ لحاف اوڑھے اونگھ رہی تھیں۔ وہ بھی ان کے لحاف میں دبک گئی۔ حسب معمول ماں، بیٹی نے بہت سی باتیں کرنا تھیں اور انہی باتوں کے دوران عریشہ نے اچانک سوال کر دیا۔
"امی نانا نے کیا دیکھ کر آپ کی شادی اس خاندان میں کی تھی؟"
"کیوں؟" عادلہ نے حیرت سے بیٹی کا چہرہ دیکھا۔
"بہت فرق ہے میرے ننھیال اور ددھیال میں۔ رہن سہن، بات چیت، عادات۔ وہاں سب پڑھے لکھے ہیں، یہاں سب دکان دار۔ صرف ثوبان ہی ہے، جو اپنے کیریئر کے بارے میں سنجیدہ ہو، ورنہ تو چل سو چل۔ کیا ہوا؟ اتنے غور سے کیوں دیکھ رہی ہیں؟"
وہ بات کرتے کرتے گڑبڑائی۔ عادلہ اسے دیکھے جا رہی تھیں۔ آج انہیں احساس ہوا تھا، بیٹی اب بڑی ہو گئی ہے۔ کالج جانے لگی ہے سو سوالات کی نوعیت بھی بدل گئی تھی۔
"ہم چھ بہنیں تھیں۔ سفید پوش، مگر پڑھا لکھا گھرانا۔ پیسہ نہیں تھا اور اس زمانے کے ڈھنگ کچھ اور ہی تھے۔ سو ابا نے شریف اور باکردار لڑکا دیکھا اور بیاہ دیا۔ تمہارے ابو واقعی ان لوگوں سے مختلف تھے۔ پھر میں نے بھی ٹیچنگ کر لی۔ ان کا جنرل اسٹور بھی اچھا چلنے لگا۔ سو مل بانٹ کر بہت اچھا گزارا ہو جاتا تھا۔ تمہارے ابو بہت شائستہ انداز و اطوار کے مالک تھے۔"
انہوں نے مختصراً بتایا۔
"میری شادی کرتے ہوئے بھی آپ یہی دیکھیں گی؟" یہ سوال کرتے ہوئے عریشہ کے سامنے صرف اور صرف ثوبان کا چہرہ تھا۔
"ظاہر ہے، روپیہ پیسہ نصیب کی بات ہے۔ اصل چیز شائستہ اطوار اور مضبوط کردار ہے، لیکن عرشی...! شرم کرو، لڑکیاں اپنی شادی کی بات خود نہیں کرتیں۔" آخر میں انہوں نے گھورا۔
"آپ تو میری سہیلی ہیں۔" عریشہ نے مسکہ لگایا۔
"اب سو جاؤ، پھر کہتی ہو نیند پوری نہیں ہوئی، صبح کالج بھی جانا ہے۔" انہوں نے خالی کپ اس کی سمت بڑھایا۔
"میں نہیں جا رہی.... کالج میں پڑھائی تو ہوتی نہیں۔" وہ سستی سے بولی۔
"پڑھائی پڑھنے والوں کے لیے ہوتی ہے، جب کلاسز ہی بنک کر دیتی ہو تو پتا کیا چلے، استاد کیا کچھ پڑھا گئے ہیں۔" عادلہ نے لتاڑا۔
"مریم بھی نہیں جا رہی۔" وہ منمنائی۔
"عریشہ! مجھے خوشی ہو گی، اگر تم دوسروں کی عقل پر بھروسا کرنے کے بجائے اپنی عقل پر کرنا سیکھو۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ بے زار ہو کر لیٹتی۔ پھر فوراً سیدھی ہوئی۔ "امی کالج میں فن فیئر ہے۔"

"تو۔۔۔؟"

"نیا سوٹ لینا ہے۔"

"صبح ہونے دو گی؟" انہوں نے اس کی بے وقت فرمائش پر گھورا۔

"پنک کلر میں۔" اس کے لبوں پر شوخ و شریر سی مسکراہٹ ابھری۔ عادلہ بھی مسکرا کر رہ گئیں۔

☼ ☼ ☼

گھر میں ماں کے سوا کوئی سنگی ساتھی نہ تھا۔ سو بچپن سے عادت تھی، اسکول سے آتے ہی ادھر بھاگتی۔ اب بھی کالج سے آتی تو پہلے تایا کے گھر جاتی۔ برآمدے کے تخت پر تائی کے گھٹنے سے لگی بانو آپا کو دیکھ کر اس نے سلام کیا۔ ان کی گود میں پانچ ماہ کا فہد سو رہا تھا۔

"کیسی ہو عرشی! اچھی کیسی ہیں؟ ماشاء اللہ کیسا رنگ روپ نکھارا ہے، کیا لگاتی ہو؟ اپنی مریم کو بھی کوئی ٹوٹکا بتا دو، کیسی عجیب سی شکل ہوتی جا رہی ہے۔" بانو آپا کو شروع سے عادت تھی، ایک ہی وقت میں کئی سوال کرتیں۔ اگلا جواب سوچتا ہی رہ جاتا اور وہ دوسرا موضوع پکڑ لیتیں۔ کچن سے ٹرے لے کر نکلتی مریم نے غصے سے بہن کو دیکھا اور تنک کر بولی۔

"کیوں، مجھے کیا ہوا ہے؟"

"ارے چھوڑو بھی اسے۔" تائی نے بے زاری سے ہاتھ ہلایا۔ "تم کیا کہہ رہی تھیں؟"

"وہی ہما کی شادی ہے۔" انہوں نے اپنی نند کا نام لیا۔ "اب سسرال میں ناک نہ کٹوا دینا اماں!"

"بانو آپا! آپ ہر بار یہ ہی کرتی ہیں، کبھی نند کی شادی، کبھی دیور کی، اچھا خاصا خرچ کروا دیتی ہیں۔" مریم نے ٹرے درمیان میں رکھی۔ کباب، دہی بڑے، فروٹ چاٹ، بانو آپا کی اچھی طرح خاطر تواضع نہ ہو تو خفا ہو جاتی تھیں۔

"تمہیں کوئی تکلیف ہے؟ کل کو بیاہ کر جاؤ گی تو پتا چلے گا، سسرال میں میکے کی قدر کیسے کروائی جاتی ہے۔ دیور کی شادی میں میری ساس کا سوٹ نہیں تھا۔ اپنے پاس سے ہزار روپیہ ملانا پڑا۔ اماں! اس بار مقابلہ دیورانی کے ساتھ ہے۔ بڑے بج گج کے ساتھ آرہے ہیں، اس کے میکے والے، بڑے کھاتے پیتے لوگ ہیں۔ میری ہیٹی نہ کروا دینا۔ گڈو کے ریڈی میڈ کپڑے لینا، کہیں ٹوٹے نہ رکھ دینا، چار سوٹ ہما کے اور ساتھ دس ہزار رکھ دینا۔"

"وہ کس لیے؟" تائی بلبلائیں۔

"کراکری کی کوئی چیز نہیں دینی؟" بانو نے ماں کا تلملانا دیکھا ہی نہیں۔

"آپا! کباب کھاؤ۔" اس سے قبل کہ وہ مطالبے میں کچھ اور اضافہ کرتیں۔ مریم نے فہد اس کی گود سے لے لیا۔ بانو نے ٹرے سامنے کی اور شروع ہو گئیں۔ کباب ختم ہونے تک تائی سر پکڑ کر بیٹھ گئی تھیں عریشہ نے ہنسی دبائی اور چپکے فروٹ چاٹ کھاتی رہی۔

"آپا! اتنا کھڑاک تو بڑی نند کی دفعہ بھی نہ ہوا تھا۔" فاطمہ بھی فارغ ہو کر وہیں آ بیٹھی۔

"تب میری دیورانی نہیں آئی تھی۔" وہ اطمینان سے گویا ہوئیں۔

"تو اس کی سزا ہم کو بھگتنی ہے؟" مریم بڑبڑائی۔ بانو آپا کو پتنگے لگ گئے۔ عریشہ انہیں جھگڑتا چھوڑ کر اوپر چلی آئی مگر کمرا خالی تھا۔ عریشہ کو لگا کمرا ہی نہیں اس کا دل بھی خالی ہو گیا ہے۔ وہ یقیناً "کمبائن اسٹڈی کے لیے اپنے دوست کے گھر جا چکا تھا۔ پہلے بھی جاتا رہتا تھا لیکن اس بار عریشہ کی بے چینی کا عالم ہی کچھ اور تھا۔

"یا اللہ! یہ محبت کتنا بے بس کرتی ہے۔" عریشہ نے آزردگی سے سوچا۔ کچھ دیر ثوبان کی کرسی پر بیٹھی رہی۔ نیچے آئی تو مطلع صاف ہو چکا تھا۔ مریم غائب تھی۔ فاطمہ کام سمیٹ چکی تھی اور بانو آپا کہہ رہی تھیں۔

"اماں! ذرا فون کر کے اظہر کو بھی کھانے کا کہہ دیں۔ انہوں نے مجھے لینے تو آنا ہی ہے۔ آپ کو تو کبھی خیال نہیں آیا کہ داماد کو کھانے پر ہی روک لیں۔ میری دیورانی کے میکے والوں نے۔۔۔"

تائی بوکھلا کر فون کرنے اٹھ گئیں۔ اظہر بھائی کے آنے کا مطلب تھا کہ اب گھر میں اچھی خاصی ہڑبونگ مچے گی۔ عریشہ چپکے سے کھسک آئی۔ تایا ڈیوڑھی میں چلا رہے تھے۔

"سارے کباب خود ہی ڈکار جاؤ، مجھے نہ پوچھنا۔"

"ارے بھیج دیتی ہوں تمہیں بھی۔"

"تو نے اپنے میکے سے منگوائے ہیں، جو مجھ پر رعب جماتی ہے۔"

"ابا۔۔۔ ابا!" فرید باہر سے بھاگا آیا۔ "وہ چاچا ناصر آیا ہے۔ پانچ سو روپے ادھار مانگ رہا ہے۔"

"ہاں۔۔۔ اپنی ماں سے پانچ سو لے کر اس کو دے آ۔ بے چارے کے گھر میں آٹے کے لیے بھی پیسے نہیں ہیں۔"

"کہاں سے دے دوں، تمہاری لاڈلی آئی بیٹھی ہے، شادی اور خرچے کا بلاوا لے کر۔ ان کا پورا کروں یا ان غریب مفت خوروں میں بانٹوں۔"

"اچھا چل دے دے ثواب ملے گا۔"

"میں نے کما لیا ثواب، میرے تو اپنے سیاپے پورے نہیں پڑتے۔ جا کہہ دے، ابا گھر پر نہیں ہیں۔"

"اماں! پکی بات ہے؟" فرید نے پوچھا۔

"ٹھہر۔۔۔ میں تجھ پر مہر لگا کر بتاتی ہوں کہ کچی بات ہے یا پکی۔" حمیدہ نے جوتی اٹھائی تو وہ باہر کی طرف بھاگا، تایا کو تاؤ آگیا۔

"تیرے جیسی عورتیں جہنم میں جاتی ہیں۔"

"ہاں جنت تو تُو نے ہی جا کر آباد کرنی ہے۔" حمیدہ بڑبڑائیں۔

"یہ گھر ہے یا مچھلی بازار، جب گھر آؤ، بس شور شرابا ہوتا رہتا ہے۔" نعمان آتے ہی دہاڑا۔

تایا ظفر کے ساتھ ساتھ حمیدہ تائی بھی دبک گئی تھی۔ وہ بڑبڑاتا ہوا باتھ روم میں گھس گیا۔

☼ ☼ ☼

"آنٹی! کھانا لگا دوں؟" طیبہ نے کمرے میں جھانکا۔ آج کھانا اس نے بنایا تھا۔ سو بہو رانی کے چہرے پر بے زاری صاف دکھتی تھی۔ نبیلہ نے کتاب بند کرتے ہوئے عینک اتاری۔

"محسن آگیا؟"

"ابھی تک تو نہیں آیا۔"

"آجائے تو اکٹھے کھاتے ہیں۔" وہ مسکرائیں۔

"اگر وہ نہ آیا تو ہم بھوکے بیٹھے رہیں گے؟" طیبہ میں مروت نام کی کوئی چیز تھی ہی نہیں۔

"نہیں، بھوکی کیوں بیٹھو گی، ایسا کرو، تم کھا لو، میں اور محسن اکٹھے کھا لیں گے۔" نبیلہ نے نرمی سے کہا۔ تب ہی طیبہ کے قریب سے محسن نے جھانکا۔ وہ غالباً ماں کا آخری جملہ سن چکا تھا۔

"ہم حاضر ہیں۔ کھانا لگا دیا جائے۔"

"لو۔۔۔ محسن بھی آگیا۔" نبیلہ نے کتاب اور عینک سائیڈ ٹیبل پر رکھی۔

"بھابھی! بہت سخت بھوک لگی ہے؟"

"تمہارے آفس کے رستے میں کوئی ریسٹورنٹ نہیں ہے؟"

محسن نے منہ کھول کر ماں کو دیکھا۔ وہ مسکراہٹ دبا گئیں۔ طیبہ اپنی بات کہہ کر کمرے سے چلی گئی تھی۔

"لگتا ہے آج جمال بھائی کا فون نہیں آیا۔" محسن نے شرارت سے سرگوشی کی۔

"جاؤ، فریش ہو کر آجاؤ۔ میں میز پر انتظار کر رہی ہوں۔" نبیلہ بیٹے کے کندھے پر چپت لگا کر جانے لگیں۔ محسن نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"اب کیسی طبیعت ہے؟"

"ہاں، دوا لے لی تھی۔ اب بہتر ہوں۔" وہ تسلی دے کر چلی گئیں۔ محسن فریش ہو کر آیا تو کھانا لگ چکا تھا۔ ماں انتظار میں بیٹھی تھی۔

"بھابھی نہیں کھائیں گی؟"

"شاید نہیں۔" انہوں نے محسن کی پلیٹ میں چاول ڈالے۔ دو نوالوں کے بعد ہی محسن کا منہ بن گیا۔ کھانے کے معاملے میں وہ یوں بھی بہت نخریلا تھا۔ کھانا اچھا بنا ہو، ذائقے دار ہو، خواہ دال یا سبزی ہی کیوں

نہ ہو' کچھ ماں کے ہاتھ کے ہی پکے کھانوں کا عادی تھا۔ سو کھانے میں کمی دیکھ کر فوراً بول اٹھا۔

"یہ کیا ہے امی! چاول گلے نہیں ہیں اور سبزی میں ابھی پانی ہے۔ اچھی طرح بھنی بھی نہیں ہے۔"

"آہستہ بولو بیٹا! آج کھانا طیبہ نے بنایا ہے۔"

"تب ہی بھابھی خود نہیں کھا رہیں۔ ہمارے سامنے تو ساری چیزیں ابال کر نمک مرچ چھڑک کر رکھ دیتی ہیں۔ گویا کھانا انسانوں کو نہیں' جانوروں کو کھانا ہے۔" محسن نے چمچہ پٹخ کر پلیٹ کھسکائی۔

"اچھا۔ شور کیوں مچا رہے ہو' ہو جاتا ہے کبھی کبھار۔" نبیلہ نہیں چاہتی تھیں کہ طیبہ کے کان میں کوئی بات پڑے۔ وہ بات بڑھا دیتی اور پردیس میں بیٹھے جمال کو پریشان کرتی۔

"کبھی کبھار نہیں ہمیشہ۔ جب بھی بھابھی کو کھانا بنانا پڑتا ہے' وہ یہ ہی حرکت کرتی ہیں۔ مجھے نہیں کھانا' میں باہر سے کچھ کھا لوں گا۔" وہ کھڑا ہو گیا۔

نبیلہ کا دل خراب ہو گیا۔ بیٹا آفس سے سارے دن کا تھکا ہارا آیا تھا اور ڈھنگ کا کھانا بھی نصیب نہ ہوا۔ انہیں طیبہ سے زیادہ خود پر غصہ آیا۔ اب اتنی بھی طبیعت خراب نہ تھی کہ وہ کھانا نہ بنا سکتیں۔ بس یوں ہی کبھی کبھار کسی ذمہ داری سے جان چھڑانے کو دل چاہتا تھا۔ سوچا تھا' بہو آئے گی تو سارا گھر اس کے حوالے کر کے بے فکر ہو جائیں گی' مگر یہاں تو فکروں میں اضافہ ہی ہوا تھا۔ وہ پھر بھی طیبہ کو موقع دے دیتی تھیں کہ اس کا شوہر یہاں نہیں رہتا تھا اور طیبہ خوب ان کی نرمی سے فائدہ اٹھاتی۔

"اور یہ کچے چاول کھا کے آپ کی طبیعت ٹھیک رہے گی' رہنے دیں' میں آپ کے لیے بھی کچھ لیتا آؤں گا۔" محسن کو خیال آیا۔

"ارے بیٹا! میں نے جتنا کھانا تھا کھا لیا۔ باہر کی چیزیں مجھے یوں بھی ہضم نہیں ہوتیں' ضرورت محسوس ہوئی تو کوئی پھل لے لوں گی۔"

"اوکے۔" محسن باہر نکل آیا' پھر رک گیا' چھوٹے سے گیراج کے پار گیٹ کے پاس طیبہ پڑاوصول کر رہی تھی۔ گیٹ بند کر کے پلٹی تو محسن کو کھڑا دیکھ کر ٹھٹک گئی' پھر ڈھٹائی سے بولی۔

"کھاؤ گے؟"

"شکریہ! آپ کے ہاتھ کا بنا مزے دار کھانا کھا کر آ رہا ہوں۔" وہ بگڑ کر بولا' طیبہ کندھے اچکا کر گزر گئی۔ محسن کلس کر رہ گیا۔ پھر گیٹ کھول کر باہر نکل آ گیا۔

٭ ٭ ٭

"اب باہر بھی آ جا جمیلہ! سو کام پڑے ہیں' یا پتر کی پٹی سے ہی لگی رہے گی۔" اصغر کے سامنے روٹی رکھتے کبریٰ نے بے زاری سے آواز لگائی تو اصغر چونک گیا۔ وہ پینتالیس سالہ لمبا تڑنگا جھلسی ہوئی رنگت والا محنت کش کسان تھا۔ طبیعت کا اکھڑ اور کانوں کا کچا تھا۔ خاص طور پر گھر کے معاملات میں کبریٰ کی آنکھوں سے دیکھتا اور کبریٰ کے دماغ سے سوچتا تھا۔

"بلو کو کیا ہوا؟"

"ذرا سا تاپ ہے۔ زنانیوں کی طرح چارپائی پکڑ کر بیٹھ گیا' اور ماں پٹی سے لگی بیٹھی ہے۔ جیسے ننھا کاکا ہے گودی سے ہی نہیں نکل رہا۔"

"بک بک کم کر' پانی نہیں دینا کیا؟" اصغر نے جھڑکا۔

"ہاں' میں نوکرانی مل گئی ہوں' مفت کی۔" وہ بڑبڑاتی گھڑے سے پانی بھر لائی۔ "سوچا جوان ہو گا تو چاچے کا بازو بنے گا' پر اسے تو پڑھائیوں نے لے لیا۔ نہ پڑھائیاں ختم نہ ہوں' نہ کسی کم لگے' میں کہتی ہوں' کوئی خبر بھی لے لو شہر میں پڑھنے ہی جاتا ہے ناں۔"

"پتا نہیں اللہ نے زنانیوں کے منہ میں زبان کیوں ڈالی تھی۔ کیا پٹھے کترنے والی مشین چلتی ہو گی' جو ان کی زبان چلتی ہے۔" اصغر نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔

"اٹھ جاتی ہوں' نہیں اچھی لگتی تو۔" کبریٰ تلملا کر اٹھی اور گھر سے باہر نکل گئی۔ اصغر نے روٹی کھائی' گلاس میں بچے پانی سے انگلیوں کی پوریں دھوئیں اور اٹھ کر اندر آ گیا۔ بلو کی آنکھیں بند تھیں اور جمیلہ اپنا دوپٹہ بھگو بھگو کر اس کے چہرے اور سینے پر پھیر رہی تھی۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔ گویا روتی رہی ہے۔ بلو کا چہرہ بخار کی شدت سے دہک رہا تھا۔

"او۔۔۔ اٹھ جواناں! تو کیا ذرا سے بخار سے ڈھے گیا ہے۔"

بلو نے بمشکل آنکھیں کھول کر چاچے کو دیکھا۔

"اصغر! اس کا پنڈا دیکھ' تاپ کم نہیں ہو رہا۔"

"دوا لائی تھی؟" اصغر نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔

"ہاں دے دی ہے۔" جمیلہ نے روتے ہوئے کہا۔

"دی ہے تو آرام آ جائے گا' اور تو بھی مرد بن مرد' ایسے چھوٹے موٹے بخار مردوں کا کچھ نہیں بگاڑتے۔" وہ لاپروائی سے کہہ کر باہر نکل گیا۔ جمیلہ کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

"اپنا پتر ہوتا تو دیکھتی' ایسے بے فکری سے جاتا ہے۔"

"اماں!" بلو آنکھیں کھول کر مسکرایا۔

"ماں صدقے۔"

"اب تو ان کی باتوں اور رویوں سے پریشان نہ ہوا کر۔ عرصہ ہوا ابا کے مرنے کے بعد سے یہ ہی کچھ تو دیکھ رہے ہیں۔"

"بس چپ۔۔۔ ایسی باتیں نہ سوچ' دماغ پر زور پڑے گا' ابھی تیری ماں زندہ ہے۔"

"ہاں اماں! تمہارا ہی آسرا ہے۔"

"نہ۔۔۔ آسرا صرف رب سوہنے کا۔"

"تھوڑا پانی دو۔"

"ابھی لائی۔"

"تائی۔۔۔ تائی! بلو کو کیا ہوا ہے؟" بندرہ' سولہ سال کی الھڑ سی لڑکی دوپٹے کی بکل مارے جھجکتی ہوئی اندر آئی۔ دوپٹے کے نیچے سے بالوں کی لمبی اور مریل سی چوٹی جھانک رہی تھی۔

"بشریٰ! کدھر نکلی تھی؟ تیری ماں کب سے ڈھونڈ رہی ہے۔"

"میں نے کدھر جانا ہے' رانو کے گھر تھی۔" اس نے لاپروائی سے بتایا۔ وہ کبریٰ اور اصغر کی چھوٹی بیٹی تھی۔ بڑی والی ناصرہ کو کبریٰ نے پندرھویں سال ہی بیاہ دیا تھا۔ وہ اب اوپر تلے کے تین بچے لیے پھر رہی تھی۔ اصغر کی صرف دو ہی بیٹیاں تھیں۔ اس ناتے بلو کو گھر میں خاصی اہمیت ملنا چاہیے تھی' مگر کبریٰ کچھ نہ کچھ ایسا کرتی رہتی کہ دونوں ماں' بیٹے کونے میں لگے ہوئے تھے۔

"زیادہ بخار ہے؟" بشریٰ نے ہمدردی سے بلو کو دیکھا۔ اسے اپنا تایا زاد اچھا لگتا تھا کیونکہ اس کی سکھیاں کہتی تھیں اس کی ماں اس کی شادی بلو سے ہی کروائے گی۔

"بشریٰ! ایک پیالا دودھ کا لا دے' بلو کو پاپے کھلا کے دوا دے دوں۔"

جب سے ان کی بھینس نے دودھ دینا چھوڑا تھا' جمیلہ کو یوں ہی منتوں سے شے مانگنی پڑتی۔ بیٹے کے لیے مانگنے میں اسے کوئی شرم بھی نہ آتی تھی مگر کبریٰ کئی باتیں سناتی۔ ہاں بشریٰ کی بات اور تھی۔

"ابھی لائی تائی!" بشریٰ باہر بھاگ گئی۔

"اماں! اس طرح فقیروں کی طرح نہ مانگا کر' زمین میں میرا بھی حصہ ہے۔" بلو کو ماں کا لہجہ ناگوار گزرا۔

"ہاں پر' بھینس تو کبریٰ کی ہے' داج میں لائی تھی۔"

"ہاں مگر۔۔۔"

"بس چپ' کہا نا' ابھی دماغ پر زور نہ دے' تاپ سر کو چڑھ جائے گا۔"

جمیلہ نے پیار سے ڈانٹا تو اس نے لب بھینچ کر آنکھیں موند لیں۔

٭ ٭ ٭

ساری رات نبیلہ کی طبیعت خراب رہی' پیٹ میں رہ رہ کر درد اٹھتا رہا۔ انہوں نے محسن کو نہیں جگایا۔ خود ہی گھریلو ٹوٹکے آزماتی رہیں۔

"امی! آج ناشتا نہیں ملے گا؟" محسن آفس جانے

کے لیے تیار تھا۔

"طیبہ نہیں اٹھی؟" وہ کچھ مضمحل سی تھیں۔

"نہیں... بھابھی تو... آپ کی طبیعت ٹھیک ہے؟" محسن نے تشویش سے دیکھا۔ پاس آکر ماتھا چھوا۔

"ہاں ٹھیک ہوں' چلو تمہارے لیے ناشتا بنا دوں۔" نبیلہ اٹھنے لگیں۔

"آپ بالکل ٹھیک نہیں ہیں' مت اٹھیں۔ پہلے ہی کہا تھا وہ کھانا مت کھائیں' مگر آپ بھی' اب کئی دن تک پرابلم چلے گی۔"

"محسن! تم خوامخواہ پریشان ہو رہے ہو' ابھی ٹھیک ہو جاؤں گی۔" وہ نہیں چاہتی تھیں کہ محسن آفس میں بھی پریشان رہے۔

"آپ لیٹ جائیں' میں آتا ہوں۔" وہ انہیں زبردستی لٹا کر چلا گیا۔ اور جب واپس آیا تو ناشتے کی ٹرے ساتھ تھی۔ انہیں بیٹے پر پیار آگیا' وہ غصیلا' منہ پھٹ سا لڑکا بہت حساس اور محبت کرنے والا تھا۔ چائے کے ساتھ ٹوٹے ہوئے فرائی انڈے اور سلائس تھے۔ دونوں ماں' بیٹا ناشتا کر رہے تھے' جب طیبہ آگئی۔

"خیریت..." نبیلہ جگہ جگہ کھانے کے برتن لے کر پھرنے کے خلاف تھیں۔ ناشتا' کھانا سب میز پر ہوتا تھا۔

"کچھ نہیں' بس ذرا پیٹ میں گڑبڑ تھی' معدہ بھی..."

"تو مجھے جگا دیا ہوتا' میں کوئی دلیہ وغیرہ بنا دیتی۔" احسان جتاتا سرسری لہجہ۔

"جو آپ بناتیں' وہ دلیہ ہوتا؟" محسن نے تلخی سے کہا۔

"کیا مطلب؟" طیبہ کو آگ لگ گئی۔

"پلیز امی! اگر آپ کھانا نہیں بنا سکتیں تو کسی عورت کا بندوبست کرلیں۔" اس نے چائے کا آخری گھونٹ بھرا۔

"تمہاری شادی نہ کردوں؟" طیبہ کے تیور دیکھ کر نبیلہ نے بات بدلنے کی کوشش کی۔

"ہاں مگر پہلے لڑکی کے ہاتھ کا کھانا ضرور کھا لیجیے گا۔" وہ طنزیہ انداز میں کہہ کر ماں کے سر پر بوسہ دیتا ہوا چلا گیا۔

"یہ... یہ اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے؟" طیبہ بگڑی۔

"کچھ نہیں بیٹا! بس جذباتی ہے' بنا سوچے سمجھے بول اٹھتا ہے۔" نبیلہ نے اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ "چھوٹا سمجھ کر نظرانداز کر دیا کرو۔"

"اتنا بھی چھوٹا نہیں ہے۔" وہ پاؤں پٹخ کر چلی گئی اور نبیلہ اک طویل سانس لے کر رہ گئیں۔

☼ ☼ ☼

ساجدہ نے صبح صبح چھاپہ مارا' کیونکہ اسے خبر مل گئی تھی کہ بانو کی نند کی شادی میں اماں کیا' کیا خریداری کر رہی ہیں' اور یہ اطلاع دینے والی خود بانو تھی۔ سو اب گھر مچھلی بازار بنا تھا۔ ساجدہ کے دونوں بچے آپس میں گتھم گتھا تھے۔ تیسرا گود میں بھاں بھاں کر رہا تھا۔ اور ساجدہ باپ کے گھٹنے سے لگی جلے دل کے پھپھولے پھوڑ رہی تھی۔ گھر میں سب سے بڑی ہونے کے ناتے اس کی باپ سے زیادہ بنتی تھی' اور بانو کی اپنی ماں سے' اس لیے آپس میں دونوں کی ٹھنی رہتی۔

"ساری زندگی یہ بانو اماں کی چہیتی رہی' ہمیشہ اسی کا سوچا اور وہ بھی جب دل چاہتا ہے' منہ پھاڑ کے مانگ لیتی ہے۔ اس کا جہیز بھی مجھ سے اچھا تھا۔ فرمائشیں کر کر کے ہر شے بنائی۔ مجھے آج تک میرا میاں طعنے دیتا ہے' میں کیا سوتیلی ہوں؟"

"تیرے سارے کام سوتیلے والے ہی ہیں' اب بیٹھی ہے' باپ کے گھٹنے سے لگی میری شکایتیں کرنے۔" تائی آپہنچی۔

"تو اب کیا اپنے باپ سے بھی دکھ سکھ نہ کروں؟" اس نے گود والے کو جھانپڑ رسید کیا۔

"نہ تجھے کیا نہ دیا؟ یہ بتاؤ۔" حمیدہ چمک کر بولیں۔

"میرے دیور اور نند کی شادی ہوئی کیا دیا... وہی دو سڑے ہوئے سوٹ' وہ بھی گھر سے نکال کر۔"

"اس وقت حالات ہی ایسے تھے' میں کیا کرتی۔" حمیدہ نے جواب دیا۔

"دیکھا ابا! تو اب کیا قارون کا خزانہ نکل آیا ہے؟ اتنا فرق کرتی ہیں اماں' ہم دونوں بیٹیوں میں۔" اس نے پھپک پھپک کر رونا شروع کر دیا۔

"بڑی سنگ دل عورت ہے بھئی یہ' صاف کہے دے رہا ہوں میں' بانو کے لیے جتنا کیا تھا اتنا ہی ساجد کے لیے ہو گا۔" ابا نے حکم صادر کیا۔

"تا... تو کیا تم نے میری ہتھیلی پر پیسے رکھنے ہیں؟"

"تیری زبان تو..."

ساجدہ کی بات اندر کہیں گم ہو گئی۔ دونوں آپس میں جو تیچیں لڑانے لگے۔ ثوبان گھر آیا تو بد مزا آگیا۔

"السلام علیکم آپا! کب آئیں؟" وہ مختصر سے سوال کر کے چچی کی طرف آگیا۔

عریشہ کپڑے دھو کر پھیلا رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی چہرے پر روشنیاں بکھر گئیں۔

"آپ کہاں غائب ہو گئے تھے؟" اس نے عادلہ کا سوٹ بالٹی میں ہی چھوڑ دیا۔

"یار! گھر میں پڑھا نہیں جاتا' سو اک دوست کے ساتھ ہاسٹل شفٹ ہو گیا تھا اور تم یہ اتنی ٹھنڈ میں کپڑے کیوں دھو رہی ہو؟" ثوبان نے اس کی سرخ ہوتی ہتھیلیاں دیکھیں۔

"اب کپڑے دھونے کے لیے گرمیوں کا انتظار کروں؟" وہ کھلکھلائی۔ اسے دیکھتے ہی ساری کلفت دور ہو گئی تھی۔

"میری جاب ہو گئی تو سب سے پہلے ایک ملازمہ کا بندوبست کروں گا۔" وہ تار پکڑے عین سامنے کھڑا تھا۔

"وہ تو اپنے گھر کے لیے رکھیں گے ناں۔" عریشہ نے نل بند کیا۔

"تم ہم سے الگ ہو؟" ثوبان کا لہجہ گمبھیر اور مدھم ہو گیا۔ تب ہی اندر سے عادلہ نکلیں تو ثوبان ان کی طرف مڑ گیا اور عریشہ اپنے دل کی دھڑکنیں سنبھالتی رہ گئی۔

"گھر میں شور کیسا ہے؟" عادلہ پوچھ رہی تھیں۔

"ساجدہ آپی اور ان کے بچے آئے ہیں' میں تو آج خوامخواہ گھر آگیا۔"

"ایسے تو نہ کہو' بہنیں کبھی کبھار تو آتی ہیں۔"

"آپ بھی جانتی ہیں' میرا فائنل ایر ہے' اب کوئی کمی بیشی رہ گئی تو وہ ساری زندگی پر محیط ہو جائے گی اور مجھے اس ماحول سے نکلنا ہے۔"

"صرف خود نکلنا ہے... اور جو تم سے وابستہ لوگ ہیں۔" عادلہ مسکرائیں۔

"میری زندگی میں تبدیلی آئی تو ان پر خود بخود اثر انداز ہو گی۔"

دونوں باتیں کرتے اندر چلے گئے' عریشہ نے بے اختیار اپنی پسند پر فخر کیا۔ ثوبان سارے گھر سے مختلف تھا۔ اس میں کچھ خاص تھا۔ شاید آگے بڑھنے' کچھ بدلنے کا جذبہ۔

"لیکن کیا وہ بھی مجھے پسند کرتا ہے' کیا وہ جانتا ہے کہ میں عریشہ جمیل اس کے بغیر زندگی گزارنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔" وہ بے چین سی ہو گئی۔

"تم ہم سے الگ ہو؟" اسے ثوبان کی بات یاد آئی تو کچھ ڈھارس سی ہوئی۔

"یقیناً" وہ مجھے پسند کرتا ہے' لیکن اس جملے سے یہ تو نہیں پتا چلتا کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے' اگر وہ کسی اور کو پسند کرتا ہوا تو... ؟ وہاں یونیورسٹی میں تو اتنی ساری لڑکیاں ہوتی ہیں' خوب صورت' طرح دار... بے چینی اتنی بڑھی کہ وہ سب چھوڑ چھاڑ اندر چلی آئی۔ عادلہ نے اسے دیکھتے ہی کہا۔

"عرشی! چائے ہی بنالو۔"

"چائے کی ضرورت تو اس وقت عرشی کو ہے' دیکھیں! کیسے بھیگ رہی ہے۔"

عریشہ نے بے اختیار ثوبان کو دیکھا۔ وہ اسی کو دیکھ رہا تھا۔ عریشہ کی نگاہ جھک گئی۔

(کچھ تو ہے' یہ جو ان کہی سی ہے' وہ میرے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور سوچتا ہے' فکر کرتا ہے' ایک وقت

آئے گا کہ اظہار بھی کرے گا۔)

☼ ☼ ☼

"مریم! اری او مریم!" حمیدہ نے آواز لگائی۔ ساتھ ہی وہ شاپر سے کپڑے نکال نکال کر دیکھ رہی تھیں اور عادلہ سے مشورہ کر رہی تھیں کہ مزید کیا کچھ چاہیے۔ دونوں ابھی ابھی بازار سے آئی تھیں۔ عادلہ کا بہت بار جی چاہا کہ انہیں اس اسراف سے روکیں، مگر اپنی جٹھانی کی عادت سے بھی واقف تھیں اس لیے خاموش رہیں۔

"ساجدہ کب واپس گئی؟" عادلہ نے پوچھا۔

"صبح ہی نکل گئی تھی۔ جاتے ہوئے تین ہزار بھی لے گئی۔"

"چلیں! کوئی بات نہیں، والدین بیٹیوں پر ساری زندگی خرچ کرتے ہی رہتے ہیں۔" عادلہ نے متانت سے کہا۔

"ہاں ساری زندگی ان ہی بیاہی بیٹیوں کے چونچلے پورے کرتی رہیں گی ہماری اماں۔ ہمارے تو کوئی ارمان ہی نہیں ہیں۔" مریم پھولے منہ کے ساتھ آکھڑی ہوئی۔ شادی کے لیے اس کے کپڑے نہیں بنے تھے، سو اس کا مزاج برہم تھا۔

"ایسا کر، میری کھال کھنچوا کر سلوا لے اپنا سوٹ۔ اب یہی کسر رہ گئی ہے۔" حمیدہ کا ضبط جواب دے گیا۔

"بھابھی! اس لیے تو اعتدال اور میانہ روی کا حکم ہے۔" عادلہ نے موقع سے فائدہ اٹھایا۔ "لیکن ہماری نمود و نمائش کی عادت نے شادی جیسے مقدس فریضے کو بھی بار بنا دیا ہے۔"

"ہاں تم یہ تقریریں کر سکتی ہو۔ ایک ہی اولاد ہے، جو چاہے اس پر خرچ کرو۔ مجھ سے پوچھو عنبر کے خرچے کیسے پورے کرتی ہوں۔" انہوں نے ترخ کر کہا۔ عادلہ کے پاس خاموش ہونے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

"میں شادی پر نہیں جاؤں گی۔"

"نہ جاؤ۔" حمیدہ نے بے مروتی سے کہا۔

"اماں!" مریم روہانسی ہو گئی۔

"دیکھ مریم! میرے پاس کوئی پیسا نہیں ہے۔ وہ پرانے کپڑے پڑے ہیں پہن کر جا سکتی ہے تو چل ورنہ پڑی رہ گھر میں۔"

"وہ آؤٹ آف فیشن کپڑے......"

"یہ مجھے نہیں پتا۔" حمیدہ نے آرام سے کہہ کر سامان سمیٹنا شروع کر دیا۔ مریم پاؤں پٹختی اندر چلی گئی۔

"عرشی سے بھی کہو تیاری کر لے، ساتھ جائے گی۔"

"اسے رہنے دیں، وہ کیا کرے گی۔" عادلہ نے ٹالنا چاہا۔

"جو ڈھول ہم نے بجانے ہیں، وہی جا کر عرشیہ بجا لے گی۔" وہ پہلے ہی چڑی بیٹھی تھیں۔

"میں تو اس لیے کہہ رہی تھی۔ بانو کے سسرال والوں کا مزاج عجیب سا ہے۔ کہیں......"

"ارے گھر سے تو نہیں نکال دیں گے۔ بچی سب کے ساتھ جائے گی تو ہنس بول لے گی بس۔ تمہاری تو ویسے بھی ہمیشہ یہی کوشش رہی کہ عرشیہ ددھیال والوں سے دور رہے۔"

"بانو کے سسرال والے عرشی کے ددھیال والے تو نہ ہوئے۔" عادلہ مسکرائیں۔ عرصہ ہوا، سسرال والوں کی تلخ و شیریں وہ یونہی مسکرا کر ٹال جاتی تھیں۔

"تم تو بات پکڑ لیتی ہو۔ اچھا! تمہارے پاس کچھ پیسے ہیں؟"

"پیسے؟" عادلہ گڑبڑائیں۔ (ایک اور ادھار؟)

"دیکھو اب یہ نہ کہہ دینا کہ نہیں ہیں۔ آخر تم دو جانوں کا خرچا ہی کیا ہے۔ کچھ نہ کچھ تو رکھا ہو گا۔" وہ حمیدہ تھیں، سامنے والے کو یوں گھیرتیں کہ انکار کی گنجائش ہی نہ رہتی۔ ساری عمر گزر گئی عادلہ کو انہیں سمجھنا نہیں آیا۔

"جی...." وہ عادلہ ہچکچائیں۔

"تو بس ادھار دے دو۔ یہ شادی نبٹ جائے تو واپس کر دوں گی۔"

یہ بات تو عادلہ بھی اچھی طرح جانتی تھیں کہ ان روپوں کی واپسی کی امید بے کار ہے۔

"جی۔ عرشی کے ہاتھ بھجواتی ہوں۔" وہ اک طویل سانس لے کر اٹھ گئیں۔

☼ ☼ ☼

کچھ لمحے سکون کی تلاش میں وہ گھر سے نکل آیا۔ چلتے چلتے کیکر کے پاس خشک کنویں کے قریب رک گیا، چار دن وہ بیمار ہو کر گھر کیا رہا، کبریٰ نے گویا اس کی جان کھالی تھی۔ نجانے کیوں اسے لگا تھا کہ وہ بہانہ بنا رہا ہے۔

"کیا زندگی ہے، فضول اور بے کار۔" اس نے کنویں کی گہرائی میں جھانک کر یاسیت سے سوچا۔ "زندگی پہلے تو ایسی نہ تھی۔ جب تک ابا زندہ تھے۔"

اس نے ان دنوں کی خوشگواریت کو پوری طرح محسوس کرنے کی کوشش کی۔ تب کبریٰ ابھی اتنی بدزبان نہ تھی۔ ابا کو بہت شوق تھا کہ اس کا بلو پڑھ لکھ جائے۔ وہ ہمیشہ کہتے "میں یہ نہیں چاہتا کہ وہ پڑھ لکھ کر افسر بنے۔ بھلے! اپنی زمین سنبھالے مگر علم ضرور حاصل کرے۔" ابا کے مرنے کے بعد شاید ان کا خواب، یہ ارمان بھی مر جاتا، مگر یہاں جمیلہ آڑے آگئی۔ اس نے ہر لمحے بلو کو یہ باور کرایا کہ اسے پڑھنا ہے۔ باپ کی خواہش کو پورا کرنا ہے۔ تب ہی تو اس کا شہر کے کالج میں داخلہ کروا دیا۔ وہ اپنے گاؤں سے پڑھنے کے لیے شہر جانے والا واحد نوجوان تھا۔ جہاں گاؤں کے لوگ اس پر فخر کرتے، وہیں کبریٰ اسے ذلیل کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتی۔ پڑھنا لکھنا اسے بے کار کا کام لگتا۔ وہ چاہتی تھی کہ ابرار پڑھائی چھوڑ کر اپنے چاچا کا ہاتھ بٹائے، کیونکہ وہ تنہا زمینوں کو سنبھال رہا تھا۔ اس خواہش میں اگر خلوص تھا تو صرف اپنے شوہر کے لیے۔

"اے بلو! تو یہاں کیا کر رہا ہے؟" بشریٰ کی آواز پر ابرار کا جی چاہا سر پیٹ لے۔ "کیا مصیبت ہے؟" وہ تنک کر بولا۔

"ہا۔ تو مجھے مصیبت کہہ رہا ہے۔" بشریٰ نے پورا منہ کھول لیا۔

"میں گھر سے نکلا تھا، کچھ لمحے سکون سے گزارنے کے لیے۔" ابرار نے دانت پیسے۔

"کیا مطلب ہے، گھر میں تجھے سکون نہیں ملتا۔" بشریٰ نے کمر پر ہاتھ رکھا۔

"مجھے کوئی شوق نہیں ہے، وہاں بیٹھ کر چاچی کی باتیں سننے کا۔" ابرار نے ایک چھوٹی سی کنکری کنویں میں اچھالی۔

"اماں! تجھے باتیں سناتی ہے؟" اس نے اچنبھے سے پوچھا۔

"ہاں......"

"میں اماں کو بتاؤں گی۔" بشریٰ نے دھمکی دی۔

"ضرور بتانا، جتنی باتیں وہ سناتی ہے۔ اگر میں سنانے پر آیا تو ہوش ٹھکانے آجائیں گے۔ یہ زمین اکیلے چاچے کی نہیں ہے۔ اس میں میرا بھی حصہ ہے۔ بتا دینا اپنی اماں کو......"

وہ تلخی سے کہہ کر ناک کی سیدھ میں چلتا چلا گیا۔ بشریٰ منہ کھولے اسے دیکھتی رہی، جو راستے میں آئے ہر پتھر کو ٹھوکر سے اڑا رہا تھا۔

"لگتا ہے بخار دماغ کو چڑھ گیا ہے۔ اس کے دماغ کا علاج بھی کروانا پڑے گا۔ اماں کو جا کر بتاتی ہوں۔" وہ واپس گھر کی طرف بھاگی۔

☼ ☼ ☼

"دیکھ لیں امی حضور! عین وقت پر آیا ہوں۔" محسن نے آتے ہی کہا۔

"ہاں...... میں بھی تیار بیٹھی ہوں۔" نبیلہ نے اپنا پرس اور ایک شاپنگ بیگ اٹھایا۔

"ابھی آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ تھوڑے دن ٹھہر کر چلی جاتیں۔" محسن نے ان کے ہاتھ سے بیگ پکڑا۔

"بھئی یہ تم ہر وقت میرے پیچھے نہ پڑے رہا کرو۔ ٹھیک ہوں میں گھر بیٹھے بیٹھے تو یوں بھی دل

گھبرانے لگتا ہے۔" وہ جھنجلائیں۔

"ہاں، طیبہ بھابھی کے ساتھ رہتے ہوئے یہ ممکن ہے۔"

"شریر۔" نبیلہ نے گھورا تو وہ ہنس دیا۔

"اچھا تم گاڑی نکالو۔ میں طیبہ کو بتا آؤں۔" وہ دوپٹہ ٹھیک کرتے ہوئے طیبہ کے بیڈ روم میں آئیں۔ وہ ریسیور کان سے لگائے بات کر رہی تھی۔

"دل لگانے کے لیے یہاں ہے کیا؟ جمال! میں تنگ آگئی ہوں۔"

نبیلہ لاشعوری طور پر رک سی گئیں۔

"گھر کے کام کیسے کروں۔ جو کام بھی کرتی ہوں۔ اس میں سو سو نقص نکالے جاتے ہیں۔ ہر کام پر اعتراض کیا جاتا ہے۔ امی تو ایک طرف، محسن بھی باز نہیں آتا۔ میں بڑی بھابھی ہوں، مگر مجال ہے جو ذرا عزت کرتا ہو۔ ہر بات منہ پر مار دیتا ہے۔ روٹیاں ایسی کیوں ہیں۔ چاول کچے ہیں۔ سبزی نہیں بھنی، بتائیں کیا میں پھوہڑ ہوں؟ اپنے گھر میں کوکنگ کی ماہر سمجھی جاتی تھی اور یہاں۔۔۔"

وہ رک کر جمال کی بات سننے لگی۔

"جانتی ہوں؟ ہر گھر کے اپنے طور طریقے ہوتے ہیں، مگر آپ کے گھر کے طریقے میری سمجھ میں نہیں آتے۔" نبیلہ ایک طویل سانس لے کر واپس پلٹ گئیں۔ محسن ان کا گاڑی میں انتظار کر رہا تھا۔ وہ خاموشی سے جا کر بیٹھ گئیں۔

"کیا ہوا؟" محسن نے چونک کر پوچھا۔

"کچھ نہیں، چلو۔۔۔" وہ بدقت مسکرائیں۔

☼ ☼ ☼

"مریم!" عرشیہ نے پکارا۔

"ہوں۔۔۔" مریم اپنے ہاتھوں اور پیروں پر ابٹن ملنے میں مصروف تھی۔ دونوں چھت پر تھیں۔

"محبت کیسے ہوتی ہے۔۔۔؟"

"ایں۔۔۔" مریم نے سر اٹھا کر اسے دیکھا، وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبی تھی۔

"بتاؤ نا۔۔۔ محبت کیسے ہوتی ہے؟" عرشیہ نے اصرار کیا۔

"تم نے رس ملائی بنانے کی ترکیب پوچھی ہوتی تو میں بتا دیتی۔ اب مجھے کیا پتا محبت کیسے ہوتی ہے۔ ویسے تم کیوں پوچھ رہی ہو؟" مریم نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا۔

"ویسے ہی معلومات میں اضافے کے لیے۔" عرشیہ نے کندھے اچکا کر کہا۔

"عرشی! پتا ہے میرا بھی دل چاہتا ہے، کوئی مجھ سے محبت کرے بالکل فلمی ہیرو جیسی مجھ پر مر مٹے، میرے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہو۔ میں راتوں کو اٹھ کر آہیں بھروں۔۔۔ چوری چوری باتیں، ملاقاتیں کروں اور آخر میں ہم دونوں گھر سے بھاگ جائیں۔" وہ جوش سے بولتی چلی گئی۔

"ربش۔۔۔ ایسی سڑک چھاپ قسم کی محبت کرنی ہے تمہیں؟" عرشیہ نے گھورتے ہوئے کہا۔

"تمہیں پسند نہیں آئی تو نہ سہی۔" مریم نے کندھے اچکائے، پھر ابٹن والا برتن اٹھا کر نیچے جھانکا۔

"فاطمہ! چائے بن گئی کیا؟"

"ہاں میں آواز دینے ہی والی تھی۔ آجاؤ۔۔۔" فاطمہ نے جواب دیا۔

دونوں نیچے آگئیں۔ فاطمہ نے برآمدے کے تخت پر چائے اور گھر کے بنے بسکٹ رکھے تھے۔

"اپنے باپ کو دے دی؟" حمیدہ نے پوچھا۔

"جی امی!" فاطمہ نے جواب دیا، وہ اپنا کپ لیے فرید کو قابو کیے بیٹھی تھی، جو بے زار چہرے کے ساتھ کتابیں کھول رہا تھا۔

"فاطمہ آپی! میں بھی آپ سے بسکٹ بنانا سیکھوں گی۔" عرشیہ نے کہا تو تائی جھٹ سے بولیں۔

"لو، سیکھنا کیا ہے، جب دل چاہے فاطمہ بنا دے گی۔"

"سیکھنے دیں سسرال میں کام آئے گا۔" مریم ہنسی۔

"لو! عرشی کو کہاں جانا ہے۔ یہیں رہے گی میرے

پاس۔" حمیدہ نے پیار سے عرشیہ کو دیکھا۔

عرشیہ کے ہاتھ سے بسکٹ چھوٹ کر کپ میں گر گیا۔ اس نے تائی کو دیکھا، وہ آرام سے چائے میں بسکٹ ڈبو ڈبو کر کھا رہی تھیں۔ عرشیہ نے باری باری سب کو دیکھا۔ فاطمہ اسے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ عرشیہ نے گڑبڑا کر سر جھکا لیا۔ دل نے خوش گوار دھڑکنوں کا راگ چھیڑ دیا۔

"تو کیا تائی بھی یہی چاہتی ہیں؟"

تب ہی دروازے پر بیل ہوئی، فرید کتاب پھینک کر بھاگا۔ فاطمہ "ارے۔۔۔ ارے" کہتی رہ گئیں۔ اس نے بھاگ کر دروازہ کھول دیا۔

"لو آگئیں نصیحت بی بی!" حمیدہ نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔ پھپھو نبیلہ کے ساتھ محسن کو دیکھ کر تینوں لڑکیوں نے سر پر دوپٹے لے لیے۔ حمیدہ نے بھی زبردستی کی مسکراہٹ لبوں پر سجالی۔

"بڑے دنوں کے بعد چکر لگایا۔ اور یہ محسن۔۔۔ اسے تو کبھی مامی کی یاد ہی نہیں آئی۔" حمیدہ نے شکوہ کیا۔

"کئی دنوں سے آنا چاہ رہی تھی۔ کبھی محسن فارغ نہیں ہوتا تھا تو کبھی میں بیمار پڑ جاتی۔ آج سوچا ہو ہی آؤں، موسم بدل گیا ہے۔ کئی دنوں سے لڑکیوں کے لیے کپڑے خرید رکھے تھے۔"

نبیلہ کی ہمیشہ سے عادت تھی۔ ان کے لیے کچھ نہ کچھ خریدتی رہتیں۔ بقول ان کے "اس طرح وہ بیٹیوں کی کلر فل شاپنگ کا مزا لیتی ہیں۔"

"محسن بھائی! آپ بیٹھیں نا۔" مریم کو خاموش کھڑے محسن کا خیال آیا، تو اس نے جلدی سے کرسی سامنے کی۔

"شکر ہے، پھپھو کے علاوہ کچھ نظر تو آیا۔ ورنہ میں تو سوچ رہا تھا، کھڑے کھڑے واپس جانا پڑے گا۔" وہ شرارت سے کہہ کر بیٹھ گیا۔ "اور سنائیں عرشی بی بی! کیا حال چال ہیں۔" وہ عرشیہ سے مخاطب ہوا۔

"فٹ فاٹ۔" وہ مسکرائی۔ محسن سے زیادہ فری نہیں تھی۔

"اصغری بی بی! آج چائے نہیں ملے گی؟" محسن نے عین سامنے بیٹھی فاطمہ کو چھیڑا، جو کاپی پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔ اس نے نظریں اٹھا کر محسن کو دیکھا۔

"محسن! میری بیٹی کو تنگ مت کرو۔" نبیلہ نے گھورا۔

"میں نے اسے اکبری تو نہیں کہا، اصغری کہا ہے تعریف ہی کی ہے، کیوں بچو!" اس نے عقب میں کھڑی عرشیہ اور مریم سے تائید چاہی۔

"میں لاتی ہوں۔" فاطمہ مسکراہٹ دباتی اٹھ گئی۔

"اور لڑکی! تم ابھی تک یہیں کھڑی ہو۔ چھوٹی مامی کو بلاؤ اکٹھے چائے پیتے ہیں۔" عرشیہ محسن کی بات سن کر ماں کو بلانے چل دی۔

"بھائی جان کدھر ہیں؟" نبیلہ نے پوچھا۔

"نماز پڑھنے گئے ہیں۔ پتا نہیں عوری آتی بھی ہے یا نہیں۔" حمیدہ کے جواب پر محسن کو زور سے ہنسی آگئی۔

☼ ☼ ☼

توبہ۔۔۔ توبہ ایسی مہنگائی کہ مت پوچھو۔ بیٹھے بٹھائے پورے پندرہ ہزار خرچ ہو گئے۔ اوپر سے لڑکیوں کے چونچلے۔۔۔ اگر عادلہ ادھار نہ دیتی تو پتا نہیں کیسے پورا ہوتا۔ نعمان نے تو کہہ دیا تھا اور ایک پیسا نہیں دوں گا۔"

نبیلہ نے بے اختیار عادلہ کو دیکھا۔ وہ نظریں چرا گئیں۔ نبیلہ نے طویل سانس لے کر حمیدہ کو دیکھا، جو ابھی تک مہنگائی کے رونے رو رہی تھیں۔

"ہاں، بات تو کچھ ایسی ہی ہے اسی لیے انسان کو چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانا چاہیے۔ اب کتنی بار تو سمجھا چکی ہوں کہ سوچ سمجھ کر خرچ کیا کریں۔ تھوڑی بچت کی عادت ڈالیں۔ ابھی دو لڑکیاں بیاہنی ہیں۔ ثوبان کی تعلیم۔۔۔ نعمان کی شادی۔۔۔ خواہشات کا کیا ہے۔ چیونگم کی طرح جتنا مرضی چباتے جاؤ۔ آخر میں بدمزا ہی کرتی ہیں۔ اب دکھاوے کے چکروں میں بجٹ تو نہیں

خراب کرنا چاہیے' لڑکیوں کو بھی سمجھایا کریں۔ اس مقابلے بازی میں میکے والوں کا کباڑا نہ کریں۔"

نبیلہ نے رسانیت سے سمجھایا۔ حمیدہ دل ہی دل میں کلس کر رہ گئیں' تب ہی بات بدل دی۔ "یہ محسن کہاں چلا گیا؟"

"اسے آفس جانا تھا۔ واپسی پر مجھے لے جائے گا۔"

"اچھا میں کچھ کھانے کا بندوبست کرلوں۔" حمیدہ اٹھیں۔

"جی۔۔۔" نبیلہ نے انہیں اندر غائب ہونے تک دیکھا۔ پھر عادلہ کی طرف مڑیں۔

"میں نے تمہیں منع بھی کیا تھا کہ اس طرح ادھار مت دیا کرو۔ تمہیں پتا بھی ہے کہ وہ کبھی واپس نہیں کرتیں۔"

"میں کیا کروں نبیلہ! انکار کرکے ان کے طعنے کون سنے۔"

"عادلہ حد کرتی ہو۔ خود مختار ہو۔ اپنے گھر میں رہتی ہو۔ اپنا خرچ کرتی ہو۔ پھر اتنا دبنے کی کیا ضرورت ہے۔" وہ جھنجلائیں۔

"نبیلہ! تم جانتی ہو۔ جہالت کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔"

"یہ کوئی لاجک نہیں ہے۔ عرشیہ کی شادی' تعلیم کیا بندوبست کیا ہے تم نے۔ بتاؤ تم میں اور حمیدہ میں فرق کیا ہے۔ وہ اس طرح اڑاتی ہیں' تم اس طرح۔۔۔"

"اچھا چھوڑو اس قصے کو۔" عادلہ نے بات ٹالنے کی کوشش کی۔

"میری مانو تو کمیٹی ڈال کر عرشیہ کا زیور وغیرہ بنوالو' ورنہ اس طرح تو کچھ جمع نہیں کرپاؤگی۔" نبیلہ کا مشورہ عادلہ کے دل کو لگا۔

"ہاں' یہ بات تو ٹھیک ہے۔"

"تو بس اسی مہینے سے شروع کردو۔" نبیلہ کے لیے عادلہ کو سمجھانا آسان تھا۔

☼ ☼ ☼

"بلو کا بخار اتر گیا؟" اصغر نے پراٹھے پر پگھلتے مکھن کو دیکھتے پوچھا۔ کبریٰ موٹے موٹے پراٹھے بنا رہی تھی۔ جب سے سردی کا آغاز ہوا تھا۔ سب چولہے کے پاس بیٹھ کر ناشتا کرتے تھے۔

"نہیں' دماغ کو چڑھ گیا ہے۔" کبریٰ نے تپ کر کہا۔

"ہیں؟ مجھے بتایا کیوں نہیں۔" وہ اٹھنے لگا۔

"بیٹھ جا' کیسے بھتیجے کے لیے ہڑکتا ہے۔ کچھ نہیں ہوا اسے' بس دماغ خراب ہے۔"

"تو سیدھی طرح نہیں بتاسکتی۔ پٹھی مت ہے تیری بھی۔" اصغر گرجا۔

"چار جماعتیں کیا پڑھ لی ہیں۔ ہمارے سر چڑھنے لگا ہے۔ بڑھ بڑھ کر باتیں سنانے لگا ہے۔ بشریٰ کو بلا کر پوچھ' کل کیا کیا طعنے دیے ہیں۔" اس نے گرما گرم پراٹھا چنگیر میں رکھ کر اس کی طرف بڑھایا۔ ساتھ میں دہی کا پیالا اور مٹی کی کٹوری میں اچار بھی موجود تھا۔ اصغر اس میں سے مرچ کا اچار الگ کرنے لگا۔

"کیا کہتا ہے؟"

"بشریٰ کو کہتا ہے' تیری ماں مجھے طعنے دیتی ہے۔ اس زمین میں میرا بھی حصہ ہے۔ چاچا اکیلا نہیں ڈکار سکتا۔"

"اس نے یہ کہا؟" اصغر کی تیوری چڑھی۔

"نہیں' میں جھوٹ بول رہی ہوں۔"

"بلوا۔۔۔ بلو۔" اصغر دھاڑا۔

"اچھی طرح دماغ درست کرنا۔" کبریٰ کو موقع مل گیا تھا۔

"جی چاچا!" بلو باورچی خانے کے دروازے میں آکھڑا ہوا۔ وہ کالج جانے کے لیے تیار تھا۔

"کل بشریٰ سے کیا بکواس کی تھی؟"

بلو نے کبریٰ کو دیکھا۔ یقیناً" اچھی خاصی لگائی بجھائی کی تھی۔ کل غصے میں جو کچھ کہا تھا۔ اس پر پچھتایا بھی تھا' فی الحال اسے چاچا کی ضرورت تھی۔ اپنا حق' عنایت سمجھ کرلینا منظور تھا' کم از کم اس وقت تک جب تک وہ خود کمانے کے قابل نہ ہوجاتا۔

"تیرا زمین میں حصہ ہے؟" اصغر نے پوچھا۔

"کیا نہیں ہے؟" ابرار نے سنبھل کر نگاہ اٹھائی۔

"اوئے تیری۔۔۔"

"چاچا! گالی مت دینا۔" ابرار نے انگلی اٹھائی' ایک لمحے کے لیے اصغر کو احساس ہوا۔ اصغر بوڑھا ہوگیا ہے اور بلو جوان' وہ اب بے عزتی نہیں سہارے گا' اس احساس نے اسے جھنجلا دیا۔

"مجھے انگلی دکھاتا ہے۔۔۔" اچار کی کٹوری اڑتی ہوئی ابرار کے سینے سے ٹکرائی اور اس کی سفید شرٹ کو داغ دار کرتی نیچے گر کر ٹوٹ گئی۔ ابرار ذرا سا پیچھے کو لڑکھڑایا' ایک لمحے کو کبریٰ بھی ششدر رہ گئی۔ اتنے شدید رد عمل کی توقع نہ تھی۔ یوں تو کئی مرتبہ شکایتیں لگا کر ابرار کو ڈانٹ پڑوائی تھی۔

مگر آج کچھ نیا ہوا تھا۔

آج ابرار نے سر جھکا کر گالیاں نہیں سنی تھیں۔ اس کی انگلی اٹھی تھی۔ آج انگلی اٹھی تھی تو کل۔۔۔

کبریٰ توے پر پڑا پراٹھا بھول گئی۔

اصغر مغلظات بک رہا تھا اور ابرار۔۔۔

کبریٰ کو ابرار کی شرارے برساتی آنکھوں سے خوف آیا۔

شور سن کر جمیلہ اور بشریٰ بھاگتی ہوئی آئیں۔

"کیا ہوا؟"

"سمجھالے۔۔۔ سمجھالے۔۔۔ اس سانپ کو۔۔۔ مجھے انگلی دکھاتا ہے۔ میں تو اس کی۔۔۔" اصغر لپکا' کبریٰ نے تیزی سے اٹھ کر آٹے سے بھرے ہاتھوں سے اصغر کا بازو پکڑلیا۔ "جانے دے' رہنے دے' بچہ ہے۔"

جمیلہ دل پر ہاتھ رکھے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ ابرار کی سفید شرٹ سرسوں کے تیل میں لتھڑی تھی۔

"بلو! تو چل باہر۔۔۔ چل ادھر سے۔۔۔" جمیلہ اسے کھینچنے لگی تو بلو نے اپنا بازو چھڑایا۔ ایک نفرت بھری نگاہ سب پر ڈالی اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا۔

جمیلہ اس کے پیچھے بھاگی' مگر وہ لمحوں میں بیرونی دروازہ پار کر گیا۔ وہ وہیں چوکھٹ پر بیٹھ کر رونے لگی۔

کبریٰ اصغر کا غصہ ٹھنڈا کررہی تھی اور بشریٰ ایک طرف تھر تھر کانپ رہی تھی۔

"اگر بلو گھر نہ آیا تو۔۔۔"

☼ ☼ ☼

"نہیں۔۔۔ نہیں اپنے سیاپے پورے کرلے۔ میرا کیا ہے؟ کسی نے جوتے پر پالش پھیرنے کی زحمت گوارا بھی نہیں کی۔ گھر میں رکھی کوڑے کے ٹوکری جتنی اہمیت نہیں۔"

تایا ظفر کو ویسے بھی بہت شوق تھا' ایسے کسی بھی موقع پر گھر والوں کے ہاتھ پاؤں پھلانے کا۔ فاطمہ سب کام چھوڑ کر بھاگی۔ ہاتھ میں چمکتے دمکتے جوتے تھے۔

"دیکھیں نا ابا! میں نے تو صبح سے آپ کے جوتے چمکا کر رکھے ہیں۔"

"تو چھپا کر رکھنے کی کیا ضرورت تھی؟" انہوں نے گھورا۔

"چھپائے نہیں' وہ تو ادھر۔۔۔"

"فاطمہ! میں نئی بنیان لایا تھا۔" نعمان کی آواز پر وہ ادھر لپکی۔

"ہاں پہلے ان کو دولہا بنادو۔ جتنا کماتا ہے۔ اس سے دگنی آنکھیں دکھاتا ہے۔" وہ بڑبڑانے لگے۔ گھر میں عجیب سی ہڑبونگ مچی ہوئی تھی۔ ثوبان اوپر سے تیار ہوکر خوشبو میں بسا نیچے آیا۔

"ماشاء اللہ! میرا بیٹا ہیرو لگتا ہے۔ آج تو لوگ جل مریں گے۔۔۔ ہے کوئی اس جیسا۔" حمیدہ سارے کام چھوڑ کر اس کی بلائیں لینے لگی۔ نعمان نے مڑ کر ثوبان کو دیکھا اور مسکرایا۔

"ہاں اماں! یہ تو ٹھہرا تیرا افسر بیٹا! اسی کی بلائیں لے گی۔"

"نہیں۔۔۔ تُو بھی کسی سے کم نہیں۔" ماں نے تسلی دی۔ ساتھ ہی پکارا۔ "مریم او مریم! جلدی سے مرچیں لا' اپنے بیٹوں سے وار دوں۔"

"اماں! میں عرشیہ سے جوتے لینے جارہی ہوں۔" مریم نے جواب دیا' اور عرشیہ کی طرف آگئی۔

وہ میک اپ کر رہی تھی۔ مریم ٹھٹک گئی۔ میرون اور گلابی امتزاج کے جدید اسٹائل سوٹ میں وہ غضب ڈھا رہی تھی۔

"تم نے یہ سوٹ کب لیا؟"

"امی کے ساتھ جا کر لائی تھی۔" عرشیہ مڑ کر مسکرائی۔

"شادی کے لیے؟"

"ہاں۔"

"مجھے دکھایا ہی نہیں۔" اس کے لہجے میں حسد ہی حسد تھا۔

"ابھی کل ہی تو لائے ہیں۔ تم اس وقت مہندی لگوانے گئی تھیں۔" عرشیہ نے کانوں میں وہی ٹاپس ڈالتے ہوئے بتایا' جو عادلہ نے اسے میٹرک پاس کرنے پر بنوا کر دیے تھے۔

"تم تیار ہو گئیں؟"

"ہوں... تم سے اسٹریپ والے بلیک سینڈل لینے آئی تھی۔"

"اوہ... وہ تو میں نے پہن رکھے ہیں۔" عرشیہ نے پاؤں سامنے کیا۔ "تم کوئی اور دیکھ لو براؤن..."

"نہیں سوٹ پرانا ہے تو میں سینڈل بھی پرانے پہن لوں گی۔" مریم کا مزاج مکمل طور پر برہم ہو چکا تھا۔ اسے اپنی ساری تیاری بے کار لگنے لگی تھی۔

"جیسے تمہاری مرضی..." عرشیہ کندھے اچکا کر میرون اور گلابی چوڑیاں پہننے لگی۔ مریم پاؤں پٹختی وہاں سے چلی گئی۔

"عرشی! اب جلدی آجاؤ' میں جا رہی ہوں۔" عادلہ اندر آئیں' پھر ٹھٹک گئیں۔

"بری بات عرشیہ! کنواری لڑکیاں اتنا میک اپ نہیں کرتیں۔" انہوں نے نرمی سے ٹوکا۔

"امی! زیادہ تو نہیں ہے۔" عرشیہ نے آئینہ دیکھا۔

"ہاں... بس لپ اسٹک ہلکی کر لو۔ زیادہ میک اپ سے نیچرل بیوٹی دب جاتی ہے اور میری بیٹی ویسے ہی بہت پیاری ہے۔"

"اوکے..." عرشیہ اپنی تعریف پر خوش ہو گئی۔

"اچھا... میں جا رہی' تم بھی جلدی آؤ۔"

"بس چوڑیاں پہن لوں..." وہ جلدی جلدی چوڑیاں پہننے لگی۔ تھوڑی تنگ تھیں۔ اس لیے دقت ہو رہی تھی۔ دوسری طرف اٹھنے والا شور بتا رہا تھا کہ سب گاڑی میں بیٹھنے والے ہیں۔ چوڑیاں پہن کر عرشیہ نے ایک نظر آئینے میں خود کو دیکھا۔

"آج غضب ڈھا رہی ہو۔" آئینے نے سرگوشی کی۔

"اچھا... تو کیا آج وہ کچھ بولے گا؟"

آئینہ خاموش ہوا' مگر اس میں ثوبان کا عکس بولنے لگا۔

عرشیہ گھبرا کر پلٹی۔ ثوبان اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔

کچی کلیوں سی نازک لڑکی گلابی رنگ اوڑھے

آنکھوں میں خوابوں کی دھنک

لبوں پر شرمیلی مسکان۔

جھکی نگاہ بتاتی تھی کہ وہ ثوبان پر اپنا آپ ہار چکی ہے۔

اس کی انا اور خود پسندی بلند ہونے لگی۔

"آج تو اتنی پیاری لگ رہی ہو کہ کوئی بھی ساری دنیا کے خزانے تم پر لٹانے کو تیار ہو جائے۔" وہ پلٹ کر ڈریسنگ ٹیبل پر رکھی اشیا کو خوامخواہ چھیڑنے لگی۔

"مجھے کسی کے خزانے کی ضرورت نہیں۔" عرشیہ کو لگا یہی لمحہ ہے۔ اگر اس لمحے میں ثوبان بندھ گیا تو ساری عمر کے لیے قید ہو جائے گا۔

"تو..." وہ قریب آیا۔ اتنا قریب کہ اس کے پرفیوم کی مہک عرشیہ کے حواسوں پر طاری ہونے لگی۔

"کبھی کبھی کسی کے کہے چند الفاظ انمول خزانوں سے بڑھ کر ہوتے ہیں۔"

"کون سے الفاظ؟" وہ مستقل انجان بن رہا تھا۔

"آپ کے پاس میرے لیے چند الفاظ بھی نہیں؟" عرشیہ نے ایک ادا سے کہا۔

ایک پل کو ثوبان حیران رہ گیا۔

اتنی بے باکی' اتنی جرأت' اتنا کھلا اظہار...

"تو سنو..." وہ اس کے کان پر جھکا۔

"کوئی وعدہ نہیں ہم میں

نہ آپس میں بہت باتیں

نہ ملنے میں بہت شوخی

نہ آخر شب مناجاتیں

مگر اک ان کہی سی ہے

جو ہم دونوں سمجھتے ہیں۔"

"عرشیہ! وہ..." عادلہ اپنی دھن میں اندر آئیں۔ ثوبان بدک کر پیچھے ہٹا۔

عرشیہ گھبرا کر مڑی تو ہاتھ لگنے سے پرفیوم کی شیشی نیچے گر گئی۔

عادلہ ششدر سی کھڑی بھول گئیں کہ کیا کہنے آئی تھیں۔

پرفیوم نیچے گر کر ٹوٹ گیا۔

خوشبو چار سو بکھرنے لگی۔

خوشبو جو سارے راز افشا کر دیتی ہے۔

"کب سے کہہ رہا ہوں' اب نکلو بھی۔ مگر ان لڑکیوں کی تیاری بھی" ثوبان بوکھلا کر باہر نکل گیا۔ عادلہ ہکا بکا تھیں' بچپن سے ایک ساتھ پلے بڑھے تھے۔ یوں کھڑے ہو کر بات کرنا انوکھا نہ تھا' مگر انوکھے تو دونوں کے انداز تھے۔

"اور کتنی دیر ہے؟" عادلہ نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"بس آ رہی ہوں۔" عرشیہ دوپٹہ اوڑھتی باہر کھسک گئی۔ شادی میں انجوائے کرتے اس نے ایک بار بھی نہیں سوچا کہ وہ اپنی ماں کے لیے فکروں کے نجانے کون کون سے در کھول آئی ہے۔

☼ ☼ ☼

گڑ والی چائے کی پیالی سے اٹھتی بھاپ معدوم ہو گئی تھی۔

ابھی ابرار نے ایک گھونٹ نہیں لیا تھا۔ ماسٹر صاحب عشا کی نماز پڑھ کر آئے تو ٹھٹک گئے۔ وہ ابھی تک نہیں گیا تھا۔ ماسٹرنی نے بتایا تھا۔ اس نے نماز بھی نہیں پڑھی اور کھانے سے بھی انکار کر دیا تھا۔

"کیا بات ہے بلو بیٹا! ٹھیک تو ہو..." انہوں نے لوئی اتار کر کھونٹی پر ٹانگی۔ گاؤں کی راتیں ٹھنڈی ہونے لگی تھیں۔ رات کو گرم کپڑوں کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔

"جی ماسٹر صاحب!" ابرار نے کہا اور پیالی اٹھا لی' چائے میں ہلکی سی گرمائش تھی۔ وہ ایک ہی گھونٹ میں پی گیا۔

"گھر نہیں جانا؟" انہوں نے چارپائی پر بیٹھ کر کھیس ٹانگوں پر ڈال لیا۔

ابرار خاموش رہا۔

"ماں انتظار کر رہی ہو گی۔" انہوں نے پھر کہا تو ابرار کھڑا ہو گیا۔

ماسٹر صاحب نے اسے بغور دیکھا۔ پھر نرمی سے بولے۔

"بلو! نہیں جی چاہ رہا تو بیٹھ جاؤ۔ ٹھنڈی رات کو گلیوں میں پھرنے کی ضرورت نہیں۔" ابرار اسی طرح بیٹھ گیا۔

"چاچے نے کچھ کہا ہے؟" وہ اس کے گھر کے حالات سے بخوبی آگاہ تھے۔

"کچھ..." ابرار نے نظر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ "بہت کچھ۔ سب کچھ چاچے کا ہے۔ بس نہیں چلتا اس کا کہ میرے ہاتھ سے کتابیں چھین کر کہیں پھینک دے۔ وہ چاہتا ہے میں کالج چھوڑ کر اس کے ساتھ زمینیں سنبھالوں۔"

"اس کا بیٹا نہیں ہے۔ اس لیے چاہتا ہے کہ تم اس کے بازو بنو۔ ہاں کالج چھوڑنے والی بات غلط ہے۔ زمین سونا اگلتی ہے تو علم ذہن کو زرخیز کرتا ہے۔" ماسٹر صاحب نے رسانیت سے کہا۔

"جاہل کیا جانیں علم کی قدر۔"

"تم خود کو عالم سمجھنے لگے ہو۔" وہ دھیرے سے مسکرائے۔

ابرار کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔

"میرا یہ مطلب نہیں ہے۔ پر چاچی کی ہر شکایت پر چاچا بار بار بے عزتی کرتا ہے۔ خرچا تک پورا نہیں دیتا۔ ماں دودھ بیچ بیچ کر کرایہ دیتی ہے۔ ایک ایک پیسے کے لیے ہاتھ پھیلانا پڑتا ہے۔ کیوں' میرا اس زمین میں

حصہ نہیں ہے کیا؟ آج وہ محنت کر رہا ہے۔ تو کل کو میں بھی کماؤں گا۔ کہاں لے جاؤں گا؟ اسی گھر میں لاؤں گا نا؟" ابرار دل کی بھڑاس نکالتا چلا گیا۔

"اصغر کو اسی بات کا تو یقین نہیں ہے۔ اسے لگتا ہے کہ جب تو پڑھ لکھ کر کسی ملازمت پر لگے گا تو یہاں نہیں رہے گا۔ شہر چلا جائے گا ماں کے ساتھ۔"

"جیسا اس کا سلوک ہے۔ یہی کروں گا۔"

"دیکھ پتر! تو میرے شاگردوں میں سب سے ہونہار شاگرد تھا۔ تجھے بہت آگے جانا ہے۔ پر ابھی تیری منزل دور ہے۔ صبر اور تحمل سے یہ وقت گزار دے۔ اسے یہی گلہ ہے کہ تو اس کا ہاتھ نہیں بٹاتا۔ تھوڑا وقت نکال کر کھیتوں میں چلا جایا کر۔ اس کے شکوے بھی دور ہو جائیں گے۔" ماسٹر صاحب نے رسانیت سے سمجھایا۔

"اس کے شکوے کبھی دور نہیں ہوں گے۔ آپ جانتے ہیں۔ شہر یہاں سے کتنی دور ہے۔ دو دو ویگنیں بدل کر جانا پڑتا ہے۔ کالج شہر کے آخری نکڑ پر ہے۔ آتے آتے شام ہو جاتی ہے۔ میں کیا کروں اور چاچے نے کون سا میرا خرچا اٹھا رکھا ہے۔ ایک ایک پیسے کے لیے ترساتا ہے۔ جس دن کرایے کی رقم کم ہو مجھے پیدل کالج تک جانا پڑتا ہے۔" وہ تلخی سے کہتا چلا گیا۔

"اور ماسٹر صاحب! آج میرے ساتھ جو یہ سلوک کر رہے ہیں۔ میں کل ان کے ساتھ کیسا سلوک کروں گا؟ یہی کچھ لوٹاؤں گا۔"

"ہوں۔ نیت نیک رکھ۔ اللہ سارے رستے کھول دے گا۔ مشکل وقت ٹل جانے کے لیے ہوتا ہے۔ اسے صبر سے گزارے گا تو میٹھا پھل پائے گا۔ میں تجھے یہیں ٹھہرا لوں پر تیری ماں دروازے سے لگی بلک رہی ہوں گی۔ جا ماں کو اتنا نہ ستا اس دنیا میں اللہ کے بعد تو ہی اس کا سہارا ہے۔ جا میرا بیٹا اللہ نگہبان۔"

ابرار سست روی سے اٹھا۔ اگر ماں کے انتظار کا خیال نہ ہوتا تو کبھی گھر کا رخ نہ کرتا، مگر اب جانا ہی تھا۔

✡ ✡ ✡

رات کافی بیت گئی تھی۔ مگر سب لوگ ابھی بھی بغیر تھکے تبصروں میں مصروف تھے۔ چائے کے دو دور چل چکے تھے مگر گپ شپ جاری و ساری تھیں۔

"توبہ! نجانے کسی سستی بیوٹیشن سے میک اپ کروایا تھا۔ سارا منہ لال لال کر دیا اور آئی شیڈ۔ توبہ!" مریم نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔

"اور اس کے سسرال والے دیکھے تھے؟ ساری عورتیں اپنی شادی کے جوڑے پہن کر آئی تھیں۔ پندرہ پندرہ سال پرانے۔" ساجدہ بھی ان کے ساتھ ہی آگئی تھی۔

"ارے لوگ بڑے سیانے ہیں۔ میرے تمہارے جیسے نہیں ہیں۔" حمیدہ نے جل کر کہا۔ "بانو نے اپنی دیورانی کو ہوا بنایا تھا۔ کیا لے کر آئے اس کے میکے والے؟ کھتے تے سواہ۔ اور کہہ کر ہمارا اتنا خرچ کروا دیا۔"

"آپ ہی فوراً اس کی باتوں میں آجاتی ہیں۔ ان کی اوقات کا پہلے نہیں پتا تھا کیا؟" ساجدہ تڑخ کر بولی۔ عادلہ نے طویل سانس لے کر عریشہ کو دیکھا۔ وہ اب بھی فاطمہ اور مریم کے ساتھ باتوں میں مگن تھی۔ پوری شادی میں انہوں نے بہت کچھ دیکھا اور محسوس کیا تھا۔ بیٹی کے بدلے ہوئے انداز ان کے تفکرات میں اضافہ کر رہے تھے۔

انہوں نے بہت غور سے عریشہ کو دیکھا۔ وہ واقعی بڑی ہو چکی تھی۔

"عریشہ!" انہوں نے گھبرا کر پکارا۔ آواز اتنی بلند تھی کہ سب مڑ کر انہیں دیکھنے لگے۔

"کافی دیر ہو گئی ہے اب چلو، صبح کالج کے لیے لیٹ ہو جاؤ گی۔"

"میں تو صبح بالکل نہیں جا رہی کالج۔ اتنی تو تھکن ہو رہی ہے۔" مریم نے آرام سے کہا۔ عادلہ عریشہ کو اشارہ کرکے کھڑی ہو گئیں۔ گھر آکر بھی عریشہ نے کپڑے نہیں بدلے۔ یونہی مسرور سی گھومتی رہی۔

آخر عادلہ کو ٹوکنا پڑا۔

"اب کیا یونہی چکراتی رہو گی۔ کپڑے بدل کر آؤ۔"

عریشہ نے ٹھٹک کر ماں کو دیکھا۔ وہ کچھ الجھی ہوئی لگ رہی تھیں۔

اسے صبح والا منظر یاد آیا تو کپڑے بدلنے کے بہانے کھسک گئی۔ واپس آئی تو عادلہ جاگ رہی تھیں۔ وہ خاموشی سے کمبل اوڑھ کر لیٹ گئی۔

"عریشہ!" وہ نیم غنودگی میں تھی، جب عادلہ نے پکارا۔

"تمہیں ثوبان کیسا لگتا ہے؟"

عریشہ کی ساری نیند اڑ گئی۔ "اچھا ہے۔ اچھا لگتا ہے۔"

"ہوں۔" عادلہ کسی گہری سوچ میں گم ہو گئیں۔ عریشہ منتظر تھی کہ وہ کچھ اور پوچھیں تو وہ ماں سے دل کا حال کہہ دے گی، مگر وہ بالکل خاموش ہو گئی تھیں۔ عریشہ نے کروٹ بدلتے ہوئے سوچا۔

"اچھا تو امی کو کچھ نہ کچھ اندازہ ہو گیا ہے۔ اللہ خیر کرے ویسے ثوبان میں کس چیز کی کمی ہے۔ سب سے بڑھ کر اپنا ہے۔ میں ہمیشہ امی کی نظر کے سامنے رہوں گی۔"

اپنی ہی سوچوں نے اس کے لبوں پر پھول کھلا دیے تھے۔

✡ ✡ ✡

جمیلہ کب سے دہلیز پکڑے بیٹھی تھی۔ رات گہری ہو گئی گلیوں میں پھرتے آوارہ کتے بھی منہ چھپا گئے گہری خاموشی پورے گاؤں پر سائے کی طرح پھیل گئی۔ باڑے میں جانور گردن ہلاتے تو گردنوں میں بندھی گھنٹیاں گنگنانے لگتیں۔ تاریک رات کی گود بے حد روشن ستاروں سے بھری ہوئی تھی۔

"تائی! تم ابھی تک سوئی نہیں۔" بشریٰ آنکھیں ملتی سر پر کھڑی تھی۔ وہ پانی پینے کے لیے اٹھی تھی، جو صحن کے آخری کونے میں تھا۔

"ماں کا کلیجہ گلیوں میں رل رہا ہے۔ نیند کہاں سے آئے۔" جمیلہ نے دوپٹے سے آنکھیں خشک کیں۔

"ہائے اللہ! بلو ابھی تک نہیں آیا؟" جمیلہ نے کھا جانے والی نظروں سے بشریٰ کو دیکھا۔

"سارا سیاپا تو نے لگایا تھا، کیا ضرورت تھی، جھوٹ سچ لگانے کی۔ پتا بھی ہے تیرے ماں پیو گرم دماغ کے ہیں۔"

"لو! میں نے کوئی جھوٹ بولا تھا۔ بلو نے مجھ سے خود یہ سب....." بشریٰ نے تنک کر کچھ کہنا چاہا۔ جمیلہ نے درشتی سے اس کی بات کاٹ دی۔

"تو..... غصے میں بلو نے کچھ کہہ ہی دیا تھا تو پی نہیں سکتی تھی۔ ذرا سی بات اور....."

"ہاں سارا قصور تو میرا ہے۔" بشریٰ روہانسی ہو گئی۔

"ہائے ربا! یہ آدھی رات کو دروازے پر بارات کیوں کھڑی ہے۔" کبریٰ کی بات دار آواز پر بشریٰ نے مڑ کر دیکھا۔

"اماں! بلو ابھی تک گھر نہیں آیا۔"

"ہائے..... وہ کیا ننھا کاکا ہے، جو گھر کا راستہ بھول گیا۔ کہیں پھر رہا ہو گا آوارہ..... تو کیا اس کی راہ تک رہی ہے۔ چل دفع ہو اندر۔ اب ماں بیٹوں کے تماشے تو چلتے رہیں گے..... نہ دن کو چین، نہ رات کو سکون۔" کبریٰ نے کھا جانے والی نظروں سے جمیلہ کو دیکھا۔

"جا۔ کبریٰ! خوامخوا میرا جی نہ جلا۔ میں نے نہیں کہا، اس سے میرے پاس دروازے پر کھڑی ہو۔ میں اپنی پتر کی راہ دیکھ رہی ہوں۔"

"ہونہہ پتر..... جسے نہ ماں کی فکر ہے، نہ خیال..... چل نی۔" وہ بشریٰ کو ٹہوکا لگا کر اندر چلی گئی۔

جمیلہ نے طویل سانس لے کر گھٹنوں پر سر جھکا لیا۔

بلو نے تاروں کی روشنی میں دروازے پر ایستادہ اس سائے کو دیکھ لیا تھا۔ شرمندگی سے اس کے قدم من من بھر کے ہو گئے۔ سارے دن کی تھکی ہاری ماں کو اس وقت گرم بستر میں ہونا چاہیے تھا اور وہ اس کی

خاطر سردی میں ٹھٹھر رہی تھی۔

ابرار کو خوامخواہ غصہ آنے لگا۔

"اماں! یہاں کیوں بیٹھی ہو؟"

جمیلہ جھٹکے سے اٹھی اور اس سے لپٹ کر رونے لگی۔

"صدقے جاؤں پتر! تو کہاں چلا گیا تھا۔"

"اماں! کہاں جاؤں گا' ادھر ہی تھا گاؤں میں۔ تو آرام سے سو جاتی۔"

"آرام سے..." جمیلہ نے سر اٹھا کر بیٹے کو دیکھا۔ وہ اس سے اونچا ہو گیا تھا' ایسا مشورہ دے سکتا تھا۔ تاروں کی اجلی روشنی میں جمیلہ کے آنسو جھلملا رہے تھے۔

"تجھے دیکھے بغیر تو مجھے ساہ نہیں آتا پتر! نیند کیسے آتی۔"

"اچھا! سردی ہے' اندر چل۔" ابرار کو ندامت ہونے لگی۔

"دیکھ... کتنا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ چل لحاف اوڑھ کے لیٹ میں تیری لیے دودھ پتی لاتی ہوں۔"

وہ منع کرنا چاہتا تھا' مگر جمیلہ تیزی سے باورچی خانے میں چلی گئی۔ تب ہی بشریٰ باورچی خانے سے نکلی' اسے دیکھ کر ٹھٹکی۔

"آ گیا واپس... بڑا ہی اتھرا ہے۔ ابے کی دو باتیں نہ سن سکا۔" وہ چلتی ہوئی اس کے سامنے آئی۔ ابرار نے لب بھینچ لیے۔ "ویسے اتنا ہی غصہ تھا تو واپس کیوں آیا؟"

"تو مجھے سمجھتی کیا ہے؟"

"میں تو تجھے کچھ بھی نہیں سمجھتی۔" ابرار نے ایک دم اسے بازوؤں سے دبوچا اور غرایا۔

"اپنے آپے میں رہ' ورنہ تیرا وہ حشر کروں گا کہ یاد کرے گی۔"

وہ ایک دم ڈر گئی۔

ابرار نے اسے جھٹکے سے چھوڑا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔

وہ کئی قدم لڑکھڑا کر رکی اور ساکت سی رہ گئی۔ شاید اسے بلو سے اس جارحانہ رویے کی توقع نہ تھی۔

"کیا ضرورت تھی اتنا غصہ کرنے کی۔" کبریٰ لحاف میں دبکے اصغر کے پاؤں دبا رہی تھی۔

"شاباش ہے... پہلے میرے کان بھرتی ہے۔ سنا سنا کے غصے کو ہوا دیتی ہے۔ بعد میں کیا ضرورت تھی؟" اصغر نے کبریٰ کے ہی انداز میں کہا۔

"لے... میں نے تیرے کون سے کان بھر دیے؟" کبریٰ نے غصے سے ہاتھ کھینچ لیے۔

"بھئی یہ زنانیوں میں دل پھیرے بندے کی سمجھ میں نہیں آتے۔"

"جو سچ تھا' تجھ سے وہی کہا تھا۔"

"تو میں نے بھی وہی کیا' جو مجھے کرنا ہے۔" اصغر ترکی بہ ترکی بولا۔

"جوان خون ہے۔ تجھے اس پر یوں ہاتھ نہیں اٹھانا چاہیے تھا۔ اس طرح تو وہ بالکل ہاتھ سے نکل جائے گا۔" کبریٰ نے پتے کی بات کی۔

"آخر تو چاہتی کیا ہے؟" اصغر جھنجلایا۔ کبریٰ نے بلب کی پیلی روشنی میں شوہر کا چہرہ دیکھا۔

"اصغر! نہ بھول' جوان دھی کا باپ ہے۔"

"کیا مطلب؟" اصغر بری طرح چونکا۔

"اس پر بس اتنا رعب رکھ کہ وہ تیرے کہنے میں رہے۔ بشریٰ کے لیے اس سے اچھا بر کہاں سے ملے گا۔"

اصغر کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)

فرحت اشتیاق

H شہریار خان ایک نہایت معزز اور اعلا خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ ذہانت میں بھی بے مثال اور نہایت سحر انگیز شخصیت کے مالک ہیں۔ اسی وجہ سے وہ خاصے مغرور ہو گئے ہیں۔ ورلڈ بینک میں ایک اعلا عہدے پر فائز ہونے کی وجہ سے شہریار خان اپنے بیوی بچوں کے ساتھ واشنگٹن (امریکا) میں مقیم ہیں۔ ان کی بیوی بھی نہایت خوب صورت اور اعلا تعلیم یافتہ ہیں۔ گھر اور بچوں کی نگہداشت کی خاطر ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہونے کے باوجود وہ ایک گھریلو خاتون ہیں۔ ان کے دو بیٹے ہیں۔ بڑا بیٹا سکندر اپنے باپ کا عکس ہے۔ گو چھوٹا بیٹا زین بھی ذہین اور خوب صورت ہے مگر سکندر ٗباپ کا عکس ہونے کی وجہ سے شہریار خان کی تمام تر توجہ اور امیدوں کا مرکز ہے۔ باپ کے اس امتیازی سلوک کی وجہ سے زین بچپن سے ہی بے حد حساس اور کم گو ہو گیا ہے۔ وہ اپنے بھائی سے نفرت کرنے لگا ہے۔

لیزا ٗلندن میں رہتی ہے ٗمگر اس کا وطن روم ہے۔ اسے اپنے وطن سے بے حد محبت اور انسیت ہے ٗچنانچہ وہ ہر سال اپنی چھٹیاں روم میں گزارتی ہے۔ روم میں اس کی ملاقات ایک لڑکے سے ہوتی ہے۔ جو اپنا تعارف "سکندر" کے نام سے کرواتا ہے۔ وہ اپنی ملازمت کے سلسلے میں روم آیا ہوا ہے۔ مغرور اور ہینڈسم سا سکندر ٗلیزا کو بے حد اچھا لگا۔ وہ اس سے دوستی کی خواہاں ہے۔

لیزا ایک مصورہ ہے۔ سکندر کی مکمل شاہانہ شخصیت اور اس کے تیکھے مغرور نقوش لیزا کو بہت متاثر کرتے ہیں۔ وہ اس کو پینٹ کرنا چاہتی ہے لیکن سکندر صاف انکار کردیتا ہے۔

ایک دو اتفاقیہ ملاقاتوں کے بعد لیزا سکندر سے مزید متاثر ہوجاتی ہے لیکن سکندر کا وہی اکھڑ مغرور انداز ہے۔

لیزا کا روم میں اپنا اپارٹمنٹ ہے جو اس کے باپ نے اسے خرید کردیا ہے۔ جہاں وہ نینی کے ساتھ رہتی ہے۔

سکندر کو نیپلز میں ایک میٹنگ اٹینڈ کرنی ہے لیکن طبیعت کی خرابی کی بنا پر اس کی آنکھ وقت پر نہیں کھلتی ٹرین مس ہونے کی بنا پر اسے مجبوراً لیزا کی مدد لینا پڑتی ہے۔ لیزا اس کو نیپلز لے کر جاتی ہے۔ اور واپس بھی لاتی ہے۔

لیزا کے والد محمود خالد نے ایک مغربی عورت سے شادی کی تھی لیکن وہ اس کو ایک مشرقی ماں اور بیوی کے روپ میں دیکھنا چاہتے تھے جو ظاہر ہے ممکن نہیں تھا۔ اوپر تلے دو بیٹیوں لیزا اور سیم کی پیدائش بھی اس کو نہ بدل سکی۔

وٹوریا (لیزا کی ماں) کو لیزا اور سیم سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ سیم ذہانت اور شکل و صورت میں محمود خالد جیسی تھی۔ بے تحاشا حسین اور بے حد ذہین جبکہ لیزا اپنی ماں پر گئی تھی۔ صورت اور ذہانت میں اور درمیانہ درجہ کی تھی۔

والدین کی علیحدگی کے بعد معاہدہ کے مطابق سیم کو وٹوریا کے ساتھ رہنا تھا اور لیزا محمود خالد کے ساتھ لندن آگئی تھی۔ وٹوریا جو ظاہری طور پر مسلمان ہوئی تھی۔ علیحدگی کے بعد وہ اپنے اصل مذہب پر آگئی اور ایک ارب پتی بزنس مین سے شادی کرلی۔ اس کے ساتھ میلان چلی گئی۔

لیزا اپنی بہن سیم سے بہت قریب تھی اسے اپنے روما سے بھی بہت پیار تھا ان دونوں کی جدائی اسے بہت شاق گزری۔

محمود خالد سیم کے اخراجات کے لیے رقم بھجواتے تھے اس کے باوجود وٹوریا کا شوہر اسے بوجھ سمجھتا تھا۔ ایک دن وہ نشہ کی حالت میں سیم کے کمرے میں آگیا۔ مگر اس کے شور مچانے پر اپنے ارادوں میں کامیاب نہ ہوسکا۔

یہ واقعہ جان کر لیزا کو اپنے والدین سے نفرت محسوس ہوئی وہ اپنے والدین سے مزید دور ہوگئی۔ محمود خالد نے دوسری شادی کرلی تھی۔ لیکن لیزا اپنی سوتیلی ماں کے بھی قریب نہ ہوسکی وہ اپنے والد کی کوئی بات یا مشورہ قبول کرنے کو تیار نہ تھی۔ وہ اسے پاکستان لے جانا چاہتے تھے۔ لیزا نے صاف انکار کردیا۔ مایوس ہو کر وہ اپنی بیوی عائشہ کے ساتھ پاکستان چلے گئے۔

محمود خالد نے سیم کی شادی اپنے ایک کاروباری واقف ہاشم اسد سے کرادی تھی جو اس سے عمر میں پورے پندرہ سال بڑا تھا۔ انہوں نے اپنا کاروبار بچانے کے لیے "یہ شادی" کی تھی۔

لیزا نے عیسائی ماں ہونے کے باوجود خود مطالعہ کرکے اسلام کا انتخاب کیا ہے۔ لیکن اپنے باپ اور بہنوئی کی وجہ سے وہ پاکستانی مردوں کو اچھا نہیں سمجھتی۔

سکندر کے بھائی زین شہریار کی زندگی میں ایک لڑکی ام مریم آجاتی ہے۔ ام مریم غیر معمولی ذہانت کی مالک ہے۔ وہ نصابی اور غیر نصابی دونوں طرح کی سرگرمیوں میں شان دار ریکارڈ رکھتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ بے حد حسین بھی ہے۔ ام مریم نے زین شہریار کو اہمیت دی تو اس نے ام مریم کو پروپوز کیا۔ ام مریم نے اس کا پروپوزل بہت خوش دلی سے قبول کرلیا۔ زین شہریار نے اپنی والدہ کو فون کرکے بتادیا۔ زین کو یقین تھا کہ ام مریم جیسی لڑکی کو اس کے والد انکار کرہی نہیں سکتے۔

سکندر دو دن تک اعصابی درد میں مبتلا رہا تھا۔ لیزا سے اس کی ملاقات آفس میں ہوئی تو سکندر کا رویہ بہت سرد اور روکھا تھا۔ اس کے باوجود لیزا نے اسے فون کیا تو پتا چلا کہ سکندر اسپتال میں ہے اور اس کا ایکسیڈنٹ ہوچکا ہے۔ لیزا فوراً ہی اسپتال پہنچی ۔ سکندر کے پیر میں چوٹ آئی تھی لیزا دو دن اس کے ساتھ اسپتال میں رہی۔ سکندر کو اپنی بالکل پروا نہیں تھی۔ دراصل ایکسیڈنٹ بھی سکندر کی لاپروائی سے ہوا تھا۔ ڈسچارج ہونے پر لیزا سکندر کو اپنے گھر لے آئی۔

زین کے والدین کو جب زین کی ام مریم سے وابستگی کا پتا چلا تو انہوں نے ام مریم کے والدین اور اس سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ شہریار خان ام مریم کے والدین سے ملے تو انہیں ام مریم اپنی بہو کی حیثیت سے بہت پسند آئی زین کی منگنی ام مریم کے ساتھ ہوگئی۔ ام مریم چھٹیاں گزارنے کے لیے زین کے ساتھ شہریار خان کے گھر آئی۔ سکندر لیزا کے گھر تھا، جہاں لیزا اس کا بہت خیال رکھ رہی تھی ایک رات امو جان کا فون آگیا۔ سکندر ان سے بات کرکے بہت ڈسٹرب ہوگیا تھا۔

۴
چوتھی قسط

وہ بہت دیر گم صم بیٹھا رہا تھا، کام کرنے، وقت پر کام مکمل کرنے کی تمام خواہش ایک دم ہی دم توڑ بیٹھی تھی۔ اس کا کوئی بھی کام کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اس کے کانوں میں ابھی بھی ماں کی آنسوؤں بھری آواز گونج رہی تھی۔

اس نے لیپ ٹاپ بند کرکے رکھ دیا تھا۔ وہ ایک ٹک سامنے دیوار کو دیکھے جارہا تھا۔ اسے اس طرح بیٹھے کتنی دیر ہوگئی تھی وہ نہیں جانتا تھا ہاں، وہ چونک کر اپنے حال میں واپس دروازے پر دستک کی آواز سے آیا تھا۔ بجائے کچھ بولنے کے وہ خالی الذہنی سے دروازے کو گھور رہا تھا۔ دروازے پر دوبارہ دستک ہوئی تھی، پھر سہ بارہ۔ یہ لیزا ہوگی یقیناً "اس کے لیے لنچ لائی ہوگی۔ عجیب الجھن تھی، اب اس کے ساتھ روڈ بھی نہیں ہونا چاہتا تھا، مگر کھانا کھانے، باتیں کرنے کسی بھی چیز کا اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔

وہ خاموشی سے تکیے پر سر رکھ کر لیٹ گیا تھا۔ لیٹنے کے بعد اس نے لیزا کی غالباً" چھٹی یا ساتویں دستک کا جواب دیا تھا۔

"آجاؤ لیزا!" وہ دروازہ کھول کر اندر آئی تو اس کے ہاتھوں میں کھانے کی ٹرے تھی۔

"کیا ہوا سوگئے تھے کیا؟" اسے لیٹا دیکھ کر اور پھر دستک کا جواب اتنی دیر بعد دیے جانے پر اسے یقیناً" یہی لگا تھا کہ سکندر کی آنکھ لگ گئی ہوگی۔

"ہاں شاید آنکھ لگ گئی تھی۔" وہ یہ سوچ کر لیٹا تھا کہ لیزا سے نیند اور تھکاوٹ کا بہانہ بنا کر کھانا کھانے سے انکار کردے گا، مگر اب اسے کھانے کی ٹرے ہاتھوں میں لیے ہوئے کھڑا دیکھ کر اس کے لیے کھانے سے انکار مشکل ہورہا تھا۔ وہ اس کی ملازمہ نہیں تھی۔ دوستی اور خلوص میں وہ پہلے ہی اس کے ساتھ اتنا زیادہ کرچکی تھی کہ اسے اچھی خاصی شرمندگی ہونے لگتی تھی۔

"لگ رہا ہے تمہارا ابھی کھانا کھانے کا دل نہیں چاہ رہا۔" وہ کھانا کھانے کے لیے اٹھ کر بیٹھنے لگا تھا جب لیزا سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھ کر بولی۔ اس کے کس انداز سے اسے یہ پتا چلا تھا، وہ سمجھ نہیں سکا تھا۔ اتنا تو وہ خود کو جانتا تھا کہ اسے پڑھنا، اس کی سوچ کو جان لینا، اس کے دل میں کیا ہے، پتا چلا لینا کوئی ایسا سہل کام نہیں ہے۔

"تمہیں کیسے پتا چلا؟" وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"بس پتا چل گیا۔" وہ مسکراتے ہوئے ٹرے بیڈ پر رکھنے لگی

"دل نہیں چاہ رہا، پھر بھی تھوڑا سا کھالو۔ تمہیں میڈیسن لینی ہے۔"

وہ نرم لہجے میں کہتے ہوئے بیڈ کے پاس رکھی کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ وہ کچھ بھی کہے بغیر کھانا کھانے لگا۔

"اب تم تھوڑی دیر ریسٹ کرلو، پھر ہمیں ہسپتال جانا ہے۔ کافی تکلیف سے گزرنا ہوگا تمہیں وہاں۔ تمہارے پیر کی بینڈیج چینج ہوگی۔"

اس نے تھوڑا سا کھایا تھا۔

"بس کھاچکے؟"

"ہاں!" وہ اب لیزا کے اصرار سے ڈر رہا تھا، مگر حیرت کی بات یہ ہوئی کہ وہ بغیر اصرار کیے وہاں سے اٹھ

گئی تھی۔

✲ ✲ ✲

"چلیں؟" دروازہ کھٹکھٹانے کے بعد ہلکا سا کھول کر لیزا نے باہر سے کھڑے کھڑے اس سے پوچھا تھا۔ کھانے کے بعد وہ ایک مرتبہ پھر آفس کا کام کرنے لگا تھا۔ ذہن میں سوچیں اور دل میں تکلیف بہت تھی مگر یہ سب کب نہیں ہوتا تھا، کام تو بہرحال کرنا ہی تھا ناں۔ کچھ کام مکمل کر کے وہ آفس ای میل کر چکا تھا، کچھ ابھی نامکمل تھا۔

"چلو!" لیپ ٹاپ بند کر کے وہ بیڈ سے اٹھنے لگا۔ اسے تکلیف ابھی بھی تھی، مگر نہ وہ تکلیف کو سوچ رہا تھا، نہ اسے اہمیت دے رہا تھا۔ لیزا اسے مدد دینے اس کے نزدیک آئی تھی۔ مگر وہ اس کی مدد کے بغیر ہی اٹھ گیا تھا۔ وہ بیساکھی کے سہارے چلتا کمرے سے باہر آگیا فلیٹ میں اس وقت مکمل خاموشی تھی۔

"نینی سو رہی ہیں۔ لنچ کے بعد روزانہ کچھ دیر نیند لیتی ہیں۔" لیزا ہنس کر بولی تھی۔

وہ اسے لے کر کچن میں آگئی تھی، پتا نہیں کیوں۔

"آؤ!" اس سے کہہ کر وہ کچن میں داخل ہوئی تو نا سمجھی کے سے عالم میں وہ بھی اندر آگیا۔

"بیٹھو!" وہ کچن ٹیبل کے آگے رکھی کرسی اس کے لیے کھینچ کر باہر نکال رہی تھی۔ وہاں میز پر ایک پلیٹ میں سلیقے سے کئی طرح کے پھل کٹے ہوئے تھے، چوکور ٹکڑوں میں کٹے مکسڈ فروٹ، پلیٹ میں کانٹا بھی رکھا تھا۔ وہ حیران سا کرسی پر بیٹھا۔ تب وہ اس سے نرمی سے بولی۔

"منع مت کرنا۔ تم نے کھانا بہت کم کھایا تھا۔ تھوڑے سے فروٹس کاٹے ہیں میں نے تمہارے لیے۔ دیکھو یہ بالکل بھی زیادہ نہیں ہیں۔ اچھے بچوں کی طرح خاموشی سے انہیں کھالو۔"

وہ بغور اس کی طرف دیکھنے لگا تھا۔

"مجھ پر غصہ بعد میں کرلینا، ابھی ہمیں دیر ہو رہی ہے۔"

بارہ سال گزر چکے تھے، اس کی عادت ختم ہو چکی تھی اپنا خیال رکھوانے کی، اپنی پروا کروانے کی۔ وہ کیوں کرتی تھی اتنی پروا؟ شاید اہم سوال یہ ہونا چاہیے تھا مگر اسے اپنی پروا کیا جانا کیوں اچھا لگ رہا ہے؟ اہم سوال یہ بن گیا تھا اس کے لیے۔

لیزا پر سے نظریں ہٹا کر وہ خاموشی سے کانٹے سے مکس فروٹ کھانے لگا تھا۔ ان میں پائن ایپل بھی تھا، اسٹرابری بھی، سیب بھی، ناشپاتی، خوبانی اور انگور وغیرہ بھی۔

"تمہیں ناشپاتی پسند ہے؟" اس نے بے تکلف سے انداز میں اس کی پلیٹ میں سے ناشپاتی کا ایک کیوب چمچ سے اٹھایا تھا۔

"ٹھیک لگتی ہے۔" وہ ناشپاتی کا ٹکڑا منہ میں ڈال رہی تھی۔

"مجھے بہت پسند ہے۔ پھلوں میں میرا فیورٹ پھل ناشپاتی ہے۔"

اس نے اس وقت پرنٹڈ ٹاپ، جس میں زیادہ تر سبز، نیلا اور جامنی رنگ شامل تھے، گرے کلر کی کیپری کے ساتھ پہن رکھا تھا۔ بالوں میں کیچر لگا تھا۔ چند چھوٹی لٹیں پیشانی اور کانوں کے پاس پڑی تھیں۔ وہ ہمیشہ کی طرح بہت پیاری لگ رہی تھی۔ لیزا سے نظریں ہٹا کر اس نے دوبارہ پلیٹ پر نظریں مرکوز کیں۔

"تمہارا کتنا ٹائم برباد ہو رہا ہے میری وجہ سے۔ میرا مطلب ہے بے شک تم یہاں چھٹیوں پر ہو، مگر اتنی فارغ بھی نہیں ہو۔ تمہارے سولو شو کی تیاری ہے اور پھر ہمارے آفس والا پروجیکٹ بھی ہے۔"

"میرا کوئی وقت برباد نہیں ہو رہا۔ رات میں کرتی ہوں ناں میں اپنا کام۔ اب چلو، دیر ہو رہی ہے۔"

وہ ایک دم ہی عجلت کا تاثر دیتے ہوئے کرسی پر سے اٹھی تھی۔ وہ اسے بغور دیکھتا کرسی پر سے اٹھ گیا۔

✲ ✲ ✲

انہیں ہسپتال میں کافی ٹائم لگا تھا۔ وہاں اس کے پیر کی بینڈیج تبدیل کیے جانے کا عمل خاصا تکلیف دہ رہا تھا۔ اگر وہ ایسا سخت جان نہ ہوتا تو شاید اتنی تکلیف سے گزرنے کے بعد رات تک بستر پر نڈھال ہی پڑا رہتا۔

"لیزا! اگر تم مائنڈ نہ کرو تو کیا اب میں اپنے ہوٹل چلا جاؤں؟"

وہ اب اپنے ہوٹل واپس جانا چاہتا تھا، مگر لیزا کو ناراض بھی ہرگز نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"کس خوشی میں؟ تمہیں کیا میرے گھر پر کوئی تکلیف ہے؟"

"نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے لیزا! در اصل میں....."

"در اصل تمہیں میرے گھر پر رہنا میرا احسان لگ رہا ہے اور مغرور و خود پسند سینور سکندر کسی کا احسان لینا پسند نہیں کرتے۔ یہی بات ہے ناں؟"

لیزا خفگی سے اسے گھور رہی تھی۔ اس کے ساتھ اسے لیزا کے چہرے پر ایک دکھ بھرا تاثر بھی نظر آیا تھا۔

"سینورا لیزا! اتنی اموشنل (جذباتی) مت ہو ہوٹل جانے کی بات صرف اس لیے کر رہا ہوں کہ کل سے میں آفس جانا چاہتا ہوں۔ اور آفس جانے کے لیے میرے کپڑے وغیرہ سب ہوٹل میں ہیں۔ تم لاکھ یقین دلاتی رہو، مگر یہ میری رومن ہالی ڈیز ہیں تو نہیں ناں؟ مصورہ پلیز! میری مجبوری سمجھنے کی کوشش کرو۔ مجھے یہاں وقت پر اپنا کام مکمل کر کے واپس اپنے ہیڈ آفس رپورٹ کرنی ہے۔ پہلے ہی اس ایکسیڈنٹ کی وجہ سے میرے کاموں کا خاصا حرج ہو چکا ہے۔"

وہ نرمی اور آہستگی سے دوستانہ انداز میں بولا۔

"اگر یہ بات ہے تو چلو! ابھی تمہارے ہوٹل چلتے ہیں۔ تم وہاں سے اپنے کپڑے لے لو۔ آج تمہارے اتنی تکلیف ہے۔ میں تمہیں واپس ہوٹل تو ہرگز نہیں جانے دوں گی۔ ویسے تو کل سے آفس جانے کی بات بھی میری سمجھ میں نہیں آرہی۔ تمہارے ہیڈ آفس والے کیا انسان نہیں ہیں؟ ایک شخص بری طرح زخمی ہو کر بستر پر پڑا ہے، اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے میں اسے مشکل ہے، وہ آفس کیسے آسکتا ہے؟ لیکن میرے روکنے سے تم نے رکنا تو ہے نہیں۔ اگر سینور سکندر طے کر چکے ہیں کہ کل آفس جائیں گے تو وہ لازما" جائیں گے، لیکن وہ آفس لیزا محمود کے گھر سے جائیں گے۔ یہ میں طے کر چکی ہوں۔"

وہ دوستانہ دھونس بھرے لہجے میں بولی۔

انکار کی خواہش رکھنے کے باوجود وہ چپ ہو گیا۔

گزرے ماہ و سال کی ایسی بہت سی باتیں، بہت سے حادثات یاد آنے لگے تھے، جب وہ اس سے بھی زیادہ شدید زخمی اور بیمار ہو کر تنہا پڑا رہا تھا۔ خیال رکھنا اور پروا کرنا تو دور، "اسے ہوا کیا ہے" یہ تک پوچھنے کوئی نہیں آیا تھا۔ اب جب دل میں یہ خواہش بھی ختم ہو گئی تھی کہ کوئی اسے پوچھے، اس کا خیال رکھے، تب یہ لڑکی نہ جانے کہاں سے زندگی میں آگئی تھی۔ لیزا کا خیال رکھنا نہ اسے اچھا لگ رہا تھا نہ برا۔ اچھا برا تو اس وقت لگتا جب وہ اس رویے کو قبول کر پاتا۔ ابھی تو وہ یہ ہی قبول

نہیں کرپایا تھا کہ اس کا خیال بھی رکھا جاسکتا ہے؟ اس کی پروا بھی کی جاسکتی ہے؟

لیزا نے گاڑی اس کے ہوٹل کی پارکنگ میں لاکر روکی تھی۔ اس کا خیال تھا' وہ وہیں بیٹھ کر اس کا انتظار کرے گی' مگر وہ اس کے ساتھ اتر کر اندر جارہی تھی۔

"تم صوفے پر بیٹھ جاؤ۔ مجھے بتاتے رہو' تمہارے کپڑے اور دیگر ضرورت کا سامان کہاں ہے۔" ہوٹل میں اس کے کمرے میں آنے کے بعد وہ اس سے بولی تھی۔

"لیزا! میں خود کر..." لیزا نے گھور کر اسے دیکھا تھا۔ اس نے اسے ہاتھ پکڑ کر صوفے پر بٹھادیا تھا۔

"کس بیگ میں چیزیں رکھنی ہیں اور کیا کیا چیزیں رکھنی ہیں۔ جلدی بتاؤ!" ایک بار پھر اس سے ہار مان کر وہ اسے بتانے لگا تھا کہ اس کے کون کون سے کپڑے بیگ میں رکھنے ہیں۔ وہ جلدی جلدی اس کا کوٹ' پینٹ' ٹائی' شرٹ' ٹی شرٹ' جینز وغیرہ بیگ میں رکھ رہی تھی۔

"لیزا! میں تمہارے خلوص اور دوستی کی دل سے قدر کرتا ہوں' مگر پلیز میں صرف کل کا دن اور رکوں گا تمہارے گھر پر۔ کل کے بعد تم مجھ سے اپنے گھر پر رکنے کے لیے اصرار مت کرنا۔"

وہ دونوں اس کے ہوٹل کے روم سے باہر نکل رہے تھے' جب وہ لیزا سے بولا تھا۔ بیگ میں اس کا سامان رکھنے کے بعد وہ بیگ کندھے پر لٹکا بھی لیزا نے رکھا تھا' باوجود اس کے شدید اصرار کے کہ وہ اسے خود پکڑنا چاہتا ہے۔

☼ ☼ ☼

"کھانا لے آؤں سکندر؟"

کمرے کا دروازہ ہلکا سا کھول کر لیزا نے باہر سے کھڑے کھڑے پوچھا۔ واپس آنے کے بعد وہ بیڈ پر نیم دراز ہوگیا تھا' اسی نیم دراز انداز میں وہ لیپ ٹاپ پر آفس کا کام کررہا تھا۔

"میں تمہارے اور تمہاری نینی کے ساتھ باہر ٹیبل پر بیٹھ کر کھانا کھاؤں گا۔"

لیزا کے مسکراتے چہرے کو بغور دیکھتے وہ آہستگی سے بولا۔ لیزا یا اس کی نینی کھانے کی ٹرے خدمت میں پیش کرتی تھیں تو اسے شرمندگی کا احساس زیادہ ہوتا تھا۔ ان کے ڈائننگ ٹیبل پر ان لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھالے' اسے یہ زیادہ بہتر محسوس ہوا تھا۔

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ آجاؤ پھر میں ٹیبل پر کھانا لگاتی ہوں۔"

وہ اس کی فرمائش پر خوش ہوئی تھی۔ وہ پانچ منٹ کے بعد اٹھ کر باہر آیا' اسے لیزا اور اس کی نینی کی آوازیں چونکہ کچن سے آئی تھیں' سو وہ وہیں آگیا۔

"آؤ سکندر! بیٹھو۔" لیزا نے اسے دروازے پر رکتے ہی دیکھ لیا تھا۔ وہ میز پر کوئی ڈش رکھ رہی تھی۔ اس کی نینی کوکنگ رینج کے پاس کھڑی تھیں۔ وہ ڈش میں سالن نکال رہی تھیں۔ وہ بھی اسے دیکھ کر مہمان نوازی سے بھرپور انداز میں مسکرائی تھیں۔

لیزا نے جلدی سے اس کے لیے کرسی کھینچی۔ وہ بیساکھی کو ٹانگز پر مضبوطی سے جماکر رکھتے اور تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے کرسی پر آکر بیٹھ گیا

"اتنا تیز مت چلو! اور پلیز اس پیر پر وزن ڈال کر مت چلو۔"

لیزا نے فوراً" اسے ٹوکا تھا۔ وہ اس کے زخمی پیر کی طرف اشارہ کررہی تھی۔ وہ اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ نینی بھی ڈش لے کر آگئی تھیں۔ ڈش میز پر رکھ کر انہوں نے لیزا کے برابر والی کرسی سنبھالی تھی۔

میز پر اطالوی اور پاکستانی دونوں طرح کی ڈشز نظر آرہی تھیں۔ اس نے مشروم والا پاستا اپنی پلیٹ میں ڈال لیا۔ لیزا نے سلاد کا پیالا اس کے سامنے کیا بیف کے کباب تھے' وہ اس نے اس کے سامنے رکھے تھے۔

"تمہارے گھر تمہیں حلال گوشت ملے گا۔ بے فکر ہوکر کھانا کھاؤ۔"

لیزا نے مسکرا کر اس سے کہا' پھر وہ نینی سے مخاطب

ہوئی۔

"پتا ہے نینی! میری اور سکندر کی دوستی کیسے ہوئی تھی؟" وہ کھاتے ہوئے لیزا کو دیکھ رہا تھا۔ "سکندر البرٹو کے پزیریا میں اپنے لیے پزا آرڈر کررہا تھا' سبزیوں والا۔ زبان کے مسئلے کی وجہ سے سکندر کو آرڈر کرنے میں مشکل ہورہی تھی۔"

"اور تب لیزا نے میری مدد کی تھی۔" مسکرا کر اس نے بات مکمل کی۔

"اس کی اسی طرح سب سے دوستی ہوجاتی ہے۔ بس دو منٹ لگتے ہیں اسے کسی سے بھی دوستی کرنے میں۔"

نینی مسکرا کر بولیں۔ انہوں نے ممتا بھری محبت کی نگاہوں سے لیزا کو دیکھا تھا۔

"کافی پیوگے ناں؟" ان تینوں نے کھانا ختم کیا' تب لیزا نے اس سے پوچھا۔

"تم بناؤ گی؟" اس نے مسکرا کر پوچھا۔

"آف کورس! میں بناؤں گی۔ نینی! آپ بھی پئیں گی ناں؟"

نینی نے بھی مسکرا کر سر اثبات میں ہلادیا۔

"آجاؤ بیٹا! ہم لیونگ روم میں بیٹھتے ہیں۔"

پرشفقت سے انداز میں نینی اس سے بولی تھیں۔ وہ ابھی تک یہ طے نہیں کرپایا تھا کہ انہیں کیا کہے اس لیے محض "جی" کہتا ان کے ساتھ اٹھا تھا۔ لیزا کچن میں کافی بنارہی تھی کہ وہ اور نینی لیونگ روم میں صوفوں پر آکر بیٹھ گئے تھے۔ نینی نے ٹی وی آن کردیا۔ ٹی وی کی آواز ہلکی رکھ کر وہ اس سے باتیں کرنے لگی تھیں۔ ان کی باتیں لیزا کے متعلق تھیں۔ اس کے بچپن کی باتیں' وہ بچپن سے ہی ان کے کتنے قریب رہی ہے' یہ باتیں۔

"کبھی لگا ہی نہیں یہ میری سگی بیٹی نہیں ہے' اسے میں نے جنم نہیں دیا' جیسے پہلی نظر میں اس نے مجھے اپنی ماں اور میں نے اسے اپنی بیٹی مان لیا تھا۔"

وہ ان کے چہرے پر ممتا کا نور بکھرا دیکھ رہا تھا۔ اسے ماں کا چہرہ یاد آنے لگا تھا۔ ماں کی آنسوؤں میں بھیگی آواز کانوں میں گونجنے لگی تھی۔ اسی وقت لیزا ٹرے میں کافی کے مگ لیے وہاں آگئی تھی۔ ان دونوں کو کافی پیش کرکے وہ خود بھی کشن گود میں رکھ کر سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔ وہ کافی کے گھونٹ بھر رہا تھا۔ نینی لیزا سے کہہ رہی تھیں۔

"آج ساری رات کام مت کرتی رہنا۔ پھر دن میں بھی نہیں لیٹتی ہو۔ تھوڑی بہت دیر تو سوؤ۔"

وہ اپنا کافی کا مگ ختم کرچکی تھیں۔ اسے اور لیزا کو شب بخیر کہہ کر وہ اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

"تم بھی اب آرام کرو لیزا!"

لیزا اس کی دوائیں وہیں لے کر آگئی تھی۔ اس نے دوا اور پانی اسے پکڑایا۔ دوا کھالینے کے بعد وہ اس سے بولا تھا۔

"ابھی مجھے تھوڑی دیر کام کرنا ہے پھر سوؤں گی"

لیزا نے مرہم اس کے سامنے رکھا تھا۔

"جیسے کل دوا کھانا اور مرہم لگانا بھول گئے تھے' آج مت بھولنا۔ سونے سے پہلے اسے دونوں ہاتھوں پر لگا لینا۔ اگر تم کہو تو میں لگادوں؟"

"نہیں' میں لگالوں گا۔ تم اب اپنا کام کرو۔ میں تھوڑی دیر ٹی وی دیکھنا چاہتا ہوں۔ نیند آئے گی تو سونے چلا جاؤں گا۔" وہ مسکرا کر یقین دلانے والے انداز میں بولا۔

"اوکے! گڈ نائٹ۔" وہ مسکراتے ہوئے لکڑی کے زینے کی طرف بڑھ گئی۔ وہ اوپر اپنے اسٹوڈیو میں جارہی تھی۔ وہ صوفے پر بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا۔

اس نے مرہم نہیں لگایا تھا' جان بوجھ کر نہیں بس اسے دھیان ہی نہیں رہا تھا۔ اپنے نخرے اٹھانے کی عادت جو نہیں تھی۔ وہ صوفے پر لیٹ گیا تھا۔ کوئی اٹالین اطالوی مووی تھی جو وہ دیکھ رہا تھا۔ آواز اس نے بالکل بند کررکھی تھی۔ بس خاموش فلم دیکھ رہا تھا۔ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی' وہ کوشش کررہا تھا کہ نیند آجائے۔ دو تین بار وہیں آنکھیں بند کرکے بھی لیٹا تھا مگر نیند نہیں آرہی تھی۔ اسے سیڑھیوں پر سے کسی کے اترنے کی آواز آئی تھی۔ لیزا نیچے آرہی تھی

۔ چکر دار سیڑھی پر چند زینے اترنے کے بعد لیزا کو لیونگ روم نظر آنے لگا' تب اس کی سب سے پہلے اسی پر نظر پڑی تھی۔
"کیا ہوا؟ تم سوئے نہیں؟" حیران پریشان سی تیزی سے اتر کر نیچے اس کے پاس آئی تھی۔
وہ جواباً" دھیمے سے مسکرایا تھا۔
"ہاں! نیند نہیں آرہی۔" لیزا کی نگاہیں وال کلاک پر گئی تھیں جو رات کے تین بجا رہی تھی۔
"لیکن تمہاری میڈیسنز میں نیند کی دوا شامل ہے۔ وہ کھا کر تو نیند آنی چاہیے تھی۔"
"مجھے نیند بہت مشکل سے آتی ہے لیزا! دراصل مجھے انسومنیا ہے۔" وہ سنجیدگی سے سچ بولا تھا۔
"او! پھر آج تمہیں ہسپتال میں ڈاکٹر کو یہ بات بتانی چاہیے تھی۔ وہ پھر تمہیں اس لحاظ سے کوئی اور میڈیسن دیتا۔"
"مجھے یہ تکلیف بارہ سال سے ہے لیزا! اور کسی علاج اور کسی دوا سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں عادی ہوگیا ہوں راتوں کو جاگنے کا۔ تم میری فکر مت کرو۔ جاکر آرام کرو۔"
اپنی یہ اتنی ذاتی بات اس نے آج تک کبھی کسی کو نہیں بتائی تھی' جو دیار غیر میں ملنے والی اس اجنبی لڑکی کو بتا رہا تھا۔ کوئی ضرورت نہیں تھی سچ بتائے جانے کی وہ کہہ سکتا تھا کہ ہاں' آج نیند نہیں آرہی' مگر پھر بھی اس نے سچ بولا تھا۔ پتا نہیں کیوں؟ کارپٹ پر قدرے دور رکھا فلور کشن لیزا نے کھینچ کر صوفے کے قریب کیا اور اس پر بیٹھ گئی۔
"تم اتنے اداس' اتنے دکھی کیوں رہتے ہو سکندر؟" بہت آہستہ آواز میں اس نے پوچھا تھا۔ وہ اسے بغور دیکھ رہی تھی۔
"میں؟ نہیں تو۔۔۔ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔"
"میں نے تمہیں کبھی دل سے ہنستے نہیں دیکھا۔ جب تم ہنستے ہو' تب بھی تمہاری آنکھیں تمہاری ہنسی کا ساتھ نہیں دے رہی ہوتیں۔ تمہاری آنکھوں میں مجھے کبھی بھی خوشی نظر نہیں آئی سکندر!"
اس کا انداز تجسس لیے ہوئے نہیں تھا' اس کے انداز میں دکھ تھا جیسے وہ اسے دکھی دیکھ کر دکھی ہو رہی تھی۔
"شاید اس لیے کہ میری زندگی میں خوش ہونے کے لیے کوئی وجہ ہی نہیں ہے۔"
دن کی روشنی میں وہ شاید یہ بات کبھی نہ کہہ پاتا جو رات کی خاموشی اور تنہائی میں کہہ گیا تھا۔
"خوش ہونے کے لیے وجہ ڈھونڈو گے تو کبھی خوش نہیں ہو سکو گے۔ میری زندگی میں بھی ایسا بہت کچھ ہے جسے اگر میں ہر وقت سوچنا شروع کر دوں تو ایک لمحے کے لیے بھی خوش نہیں رہ سکتی' مگر تم دیکھتے ہو میں کتنا خوش رہتی ہوں۔" اس نے سر اثبات میں ہلایا۔
"ہاں اور میری دعا ہے تم ہمیشہ اسی طرح خوش رہو' ہنستی مسکراتی رہو۔ تمہیں دیکھ کر زندگی سے پیار کرنے کا دل چاہنے لگتا ہے۔"
"تو کرو ناں زندگی سے پیار سکندر! زندگی بہت خوب صورت ہے۔ خوشی کو' رنگوں کو اور زندگی کو اپنے اندر محسوس تو کرکے دیکھو۔" وہ دکھ بھرے انداز میں مسکرایا تھا۔
"آج جو فون آیا تھا' تم اس سے دکھی ہوئے ہو ناں؟" وہ آہستہ آواز میں نرمی سے پوچھ رہی تھی۔
"ہاں بہت۔" جواب دیتے ہوئے اس نے لیزا پر سے نظریں ہٹالی تھیں۔ چہرہ سیدھا کرکے آنکھیں بند کرلیں' وہ اپنی آنکھوں میں ابھرتے آنسو اس سے چھپا لینا چاہتا تھا۔ اتنا سخت جان ہو جانے کے بعد یہ آنسو کیوں چلے آتے تھے آنکھوں میں۔ وہ آنکھیں بند کرکے لیٹا رہا۔
"تم نے آئنمنٹ لگا لیا تھا؟" اسے لیزا کی آواز سنائی دی تھی۔ وہ اسی طرح اس کے نزدیک بیٹھی تھی۔
"نہیں۔" اس نے اسی طرح آنکھیں بند کیے کیے جواب دیا۔ اسے اپنے نزدیک سے ابھرتی آوازوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ میز پر سے مرہم کی ٹیوب اٹھا رہی ہے۔ ایک سیکنڈ بعد بغیر کچھ کہے اس نے اس کا ہاتھ پکڑا تھا۔ وہ کہنی سے لے کر کلائی تک آہستہ آہستہ

اس کے ہاتھ پر مرہم لگا رہی تھی۔ وہ کہنا چاہتا تھا۔
"گھاؤ میرے جسم پر نہیں میری روح پر لگے ہیں۔ کوئی مرہم لگا سکتی ہو تو ان زخموں پر لگاؤ۔"
وہ چپ چاپ آنکھیں بند کرکے لیٹا رہا۔ وہ اس کی انگلیوں کا لمس اپنے ہاتھ پر محسوس کر رہا تھا۔ کب وہ پہلے ہاتھ پر مرہم لگا چکی تھی' کب اس نے دوسرے ہاتھ پر مرہم لگایا تھا۔ اسے بالکل پتا نہیں چلا تھا۔ کس وقت اس کی آنکھ لگی تھی' اسے یاد نہیں تھا۔
اس کی آنکھ کھلی تو صبح ہو چکی تھی۔ صبح کے سات بج رہے تھے۔ وہ تین بجے سے سات بجے تک پورے چار گھنٹے اتنی بے خبری کی نیند سو گیا۔
اس نے صوفے پر کروٹ لینے کی کوشش کی تو وہاں لیزا کی موجودگی کا احساس ہوا۔ وہ صوفے پر اس کے نزدیک فلور کشن پر اسی طرح بیٹھی تھی' اس کا سر صوفے پر اس کے ہاتھ کے نزدیک بالکل کنارے پر ٹکا تھا۔ وہ صوفے کے کنارے پر سر ٹکائے گہری نیند سو رہی تھی۔ گویا وہ رات اس کے سو جانے کے بعد بھی اس کے پاس سے اٹھ کر نہیں گئی تھی۔
وہ چند سیکنڈ ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتا رہا۔ وہ صوفے سے اٹھنا چاہ رہا تھا۔ بغیر کوئی آواز پیدا کیے اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔ وہ اپنی چوکس سی نیند سے بیدار ہوئی۔ فوراً" سیدھی ہوئی۔ اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔
"گڈ مارننگ سینورا لیزا۔ میری وجہ سے پوری رات بے آرام ہو کر گزار دی تم نے؟"
وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور وہ مسکرا کر آنکھوں میں نرمی لیے اسے دیکھ رہا تھا۔ لیزا کی آنکھوں میں نیند بھری تھی۔ بالوں کو ہاتھوں سے لپیٹ کر جوڑے کی سی شکل دیتے وہ آہستگی سے ہنسی تھی۔
"اس طرح سونے کا ارادہ تو نہیں تھا' پتا نہیں کیسے نیند آگئی۔ تمہیں نیند آئی ناں؟"
"ہاں بہت پرسکون اور گہری نیند سویا ہوں میں۔"
"تمہاری اداسی کم ہوئی؟"
"ہاں۔" وہ مسکرا کر جواب دیتا صوفے سے اٹھ گیا

لیزا بھی اس کے ساتھ ہی فلور کشن سے اٹھی
تھی۔
"میں تیار ہو جاؤں؟ آفس تھوڑا جلدی جانا چاہ رہا
ہوں۔"
لیزا نے سر اثبات میں ہلایا۔ وہ بیساکھی کا سہارا
لے کر چلتے ہوئے کمرے میں آگیا۔ وہ تیار ہو کر باہر
نکلا تو کچن میں میز پر ناشتا لگائے لیزا اس کا انتظار کر رہی
تھی۔
"نینی! صبح نماز کے بعد دوبارہ سو جاتی ہیں۔ صبح نہ
انہیں کہیں جانا ہوتا ہے' نہ مجھے' اس لیے ہمارے
فلیٹ میں صبح ذرا دیر سے ہوتی ہے۔" وہ ناشتا خود تیار
کرنے کی وجہ اسے بتا رہی تھی۔
"تم نے کیوں زحمت کی لیزا۔ میں ناشتا آفس جا کر
کر لیتا۔ مجھے اچھا نہیں لگتا' تمہیں مسلسل میری وجہ
سے بے آرامی۔۔۔"
"یہ جذباتی جملے بعد میں بول لینا۔ پہلے ناشتا کر لو۔
ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ یہ چیز آملیٹ کھاؤ' تمہیں ضرور اچھا
لگے گا۔ میں نے خاص طور پر تمہارے لیے بنایا
ہے۔"
وہ اس کی بات کاٹ کر فوراً" بولی تھی۔ اس نے
چھری کانٹا اس کے سامنے کیے تھے۔
"کھاؤ!" وہ چیز آملیٹ کھانے لگا تھا۔ وہ کرسی پر اس
کے سامنے بیٹھی اسے کھاتا ہوا دیکھ رہی تھی۔ دونوں
ہاتھ میز پر جمائے وہ اسے پیار بھری نظروں سے کھاتے
ہوئے دیکھ رہی تھی۔ وہ بے ساختہ مسکرایا تھا۔
"کیا ہوا؟"
"کچھ نہیں۔" اس نے اسی طرح مسکراتے ہوئے
جواب دیا۔
"پھر اس طرح مسکرا کیوں رہے ہو۔ بتاؤ مجھے؟" وہ
بضد ہوئی تھی۔
"جس طرح تم مجھے کھاتے ہوئے پیار سے دیکھ
رہی ہو' اس طرح پیار سے مائیں اپنے بچوں کو کھاتا ہوا
دیکھتی ہیں۔"
بولتے ہوئے وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔ لیزا قدرے
جھینپ کر ہنسی۔
"سچ کہہ رہا ہوں تمہارے دیکھنے اور فکر کرنے کا
انداز بالکل ماں جیسا ہوتا ہے۔"
وہ اس کے لیے کپ میں چائے ڈال رہی تھی۔
"اچھا! اب میرا مذاق مت اڑاؤ۔ میں سچ میں
تمہاری فکر کرتی ہوں۔" وہ اس کے مسلسل مسکرانے
پر قدرے خفت بھرے انداز میں بولی۔
"مجھے پتا ہے۔" اس کی طرف دیکھ کر وہ یک دم ہی
سنجیدگی سے بولا۔
"اب تم لیٹ کر سو جاؤ۔ مجھے لینے آفس سے گاڑی
آئے گی۔" چائے کا کپ خالی کرتے ہوئے جب وہ
اٹھنے لگا' تب اس سے بولا تھا۔
اسے معلوم تھا وہ اسے آفس چھوڑنے کے لیے
ہر حال میں جائے گی' اس لیے اس نے تیار ہونے کے
دوران ہی فون کر کے آفس کی گاڑی بلوالی تھی۔
"ٹھیک ہے! لیکن شام میں' میں تمہیں لینے آؤں
گی۔"
"ایسا نہ کرو تو بہتر ہے۔ میرا آفس میں دیر تک
رکنے کا ارادہ ہے۔"
"تمہیں جب تک بھی رکنا ہے' رکو' مگر لینے میں
ہی آؤں گی۔" وہ دو ٹوک اور فیصلہ کن انداز میں بولی
تھی۔ اس نے قدرے بے چارگی سے مسکرا کر سر
اثبات میں ہلایا تھا۔

☆ ☆ ☆

آفس میں جو اسے دیکھ رہا تھا' خیریت پوچھ رہا تھا۔
سوائے اس کے کہ وہ بیساکھی کے سہارے چل رہا تھا'
باقی اس کے معمولات میں کوئی تبدیلی نہ آئی تھی۔ وہ
اسی رفتار سے اپنے کام نبٹا رہا تھا جیسے نبٹایا کرتا تھا۔
لنچ کا اسے ہوش نہ رہا تھا۔ وہ اتنے دنوں کے جمع
سب کاموں کو مکمل کرنے میں مصروف تھا۔ وہ شام
ساڑھے سات بجے تک آفس میں رہا تھا۔ لیزا نے سہ
پہر فون کر کے اس کی واپسی کا ٹائم پوچھا تھا۔
وہ باہر نکلا تو وہ گاڑی میں بیٹھی اس کا انتظار کر رہی

تھی۔
"تمہیں زیادہ انتظار تو نہیں کرنا پڑا؟"
"نہیں' میں ابھی پانچ منٹ پہلے ہی پہنچی ہوں۔ تم
بتاؤ! طبیعت کیسی ہے؟ میری نصیحتوں کا کچھ اثر تو ہوا
نہیں ہو گا تم پر۔ خوب خود کو تھکایا ہو گا۔ انسان اتنا
ضدی بھی نہ ہو۔ آفس جانا ہے تو جانا ہے۔ دیر تک
رکنا ہے تو رکنا ہے۔"
وہ گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کچھ خفگی سے بولی
وہ اس کے آفس اتنی دیر تک رکنے پر ناراض
تھی۔
"ماں جیسی میری پروا کرنے والی سینورا لیزا! میں
آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ بالکل ٹھیک ہوں۔ کہیں
درد' تکلیف کچھ نہیں ہو رہا۔" وہ مسکرا کر بولا
"تم سارا دن کیا کرتی رہیں؟"
سڑک پر ٹریفک اور لوگوں کو دیکھتے ہوئے اس نے
پوچھا تھا۔
"دوپہر تک سوتی رہی' اس کے بعد شام تک
پینٹنگ کرتی رہی۔ بیچ میں سیم سے اور اپنی ایک
دوست سے فون پر باتیں بھی کیں۔" ٹریفک جام میں
پھنس کر انہیں گھر پہنچتے ایک ڈیڑھ گھنٹہ لگ گیا تھا۔
"تم فریش ہو جاؤ۔ میں دیکھتی ہوں کھانا تیار ہوا کہ
نہیں۔ کھانے کا ٹائم ہو گیا ہے۔ ڈنر کرتے ہیں۔"
فلیٹ میں آنے کے بعد لیزا اس سے بولی تھی۔ وہ
سر ہلا کر کمرے میں چلا گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"بہت مزے کی بریانی بنائی ہے آپ نے۔" نینی
نے ڈنر میں بریانی بنائی تھی۔ ساتھ رائتہ' سلاد اور میٹھے
میں شاہی ٹکڑے۔ اسے کھانا پسند تو آرہا ہے' انہوں
نے اس سے یہ پوچھا تب وہ خوش اخلاقی سے تعریفی
جملہ بولا تھا۔
"لیزا نے کہا تھا تمہارے لیے کوئی پاکستانی ڈش
بناؤں۔" وہ مسکرا کر بولی تھیں۔
"میں واقعی گھر کے بنے پاکستانی کھانوں کو بہت مس
کر رہا تھا۔"
وہ یونہی خوش اخلاقی کے اظہار کے طور پر بولا تھا۔
ورنہ پاکستانی' چینی' جاپانی وہ کسی بھی طرح کے کھانوں کو
نہ تو سوچتا تھا نہ یاد کرتا تھا۔ وہ کھانا اس لیے کھاتا تھا کہ
کھڑا ہو سکے' چل پھر سکے' اپنے تمام کام انجام دے
سکے۔ کھانے کو ذائقے اور مزے کے لیے بھی کھایا
جاتا ہے' اسے بھول چکا تھا۔
"کیوں؟ تمہارے گھر میں تو بنتے ہوں گے پاکستانی
کھانے؟"
نینی نے اس کی طرف دیکھ کر فوراً" پوچھا تھا۔ اس کا
چہرہ یک دم ہی سنجیدہ ہو گیا تھا۔ مسکراہٹ چہرے پر
سے چلی گئی تھی۔
"جی!" اس نے یک لفظی انتہائی مختصر ترین جواب
دیا تھا۔ پتا نہیں کیوں مگر اسے ایسا لگا جیسے لیزا کی نینی
نے یہ بات جان بوجھ کر نکالی تھی۔ وہ بغور اسے دیکھ
رہی تھیں۔ اس نے یہ بھی دیکھا کہ لیزا انہیں ناراضی
سے دیکھتے ہوئے آنکھوں آنکھوں میں یہ سمجھانے کی
کوشش کر رہی تھی کہ وہ اس سے اس کی فیملی کے
بارے میں کوئی بات نہ کریں مگر انہوں نے لیزا کے
اشارے سراسر نظر انداز کر کے اس سے مزید پوچھا
تھا۔
"خیر سے شادی ہوئی بیٹا؟"
"نہیں۔"
"منگنی وغیرہ۔"
"فی الحال تو وہ بھی نہیں ہوئی۔" وہ زبردستی
مسکرایا تھا۔
اسے ان کے سوالات سے شدید الجھن ہو رہی
تھی' وہ دیکھ رہا تھا کہ لیزا کی نینی اسے بغور دیکھ رہی
ہیں۔ قبل اس کے کہ وہ اس سے مزید کوئی ذاتی سوال
کرتیں لیزا نے جلدی سے گفتگو کا موضوع تبدیل
کیا تھا۔
"نینی! اب سویٹ ڈش بھی سرو کر دیں۔ میں نے
شاہی ٹکڑوں کے لالچ میں کھانا بھی کم کھایا ہے۔"
لیزا کے کہنے پر وہ فوراً" کرسی سے اٹھی تھیں۔

اس کے بعد لیزا نے اس طرح بغیر رُکے ایک کے بعد ایک غیر متعلقہ اور فضول قسم کی باتیں شروع کی تھیں کہ اس کی نینی اگر اس سے مزید کچھ اور بھی پوچھنا چاہتی تھیں تب بھی انہیں اس کا موقع نہیں ملا تھا۔

* * *

اگر اسے اندازہ ہوتا نینی کھانے کے دوران سکندر سے اس طرح کے نامناسب سوال کریں گی تو وہ سکندر کے ساتھ کمرے ہی میں بیٹھ کر کھانا کھا لیتی۔ پتا نہیں نینی کو ہوا کیا تھا۔ وہ اچھی خاصی سمجھ دار خاتون تھیں، ان کی سمجھ داری پر بھروسا کرتے ہوئے اس نے انہیں بہ طور خاص یہ تاکید کی ہی نہیں تھی کہ خدارا سکندر سے اس کی ذاتی زندگی کے بارے میں کوئی بات نہ کیجیے گا۔ کاش وہ انہیں تاکید کر ہی دیتی۔

سکندر اپنی ذاتی زندگی سے متعلق گفتگو کو ناپسند کرتا تھا، کہیں وہ برا نہ مان گیا ہو، کہیں اس کا موڈ نہ خراب ہو گیا ہو؟

کھانے کے بعد سکندر کے کسی کولیگ کا وہاں سے فون آگیا تھا۔ وہ اس سے دفتری امور پر کچھ گفتگو کر رہا تھا۔ وہ اسے لیونگ روم میں فون پر بات کرتا چھوڑ کر کچن میں اپنے اور اس کے لیے گرین ٹی بنانے آئی تھی۔ اگر اسے نیند نہ آنے کی شکایت تھی تو پھر سونے سے پہلے کافی پینا ہرگز مناسب نہیں تھا۔ کچن میں نینی بچا ہوا کھانا فریج میں رکھ رہی تھیں۔

"کافی کا موڈ ہے؟ لاؤ میں بنا دوں؟" اسے دیکھ کر وہ مسکرا کر بولی تھیں۔

"گرین ٹی بنا رہی ہوں نینی! میں بنا لوں گی۔ آپ اس کے بعد آرام کیجیے۔"

وہ کیبنٹ کھول کر گرین ٹی کے ٹی بیگز نکالنے لگی تھی۔ کام کرتے کرتے ہی اس نے انہیں مخاطب کیا

"نینی! آپ سے ایک بات کہوں؟"

"نینی! سکندر کو میں بضد ہو کر، بہت اصرار کر کے یہاں لائی ہوں۔ وہ ہوٹل سے یہاں آنے کے لیے کسی بھی طرح راضی نہیں تھا۔ اب میں نہیں چاہتی وہ یہاں کسی بھی طرح کی کوفت یا الجھن محسوس کرے۔ وہ پسند نہیں کرتا کہ اس کی ذاتی زندگی، اس کی فیملی کے بارے میں اس سے بات کی جائے، کچھ پوچھا جائے۔ اگر وہ یہ چاہتا ہے کہ ایک حد سے زیادہ اس سے بے تکلف نہ ہوا جائے تو ہمیں اس کی اس خواہش کا احترام کرنا چاہیے۔ وہ ہمارے گھر پر مہمان ہے نینی!"

"کیا سکندر نے تم سے کچھ کہا ہے؟" نینی سنجیدہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

"نہیں وہ کچھ نہیں بولا، مگر میں یہ بات پہلے سے جانتی ہوں۔"

"ویسے تو میرے خیال سے میں نے کوئی غلط بات نہیں کی، لیکن پھر بھی اگر تمہیں ایسا لگ رہا ہے تو اب اس کی فیملی اور ذاتی زندگی کے بارے میں کچھ نہیں پوچھوں گی۔"

"تھینکس نینی!" وہ مسکرا کر گرین ٹی بنانے لگی تھی۔

اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اپنا کام کرنے کے دوران نینی گاہے گاہے اسے بغور دیکھ رہی ہیں، جیسے اس کے چہرے پر کچھ پڑھنے کی کوشش کر رہی ہوں۔

"گرین ٹی۔" وہ ٹرے میں کپ رکھ کر لیونگ روم میں آئی تھی۔ سکندر کی فون پر بات ختم ہو چکی تھی۔

"تھینکس۔" اس نے مسکراتے ہوئے ٹرے میں سے کپ اٹھایا تھا۔ اس کے مسکرانے پر اس کے دل کو کچھ تسلی ہوئی تھی، اسے برا تو یقیناً لگا تھا، مگر کم از کم وہ ناراض تو نہیں ہوا تھا۔ وہ اس کے سامنے والے صوفے پر اپنا کپ لے کر بیٹھ گئی

"تمہارا یہ لکڑی کا زینہ مجھے بڑا خوبصورت لگتا ہے۔ یہاں لیونگ روم کے ساتھ یہ بڑا آرٹسٹک لک دیتا ہے۔"

چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے وہ سیڑھی کی طرف دیکھتے ہوئے اس سے بولا۔ لیزا نے بھی گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا، وہ مسکرائی تھی۔

"پتا ہے یہ اپارٹمنٹ میں نے اس زینہ ہی کی وجہ سے خریدا تھا۔ اسے دیکھتے ہی میں اس پر عاشق ہو گئی تھی۔ پرانی موویز میں ہوتے ہیں ناں ایسے گھر، ایسے لکڑی کے گول زینے۔"

"ضرور اسی وجہ سے خریدا ہوگا۔ تم آرٹسٹ لوگ اسی طرح کے ہوتے ہو، پسند آگئی تو کوئی معمولی سی چیز، نہیں آئی تو عالیشان سے عالیشان چیز بھی نظروں میں نہیں سماتی۔" وہ مسکراتے ہوئے بول رہا تھا۔ "یہیں سے اوپر جا کر ہے ناں تمہارا اسٹوڈیو؟"

"ہاں! دیکھو گے تم؟" اس نے پوچھا۔

"بالکل دیکھوں گا۔ میں نے تو تم سے پرسوں رات بھی کہا تھا، میں تمہارا اسٹوڈیو دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"تمہیں اوپر چڑھ کر جانے میں کوئی مشکل تو نہیں ہوگی؟" ان دونوں نے چائے کے کپ خالی کر کے واپس رکھے، تب اس نے سکندر سے پوچھا۔ وہ جواباً ہنسا تھا۔

"مجھے کوئی مشکل نہیں ہوگی۔ چلو! دکھاؤ مجھے اپنا اسٹوڈیو، اپنی پینٹنگز۔"

وہ دونوں اوپر آگئے تھے۔ سکندر نے بڑے آرام سے بیساکھی کے ساتھ سیڑھیاں چڑھی تھیں۔ وہ اوپر آکر چپ چاپ کھڑی سکندر کے تاثرات دیکھ رہی تھی۔ ویسے تو وہ ایک بار اسے بتا چکا تھا کہ اسے آرٹ میں قطعاً" کوئی دلچسپی نہیں ہے، مگر وہ آرٹسٹ تھی، اپنے آرٹ کی قدر افزائی چاہتی تھی۔ سکندر نظریں گھما کر ارد گرد مختلف جگہوں پر رکھی اس کی مکمل اور نامکمل پینٹنگز کو دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک ایک پینٹنگ کو بغور دیکھ رہا تھا، جس پینٹنگ پر وہ آج شام تک کام کرتی رہی تھی، وہ اس کے پاس جا کر کھڑا ہوا تھا۔ اس پینٹنگ میں اس نے خزاں کے موسم کی عکاسی کی تھی۔ وہ اسے بغور دیکھ رہا تھا۔ وہ بھی اس کے پاس آگئی تھی۔

"ویسے تم بڑی نان سیریس سی لگتی ہو۔ مگر تمہاری پینٹنگز تمہیں ایک بہت ہی مختلف انسان کے طور پر ظاہر کر رہی ہیں۔" وہ پینٹنگ پر نظریں مرکوز کیے اس سے بولا۔

"یعنی؟"

"یعنی بہت سینسیٹو، اپنے اندر کی دنیا لوگوں سے چھپانے والی۔"

بولنے کے دوران چلتا ہوا وہ ایک دوسری پینٹنگ کے سامنے جا کر کھڑا ہوا تھا جس میں اس نے روم کی ایک اداس شام اور ایک تنہا لڑکی کو پینٹ کیا تھا۔

"تمہیں آرٹ میں کوئی دلچسپی نہیں ہے، پھر بھی تم تبصرہ اور تجزیہ تو ایسے کر رہے ہو میری پینٹنگز پر جیسے بہت جانتے ہو۔"

وہ اس کی بات کی تردید یا تصدیق کیے بغیر مسکرا دیا تھا۔ وہ آگے بڑھ کر کھڑکیوں اور دروازے پر پڑے مخملیں پردے ہٹانے لگی۔

"آؤ! میری بالکونی بھی دیکھو۔" اس نے شیشے کا سلائیڈنگ ڈور بھی کھول دیا تھا۔ کچھ دیر قبل بارش ہونا شروع ہوئی تھی، موسم بے حد خوبصورت تھا۔

"جب بھی میں کام کرتے کرتے تھک جاتی ہوں تو کافی کا کپ لے کر یہاں بیٹھ جاتی ہوں۔" اس نے بالکونی میں رکھی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

"صرف تمہارا لکڑی کا زینہ ہی نہیں بلکہ تمہارا اسٹوڈیو اور یہ جگہ بھی بہت خوبصورت ہے۔ یہاں سے تمہارے روما کا نظارہ بھی بہت خوبصورت ہے۔" وہ ریلنگ کے ساتھ کھڑا ہو کر سڑکوں اور بلند و تاریخی عمارتوں کو دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ وہ بھی جواباً" مسکرائی تھی۔ وہ دونوں خاموشی سے کھڑے برستی بارش کو دیکھ رہے تھے۔ روم کی سڑکوں اور عمارتوں کو دیکھ رہے تھے۔

"کل تم اپنے ہوٹل واپس چلے جاؤ گے؟"

"ہاں، کافی دن تمہارا مہمان بن گیا۔ کل صبح آفس جاؤں گا، وہاں سے شام میں ہوٹل۔" وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرا کر بولا۔

"ٹھیک ہے! میں تم سے اب اور رکنے پر اصرار نہیں کر رہی، لیکن پلیز تم ہوٹل جا کر اپنا خیال رکھنا۔"

"میں اپنا خیال رکھوں گا مصورہ! آپ فکر نہ

کریں۔"

"ہم اب کب ملیں گے؟" اس نے سنجیدگی سے سکندر کو دیکھا۔

"جب تم چاہو۔"

"میں تو یہ چاہوں گی کہ تم مجھ سے کل ہی ملو۔" وہ مسکرا کر بولی — سکندر بے ساختہ ہنسا تھا۔

"تم سے پینٹنگ بنوائے بغیر میں کہیں نہیں بھاگنے والا۔ اطمینان رکھو۔ مجھے پتا ہے روز ملنے کی بات اسی لیے کی جارہی ہے کہ سینیورا لیزا کو میری وعدے کی پاس داری پر شکوک و شبہات ہیں۔"

"اتنی مشکل اردو مت بولو' سمجھنے میں تکلیف ہوتی ہے۔"

وہ بے چارگی سے — بولی تھی گویا سکندر کے جملے میں شامل کچھ الفاظ سمجھنے سے قاصر رہی تھی۔

کچھ دیر مزید وہاں کھڑے رہ کر بارش' روم کی سڑکیں اور روم کی رات کو انجوائے کرتے رہنے کے بعد وہ دونوں نیچے آگئے تھے۔ لیزا اس کے ساتھ کمرے میں آئی تھی۔ وہ اسے دوا اور پانی دے رہی تھی۔ ایک ٹیبلیٹ جو وہ دن میں دو بار لے رہا تھا' اس کی آج رات اور کل صبح کے لیے ملا کر بس دو ہی ٹیبلٹس بچی تھیں۔

"کل فارمیکا سے یہ ٹیبلٹ یاد سے خرید لینا۔" وہ کرسی پر بیڈ سے نزدیک بیٹھی ہوئی تھی۔

"لے لوں گا۔" مسکرا کر اسے جواب دیتے ہوئے اس نے پانی سے دوا نگلی تھی۔

"تم سو جاؤ اب جا کر۔ میں بھی سونے کی کوشش کرتا ہوں۔"

"تم چاہو تو میں تھوڑی دیر تمہارے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرسکتی ہوں۔ تم اکیلے لیٹ کر پتا نہیں کیا کیا الٹا سیدھا سوچتے رہتے ہو ڈپریسڈ ہوتے ہو اور پھر تمہیں نیند نہیں آتی۔" وہ سنجیدگی سے بولی تھی۔

"آج میں سینیورا لیزا محمود اور ان کی پینٹنگز کو سوچتے ہوئے سوؤں گا۔" وہ شرارت بھرے انداز میں بولا۔

"اتنی خوبصورت چیزیں سوچو گے تب تو نیند بھی خوب پر سکون آئے گی اور خواب بھی بڑے حسین نظر آئیں گے۔"

وہ اس کے شرارتی انداز کا شرارت بھرے انداز ہی میں جواب دیتی وہاں سے اٹھ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

صبح وہ تو وقت پر اٹھ ہی گئی تھی' نینی بھی اٹھ گئی تھیں۔ انہیں پتا تھا آج سکندر اپنے ہوٹل واپس چلا جائے گا اور وہ یقیناً" اپنی رات کی کہی بات کا ازالہ کرنا چاہتی تھیں۔ اسے نینی کی خود سے محبت پر بے طرح پیار آیا تھا۔ وہ سکندر سے پوچھے اپنے سوالوں کو بالکل بھی غلط نہیں سمجھ رہی تھیں۔ مگر چونکہ وہ اسے پسند نہیں آئے تھے' سو اسے خوش کرنے کو وہ صبح صبح سکندر کے لیے خوب اہتمام سے ناشتا تیار کررہی تھیں۔

سکندر نے اور اس نے ساتھ بیٹھ کر ناشتا کیا تھا۔ نینی گرم گرم پراٹھے توے سے اتار اتار ان دونوں کو قیمے اور آلو کی بھجیا کے ساتھ کھانے کے لیے لا کر دے رہی تھیں۔

"آپ کو بہت زحمت ہوئی میری وجہ سے۔" رخصت ہوتے وقت سکندر نینی کا شکریہ ادا کررہا تھا۔ اس کا انداز مہذب اور پر تکلف تھا۔

"مجھے کوئی زحمت نہیں ہوئی ہے۔ میری بیٹی کے دوست ہو تم۔ یہ تمہارا اپنا گھر ہے۔ جب تک روم میں ہو' جب دل کرے آجایا کرو۔"

پرشفقت انداز میں بولتے ہوئے انہوں نے سکندر کے سر پر ہاتھ پھیرا — سکندر نے آج بھی جانے کے لیے آفس کی گاڑی منگوائی ہوئی تھی۔

"تمہارا شکریہ نہیں ادا کررہا ہیں۔" وہ دروازے تک اسے چھوڑنے آئی تھی۔ سکندر سنجیدگی سے اس سے بولا تھا۔

"بہت اچھا کررہے ہو' اگر کرتے تو مجھے بہت برا لگتا۔"

☼ ☼ ☼

وہ آفس میں تھا۔ لنچ ٹائم تھا مگر وہ کاموں میں مصروف تھا۔ بغیر ناشتے کے لنچ کا دھیان نہیں رہا کرتا تھا تو آج جب کہ اس نے خاصا ٹھیک ٹھاک ناشتا کر رکھا تھا' لنچ کا خیال بھی کیسے آتا۔ وہ ایک کانٹریکٹ ڈرافٹ کررہا تھا جب اس کے موبائل پر لیزا کی کال آئی۔

"کیسی ہو مصورہ؟" اس نے مسکراتے ہوئے کال ریسیو کی تھی۔ نظریں لیپ ٹاپ سے ہٹا لی تھیں' اور کرسی سے ٹیک لگا کر اطمینان بیٹھ گیا تھا' گویا فرصت سے گپ شپ کے لیے تیار ہو۔

"میں ٹھیک ہوں۔ تم اپنا بتاؤ طبیعت کیسی ہے؟ زیادہ تھکا تو نہیں رہے خود کو؟ زیادہ چل پھر تو نہیں رہے؟ لنچ کیا؟ میڈیسن خریدلی؟"

وہ اس کے ایک سانس میں اتنی ساری باتیں بیک وقت پوچھنے پر ہنس پڑا تھا۔

"یا خدا لیزا! تم تو واقعی بنی بنائی ماں ہو۔ میرے لال نے کھانا کھایا اور تھکا تو نہیں۔ اس طرح کی فکریں تو صرف ماں ہی کرتی ہے۔"

"بات کو گھماؤ نہیں۔ میرے سوالوں کا جواب دو۔" وہ قدرے ناراضی سے بولی' گویا اپنا مذاق اڑائے جانے پر خفا ہوئی ہو۔

"میری طبیعت بالکل ٹھیک ہے۔ پراٹھوں والے اتنے ہیوی ناشتے کے بعد لنچ کون کرسکتا ہے لڑکی؟ اور میڈیسن شام میں آفس سے جاتے ہوئے خرید لوں گا۔"

وہ میڈیسن ختم ہوگئی ہے اس بات کو سراسر بھول چکا تھا۔ اب لیزا کے یاد دلانے پر یاد آیا تھا۔

"ٹھیک ہے لیکن خرید لینا یاد سے۔ پتا نہیں خود کو اس طرح اگنور کرنے کی عادت کیوں ہے تمہیں؟"

وہ سنجیدگی سے بولی — اس کے مسکراتے لب یک دم ہی سنجیدہ ہوگئے تھے' چہرے پر درد سے بھرا ایک تاثر ابھر آیا تھا۔ خود کو مزید زیر بحث لائے جانے سے بچنے کے لیے اس نے فوراً" پوچھا۔

"تم کیا کررہی ہو؟"

"پینٹنگ اور کیا۔ شام میں باہر نکلوں گی۔ اپنے کچھ دوستوں سے بھی ملنا ہے۔ تمہارا شام کا کیا پروگرام ہے؟"

"شام تک ایک میٹنگ میں بزی رہوں گا اور رات میں ایک ڈنر میں جانا ہے۔"

اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ اس سے ملنا چاہتی ہے۔ اگر کوئی اور مصروفیت نہ ہوتی تو وہ اس سے ضرور ملتا مگر میٹنگ بھی ضروری تھی اور آفیشل ڈنر بھی۔ یہ میٹنگ اس کے ایکسیڈنٹ کی وجہ سے ملتوی ہونے کے بعد آج ہورہی تھی۔ اس کے بعد یہاں کمپنی کے ایک ایگزیکٹو کے گھر رات میں ڈنر پر جانا تھا۔

"گویا آج ملنے کا کوئی امکان نہیں ہے؟" اسے لیزا کے لہجے میں مایوسی کی ہلکی سی جھلک محسوس ہوئی۔

"ہاں! آج اور کل میں تھوڑا بزی رہوں گا۔ پرسوں کا کوئی پروگرام رکھ لیتے ہیں۔"

اب لیزا سے بات کرتے ہوئے اس کا لہجہ ہمیشہ بے تکلف ہوتا تھا۔ جس طرح باقی لوگوں سے وہ خود کو بہت فاصلے پر رکھ کر ملتا تھا' اس طرح اس سے نہیں مل پاتا تھا۔ اس کے ساتھ وہ بالکل اسی طرح ملتا تھا جیسا وہ تھا۔ اگر وہ خوش ہوتا تھا تو اپنی خوشی اس پر ظاہر ہوجانے دیتا تھا' اگر اس کا موڈ خراب ہوتا' وہ اداس اور دکھی ہوتا' تب بھی اپنی یہ کیفیات اس سے چھپا نہیں پاتا تھا۔

وہ کل رات بھی سو نہیں پایا تھا مگر لیزا سے مذاق میں کہی ہوئی بات پر عمل کرتا وہ اسے اور اس کی پینٹنگز کو سوچتا رہا تھا۔ نیند اسے بے شک نہیں آئی تھی' مگر وہ روزانہ کی طرح بے سکون اور مضطرب بھی نہیں رہا تھا۔ ایکسیڈنٹ کے بعد سے کبھی ڈاکٹر کی تجویز کردہ دوا سے نیند آجاتی تھی اور کبھی نہیں' وہ اس مسئلے کو سمجھ نہیں پارہا تھا۔ وہ تو یہ بھی نہیں سمجھ پارہا تھا کہ اسے اتنے دنوں سے وہ خواب نظر کیوں نہیں آرہا۔ وہ آج کل اتنا پرسکون اور مطمئن کیسے ہے؟

✲ ✲ ✲

وہ اور ام مریم واشنگٹن میں تھے۔ شہریار خان اور امو جان ان دونوں کی آمد سے بہت خوش تھے۔ سکندر چھٹیوں کے آغاز میں اپنے دوستوں کے ساتھ کہیں گھومنے چلا گیا تھا۔ اسے دو تین روز بعد آنا تھا۔

سکندر کے آنے یا نہ آنے سے اسے کوئی فرق پڑتا نہیں تھا' اس لیے اس نے تو یہ پوچھا تک نہیں تھا کہ سکندر کہاں گیا ہے اور کب آئے گا۔ یہ معلومات امو جان نے اسے اور ام مریم کو اس کے پوچھے بغیر فراہم کی تھیں۔

ام مریم اس کے ماں' باپ کے دل تو پہلے ہی جیت چکی تھی' اب یہاں ان کے گھر آکر' ان لوگوں کے ساتھ رہ کر وہ ان دونوں سے مزید قریب ہو گئی تھی۔ خود اعتماد وہ بلا کی تھی' اس لیے پہلی بار اپنی سسرال آنے پر نروس تھی نہ شہریار خان کی رعب دار شخصیت سے خائف۔

"آنٹی! میں کافی بنا کر لاؤں؟"

رات کے کھانے کے بعد امو جان ان کے پاکستانی ملازم گلزار کو کافی لانے کا کہنے لگیں تب وہ ان سے بولی تھی۔

امو جان اس کے خود کو گھر کا فرد سمجھنے کو پسند کرتے ہوئے مسکرائی تھیں۔ شہریار خان کھانے کی میز سے اٹھ کر جا رہے تھے۔

"انکل! آپ کافی نہیں پییں گے؟" باپ کا رعب اور دبدبہ اس پر اتنا تھا کہ وہ ساری زندگی کبھی ان سے اس طرح بے تکلفی سے بات نہیں کر سکا تھا جیسے ام مریم کر رہی تھی۔

اس نے ام مریم کی خود اعتمادی کو پیار سے دیکھا۔ وہ شہریار خان کی شخصیت کے رعب میں نہیں آئی تھی' وہ عزت اور احترام لیے بے تکلفی سے ان سے اسی طرح بات کر رہی تھی جیسے اپنے والد اور چچا سے کرتی تھی۔

"میری کافی اسٹڈی میں بھجوا دینا مریم!"

وہ خلاف عادت مسکرا کر اور نرمی سے بولے تھے۔ حیرت سی حیرت تھی' اس نے اپنے باپ کو بہت کم ہی ہنستے اور مسکراتے دیکھا تھا۔ باہر دفتری حوالے سے لوگوں سے ملتے ہوں گے تو مسکرا لیا کرتے ہوں گے۔ گھر پر تو بلا ضرورت انہیں مسکراتے اور بات کرتے کبھی کسی نے نہ دیکھا تھا۔

"آپ ہم لوگوں کے ساتھ بیٹھیں گے نہیں؟ ہم لوگ دوپہر سے آئے ہوئے ہیں۔ آنٹی سے تو میری خوب باتیں ہو گئیں۔ میں سوچ رہی تھی آپ سے شام میں ملاقات ہو گی تب باتیں کروں گی آپ سے بھی۔"

شہریار خان ہونے والی بہو کے بے تکلفانہ انداز پر مسکراتے ہوئے بولے تھے۔

"کافی بنا کر لے آؤ' پھر کر لیتے ہیں باتیں۔" وہ لیونگ روم میں اس کے اور امو جان کے ساتھ آکر بیٹھ گئے تھے۔

ام مریم کافی بنا کر لے آئی تھی۔ امو جان کو اگر اس کے ہاتھ کی بنائی کافی پسند آئی تھی تو شہریار خان اس کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے خوش نظر آ رہے تھے۔ کیمپس میں جن تنظیموں اور کلبز کی وہ ممبر تھی شہریار خان اس سے ان کے حوالے سے بات کر رہے تھے۔ وہ آگے کیا پڑھنا چاہتی ہے' کیا کیا کچھ کرنا چاہتی ہے' وہ انہیں بتا رہی تھی۔ وہ بظاہر کافی پیتے ہوئے امو جان کے ساتھ باتیں کر رہا تھا مگر اس کے کان شہریار خان اور ام مریم کی گفتگو پر لگے تھے۔

"کافی ٹھیک ٹھاک طریقے سے امپریس کر چکی ہیں آپ میرے اروگینٹ پاپا کو۔" رات جب وہ ام مریم کو اس کے کمرے میں چھوڑنے جا رہا تھا تب مسکرا کر بولا تھا۔

"اور ان کے بیٹے کو؟" مریم کا سوالیہ انداز شرارت لیے ہوئے تھا۔

"وہ بے چارہ تو آپ پر پورا کا پورا نثار ہو چکا ہے۔" وہ بے چارگی سے بولا۔ ام مریم کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔

وہ جانتا تھا کہ اس کے پاپا کو اپنی ہونے والی بہو دل و جان سے پسند آ گئی تھی اور وہ اس کی ساتھ بیٹھ کر کافی پینے کی خواہش رد نہیں کر پائے تھے۔

اگلے روز صبح ناشتے کے بعد ہی وہ ام مریم کو لے کر گھومنے نکل گیا تھا۔ شہریار خان اپنے آفس چلے گئے تھے۔ گھر پر امو جان تھیں۔ وہ دونوں سارا دن گھومتے رہے تھے۔

"تم بور تو نہیں ہو رہیں مریم؟ تمہیں میرے گھر آکر مزا آ رہا ہے؟"

اس کا ہاتھ تھام کر سبزے پر چلنا بہت اچھا لگ رہا تھا۔ وہ دونوں بار تھوپ پارک کے فلاور گارڈن میں آئے ہوئے تھے۔

اردگرد بے شمار اور بے حساب پھول ہی پھول تھے دلکش اور خوشنما پھول۔ رنگوں' خوشبوؤں' خوشیوں اور محبتوں کا احساس دلاتے پھول۔ فلاور گارڈن کے بالکل درمیان میں دلکش فوارہ اور اس کے چاروں اطراف پھولوں کا ڈھیر۔ ام مریم چلتے چلتے رکی تھی۔ وہ بھی رک گیا تھا۔

"تمہارا گھر؟" اس نے اسے فوراً" ٹوکا تھا۔

"میں تمہارے نہیں' ہمارے گھر آئی ہوں زین! میں نے آنٹی' انکل کی دعوت قبول ہی اس لیے کی تھی' کیونکہ میں میرا اور تمہارا یہ گھر دیکھنا چاہتی تھی۔" وہ سرشار سا ہو کر مسکرایا تھا۔

"کبھی کبھی مجھے سب کچھ اک خواب جیسا لگتا ہے۔" وہ ام مریم کی انگلی میں سجی اپنے نام کی انگوٹھی کو پیار سے دیکھتے ہوئے بولا۔ وہ اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

"میں نے تمہیں چاہا اور اتنی آسانی سے تم مجھے مل بھی گئیں' سچ مجھے اپنی خوش قسمتی پر خود یقین نہیں آتا۔"

"یقین کر لو زین شہریار! تم ام مریم کے دل کو فتح کر چکے ہو۔" وہ شاہانہ سے انداز میں بول کر کھلکھلائی تھی۔

"مجھے جیت لینا آسان نہیں تھا' مگر تم نے یہ مشکل کام بڑی آسانی سے کر لیا ہے۔"

"میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں مریم!" اس کے لہجے میں جذبات کی شدت تھی۔

"میں جانتی ہوں اور میں بھی تم سے بہت محبت کرتی ہوں۔" وہ سرشار سا ہو کر مسکرایا تھا۔ پورا دن ساتھ گھوم پھر کر رات آٹھ بجے کے قریب وہ دونوں گھر واپس آئے تھے۔ شہریار خان اور امو جان لیونگ روم میں ساتھ بیٹھے تھے۔

"گھوم لیا واشنگٹن؟" شہریار خان نے مسکرا کر مریم سے پوچھا تھا۔

"ابھی کہاں انکل! ابھی تو زین نے ایک' دو ہی جگہیں دکھائی ہیں۔ اب میرا دل چاہ رہا ہے' ہم کہیں آؤٹنگ کا کچھ ایسا پروگرام بنائیں جس میں آپ اور آنٹی بھی ہوں۔ تب زیادہ مزا آئے گا۔" وہ بے تکلفانہ سے انداز میں کہتے ہوئے شہریار خان کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔

"بالکل بنانا چاہیے ایسا کوئی پروگرام۔ ان فیکٹ میرے دل میں یہ خیال تھا' بس میں سکندر کے آنے کا منتظر ہوں۔ وہ بھی آجائے تب آؤٹنگ کے دو' تین پروگرام بنا لیتے ہیں۔"

شہریار خان ام مریم کے بے تکلف انداز کو مسکراتی' پسند کرتی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولے تھے جبکہ سکندر کے نام پر اس کے لبوں سے مسکراہٹ رخصت ہو گئی تھی۔ پتا نہیں اس کے ذکر کے بغیر شہریار خان کی کوئی بھی بات مکمل کیوں نہیں ہوتی تھی۔

"سکندر شاید کل یا پرسوں آجائے گا۔" امو جان ابھی مسکرا کر یہ بات کہہ ہی رہی تھیں کہ لیونگ روم کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوتا سکندر با آواز بلند' شوخ و شریر سے لہجے میں بولا۔

"سکندر آچکا ہے امو جان!" اس سمیت ان سب لوگوں نے گردن گھما کر دروازے کی طرف دیکھا تھا۔ لائٹ براؤن پینٹ' ڈارک براؤن جیکٹ' مفلر اور گلوز پہنے ہوئے' بکھرے بالوں اور لبوں پر شوخ سی

مسکراہٹ کے ساتھ وہ بے حد ہینڈسم لگ رہا تھا۔

وہ واقعی سکندر لگ رہا تھا' وہ ایلگزینڈر لگ رہا تھا' جیسے وہ دنیا کو فتح کر سکتا ہے' ہمیشہ کی طرح۔

سکندر کو دیکھ کر اس کے لبوں پر سے مسکراہٹ فوراً" رخصت ہو گئی تھی۔ ام مریم کے ساتھ اپنے گھر پر یہ چھٹیاں اب وہ اس طرح انجوائے نہیں کر سکے گا جیسے کرنا چاہتا تھا۔ یہ سن کر کہ سکندر اپنے دوستوں کے ساتھ گھومنے پھرنے چلا گیا ہے' اس نے دل میں خواہش کی تھی کہ کاش ان چھٹیوں میں سکندر گھر نہ آئے' مگر اس کی خواہش کہاں پوری ہوئی تھی۔ اس کی چھٹیوں کا مزا خراب کرنے کے لیے وہ موجود تھا۔

سکندر کو دیکھ کر جو تاثر اس کے چہرے پر ابھرا تھا' اس پر کسی کا بھی دھیان نہیں گیا تھا' کیونکہ امو جان' شہریار خان اور ام مریم تینوں کے تینوں سکندر کی جانب متوجہ تھے۔ امو جان بے ساختہ صوفے سے اٹھی تھیں۔

"آگیا میرا بیٹا۔ بس تمہاری کمی تھی گھر میں۔" انہوں نے سکندر کی پیشانی پر بے اختیار پیار کیا تھا۔ شہریار خان بھی اسے دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔

"اس طرح اچانک؟ تمہاری ماں تو کہہ رہی تھیں' تم دو' ایک دن بعد آؤ گے۔" سکندر نے مسکراتی نگاہیں ام مریم اور اس پر ڈالی تھیں۔

"بس پاپا جیسے ہی مجھے پتا چلا زین اور میری ہونے والی بھابھی گھر تشریف لا چکے ہیں' میں نے اپنے باقی سارے پروگرام کینسل کر دیے۔ پہلے ہی مجھے زین کی منگنی میں شرکت نہ کرنے کا اتنا افسوس ہے۔"

وہ مسکرا کر بولتے ہوئے صوفے پر اس کے برابر بیٹھ گیا۔

"کیسے ہو زین؟"

"میں ٹھیک ہوں۔" ام مریم کا خیال کر کے وہ قصداً" مسکرا کر بولا۔

وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ ام مریم اس کے اور سکندر کے بیچ کسی تناؤ کو محسوس کرے۔ اس کے ماں باپ کے لیے یہ بات تعجب کی نہیں تھی کہ بچپن ہی سے وہ دونوں بھائی ایک دوسرے سے بہت دور رہتے تھے' مگر ام مریم اس بات پر حیران ہو سکتی تھی کہ زین کی اپنے اکلوتے بھائی سے کیوں بات چیت نہیں ہوتی۔ وہ ان وجوہات کو' بچپن کی محرومیوں کو فی الحال ام مریم کے سامنے لانا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اس سے خیریت پوچھنے کے بعد سکندر اب ام مریم کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ وہ اسے مسکرا کر دیکھ رہا تھا۔

"بہت شوق تھا مجھے تم سے ملنے کا۔ میں تمہیں "تم" کہہ سکتا ہوں ناں؟ رشتے میں تو تم سے بڑا ہوں۔ زین کا بڑا بھائی جو ہوا۔" وہ مسکرا کر خوش دلی سے بولا تھا۔

"بالکل کہہ سکتے ہو۔" ام مریم سدا کی پر اعتماد لڑکی' مسکرا کر بھرپور اعتماد کے ساتھ بولی تھی۔

وہ سکندر کے چہرے کو بغور دیکھ رہا تھا جو اس وقت مکمل طور پر ام مریم کی جانب متوجہ تھا۔ وہ سکندر سے بہت دنوں کے بعد مل رہا تھا۔ جب سے ام مریم اس کی زندگی میں آئی تھی وہ سکندر سے نہیں ملا تھا۔ بالکل سامنے وہ بے تحاشا حسین اور غیر معمولی لڑکی بیٹھی تھی جسے اس کی زندگی کی ساتھی بننا تھا۔ وہ سکندر کے تاثرات کو بغور دیکھ رہا تھا۔

اس کی زندگی میں پہلی بار کچھ ایسا اچھا ہوا تھا جو ابھی تک سکندر کی زندگی میں نہ ہوا تھا۔ اس نے سکندر سے پہلے اپنی زندگی کی ساتھی چن لی تھی اور جسے اس نے چنا تھا' اس کی ٹکر کی لڑکی سکندر ساری زندگی تلاش نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے اپنے اندر ایک عجیب سی خوشی محسوس کی تھی۔

سکندر اس وقت بیگ سے نکال کر اسے اور ام مریم کو الگ الگ تحفے دے رہا تھا۔

"یہ میری طرف سے تم لوگوں کی منگنی کا تحفہ۔"

سکندر سے وہ تحفہ قبول کرتے ہوئے' سکندر کا خوشی اور مسکراہٹ سے بھرپور انداز دیکھتے ہوئے اسے لگ رہا تھا کہ سکندر خوش ہونے کا محض ڈرامہ کر رہا ہے۔ وہ خود سے ہر معاملے میں کمتر چھوٹے بھائی کو خود سے آگے بڑھتا' ام مریم جیسی حسین و بے مثال لڑکی کا

ساتھ پاتا دیکھ کر کیونکر خوش ہو سکتا تھا؟

کم ظرفی کی بات تھی' مگر وہ یونان کے اس بادشاہ کو جسے دنیا فتح کرنے کے لیے پیدا کیا گیا تھا' زندگی کے اس مقام پر خود سے مات کھاتے دیکھ کر عجیب سی خوشی اور طمانیت اپنے اندر اترتی محسوس کر رہا تھا۔

صبح ناشتے کی میز پر وہ' ام مریم اور سکندر ساتھ تھے۔ امو جان ان لوگوں کا ساتھ دینے بیٹھی تھیں ورنہ وہ ناشتا شہریار خان کے ساتھ صبح ہی کر چکی تھیں۔ شہریار خان دفتر جا چکے تھے۔

"کافی صبح کا اٹھا ہوا ہے سکندر۔ کہہ رہا تھا میں ناشتا زین اور مریم کے ساتھ کروں گا۔" امو جان اسے اور مریم کو بتا رہی تھیں۔

"تم چھٹیوں میں بھی صبح جلدی اٹھ جاتے ہو؟" مریم نے آملیٹ کھاتے ہوئے سکندر سے پوچھا تھا۔ وہ اسی دوستانہ و بے تکلف انداز میں سکندر سے گفتگو کر رہی تھی جس طرح باقی سب سے کیا کرتی تھی۔

"ہاں! بس عادت ہے شروع سے میری صبح جلدی اٹھنے کی۔" وہ اپنے لیے توس پر مکھن لگا رہا تھا۔ مریم اب سکندر سے اس کی پڑھائی کے حوالے سے گفتگو کرنے لگی تھی۔ وہ کیا پڑھ رہا ہے' کس یونیورسٹی میں پڑھ رہا ہے اور کیا مضامین پڑھ رہا ہے۔ اسے چونکہ سکندر کے ساتھ باتیں کرنے میں قطعاً" کوئی دلچسپی نہیں تھی اس لیے وہ اس گفتگو میں شامل ہونے کے بجائے اخبار کی سرخیوں پر نگاہیں دوڑاتے ہوئے ناشتا کرنے میں مگن تھا۔ اس کا تو یہ بھی دل نہیں چاہ رہا تھا کہ مریم' سکندر کے ساتھ زیادہ خوش اخلاقی دکھائے مگر اس سے روکنے کے لیے اسے ام مریم کو اپنے اور سکندر کے حوالے سے بہت سی ایسی باتیں بتانا پڑتیں جو وہ ابھی بتانا چاہ نہیں رہا تھا۔ وہ اپنے بھائی کے مقابلے میں خود کو کمتر سمجھتا ہے' وہ اپنے بھائی سے ہمیشہ ہر معاملے میں پیچھے رہا ہے باپ کے ہاتھوں نظر انداز ہوا ہے۔ یہ سب زبان سے کہنا اسے دشوار لگ رہا تھا۔

"اس کا مطلب ہوا تمہارے اور زین کے سبجیکٹس بالکل ایک جیسے ہیں؟" سکندر نے ام مریم کے سوالات کے مفصل جواب دیے۔ تب وہ مسکرا کر پوچھنے لگی۔

"ہاں۔" سکندر نے بھی مسکرا کر سر ہلایا۔

"تم بھی کہیں زین کی طرح لائر تو نہیں بننا چاہتے؟"

"بننا تو چاہتا ہوں۔"

اسے ایسا لگا تھا' سکندر مذاق اڑاتی نگاہوں سے اسے دیکھ کر کہے گا۔ "میں نہیں' زین وہ مضامین پڑھ رہا ہے جو میں نے اپنے لیے منتخب کیے ہیں۔ وکیل وہ میری نقل اور میری حرص میں بننا چاہتا ہے۔ میں نہیں وہ مجھے فالو کیا کرتا ہے۔"

سکندر نے ایسا کچھ بھی نہیں کہا تھا' مگر وہ یک دم ہی عجیب سی الجھن اور بے چینی محسوس کرنے لگا تھا۔ کہیں ام مریم کو یہ نہ پتا چل جائے کہ وہ سکندر جیسا بننے کی کوشش کرتا ہے۔

"مجھے جب آنٹی نے بتایا کہ زین کا ایک بھائی بھی ہے' تب میں اتنی حیران ہوئی تھی۔ زین نے مجھ سے کبھی بھی تمہارا کوئی ذکر نہیں کیا۔ سمجھو اپنی منگنی والے دن مجھے پتا چلا کہ زین کا کوئی بڑا بھائی بھی ہے۔"

ام مریم اس کی سوچوں سے انجان دوستانہ انداز میں سکندر سے مخاطب تھی۔

اس نے سکندر کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر دکھ اور حیرت بھرا ایک تاثر ابھرا تھا۔

"بس! یہ میرے بھائی صاحب ایسے ہی ہیں۔" سکندر چہرے پر ابھرتا ہوا دکھ فوراً" ہی چھپا کر مسکراتے ہوئے ہلکے پھلکے انداز میں بولا تھا۔ کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے وہ بھی بدقت مسکرایا تھا۔

"آنٹی نے بتایا تھا' تمہارے ایگزامز ہو رہے تھے' اس لیے تم ہماری منگنی پر نہیں آسکے تھے۔"

"ہاں!" ناشتے کی میز سے اٹھ کر وہ تینوں لیونگ روم میں آکر بیٹھ گئے تھے۔

امو جان کچن میں خانساماں کو لنچ کے متعلق ہدایات دے رہی تھیں۔ ان کے بچے بہت دنوں بعد گھر آئے تھے۔ وہ ہر کھانے اور ہر ناشتے میں خاص اہتمام چاہتی

تھیں۔ وہ ٹی وی کھول کر بیٹھ گیا تھا۔ ام مریم اور سکندر باتیں کر رہے تھے۔

"اس کا مطلب ہے تم کافی آؤٹ اسٹینڈنگ اسٹوڈنٹ ہو۔"

مریم نے سکندر کو اپنے مضامین، تعلیمی کارکردگی اور ہم نصابی سرگرمیوں کے حوالے سے بتایا تب وہ تعریفی انداز میں بولا تھا۔ جس طرح ہر کوئی ام مریم کی ذہانت اور اس کی خود اعتمادی سے متاثر ہوتا ہے، اسی طرح سکندر بھی متاثر نظر آرہا تھا۔

"مریم! کہیں باہر چلیں؟" وہ چھٹیوں میں گھر اس لیے تو نہیں آیا تھا کہ سکندر کے ساتھ بیٹھے اور اپنا خون جلائے۔ جب اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تب وہ ٹی وی ریموٹ سے بند کر کے ام مریم سے بولا۔

"چلو! چلتے ہیں۔ سکندر! تم بھی چلو۔" مریم فوراً چلنے پر راضی ہوئی تھی، مگر خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے سکندر کو بھی چلنے کی دعوت دے ڈالی تھی۔ ادھر اس نے سکندر کا نام لیا، ادھر اس کا دل چاہا، وہ باہر جانے کا پروگرام ہی سرے سے منسوخ کر دے۔

"نہیں! تم دونوں جاؤ۔ میں کچھ وقت امو جان کے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں۔"

شکر تھا۔ اسے اتنی عقل تھی کہ وہ چلنے سے انکار کر دے۔ ان دونوں کے بیچ اس کی موجودگی کی کوئی تک ہی نہیں تھی۔ وہ اور ام مریم گھومنے پھرنے نکل گئے تھے۔ انہوں نے تھوڑی بہت شاپنگ بھی کی تھی۔ لنچ بھی باہر کیا تھا اور بے مقصد سڑکوں پر گھومے بھی تھے۔ خوب ہنسے تھے اور بہت انجوائے کیا تھا۔

✲ ✲ ✲

رات میں شہریار خان ان سب لوگوں کو باہر ڈنر کرانے لے کر گئے تھے۔ انہوں نے کہا تھا۔ یہ ڈنر بطور خاص ام مریم کے اعزاز میں ہے، جو پہلی بار اپنی ہونے والی سسرال آئی ہے۔ اس کے اعزاز میں ڈنر تھا۔ اس مناسبت سے وہ خوب دل لگا کر تیار ہوئی تھی۔ اس نے سیاہ لباس پہنا تھا اور اس سیاہ لباس میں وہ بے پناہ حسین لگ رہی تھی۔

سیاہ لباس کے اوپر اس کی سیاہ کشمیری شال اس کے حسن کو چار چاند لگا رہی تھی۔ اس کی شال پر عنابی اور سنہری دھاگے سے کام بنا تھا، اس نے کانوں میں بڑے بڑے آویزے پہن رکھے تھے اس پر سلیقے سے کیا گیا میک اپ، وہ واقعی کوئی اپسرا لگ رہی تھی، وہ سب ہوٹل پہنچے، وہاں ان کے لیے میز پہلے سے بک تھی۔

شہریار خان اپنی ہونے والی بہو کو کسی معمولی جگہ تو لا نہیں سکتے تھے۔ انہوں نے اس ڈنر کے لیے شہر کے بہترین ہوٹل کا انتخاب کیا تھا۔

وہ امو جان اور شہریار خان کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ سکندر ان کے سامنے والی کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کے برابر والی کرسی پر ام مریم بیٹھ گئی تھی۔

کھانے کے دوران تاریخ، ادب، سیاست، معاشیات ان تمام موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی تھی۔ ام مریم کی شہریار خان کے ساتھ۔ شہریار خان اس گفتگو میں اپنے لاڈلے کو بھی شامل کرنے کی کوشش کر رہے تھے مگر پتا نہیں کیوں سکندر کچھ چپ چپ سا تھا۔ وہ گفتگو میں شامل تو ہو رہا تھا مگر یوں جیسے کسی اور بات میں اس کا ذہن الجھا ہوا ہو، وہ کچھ اور سوچ رہا ہو۔ اس نے چند ایک بار سکندر کی ام مریم کی جانب اٹھتی سنجیدہ نگاہیں دیکھی تھیں۔ اس بے پناہ سنجیدگی اور خاموشی کے ساتھ سکندر نے ام مریم کو کیوں دیکھا تھا۔ وہ سمجھنے سے قاصر تھا۔

ام مریم اسی طرح چہک رہی تھی، وہ شہریار خان اور سکندر سے یونان، یونانیوں اور ان کی تہذیب پر باتیں کر رہی تھی۔ شہریار خان دلچسپی سے اپنی معلومات اس کے ساتھ شیئر کر رہے تھے جبکہ سکندر سنجیدہ تھا، وہ خاموش تھا، وہ محض سر ہلا رہا تھا یا پھر کبھی کبھی ہلکا سا مسکرا رہا تھا۔

سکندر کے اس عجیب و غریب انداز کو وہ قطعاً "نہیں سمجھ پایا تھا۔

✲ ✲ ✲

سکندر صرف اسے رات ہی نہیں بلکہ صبح بھی کچھ چپ چپ محسوس ہوا تھا۔ اور شاید کسی نے اس کی خاموشی کو بہت زیادہ محسوس بھی نہ کیا ہو مگر وہ سکندر کے ہر انداز کو بغور دیکھتا اور محسوس کیا کرتا تھا۔ سکندر ناشتے کی میز پر کل صبح کی طرح چہک نہیں رہا تھا۔

وہ ام مریم سے بھی کم کم بات کر رہا تھا۔ اس کی زیادہ گفتگو امو جان سے ہو رہی تھی یا پھر کسی کسی وقت اس کے سپاٹ سے انداز کے باوجود اس سے بھی مخاطب ہو رہا تھا مگر ام مریم سے وہ کم مخاطب ہو رہا تھا، کم بات کر رہا تھا۔ اسے سکندر کا رویہ بڑا عجیب سا لگا تھا۔

"آؤ سکندر! کارڈز کھیلتے ہیں۔" ناشتے کی میز سے اٹھتے ہوئے ام مریم نے پہلے اس سے پوچھا کہ وہ لوگ کوئی گیم کھیلیں، اس نے ہامی بھری تو وہ سکندر سے بولی۔

"سوری مریم! تم لوگ کھیلو۔ مجھے ذرا ۔۔۔ کام ہے۔"

وہ سنجیدگی سے معذرت کرتا میز پر سے اٹھ گیا تھا۔ ابھی وہ سکندر کے اس عجیب و غریب رویے ہی کو سوچ رہا تھا کہ شام میں اسے سکندر پر ٹھیک ٹھاک قسم کا غصہ آگیا۔ آج ان کے گھر پر کرسمس اور سال نو کے حوالے سے پارٹی تھی جس میں واشنگٹن کے وہ تمام ایلیٹ اور اثر و رسوخ رکھنے والے افراد جو شہریار خان کے دوست تھے، مدعو تھے۔ ان افراد میں سیاست دان بھی تھے، سینیٹرز بھی تھے، کاروباری حضرات بھی، ملٹی نیشنل کمپنیوں کے ایگزیکٹوز اور چیف ایگزیکٹوز بھی تھے۔

گھر پر پارٹی تھی، اس لیے وہ پورے دن کے لیے تو ام مریم کو لے کر گھومنے نہیں نکلا تھا بس یونہی آس پاس تھوڑا بہت گھوم پھر کر وہ دونوں واپس آگئے تھے۔ وہ اندر داخل ہوئے تو لاؤنج میں سکندر اکیلا بیٹھا نظر آیا۔ وہ ڈرائی فروٹس کھاتے ہوئے ٹی وی پر فٹ بال کا کوئی میچ دیکھ رہا تھا۔

"لو تم یہاں اکیلے بیٹھے ہوئے ہو، ہمارے ساتھ چلتے۔" ام مریم مسکرا کر بولتی صوفے پر بیٹھی تھی۔

ام مریم کو بیٹھتا دیکھ کر اسے بھی مجبوراً وہاں بیٹھنا پڑ گیا تھا۔ ام مریم نے سکندر کے ہاتھ میں موجود ڈرائی فروٹ کی پلیٹ سے کاجو اٹھا کر کھایا۔

"کیا بورنگ گیم دیکھ رہے ہو، کچھ اور لگاؤ۔" دو تین کاجو اور اٹھا کر کھاتے ہوئے ام مریم نے سکندر کے ہاتھ سے ریموٹ لے کر چینل تبدیل کر دیا۔

سکندر ایک دم ہی صوفے پر سے اٹھ گیا تھا۔

"کیا ہوا؟ کہاں جا رہے ہو؟ کیا ناراض ہو گئے؟ اچھا دیکھ لو، تم جو دیکھ رہے تھے۔"

ام مریم کا ہنستا مسکراتا بے تکلف انداز ویسا ہی تھا جیسا وہ سب کے ساتھ رکھا کرتی تھی مگر سکندر کا ردعمل بڑا عجیب نا سمجھ میں آنے والا تھا۔

"تم لوگ ٹی وی دیکھو۔" وہ سخت اور بے تاثر سے لہجے میں کہہ کر وہاں سے جانے لگا تھا۔

"ہم آئے اور تم اٹھ کر جا رہے ہو، کیا ہمارے ساتھ بیٹھنا نہیں چاہ رہے تھے سکندر؟"

ام مریم کے اس سوال کے جواب میں سکندر کو اخلاق اور تمیز کا مظاہرہ کرتے کوئی مہذب بات کہہ دینی چاہیے تھی مگر وہ بڑے صاف گو اور واضح انداز میں بولا۔

"ہاں۔ میں اس وقت اکیلا بیٹھنا چاہتا تھا۔" سنجیدہ انداز میں جواب دینے کے بعد وہ وہاں رکا نہیں تھا۔ تیز تیز قدم اٹھاتا سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا تھا۔

"سکندر کو کیا ہوا زین! کیا وہ میرے چینل تبدیل کر دینے سے ناراض ہو گیا ہے؟"

حیران پریشان سی ام مریم نے اسے دیکھا تھا۔ ام مریم نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی جس پر ناراض ہوا جائے، کرخت ہوا کیا جائے۔ سکندر بلاوجہ بدتمیزی کر کے گیا تھا۔ اس کا خون کھول گیا تھا مگر وہ ضبط کر کے چپ تھا۔ بہرحال وہ سکندر کے خلاف ام مریم سے کچھ کہنا نہیں چاہتا تھا۔

"بس اس کی عادت ہے اسی طرح کی، تم پلیز مائنڈ مت کرو۔" سکندر پر اپنے غصے کو کنٹرول کرتے ہوئے

وہ ام مریم سے نرمی اور پیار سے بولا تھا۔

رات پارٹی میں وہی تمام اہتمام تھا جو شہریار خان کی پارٹیز میں ہوا کرتا تھا۔ جس خوب صورت مینشن میں وہ رہتے تھے۔ اس کا ایک بڑا ہال نما کمرا ان کے گھر پر پارٹیز کے لیے مخصوص تھا۔ آج بھی پارٹی کا وہیں اہتمام تھا۔ شہریار خان کے مدعو کیے تقریباً" تمام مہمان پارٹی میں موجود تھے۔ وہ جوس کا گلاس لے کر ایک طرف کھڑا تھا۔

شہریار خان سکندر کو ایک اپنے ایک نئے دوست، جو ایک ملٹی نیشنل کمپنی کے سی ای او تھے' ان سے ملوا رہے تھے۔ سکندر بلیک سوٹ میں بے حد شان دار لگ رہا تھا۔ شہریار خان پارٹیز میں سکندر کو اسی طرح اپنے خاص اثر ورسوخ رکھنے والے دوستوں سے ملوایا' متعارف کروایا کرتے تھے گویا سکندر کے عملی زندگی میں قدم رکھنے کی تیاریاں انہوں نے ابھی سے شروع کر رکھی تھیں۔ وہ اس کے سنہرے مستقبل کے لیے راہیں ہموار کر رہے تھے۔ اس کو غالباً" کسی سے اس لیے نہیں ملوایا جاتا تھا کہ وہ سکندر کی طرح ان کے دوستوں اور ملنے جلنے والے اونچے معیار کے حامل لوگوں کو متاثر کرنے کی صلاحیت سے مالا مال نہیں تھا۔

جن لوگوں سے وہ واقف تھا' ان سے دعا سلام کر چکا تھا' اب بالکل تنہا کھڑا تھا۔

ام مریم پتا نہیں تیار ہو کر ابھی تک کیوں نہیں آئی تھی۔ اس نے اپنا ذہن سکندر اور شہریار خان سے ہٹانا چاہا تھا۔ نہیں' اب ان باتوں پر اس کا دل نہیں دکھتا' وہ بالکل بھی دکھی نہیں ہے۔ اب اس کے پاس' اس کی زندگی میں ام مریم ہے۔

ام مریم کمرے میں داخل ہوتی دکھائی دی' تب اسے اس کے دیر سے آنے کی وجہ سمجھ میں آئی۔ وہ بہت اہتمام سے تیار ہو کر آئی تھی' بہت دل سے۔ امو جان نے اسے تحفے میں جو خوب صورت اور بیش قیمت جوڑا دیا تھا اس نے وہ پہن رکھا تھا۔ جیسے سیاہ رنگ اس کے لیے بنا تھا' ایسے ہی سرخ رنگ بھی اس کے لیے ہی بنا تھا۔ ہر رنگ اس کے لیے بنا تھا۔

پارٹی میں جتنی لڑکیاں' جتنی خواتین شریک تھیں ان میں سے کوئی ایک بھی اس جیسی نہیں لگ رہی تھی۔

اسے آتا دیکھ کر اس کی تمام کلفت دور ہو گئی تھی۔ وہ مسکرا دیا تھا۔ وہ بھی اسے دور سے دیکھ کر مسکرائی تھی۔ شہریار خان سکندر کو اپنے جن واقف کار سے ملوا رہے تھے ملوا چکے تھے۔ سکندر اب وہاں سے کسی اور سے ملنے کے لیے جا رہا تھا۔ اسے دور سے کھڑے ہو کر نظر آ رہا تھا کہ سکندر اور ام مریم کا آمنا سامنا ہوا تھا۔

ام مریم مسکرا کر اس سے کچھ بولی تھی' اس کے چہرے پر شوخی تھی' زندگی سے بھرپور مسکراہٹ تھی مگر جواباً" سکندر نے سنجیدگی سے' بغیر مسکرائے نجانے اس سے ایسا کیا کہا تھا کہ ام مریم کا چہرہ ایک دم ہی پھیکا پڑ گیا تھا۔

آج ایک ہی دن میں سکندر نے دوسری بار ام مریم کے ساتھ ایسا روکھا کرخت رویہ اختیار کیا تھا۔ اس نے ام مریم سے جو کچھ بھی کہا تھا وہ کہہ کر رکا نہیں تھا فوراً" ہی وہاں سے آگے بڑھ گیا تھا۔ اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی۔

سکندر ہوتا کون تھا' ام مریم سے بد اخلاقی اور بد تمیزی سے پیش آنے والا وہ اس گھر کی بہو ہے' زین شہریار کی ہونے والی بیوی ہے۔ وہ مہمانوں کا لحاظ کر کے' موقع کی نزاکت کا احساس کر کے خون کے گھونٹ پی کر چپ رہا تھا۔

شرمندہ شرمندہ سی ام مریم وہاں اسی طرح چپ چاپ کھڑی تھی۔ وہ فوراً" ہی اس کے پاس آ گیا۔

"کیا ہوا مریم!" اس کا خیال تھا' وہ فوراً" سکندر کے رویے کی شکایت کرے گی مگر وہ ام مریم تھی۔ اس کی ام مریم۔ وہ اتنی چھوٹی بات کیسے کر سکتی تھی کہ اس کے بھائی کے خلاف اس سے کچھ کہتی۔ وہ فوراً" ہی خوش دلی سے مسکرائی تھی۔

"کچھ نہیں' میں تمہارے ہی پاس آ رہی تھی۔"

"تم خوش ہو ناں مریم! تمہیں یہاں کوئی بات بری تو نہیں لگ رہی؟" وہ بے قراری سے بولا۔

"اپنے گھر آ کر مجھے کچھ کیوں برا لگے گا؟ سب مجھ

سے اتنا پیار کرتے ہیں' آنٹی انکل اور سب سے بڑھ کر تو تم۔ تم ساتھ ہو تو میں خوش کیوں نہیں ہوں گی۔" وہ مسکرا کر بولی۔ اس نے بے اختیار ام مریم کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

ام مریم نے سکندر کا نام نہیں لیا تھا' وہ اس فہرست میں شامل ہونے کے قابل تھا بھی نہیں۔ اس وقت اس پل جب وہ ام مریم کا ہاتھ تھامے کھڑا تھا اس کی اچانک ہی سکندر پر نظر پڑی تھی۔ سکندر کچھ فاصلے پر اپنے ہم عمر لڑکے لڑکیوں کے ایک گروپ کے ساتھ کھڑا تھا' اس کی نگاہیں ان دونوں ہی پر مرکوز تھیں۔ اور اس پل سکندر کی نگاہوں کا تاثر پڑھنے میں وہ ہرگز ہرگز غلطی نہیں کر سکتا تھا۔ سکندر کی نگاہوں میں اسے اور ام مریم کو ساتھ کھڑا دیکھ کر ناپسندیدگی تھی' غصہ تھا۔

وہ اسے اور مریم کو ایک ساتھ دیکھ کر خوش نہیں تھا۔ سکندر کے جس رویے کو وہ ابھی تک سمجھ نہیں پا رہا تھا ایک دم ہی اس کی سمجھ میں آ گیا۔ سکندر ام مریم کو اس کی زندگی میں دیکھ کر خوش نہیں تھا۔

"بس اتنا سا حوصلہ ہے تم میں سکندر شہریار! میں ساری زندگی تمہاری بڑائی برداشت کرتا آیا ہوں اور تم سے آج میری ایک معمولی سی خوشی اور برتری برداشت نہیں ہو رہی؟ بس صرف ایک دن ڈھونگ رچا سکے میری خوشیوں میں خوش ہونے کا؟ اب وہی کم ظرفی دکھا رہے ہو۔ اتنے حاسد اور کم ظرف ہو تم سکندر شہریار کہ بھائی کی خوشی نہیں دیکھی جا رہی تم سے؟ ام مریم جیسی شان دار' حسین اور غیر معمولی لڑکی تمہارے اس معمولی بھائی کو مل گئی ہے' اس لیے حسد کر رہے ہو مجھ سے؟"

اس نے سکندر کے لیے دل میں نفرت اور غصہ محسوس کرتے ہوئے سوچا تھا۔

☼ ☼ ☼

اگلے دن سکندر زیادہ وقت اپنے کمرے میں رہا تھا بقول امو جان کے وہ پڑھائی کر رہا تھا کہ چھٹیوں کے فوراً" بعد اس کے ایگزامز ہونا تھے۔ اسے یہ سب جھوٹ معلوم ہو رہا تھا۔

سچ تو یہ تھا کہ سکندر اسے اور ام مریم کو ایک ساتھ دیکھ نہیں پا رہا تھا' ہمیشہ جیتنے کی ایسی عادت پڑ گئی تھی اسے کہ زندگی میں پہلی بار زین سے ہارنا اس سے سہا نہیں جا رہا تھا' اپنی جلن اور حسد جب کسی اور طرح نہیں ظاہر کر پا رہا تھا تو ام مریم کے ساتھ سپاٹ لب و لہجہ اور کرخت انداز اپنا کر اس رشتے پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کر رہا تھا۔

وہ سکندر کے منہ نہیں لگنا چاہتا تھا ورنہ ام مریم سے بد تمیزی کے مظاہرے پر اسے کھری کھری سنا دیتا' اس کی طبیعت صاف کر دیتا۔ شام میں سکندر کمرے سے نکلا تھا۔

"بڑے بزی ہو صبح سے۔ آؤ بیٹھو ہم لوگوں کے ساتھ۔"

وہ اور مریم شطرنج کھیل رہے تھے جب سکندر سیڑھیوں سے اترتا نظر آیا۔ ام مریم اس کی کل کی بد اخلاقی بھلا کر مسکرا کر بولی۔

"نو تھینکس۔ میں ابھی بھی بزی ہوں۔"

"چھٹیوں میں اس طرح پڑھائی کون کرتا ہے۔" ام مریم نے ہنس کر اس سے کہا۔

"میں کرتا ہوں۔" وہ سنجیدہ اور قدرے روکھے سے انداز میں اسے جواب دیتا کچن میں چلا گیا تھا۔

ام مریم شرمندہ سی ہو گئی تھی' اس کے چہرے پر خفت نظر آ رہی تھی۔ وہ سکندر کے رویے پر ام مریم سے شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔ کیا سوچ رہی ہو گی وہ بھی کہ زین کا اکلوتا بھائی اتنا کرخت ہے' اسے گھر آئے مہمان سے اخلاق برتنا بھی نہیں آتا۔

"میں نے تمہیں بتایا تھا ناں مریم! بس سکندر کی عادت اسی طرح کی ہے۔ موڈی ہے۔ بہت' برا مت ماننا اس کی کسی بات کا۔"

اسے سکندر پر شدید غصہ آ رہا تھا مگر اپنے غصے کو کنٹرول کر کے اسے مسکرا کر ام مریم سے یہ بات کہنی پڑی تھی۔ وہ اسے کیسے بتاتا کہ میرا اکلوتا بھائی مجھے اور

تمہیں ساتھ دیکھ کر جیلس ہو رہا ہے' اس سے چھوٹے بھائی کی خوشی برداشت نہیں ہو رہی۔ جو ظرف مجھ میں ہے کہ بچپن سے اس کی کامیابیوں' اس کی جیت' اس کی برتری کو قبول کرتا آیا ہوں وہ ظرف خود میں کہاں سے لائے؟ تمہاری جگہ کوئی عام سی لڑکی میری منگیتر ہوتی تو اسے کوئی تکلیف نہ ہوتی۔ اسے تکلیف اپنے معمولی بھائی کو ایک غیر معمولی لڑکی کے ملنے پر ہے۔ کیا پتا اسے یہ ڈر بھی ہو کہ چاہے ساری دنیا کی خاک بھی چھان لے مگر تم سے برتر تو کیا تمہارے جیسی بھی لڑکی اپنے لیے ڈھونڈ نہیں پائے گا۔

ام مریم اس کی سوچوں سے انجان مسکراتے ہوئے اسے یقین دلا رہی تھی کہ اس نے سکندر کی کسی بات کا برا نہیں مانا ہے۔

☼ ☼ ☼

اگلے روز ان لوگوں کا پکنک کا پروگرام تھا' یہ پروگرام شہریار خان نے اپنے بچوں اور ہونے والی بہو کے لیے بطور خاص بنایا تھا۔ شہریار خان اور امو جان کی جن چند فیملیز سے زیادہ قریبی دوستیاں تھیں وہ پانچ فیملیز بھی ان لوگوں کے ساتھ جا رہی تھیں۔

کل ملا کر وہ پچیس چھبیس افراد تھے جو پکنک پر جا رہے تھے۔ صبح سویرے ان لوگوں کی روانگی تھی۔ ان کے فیملی فرینڈز میں دو فیملیز پاکستانی تھیں' ایک انڈین اور دو امریکن۔ سب اپنی اپنی گاڑیوں میں جا رہے تھے۔ وہ لوگ میری لینڈ کے مضافات میں پہاڑوں کے دامن میں واقع خوب صورت اور قدرتی حسن سے مالا مال جھیل کے پاس پکنک منانے جا رہے تھے۔ وہاں خوب صورت جھیل کے ساتھ سوئمنگ' بوٹنگ اور فشنگ کی سہولیات موجود تھیں' کیمپنگ کے لیے بھی وہ جگہ بڑی آئیڈیل تھی' وہاں خوب صورت قدرتی آبشار بھی تھے' گھڑ سواری کرنی ہو یا ہائکنگ' وہاں تمام سہولیات موجود تھیں۔

اس کی خواہش تھی' وہ ام مریم ایک ساتھ گاڑی میں بالکل تنہا جائے۔ مگر فیملی کے ساتھ پکنک میں وہ اپنی اس خواہش کو عملی جامہ نہیں پہنا سکا تھا۔ امو جان اور شہریار خان کے سامنے یہ کہنا کہ وہ ام مریم کے ساتھ جانا چاہتا ہے اسے چھچھورا پن محسوس ہوا تھا' ام مریم ابھی تیار ہو کر نیچے نہیں آئی تھی جبکہ امو جان تیار کھڑی تھیں۔

شہریار خان نے اس سے کہا تھا کہ وہ اپنی گاڑی میں امو جان' ان کی ایک دوست اور ان کے بیٹے کو بٹھا کر لے جائے۔ سب یہیں جمع تھے اور کوئی کسی کی گاڑی میں بیٹھ گیا تھا اور کوئی کسی کی' تاکہ اپنے ہم مزاج افراد کے ساتھ پکنک اسپاٹ تک جانے کے طویل اور خوب صورت راستے کو انجوائے کیا جا سکے۔

ام مریم کو تیاری میں وقت لگ رہا تھا۔ وہ بہت اہتمام سے تیار ہو رہی تھی۔ سو وہ اسے یہ بتا کر کہ وہ امو جان وغیرہ کو لے کر جا رہا ہے' وہ گھر سے روانہ ہو گیا تھا۔ ایک لمبے سفر کے بعد وہ لوگ پکنک اسپاٹ پر پہنچ گئے تھے۔ آگے پیچھے سب ہی کی گاڑیاں وہاں پہنچنے لگی تھیں۔ تھوڑی ہی دیر میں سب وہاں پہنچ چکے تھے سوائے ام مریم اور سکندر کے۔

سکندر کی وہ کیوں فکر کرتا' اسے ام مریم کی فکر ہوئی تھی۔ اس نے ایک ایک کر کے سب سے پوچھ لیا تھا۔ ام مریم کسی کی بھی گاڑی میں نہیں بیٹھی تھی۔ شکر تھا کہ جلد ہی ام مریم اسے آتی دکھائی دے گئی تھی ورنہ وہ پریشان ہونے لگا تھا۔ وہ سکندر کے ساتھ اس کی گاڑی میں آئی تھی۔ اس نے سکندر اور ام مریم کو آگے پیچھے وہاں آتے دیکھا تھا۔ وہ دونوں ساتھ نہیں چل رہے تھے۔ سکندر ام مریم سے بہت آگے تھا' وہ پیچھے تھی۔

سکندر کے چہرے پر غصہ نظر آ رہا تھا۔ مریم چپ چپ سی لگ رہی تھی۔ اسے یک دم ہی فکر لاحق ہوئی تھی۔ کیا سکندر نے پھر ام مریم کے ساتھ بدتمیزی سے بات کی تھی؟ اسے کچھ کہہ دیا تھا۔ اسے رہ رہ کر خود پر غصہ آ رہا تھا آخر وہ مریم کو گھر پر چھوڑ کر کیوں آ گیا تھا۔ کسی اور کی نہیں ام مریم اس کی ذمہ داری تھی' شہریار خان جو بھی کہہ رہے تھے' اسے کہہ دینا چاہیے تھا وہ

ام مریم کا انتظار کرے گا۔ وہ اسے اپنے ساتھ لے کر جائے گا۔

"کیا ہوا مریم! تمہیں دیر کیوں ہو گئی؟ تم سکندر کے ساتھ آئی ہو؟"

"سکندر کا کیمرا نہیں مل رہا تھا' اس نے مجھ سے کہا' میں اس کے ساتھ مل کر اس کا کیمرا ڈھونڈ دوں۔ اس چکر میں باقی سب گاڑیاں چلی گئیں۔"

وہ مسکرا کر اسے بتانے لگی۔ ام مریم سے سیدھے منہ وہ بات کرتا نہیں تھا اور کیمرا تلاش کرنے میں اس سے مدد مانگ لی؟

اسے سکندر کے اس دوغلے پن پر شدید غصہ آیا تھا مگر اس نے یہ ہرگز نہیں سوچا تھا کہ سکندر نے ام مریم کو جان بوجھ کر بہانہ بنا کر اپنے ساتھ روکا تھا۔ یہ بات سوچ بھی کیسے سکتا تھا۔

اس کو تو بس سکندر کے دوغلے پن پر غصہ آیا تھا اور پھر اس کے بعد یہ فکر لاحق ہوئی تھی کہ کہیں سکندر نے راستے میں اس طرح کی کسی بدتمیزی اور بدتہذیبی کا مظاہرہ ام مریم کے ساتھ نہ کر دیا ہو جس طرح آج کل کیا کرتا تھا۔ براہ راست ان ہی لفظوں میں تو یہ بات اس سے نہیں پوچھ سکتا تھا۔ ہاں اس نے لہجے کو سرسری سا بنا کر عام سے انداز میں یہ ضرور پوچھا تھا کہ راستہ تو ٹھیک سے گزرا' کوئی پرابلم' کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟

ام مریم نے مسکرا کر جواب دیا کہ راستہ بالکل سکون اور آرام سے کٹا' اسے کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ یہ ام مریم کی غیر معمولی اچھائی ہی تھی کہ وہ اس کے بھائی کے خلاف اس سے کچھ کہہ نہیں رہی تھی ورنہ پکنک اسپاٹ پر پہنچنے کے فوراً" بعد جو تاثر ام مریم کے چہرے پر تھا اسے دیکھ کر وہ جانتا تھا کہ سکندر نے راستے میں مریم کے ساتھ اسی لہجہ اور اسی بدتمیز انداز میں کوئی بات کی تھی جس کا وہ آج کل کافی مظاہرہ کیا کرتا تھا۔ چند دنوں کی چھٹیاں گزار کر ان دونوں نے یہاں سے چلے جانا ہے' پھر وہ یا مریم کون سا سکندر سے مل رہے ہوں گے پھر بلاوجہ بات بڑھانے کا فائدہ کیا ہے۔

اس نے سکندر اور اس کی بدتمیزی پر لعنت بھیج کر اس سے صرف نظر کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ سکندر شہریار اگر کم ظرف تھا تو وہ تو نہیں اس کے جتنا نیچے اتر سکتا تھا۔

شروع میں تھوڑی سی دیر چپ چپ رہنے کے بعد ام مریم پھر وہی ہنستی بولتی ام مریم بن گئی تھی۔ وہ واقعی اس کی سچی ساتھی تھی۔ اس کی جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو اس کے بھائی کی بدتمیزی پر اس کے سامنے رو دھو کر اسے بھائی سے جھگڑا کرنے' بھائی سے دوبدو ہونے پر اکساتی' بلاوجہ ایک تماشا لگ جاتا — سب کی پکنک کا مزا خراب ہو جاتا۔

مریم نے اپنا موڈ ٹھیک کر لیا تھا مگر تھوڑی ہی دیر میں اسے اندازہ ہوا کہ سکندر کا موڈ ہنوز خراب ہے۔ وہ بہت چپ بھی ہے اور ایک دبا دبا سا غصہ بھی اس کے چہرے پر نظر آ رہا ہے۔ وہ ام مریم کو نظرانداز کر رہا تھا۔ بدتمیزی کی حد تک..... وہ اور ام مریم ساتھ مچھلی کا شکار کر رہے تھے ان دونوں کے ساتھ ساتھ وہاں اس کے چند ایک انکل اور ان کے بچے بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ جب مچھلیوں کی کچھ تعداد جمع ہو جاتی تب ان کے ساتھ آئے ملازمین نے انہیں دھونا اور صاف کرنا تھا پھر مچھلیوں کو گرل کرنے کا کام اس کی امو جان اور آنٹیوں نے انجام دینا تھا۔

سکندر اور شہریار خان جھیل سے کچھ فاصلے پر گھاس کے اوپر باقاعدہ نیٹ باندھ کر ٹینس کھیل رہے تھے۔ وہاں — پر موجود مضبوط اور طویل درختوں کے درمیان انہوں نے نیٹ باندھ رکھی تھی۔

"انکل ٹینس کتنا اچھا کھیل رہے ہیں۔" ام مریم نے گردن گھما کر شہریار خان کو کھیلتے ہوئے دیکھ کر اس سے کہا۔

"ہاں... پاپا باقاعدہ ایکسرسائز اور سوئمنگ وغیرہ کرتے ہیں' اسی لیے ان میں اس طرح کے کھیلوں کے لیے اسٹیمنا ہے۔" اس نے بھی گردن گھما کر اسی طرف دیکھا تھا۔

"چلو... ہم بھی وہاں چلیں۔ میرا انکل کے ساتھ

کھیلنے کو دل چاہ رہا ہے' انکل اتنا اچھا کھیل رہے ہیں۔"

پاپا اپنے چہیتے کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ وہ وہاں جانا نہیں چاہتا تھا۔ مگر ام مریم کی خواہش اس سے رد نہیں کی جا سکی تھی۔

"چلو۔" وہ دونوں وہاں آ گئے تھے۔

"انکل! آپ بہت اچھا کھیل رہے ہیں۔" ام مریم ایکسائٹمنٹ میں اس سے پہلے ان لوگوں تک پہنچ گئی تھی۔ وہ اس سے چند قدم پیچھے تھا۔

"تھینکس بیٹا۔" شہریار خان مسکرائے تھے۔ وہ بھی اب مریم کے ساتھ کھڑا تھا۔ قصداً" سکندر کو نظر انداز کر کے صرف باپ کو دیکھ رہا تھا۔

"انکل! میں اور زین بھی کھیلیں' آپ لوگوں کے ساتھ؟"

"بالکل کھیلو' آجاؤ تم دونوں بھی۔" انہوں نے ام مریم کو مسکرا کر خوش دلی سے جواب دیا۔ "وہاں سے ریکٹ اٹھا لو تم دونوں۔"

اس نے سکندر کے چہرے پر ناپسندیدگی ابھرتی دیکھی تھی' کیا سکندر ان دونوں کے ساتھ نہیں کھیلنا چاہتا تھا؟

وہ سکندر کا پارٹنر کبھی بھی نہیں بننا چاہتا تھا' وہ شہریار خان کا پارٹنر بن گیا تھا اور ام مریم' سکندر کی۔ اسے ایسا لگا تھا جیسے اس کا اور مریم کا وہاں آجانا اور ان کے کھیل میں شامل ہو جانا سکندر کو پسند نہیں آیا تھا۔ وہ شہریار خان کی طرف ان کے ساتھ جا کر کھڑا ہو گیا تھا اور ام مریم' سکندر کے ساتھ۔

"انکل! میں بھی بہت اچھا کھیلتی ہوں' آپ کو ہرا دوں گی۔"

ام مریم کی شوخ لہجے میں کی بات پر شہریار خان قہقہہ لگا کر ہنسے تھے۔ انہیں ہونے والی بہو کی خود اعتمادی پسند آیا کرتی تھی۔

"پاپا! آپ لوگ کھیلیں' میں بھول گیا تھا۔ مجھے حمزہ اور شایان کے ساتھ ہائیکنگ کے لیے جانا ہے۔" ان دونوں کے وہاں آجانے اور کھیل میں شامل ہونے کی وجہ سے سکندر نے محض چار' پانچ منٹ ہی ان لوگوں کے ساتھ کھیلا ہو گا' پھر وہ یک دم ہی شہریار خان سے بولا۔

شہریار خان نے اسے حیرت سے دیکھا۔ اس کا انداز اگر وہ چھپا بھی رہا تھا تب بھی بہت واضح تھا کہ وہ اس کے اور ام مریم کے ساتھ نہیں کھیلنا چاہتا' وہ ان دونوں کے وہاں آجانے کی وجہ سے وہاں سے کھیل چھوڑ کر جا رہا تھا۔

"یہ گیم تو پورا کر لو۔" شہریار خان نے ایک نظر ام مریم اور اس پر ڈالنے کے بعد سکندر سے سنجیدگی سے کہا۔

"پاپا! میرا موڈ بھی نہیں ہو رہا۔ میرا موڈ ہائیکنگ کا ہے۔"

سنجیدگی سے جواب دیتے ہوئے وہ اسی وقت کھیل چھوڑ کر وہاں سے چلا گیا تھا۔ وہاں موجود ان تینوں افراد میں سے کسی کو بھی یہ بات سمجھائے جانے کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ زین اور ام مریم کی وجہ سے وہاں سے گیا ہے۔

"چلو ہم لوگ کھیلتے ہیں۔ زین! اب تم کھڑے ہو کر دیکھو' میرا اور مریم کا گیم۔"

شہریار خان نے فوراً" ہی ماحول کے تناؤ کو ختم کرنے کی کوشش کی تھی' مسکرا کر اس سے بولے تھے۔

شہریار خان اور ام مریم کھیل رہے تھے۔ اپنے جلن اور حسد میں سکندر تمیز' تہذیب سب بھول گیا تھا۔ اس کا موڈ باپ سے بھی خراب ہو گیا تھا۔

یہاں بدتمیزی ان کا لاڈلا' چہیتا بیٹا کر کے گیا تھا۔ اس لیے اسے سو فیصد یقین تھا وہ اسے بعد میں بھی' اکیلے میں بھی اس بات پر کچھ نہ کہیں گے' جبکہ اگر یہ ہی حرکت وہ کر کے گیا ہوتا تو آج گھر واپس جانے کے ساتھ ہی اس کی ٹھیک ٹھاک کلاس لے لی جاتی' اسے تمیز اور تہذیب سیکھنے اور مینرز کا خیال رکھنے کی ہدایت کی جاتی۔

پکنک پر باقی سارا وقت اس کا موڈ خراب رہا تھا۔ وہ ام مریم کی خاطر ہنسا اور بولا تھا ورنہ اب اس کا ہنسنے' بولنے کسی بھی چیز کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ سکندر بھی پکنک میں باقی سارا وقت ان دونوں سے بہت الگ تھلگ رہا تھا۔ جہاں جہاں پر بھی وہ اور ام مریم تھے وہاں پر وہ اگر موجود ہوتا تو انہیں دیکھنے کے بعد یا تو وہاں سے کہیں اور چلا جاتا تھا یا پھر اسے اور مریم کو نظر انداز کر کے کسی نہ کسی لڑکے یا لڑکی کے ساتھ باتوں میں مصروف ہو جاتا تھا۔

غصے کے ساتھ اسے حیرت بھی تھی' شدید حیرت۔ بچپن سے لے کر آج تک کبھی اسے یہ اندازہ نہیں ہوا تھا کہ سکندر اتنی حاسد فطرت کا مالک ہے۔ اسے جیتنے کی ایسی لت پڑ چکی ہے کہ اب کہیں پر بھی اپنا نمبر دو ہوتا ہو تا وہ سہہ نہیں سکتا۔ سکندر کی موجودگی میں اپنے گھر پر یہ چھٹیاں گزارنا اس کے لیے مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ وہ دن گن گن کر چھٹیاں ختم ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ پکنک سے اگلا روز بھی چھٹی ہی کا دن تھا' اتوار تھا۔ شہریار خان گھر پر تھے۔

ام مریم لنچ ٹائم سے پہلے کافی دیر تک ان کے ساتھ ان کی اسٹڈی میں رہی تھی۔ ان کا کتابوں کا کلیکشن دیکھتی رہی تھی۔ انہوں نے اپنی چند ایک کتابیں اسے مطالعے کے لیے بھی دے دی تھیں' جو ان کی اپنی بہو کے لیے پسندیدگی کا واضح اظہار تھی۔ ایسے ویسے کسی کو تو ان کی اسٹڈی میں داخل ہونے تک کی اجازت نہ تھی۔

"اب تھوڑا ٹائم آپ ہمیں بھی دے دیجیے۔"

کھانے کے بعد اس نے مریم سے چھیڑنے والے انداز میں کہا تھا۔

"کیا یاد کرو گے' دیا' بولو کیا موڈ ہے؟" وہ شاہانہ سے انداز میں بولی تھی۔

"کہیں باہر چلتے ہیں۔" وہ اسے پیار سے دیکھ کر بولا۔ مریم فوراً" جانے کے لیے تیار ہو گئی تھی۔ وہ دونوں جانے کے لیے تیار ہو کر لیونگ روم میں آئے تو وہاں شہریار خان' اموجان اور سکندر بیٹھے تھے۔

"کہیں جا رہے ہو تم دونوں؟" اموجان نے پوچھا تھا۔

"جی اموجان! تھوڑا آؤٹنگ کا موڈ ہے۔"

"سکندر! تم بھی چلو ہم لوگوں کے ساتھ۔" ام مریم سکندر سے بولی تھی۔

اسے ام مریم کے اس ضرورت سے زیادہ اچھا ہونے پر غصہ آیا تھا' بندے کو اتنا اچھا بھی نہیں ہونا چاہیے' ایک شخص مسلسل آپ سے بدتمیزی کر رہا ہے' دفع کرو' لعنت بھیجو اس پر' مگر وہ اس کے اس رویے کے لیے ام مریم کو غلط بھی نہیں سمجھ رہا تھا' وہ جانتا تھا' مریم فطرتاً" اور عادتاً" ہنس مکھ اور دوستانہ مزاج رکھنے والی لڑکی تھی۔

وہ سکندر کو زین کا بڑا بھائی سمجھ کر مسلسل عزت دے رہی تھی۔ وہ اپنے سسرال میں اپنے ہونے والے سسر' ساس اور جیٹھ سب کے اوپر اپنا اچھا تاثر قائم کروانا چاہتی تھی' اپنی سسرال کے ان تینوں افراد کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کرنا چاہتی تھی۔

ام مریم کی خواہشات غلط نہیں تھیں' بس وہ پیاری لڑکی یہ نہیں جانتی تھی کہ زین کا بڑا بھائی ایک حاسد اور کم ظرف انسان ہے۔ وہ بھائی کو دیکھ کر خوش ہونے کا ظرف نہیں رکھتا' وہ اپنے چھوٹے بھائی سے حسد میں مبتلا ہے۔

"میرا موڈ نہیں' تم دونوں جاؤ۔" سکندر نے ام مریم کو بے حد سنجیدگی سے جواب دیا تھا۔ وہ اخلاق دکھانے کو بھی نہیں مسکرایا تھا۔

"تم ہم لوگوں کے ساتھ کہیں پر بھی نہیں جاتے' آج تو چلو سکندر!" ام مریم نے دوبارہ اصرار کیا۔

"میرا خیال ہے میں تمہیں منع کر چکا ہوں' میں نہیں جانا چاہتا۔"

اس بار سکندر کا انداز سخت اور کھردرا تھا۔ شہریار خان اور اموجان نے اسے تعجب سے دیکھا تھا۔ ام مریم اپنی انسلٹ پر شرمندہ سی ہو گئی تھی۔

"چلو مریم! دیر ہو رہی ہے۔" غصے سے اس کا دماغ کھول گیا تھا' اس نے فوراً" ہی ام مریم سے چلنے کے لیے کہا تھا۔ اس کے چہرے پر اس کا غصہ بہت واضح تھا۔ وہ ام مریم کو ساتھ لے کر فوراً" ہی لیونگ روم سے

باہر نکل گیا تھا۔

مریم ابھی بھی شرمندہ سی تھی' خفت سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا' وہ آج ام مریم سے صاف صاف لفظوں میں کہہ دے گا کہ وہ سکندر کو اپنا سسرالی سمجھ کر' ہونے والا جیٹھ سمجھ کر' زین کا بڑا بھائی سمجھ کر کسی بھی وجہ سے اہمیت دینا اور اسے منہ لگانا چھوڑ دے۔ بھاڑ میں گئی بھائی کی عزت۔ جب اس کے بھائی کو اپنی عزت اور رشتے میں بڑائی کا خیال نہیں تو وہ کب تک ام مریم کے سامنے اس کی حاسد فطرت کا پردہ رکھ سکتا ہے۔

وہ صاف لفظوں میں ام مریم سے یہ بہرحال پھر بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ سکندر کی تم سے بدتمیزی کرنے اور تمہیں اگنور کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ تم سے بری طرح متاثر ہے اور تم جیسی بے مثال اور غیر معمولی لڑکی اسے نہیں بلکہ مجھے مل گئی ہے' اس بات نے اسے جلن اور حسد میں مبتلا کر دیا ہے۔

وہ غصے میں باہر نکلا تھا' گاڑی کی چابی سینٹر ٹیبل سے اٹھانا بھول گیا تھا۔ ام مریم کو پورچ میں کھڑا چھوڑ کر وہ چابی اٹھانے اندر آیا تو امو جان سکندر سے کہہ رہی تھیں۔

"سکندر! کیا ہو گیا ہے تمہیں بیٹا! گھر آئے مہمان سے کوئی اس طرح بات کرتا ہے؟ اور مریم صرف مہمان نہیں بلکہ اس گھر کی ہونے والی بہو ہے' تمہیں نہیں جانا تھا' تم آرام سے بھی منع کر سکتے تھے۔"

شہریار خان سگار پیتے ہوئے خاموشی سے سکندر کو دیکھ رہے تھے۔ جو کسی بات پر چڑا ہوا نظر آ رہا تھا۔

"ہونے والی بہو؟ مجھے لگتا ہے امو جان! آپ نے اور پاپا نے زین کی منگنی کا فیصلہ جلد بازی میں کر دیا ہے' مجھے ام مریم کچھ خاص پسند نہیں آئی ہے۔"

امو جان کچھ کہنے کے لیے لب کھول رہی تھیں' مگر اسی وقت ان کی اس پر نظر پڑ گئی تھی۔ سکندر اور شہریار خان نے بھی اسے دیکھ لیا تھا۔ اس نے سکندر کے چہرے پر گھبراہٹ آتی دیکھی تھی۔ غالباً" وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ زین اور مریم گھر سے جا چکے ہیں' تب ہی اس طرح کھل کر مریم کے خلاف زہر اگل رہا تھا۔

غصے اور نفرت سے سکندر کو گھورتے ہوئے وہ بغیر چابی اٹھائے ہی وہاں سے پلٹ گیا تھا۔ امو جان نے اسے آواز بھی دی تھی' انہیں خدشہ ہوا تھا کہ وہ ناراض ہو کر جا رہا ہے' مگر وہ اس طرح باہر نکل گیا تھا جیسے ان کی بات سنی ہی نہ ہو۔ وہ ام مریم کو ساتھ لے کر پیدل ہی باہر نکل گیا تھا۔

اس کے دل میں بہت غبار جمع تھا' بہت نفرت جمع تھی۔ مختلف سڑکوں پر پیدل چلتے۔ اس نے ام مریم کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا تھا۔ کیسے وہ ہمیشہ اپنے بھائی کے مقابلے میں نظر انداز کیا گیا ہے' کیسے اسے ہمیشہ سکندر سے کم تر سمجھا گیا ہے۔ اس نے ام مریم کو صاف لفظوں میں بتا دیا تھا کہ اس کے اور سکندر کے درمیان کبھی بھی دوستانہ تعلقات نہیں رہے ہیں اور نہ ہی کبھی قائم ہو سکتے ہیں۔ اس نے ام مریم سے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ اسے سکندر کو اس کا بھائی سمجھ کر اس کے ساتھ خوش اخلاقی اور اپنائیت ظاہر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

رات امو جان نے اس کا دل سکندر کی طرف سے صاف کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ بتا کر کہ سکندر کا وہ مطلب نہیں تھا جو اچانک اندر آنے پر اس نے سنا تھا۔ اور یہ بھی کہا تھا کہ انہوں نے سکندر کو سمجھا دیا ہے اب وہ ایسی کوئی بات نہیں کرے گا جو اسے یا مریم کو بری لگے۔

وہ ماں کے دل کو تسلی دینے کے لیے مسکرا بھی دیا تھا' انہیں یہ یقین بھی دلا دیا تھا کہ اس نے کوئی بھی بات دل پر نہیں لی' مگر در حقیقت سکندر کی کوئی ایک بھی بات اور کوئی ایک بھی رویہ اس کے دل سے نکلا نہیں تھا۔ امو جان اور شہریار خان اپنے لاڈلے' بڑے بیٹے کے بدتمیز رویے پر حیران ہوں تو ہوں' کم از کم اسے کوئی حیرت نہیں تھی۔ کم ظرف اور حاسد شخص کم ظرفی اور حسد ہی ظاہر کر سکتا تھا اور کچھ بھی نہیں۔

☆ ☆ ☆

اس نے سوچ لیا تھا' وہ چھٹیوں کے بچے باقی دن سکندر کو مکمل طور پر نظر انداز کر کے اور ام مریم کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گھر سے باہر گھومنے پھرنے میں گزار دے گا۔ وہ ام مریم کے دل سے سکندر کے رویے کے سبب پیدا ہونے والی سب کلفت اور کوفت دور کر دینا چاہتا تھا۔

مریم اس کے کہنے پر اس کے ساتھ اس کے گھر آئی تھی' وہ چاہتا تھا یہاں سے واپسی کے وقت ام مریم اس کے ساتھ گزاری ان چھٹیوں کی بہت اچھی یادیں ساتھ لے کر جائے۔ مگر اس کی تمام تر کوششوں کے باوجود ام مریم اب وہاں چپ چپ سی رہنے لگی تھی۔ بظاہر وہ سب کے ساتھ ہنستی' باتیں کرتی بھی تھی' مگر اسے اس کے چہرے پر سچی خوشی نظر نہیں آئی تھی۔ وہ اسے اپنے ساتھ گھمانے لے جاتا تو وہ چپ ہی محسوس ہوتی۔ یہ سب سکندر کے رویے کے سبب تھا' وہ ام مریم کی چپ کو دیکھتا تو اسے سکندر پر مزید طیش چڑھتا۔

سکندر سے اس کا اور ام مریم کا سامنا بہت کم ہو رہا تھا۔ سکندر رہا تو گھر پر ہی نہ ہوتا' اگر گھر پر ہوتا تو زیادہ وقت اپنے کمرے میں رہا کرتا تھا' پڑھائی کا بہانہ بنا کر۔

وہ تیس دسمبر کی رات تھی جب شہریار خان اور امو جان کسی پارٹی میں گئے ہوئے تھے۔ سکندر شام سے اپنے کمرے میں تھا' بقول اس کے پڑھ رہا تھا' اس نے ڈنر بھی کمرے ہی میں کیا تھا۔ وہ اور ام مریم لیونگ روم میں کھانا کھاتے ہوئے ٹی وی پر ام مریم کی پسند کی مووی دیکھ رہے تھے۔ ڈائننگ ٹیبل کے بجائے لیونگ روم میں بیٹھ کر کھانے کی فرمائش ام مریم ہی نے کی تھی۔

کھانے کے دوران اس کے بچپن کے دوست نبیل کا فون آ گیا تھا۔ وہ ایک پاکستانی بزنس مین کا بیٹا تھا اور اس کے اسکول کے دنوں کا دوست تھا۔ اس نے اپنے گھر پر کوئی سرپرائز پارٹی رکھی تھی اور اس سے آنے پر اصرار کر رہا تھا۔

تھوڑی دیر وہ انکار کرتا رہا' مگر جب نبیل باقاعدہ ناراض ہونے لگا تب اس نے بے چارگی سے ام مریم کو دیکھا۔ وہ ساتھ بیٹھی اس کے جوابات سن رہی تھی۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا وہ کہیں دوستوں کے گیٹ ٹو گیدر میں بلایا جا رہا ہے۔

"تم چلے جاؤ زین نا!" وہ آہستہ آواز میں بولی تھی۔

"تم گھر پر اکیلے بور ہو گی' تم بھی چلو میرے ساتھ۔" فون پر آنے کی ہامی بھرنے کے بعد اس نے ام مریم سے کہا۔

"مجھے نیند آ رہی ہے زین! زیادہ دیر مجھ سے جاگا نہیں جائے گا۔ پارٹی میں پتا نہیں کتنی دیر لگ جائے۔"

کل رات ان دونوں نے دیر تک جاگ کر ایک مووی دیکھی تھی' پھر کارڈز کھیلے تھے' بہت دیر سے سوئے تھے وہ دونوں' صبح وہ تو دیر سے اٹھا تھا' مگر مریم آج صبح بھی جلد بیدار ہو گئی تھی۔ اسے یقیناً" نیند آ رہی ہو گی۔

"بس ٹھیک ہے' پھر تم لیٹ کر آرام کرو' میں چلا جاتا ہوں۔"

ام مریم نے مسکرا کر سر اثبات میں ہلایا تھا۔ وہ پارٹی میں چلا گیا تھا۔ مگر وہاں پر بھی اسے ام مریم ہی کا خیال تھا' نہیں وہ اکیلی بور نہ ہو رہی ہو' اس کے دوست اسے اور بھی روکنا چاہ رہے تھے۔ مگر وہ دو گھنٹے بعد ہی گھر واپس آ گیا تھا۔ ام مریم کے کمرے کی لائٹ بند تھی' گویا وہ سو چکی تھی۔ وہ پیار بھری نگاہ اس کے کمرے پر ڈال کر اپنے کمرے میں جانے لگا۔ سکندر کے کمرے کی لائٹ بھی بند تھی۔ سکندر کے کمرے کے بند دروازے کو دیکھتا وہ اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔

اگلی صبح 31 دسمبر کی صبح تھی۔ ام مریم کے کمرے کا دروازہ ابھی بھی بند تھا۔ وہ یقیناً" ابھی سو رہی تھی۔ اور وہ اس کی نیند نہیں خراب کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے اسے سوتا چھوڑ کر خود ناشتے کے لیے نیچے آ گیا۔ وہ ڈائننگ روم میں داخل ہونے لگا تھا۔ مگر داخل ہوتے ہوئے ٹھٹک کر رک گیا تھا۔ جہاں وہ کھڑا تھا وہاں سے اسے ڈائننگ روم کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ مگر وہاں موجود افراد اسے نہیں دیکھ سکتے تھے۔

ڈائننگ ٹیبل پر سکندر' امو جان اور شہریار خان تینوں بیٹھے تھے۔ وہ لوگ ناشتا کر رہے تھے۔ بلکہ یہ کہنا

چاہیے کہ شہریار خان اور امو جان ناشتا کر رہے تھے۔ سکندر کچھ بھی نہیں کھا رہا تھا۔ وہ بے حد سنجیدہ تھا۔ وہ بہت سنجیدگی سے شہریار خان سے کہہ رہا تھا۔

"پاپا! آپ کو نہیں لگتا' آپ نے زین کی منگنی کرنے میں تھوڑی جلد بازی سے کام لیا ہے؟"

اس کے چہرے پر تناؤ آگیا تھا۔ وہ اس کا سگا بھائی کس قدر اس سے حسد کرتا تھا۔ اس کی خود سے ایک معمولی سی برتری اور خوشی بھی اس سے سہی نہیں جارہی تھی۔

"کیا مطلب؟ تم یہ بات دو' تین روز پہلے بھی کہہ رہے تھے' کوئی مسئلہ ہے کیا؟"

شہریار خان سنجیدگی سے سکندر کو دیکھ رہے تھے' گویا اس کے چہرے پر کچھ پڑھنا چاہتے ہوں۔ امو جان تعجب سے سکندر کو دیکھ رہی تھیں۔

"پاپا! زین ابھی چھوٹا ہے' بیس سال کی عمر میں شادی کا اتنا بڑا فیصلہ؟ اسے تھوڑا میچور تو ہو جانے دیں۔"

سکندر قدرے ہچکچا کر آہستگی سے بولا تھا۔ اس کی غصے سے بری حالت تھی۔ وہ خود پر ضبط کیے سکندر کی بکواس سن رہا تھا۔

"امریکی معاشرے کے لحاظ سے بیس سال کی عمر اس طرح کے فیصلوں کے لیے چھوٹی عمر نہیں ہے سکندر! تم بھی کوئی اچھی فیملی کی لڑکی اپنے لیے منتخب کرلو' مجھے تمہاری منگنی پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔" شہریار خان چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے سنجیدگی سے بولے۔

"وہ سب تو ٹھیک ہے پاپا! پر یہ ام مریم مجھے زین کے لیے کچھ زیادہ پسند نہیں آئی ہے' ہمارے زین میں ابھی تک سادگی اور بچپنا ہے' جبکہ ام مریم مجھے کافی تیز سی لگی ہے۔"

اس کا دل چاہا آگے بڑھے اور سکندر کے منہ پر ایک تھپڑ مار دے۔ ایسی حاسد فطرت کا مالک تھا وہ؟ اس سے چھوٹے بھائی کی زندگی کی ایک خوشی برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ بظاہر اس کا ہمدرد بنا وہ شہریار خان سے ام مریم کے خلاف زہر اگل رہا تھا۔ اپنے حسد کو بھائی کی محبت کے لبادے میں لپیٹ کر وہ اس سے اس کی زندگی کی واحد خوشی' ام مریم کو چھین لینا چاہتا تھا؟

"یہ تمہاری غلط فہمی اور وہم ہے سکندر! تمہارے کہنے سے پہلے بھی میں محسوس کر رہا تھا کہ تم زین اور مریم کے رشتے سے خوش نہیں ہو۔ اب تم نے اپنی ناپسندیدگی کی وجہ بھی بتا دی ہے تو میں تم سے یہ ہی کہوں گا کہ مریم کے متعلق تمہاری آبزرویشن غلط ہے۔ وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ بہت سلجھی ہوئی اور سمجھ دار' ہمارے گھر کی بہو بننے کے لائق۔ مجھے اور آمنہ کو وہ بہت پسند ہے۔"

شہریار خان کا جواب بھی اس کے اندر بھڑکتے غصے اور نفرت کو بجھا نہیں سکا تھا۔ وہ اس وقت تو وہاں سے پلٹ گیا تھا۔ مگر جب وہ لوگ ناشتے کی میز سے اٹھ گئے اور سکندر اپنے کمرے میں واپس چلا گیا' تب وہ سیدھا اس کے کمرے میں آگیا۔ اس نے دروازہ پر دستک کی زحمت نہیں کی تھی۔ وہ بہت غصے میں تھا دروازہ دھاڑ سے کھول کر اور پھر اسے زوردار دھماکے سے واپس بند کر کے اندر آگیا تھا۔

"زین..... آؤ زین۔"

سکندر بیڈ پر بیٹھا کوئی کتاب دیکھ رہا تھا' اسے اندر آتا دیکھ کر وہ بے اختیار بیڈ سے اٹھا تھا۔ وہ کئی سالوں بعد سکندر کے کمرے میں آیا تھا۔ سکندر اس سے مصنوعی محبت کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کرتا' یوں خوشی سے اس کے نزدیک آیا تھا جیسے اسے اپنے کمرے میں دیکھ کر بے پناہ خوش اور حیران ہوا ہو۔

"شکر تم نے قسم تو توڑی۔ میرے پاس آئے تو سہی۔ مجھ سے بات کرنا کیوں چھوڑ دیا ہے تم نے زین؟ بھائی الگ الگ شہروں میں رہتے ہوں تو کیا ایک دوسرے سے فون پر بھی بات نہیں کرتے؟"

اس نے سکندر کی اس جھوٹی محبت اور چاہت کو نفرت سے دیکھا تھا۔

"مجھ سے جھوٹی محبت جتانے کے بجائے وہ کہو جو تمہارے دل میں میرے لیے ہے۔ ایک انتہائی حسین

اور غیر معمولی ذہین لڑکی کا ساتھ مجھے کیوں مل رہا ہے' اسی بات کی تکلیف ہے نا تمہیں؟" وہ نفرت سے پھنکارا' سکندر جواباً "فوراً" ہی رسانیت سے بولا تھا۔

"تمہارا انتخاب درست نہیں ہے زین! کیسے سمجھاؤں تمہیں' مریم کسی بھی طرح تمہارے لیے مناسب نہیں ہے۔"

"میرے لیے کیا مناسب ہے اور کیا غیر مناسب اس کا فیصلہ میں خود کروں گا تم نہیں۔" وہ نفرت اور غصے سے اسے دیکھ کر بولا تھا۔ "میری ہمدردی کی آڑ میں آئندہ اگر تم نے پاپا یا امو جان سے مریم اور میرے رشتے کے خلاف کچھ کہا تو میں ہرگز برداشت نہیں کروں گا۔"

اس نے انگلی اٹھا کر وارننگ دینے والے انداز میں سکندر سے کہا۔ سکندر جواب میں بالکل چپ کھڑا تھا۔ وہ نفرت اور غصے سے اسے دیکھتا پیر پٹختا اس کے کمرے سے نکل گیا تھا۔ سکندر کو وارننگ دینے' اس کی طبیعت صاف کرنے کے بعد بھی اس کا موڈ ٹھیک نہیں ہوا تھا۔ آخر اس کی جرات کیسے ہوئی ام مریم کے خلاف پاپا اور امو جان کے ذہنوں میں زہر انڈیلنے کی' ان کا برین واش کرنے کی۔

ام مریم سو کر اٹھ گئی تھی۔ اس کی خاطر اس نے زبردستی اپنا موڈ ٹھیک کیا تھا۔ خود کو ہنستا مسکراتا اور خوش باش ظاہر کیا تھا۔ مگر ام مریم کو پتا نہیں کیا ہوا تھا۔ وہ بہت چپ تھی۔ اسے فکر ہوئی تھی۔ اس نے اس سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اس کے سر میں شدید درد ہے۔ وہ بتا رہی تھی کہ رات میں اسے بخار بھی چڑھ گیا۔ الٹیاں بھی ہوئی تھیں۔ اس نے ناشتے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ اس کے اصرار پر صرف چائے لے لی تھی۔

ام مریم کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی' اب اس کا آج پارٹی میں جانا تو بہت مشکل لگ رہا تھا۔ آج اسے اور ام مریم کو شہریار خان اور امو جان کے ساتھ نیو ایئر کے حوالے سے ایک پارٹی میں جانا تھا۔ یہ پارٹی جرمن ایمبیسیڈر کے گھر پر تھی۔ چونکہ شہریار خان کے ان سے قریبی اور دوستانہ مراسم تھے' سو انہوں نے شہریار کی ساری فیملی کو پارٹی میں انوائٹ کیا تھا۔

سکندر کل شام ہی پارٹی میں جانے سے معذرت کرچکا تھا یہ کہہ کر کہ اسے گھر پر اپنا کوئی اسائنمنٹ مکمل کرنا تھا جو چھٹیوں کے فوراً بعد اس نے اپنے پروفیسر کو جمع ——— کروانا تھا۔ ام مریم کہہ رہی تھی کہ وہ پارٹی میں جائے گی۔

"انکل نے اتنے پیار سے کہا ہے کہ مریم بھی چلے گی۔ مریم بھی ہماری فیملی کا حصہ ہے۔ اگر میں نہیں گئی تو انکل کو اچھا نہیں لگے گا۔"

طبیعت کی ناسازی کے باوجود وہ اس کے پاپا کی خاطر پارٹی میں جانا چاہ رہی تھی۔ اس نے امو جان سے بھی یہ ہی کہا تھا کہ وہ پارٹی میں جارہی ہے' حالانکہ اس کا چہرہ دیکھ کر ہی پتا چل رہا تھا کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اس سے پارٹی میں بیٹھا نہیں جاسکے گا۔

"بیٹا! تم گھر پر آرام کرو' پارٹی میں جا کر بلاوجہ تھکو گی' طبیعت کہیں زیادہ خراب نہ ہو جائے۔" امو جان نے مریم سے کہا وہ اسے ڈاکٹر کو دکھا کر لے آیا تھا۔ ڈاکٹر نے الٹیاں روکنے کے لیے دوا دے دی تھی۔ وہ خود بھی اب پارٹی میں نہیں جانا چاہتا تھا۔ وہ گھر پر ام مریم کے ساتھ رکنا چاہتا تھا۔ بیماری میں اسے گھر پر اکیلا چھوڑ کر جانے کا اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا' مگر مجبوری تھی۔

شہریار خان کے جرمن دوست نے ان کے تمام فیملی ممبرز کو دعوت دی تھی۔ اگر شہریار خان کے بچوں میں سے کوئی بھی ساتھ نہ جاتا تو یقیناً وہ برا مانتے۔ وہ مریم کو دوا دے کر' اسے آرام کرنے کی تاکید کر کے شہریار خان اور امو جان کے ساتھ گھر سے روانہ ہوا تھا۔ مریم کو لیونگ روم میں صوفے پر کشنز وغیرہ سے ٹیک لگا کر بیٹھے اور ٹی وی دیکھتا چھوڑ آیا تھا۔

جرمن ایمبیسیڈر کا گھر ان کے گھر سے کافی دور تھا۔ وہ لوگ راستے میں تھے اور اپنے گھر سے کچھ دور آچکے تھے۔ جب امو جان کو اچانک ہی گاڑی میں ان تحفوں کی کمی کا احساس ہوا جو وہ ایمبیسیڈر کے گھر لے

جارہے تھے۔ نیو ایر کے حوالے سے کیک' چاکلیٹس' پھول' ایک مشہور مصور کی بنائی قیمتی پینٹنگ جو اموجان نے خوب صورتی سے پیک کروا رکھی تھی۔ ایمبیسڈر کی بیگم کرسٹلز کی شوقین تھیں تو کرسٹل کے خوب صورت گل دان کا ایک سیٹ بھی تحفوں میں شامل تھا۔

تمام تحفے انہوں نے گلزار سے گاڑی میں رکھنے کے لیے کہا تھا۔ مگر شاید وہ تحفے رکھنا بھول گیا تھا۔ شہریار خان اس لاپروائی پر بیوی کے اوپر برہم ہو رہے تھے۔ ایسی بھی کیا لاپروائی کہ سب کچھ نوکروں کے اوپر چھوڑ دیا جائے۔ بہرحال اب تحفے لیے بغیر خالی ہاتھ تو وہ لوگ پارٹی میں نہیں جاسکتے تھے۔ غصہ کرنے کے باوجود بھی لامحالہ شہریار خان نے ڈرائیور سے گاڑی موڑنے کو کہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ لوگ گھر واپس پہنچ گئے تھے۔ ان کی گاڑی پورچ میں رکی تھی۔

شہریار خان اور اموجان گاڑی ہی میں بیٹھے تھے۔ شہریار خان نے اس سے اندر سے تحفے اٹھا کر لانے کو کہا تھا۔ وہ گاڑی سے اترنے لگا' تب ہی اندر سے کسی کے چلانے کی آوازیں اور کچھ گرنے اور ٹوٹنے کی آوازیں ان لوگوں کو پورچ میں سنائی دیں۔ اموجان نے گھبرا کر سینے پر ہاتھ رکھا تھا۔

"یا اللہ خیر۔" گھبرا کر صرف وہ ہی نہیں شہریار خان اور اموجان بھی گاڑی سے اترے تھے۔ وہ اندھا دھند اندر کی طرف بھاگا۔ اموجان اور شہریار خان اس کے پیچھے اندر کی طرف دوڑے تھے۔ "بچاؤ' بچاؤ' کوئی ہے مجھے بچاؤ' چھوڑو مجھے۔" چلاتی ہوئی یہ آواز سن کر اس کے قدموں تلے سے زمین نکل گئی تھی' یہ ام مریم کی آواز تھی۔ اس کی حالت ایک پل میں غیر ہو گئی تھی۔ ایک سیکنڈ کے اندر وہ گھر کے داخلی دروازے تک پہنچا تھا۔ یہ دروازہ ان کے لیونگ روم ہی میں کھلتا تھا۔ اس نے خوف' پریشانی اور شدید گھبراہٹ کے عالم میں ایک جھٹکے سے دروازہ کھولا۔ لیونگ روم میں داخل ہونے والا سب سے پہلا شخص وہ تھا' اس کے پیچھے شہریار خان اور اموجان بھی بھاگتے ہوئے اندر داخل ہوئے تھے۔

وہاں جو منظر اس نے دیکھا' کاش اسے دیکھنے سے پہلے وہ مر گیا ہوتا۔ کاش وہ مر گیا ہوتا۔ چلاتی' روتی اور خود کو بچاتی ام مریم کارپٹ پر سکندر کی گرفت میں پڑی تھی۔ وہ خود کو اس کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ رو رہی تھی' وہ چلا رہی تھی۔

"چھوڑو مجھے۔ خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو۔ میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں سکندر! مجھے چھوڑ دو۔"

وہ خود کو سکندر کے مضبوط وجود کے شکنجے سے چھڑانے کے لیے پوری مزاحمت کر رہی تھی۔ وہ چیخ چیخ کر رو رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ سینڈوچز' فروٹس اور کافی پر گزارا کرتی کل شام سے اسٹوڈیو میں تھی۔ پینٹ کرنے کے لیے اس کے اندر کے آرٹسٹ کی تڑپ پوری طرح بے دار تھی' سو وہ بغیر کسی وقفے کے کام کر رہی تھی۔ نینی چونکہ اس کی اس طرح کی کیفیتوں سے پوری طرح آگاہ تھیں' تو آ کر یہ تو کہہ رہی تھیں کہ وہ رات کا کھانا نیچے آ کر کھالے' ناشتا کرلے۔

جب وہ منع کرتی تو کھانا' ناشتا کینوس سے نظریں اٹھائے بغیر اوپر ہی پہنچائے جانے کی بات ہوتی' جب وہ کینوس سے نظریں اٹھائے بغیر اس سے انکار کرتی تب وہ اس کے لیے سینڈوچز' ناشپاتی اور پھر کافی بنا کر اوپر ہی لے آتیں۔ وہ ٹی شرٹ اور ٹریک سوٹ کے ٹراوزر میں ملبوس تھی' بالوں کو لپیٹ کر کیچر میں جکڑ رکھا تھا۔

صبح گیارہ بجے فلورنس کی آرٹ گیلری جہاں اس کی تصویروں کی نمائش ہونا تھی۔ اس کے ڈائریکٹر کا فون آگیا' یہ پوچھنے کے لیے کہ اس کی کتنی تصاویر مکمل ہو چکی ہیں۔ انہیں یہ اطمینان دلا کر کہ مقررہ وقت تک وہ اپنا کام پورا کرلے گی' اس نے چند رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد فون پر گفتگو ختم کی تھی۔

کال ختم کرتے ہی اسے سکندر کا خیال آیا تھا۔ اس نے اپنی دو دن کی مصروفیات بتائی تھیں اور یہ کہا تھا آنے والے کل وہ اس کے ساتھ جہاں وہ کہے جانے کے لیے تیار ہے۔ اس نے فوراً" ہی سکندر کو کال ملائی تھی۔

"ہیلو لیزا۔" اس نے فون پر سکندر کی مسکراتی ہوئی آواز سنی۔ اس نے پہلی بیل پر کال ریسیو کی تھی۔

"کہاں ہو؟ کیا کر رہی ہو؟" سکندر نے دوستانہ سے لہجے میں ساتھ ہی مزید پوچھا۔

"اسٹوڈیو میں ہوں۔ پینٹ کر رہی ہوں۔ میں نے تم سے یہ پوچھنے کے لیے فون کیا تھا کہ کیا ہم کل مل رہے ہیں اور کیا یہ وہ والی کل ہے۔ جس کا تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ ایک پورا دن میرے لیے ہوگا؟"

مسکرا کر پوچھتی وہ دروازہ کھول کر باہر بالکونی میں نکل آئی۔ بالوں کی چہرے کے اطراف بکھری لٹوں کو اس نے ہاتھوں سے پیچھے کیا تھا۔ سکندر اس کی بات کے جواب میں دھیرے سے ہنسا۔

"ٹھیک ہے' کل وہی والی کل ہے۔ جس میں تم نے مجھے پینٹ کرنا ہے۔ تم یہ بتاؤ' چلنا کہاں ہے؟ تم پینٹنگ کہاں بنانا چاہتی ہو؟"

جگہ تو وہ اس وقت سے سوچے بیٹھی تھی جب سکندر نے اپنی پینٹنگ بنوانے پر آمادگی ظاہر کی تھی۔

" Tivoli چلتے ہیں۔"

" Tivoli ... اچھا ٹھیک ہے' چلنا کب ہے؟" سکندر نے فوراً" ہی اس کی بتائی جگہ کے لیے اپنی رضامندی دے دی تھی۔

"کل صبح' میں تمہیں تمہارے ہوٹل سے پک کرلوں گی۔"

"او کے مصورہ! کل میں آپ کے ڈسپوزل پر ہوں گا' جو جگہ آپ طے کریں' جو وقت آپ مقرر کریں۔" سکندر کی قدرے شرارتی سے انداز میں کہی بات کے جواب میں وہ کھلکھلا کر ہنسی۔ "اتنے فرماں بردار بنے ہوئے ہو' خیر تو ہے؟"

"وعدہ نبھا رہا ہوں جو میں نے اپنی رومن فرینڈ سے

کیا تھا۔" وہ بھی اس کے ساتھ ہنس رہا تھا۔
"تمہاری طبیعت کیسی ہے سکندر! تکلیف کم ہوئی؟"
"میں بالکل ٹھیک ہوں' جتنے گھنٹے تم کل مجھے پینٹنگ بنانے کے لیے ایک ہی جگہ ایک ہی زاویے سے بٹھائے رکھنا چاہو میں بیٹھ جاؤں گا۔"
سکندر نے مسکراتے ہوئے اس سے کہا تھا سکندر سے بات ختم کرنے کے بعد وہ بالکونی ہی میں کھڑی کل کا دن پلان کرنے لگی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ آفس دیر تک رکا تھا۔ اس کے جن کاموں کا حرج ہوا تھا' ان دو دنوں میں وہ مکمل کر چکا تھا۔ جو دو' ایک کام مزید اس کے ذمے تھے اور اسے یہاں پر مکمل کر کے جانے تھے اس نے آج ان کا بھی آغاز کر دیا تھا۔ امید تھی کہ مزید دو سے تین دنوں میں وہ اپنے سارے کام مکمل کر کے یہاں سے دوبارہ واپسی کی تیاری کرے گا۔
وہ کل تک بیساکھی کے سہارے چلا تھا اور اسپتال جا کر پیر کی بینڈیج بھی تبدیل کروالی تھی۔ آج وہ بغیر بیساکھی کے آفس آیا تھا' ٹھیک ہے ابھی اس کی چال بالکل نارمل نہیں ہوئی تھی' مگر اپنی چوٹ کے مزید چاؤ چونچلے اٹھانے کا اس کا ہرگز کوئی ارادہ نہیں تھا۔
ہوٹل واپس آکر کمرے ہی میں رات کا کھانا کھانے کے بعد اس نے اپنے پیر کی بینڈیج کھولتے' زخم کو صاف کرتے' دوا لگاتے' بینڈیج کرتے چاہے اسے جتنی بھی مشکل ہوئی تھی' جتنا بھی درد ہوا تھا' اسے اس سے کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ ڈاکٹر کی ہدایات کے مطابق وہ کوئی احتیاط نہیں کر رہا تھا۔ مگر وہ جانتا تھا کہ اس لاپروائی اور بداحتیاطی کے باوجود بھی وہ مکمل طور پر ٹھیک ہو جائے گا۔
وہ چاہے جتنا بھی بیمار ہو جاتا' چاہے اس کے کتنی بھی خطرناک چوٹیں نہ لگ جاتیں۔ وہ ہمیشہ ٹھیک ہو جاتا تھا۔ وہ واقعی بہت ڈھیٹ تھا' اسے کچھ بھی نہیں ہوتا تھا۔ وہ جانتا تھا' وہ اب کی بار بھی مکمل طور پر ٹھیک ہو جائے گا۔ چاہے وہ زخم کی سرے سے بینڈیج کرنا ہی کیوں نہ چھوڑ دے۔ اس کے جتنا ڈھیٹ اور سخت جان بھی شاید ہی کوئی دوسرا ہو گا۔ بینڈیج کرنے کے دوران بجائے درد اور تکلیف محسوس کرنے کے وہ تلخی سے مسکراتا خود اپنے آپ پر ہنس رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

لیزا نے صبح ساڑھے آٹھ بجے تک نکلنے کے لیے کہا تھا۔ سوا آٹھ کے قریب وہ جانے کے لیے تیار ہو جانے کے بعد نکل آیا تھا۔ اس کا رخ اپنے ہوٹل سے نزدیک ایک بار کی جانب تھا۔ وہ بار میں آگیا تھا۔ وہاں جلدی جلدی ناشتا کرتے رومن مرد اور عورتوں کو اپنے اپنے کام پر پہنچنے کی عجلت تھی۔ وہ کاؤنٹر کے سامنے آگیا۔ کاؤنٹر کے دوسری طرف کھڑے بوڑھے۔ اٹالین بار ٹینڈر سے اس نے اپنے لیے رومنوں ہی کی طرح کافی اور ڈونٹس آرڈر کرنا تھا۔ وہ لیزا سے کتنی اٹالین سیکھ پایا ہے' آج اس کا امتحان تھا۔
بار ٹینڈر نے Buan Goirno کہہ کر مسکراتے ہوئے اسے کیا چاہیے پوچھا تھا۔
کافی کیسی چاہیے' یہ آرڈر اس نے آسانی سے ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں کر دیا تھا۔ وہاں ڈونٹس کے لیے اسے اشاروں کی زبان سے کام لینا پڑا تھا۔ اس کی کیا قیمت ہے' یہ کتنے کا ہے' کتنے پیسے ادا کرنے ہیں' اس کے لیے لیزا کیا بولتی تھی' وہ اس نے بہت غور سے سن رکھا تھا۔
اس نے خود اعتمادی سے بار ٹینڈر سے Costa Quanto پوچھا تھا۔ دل ہی دل میں خود کو شاباشی بھی دی تھی۔ وہ اٹلی میں اپنا ناشتا ٹوٹی پھوٹی ہی سہی اٹالین میں آرڈر کرنے کے قابل ہو گیا ہے۔ اور اس بات پر بچکانہ سی خوشی محسوس کرنے پر خود پر ہنسا بھی تھا۔
خالص رومنوں کی طرح کاؤنٹر کے سامنے ہی اسٹول پر اپنی کافی اور ڈونٹ لے کر بیٹھ گیا تھا۔ ابھی اس نے ڈونٹ ہاتھ میں اٹھایا ہی تھا کہ اس کے موبائل

پر لیزا کی کال آگئی۔
"میں نے سوچا' تمہیں بتا دوں میں گھر سے نکل گئی ہوں۔ دس منٹ میں تمہارے ہوٹل ہوں گی۔" اس نے بتایا تھا۔
"ہوٹل سے ذرا سا آگے چلی آنا۔" اس نے کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے اس سے کہا۔
"کیا مطلب؟"
"مطلب یہ کہ میں۔
"جب تم روم میں ہو تو رومیوں کی طرح رہو۔" کے مقولے پر عمل کرتے ہوئے تم رومنز کی طرح بار میں بیٹھ کر ناشتا کر رہا ہوں۔" وہ مسکرا کر خوش دلی سے بولا۔
"ویری انٹرسٹنگ۔" لیزا نے خوش ہو کر کہا۔
"میں نے خود اپنے لیے ناشتا آرڈر کیا' وہ بھی اٹالین میں۔ کیا تمہیں یقین آرہا ہے؟"
خود کو شاباشی دینے کے بعد جیسے اسے اب لیزا سے بھی اس کارنامے پر تعریف وصول کرنا تھی۔
"مکمل جملے نہیں بول سکا۔ مگر ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں' میں نے بار ٹینڈر کو اپنی بات سمجھا ہی دی۔" وہ ہنس کر اپنا کارنامہ بیان کر رہا تھا۔
"یہ تو واقعی قابل تعریف بات ہے۔ میں آپ کی اس ذہانت پر آپ سے بری طرح امپریس ہو گئی ہوں۔ سینور سکندر۔" لیزا جیسے اس کی بات کا لطف لیتے ہوئے ہنسی تھی۔
"او کے۔ تم اپنا ناشتا ختم کرو' اتنی دیر میں' میں پہنچ رہی ہوں۔"
بہت سکون سے بیٹھ کر اس نے کافی اور ڈونٹ کو انجوائے کیا۔ اس کے بعد وہ بار کے دروازے سے باہر آکر کھڑا ہو گیا۔ اسے لیزا کی گاڑی آتی دکھائی دی تو اس نے دور سے ہاتھ ہلا کر اسے اپنی موجودگی سے آگاہ کیا۔ لیزا نے گاڑی اس کے پاس لا کر روکی تھی۔
اس نے براؤن سفاری پینٹ کے ساتھ گرین کلر کا ڈھیلا ڈھالا ٹاپ پہن رکھا تھا۔ بالوں کی پونی بنا رکھی تھی۔ وہ ہمیشہ کی طرح خوب صورت لگ رہی تھی۔ اسٹائلش لگ رہی تھی' رومن لگ رہی تھی' آج اس نے بھی اپنے حلیے پر ذرا زیادہ دھیان دیا تھا کہ آج لیزا نے اسے پینٹ کرنا تھا' ورنہ آج کون سا آفس جانا ہے' سوچ کر شاید اس نے شیو بھی نہیں کرنا تھا۔ لیزا اسے بغیر بیساکھی کے دیکھ کر کچھ حیرت اور کچھ غصے سے چلائی تھی۔
"تمہاری ـــــ بیساکھی کہاں ہے؟" وہ غصے اور فکرمندی سے گاڑی سے اتر آئی اور اس کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی تھی۔
"لیزا! میری چوٹ بالکل ٹھیک ہو گئی ہے' پھر بے کار میں اسے لے کر چلنے کا کیا فائدہ تھا؟ اس سے مجھے الجھن ہی ہو رہی تھی۔"
وہ اس کے غصے اور خفگی سے ڈر کر قدرے مدافعانہ انداز میں بولا۔
"دکھاؤ ذرا مجھے اپنی چوٹ۔ ذرا مجھے بھی تو پتا چلے' تمہاری چوٹ کتنی ٹھیک ہو گئی ہے۔"
وہ دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر پکی لڑاکا عورتوں والے انداز میں بولی۔
"اگر اس طرح سے لڑو گی' چیخو' چلاؤ گی تو میں پینٹنگ نہیں بنوا رہا۔" اس کی سوئی ایک ہی جگہ پر اٹکی دیکھ کر اس نے جھٹ دھمکی دی تھی۔
"ہوٹل چل کر لے لو سکندر پلیز۔ تمہیں چلنے پھرنے میں احتیاط کی ضرورت ہے۔"
وہ اس بار نرمی سے اور دوستانہ انداز میں بولی تھی۔
"میں نہیں لے رہا۔ تم نے چلنا ہے تو ایسے ہی چلو۔ بہت نخرے اٹھا لیے میں نے اپنی چوٹوں کے۔"
وہ لاپروائی سے بولتا گاڑی کا دروازہ کھول کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ لیزا باہر کھڑی اسے گھور کر دیکھ رہی تھی۔
"اب چلو بھی مصورہ! مجھے گھورنے کا شوق تو راستے میں بھی پورا کیا جا سکتا ہے۔"
اسے خود احساس ہوا تھا کہ اس کے بولنے کا لاپروا

انداز، اس کی ٹون، اس کے الفاظ بہت حد تک لیزا جیسے تھے، اتنے دنوں سے ہر روز اس کے ساتھ ملنے اور وقت گزارنے کے بعد وہ شاید کچھ کچھ اس کے جیسا ہوتا جارہا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے لیزا کے غصے سے بھرے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ لیزا ہار مانتی گاڑی میں آکر بیٹھ گئی۔

"بہت ضدی ہو تم، جو سوچ لیتے ہو کرتے وہی ہو، چاہے تمہیں جتنا بھی قائل کرنے کی کوشش کرلی جائے۔" گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے وہ خفگی سے بولی۔

"پوری امید ہے مجھے تم ڈاکٹر کے پاس بھی نہیں گئے ہوگے اور میڈیسن لینا بھی چھوڑ دی ہوگی۔"

"یار یہ ایکسیڈنٹ ایکسیڈنٹ بہت ہوگیا ہے اب۔ میں بور ہوگیا ہوں اسی ایک ٹاپک سے۔ پلیز کوئی اور بات کرو۔"

لیزا نے اسے گھورا۔ وہ جواباً "چپ ہوگئی تھی۔ وہ اب خاموشی سے ڈرائیو کررہی تھی۔

"تمہیں پتا ہے، میں نے کتنی اٹالین سیکھ لی ہے؟"

اس کے خفا خفا سے چہرے کو دیکھتے ہوئے اس نے مسکرا کر پوچھا۔ وہ اسے بولنے اور ہنسنے پر اکسا رہا تھا۔ لیزا نے صرف سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔ بولی کچھ نہیں۔

"اب میں نے سوچنا بھی اٹالین میں شروع کردیا ہے۔ ابھی بار کے پاس جب تم گاڑی لاکر روک رہی تھیں تب تمہیں دیکھتے کے ساتھ میں نے پتا ہے اٹالین میں کیا لفظ سوچا تھا؟"

لیزا نے زبان سے کہا "کیا سوچا تھا؟" اب بھی نہیں پوچھا تھا، صرف سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"bella" وہ کوشش کرکے اٹالین لہجے میں بولا تھا۔ bella اٹالین میں خوب صورت اور حسین کو کہتے ہیں، اتنا تو وہ سیکھ ہی چکا تھا۔ اس کے اندازے کے عین مطابق وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔

"بہت تیز ہو تم سینیور سکندر! تمہیں پتا ہے لڑکیوں کو کس طرح خوش کیا جاسکتا ہے۔"

وہ جواباً "مسکرا دیا تھا۔

"خیر خوب صورت تو میں ہوں، یہ مجھے پتا ہے۔" وہ فوراً "ہی مغرورانہ سے انداز میں بولی تھی۔

شکر تھا اس کی کوشش کامیاب رہی تھی، اب موضوع گفتگو اس کی چوٹیں، دوائیں اور بیساکھی نہیں رہی تھیں۔

"ہم Tivoli کیوں جارہے ہیں؟" کچھ دیر کے بعد اس نے تیز رفتاری سے ڈرائیو کرتی لیزا کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"کیا ہوگیا ہے سینیور سکندر! تمہاری پینٹنگ بنانے اور کس لیے؟" وہ جیسے اس کے سوال پر حیران ہوئی تھی۔

"وہ تو مجھے پتا ہے، میرا مطلب ہے Tivoli ہی کیوں جارہے ہیں، کہیں اور کیوں نہیں؟"

"سوال اچھا ہے۔" وہ اس کے سوال پر مسکرا کر بولی۔ ایک پل رک کر جیسے اس نے اپنی سوچوں کو یکجا کیا۔

"میرا دل چاہ رہا تھا میں Villa d este کے کسی خوب صورت سے فوارے کے سامنے تمہیں بٹھا کر وہاں تمہاری پینٹنگ بناؤں۔ میری پینٹنگ کا مرکز تم ہو اور تمہارے بیک گراؤنڈ میں سولہویں صدی کا کوئی بے مثال آرکیٹکچر رکھتا فوارہ اور اس سے گرتا پانی ہو۔ پانی میں جیسی گہرائی، جیسی طاقت اور جیسا اسرار ہوتا ہے مجھے وہی گہرائی، وہی طاقت اور وہی پراسراریت تمہاری آنکھوں میں بھی نظر آتی ہے۔ مجھے سوچنے ہی سے یہ منظر بہت انسپائر کرتا ہے، فیسی نیٹ کرتا ہے۔"

وہ ایک نظر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بہت سچائی سے بول رہی تھی۔

"مجھے تمہاری آنکھوں میں اتنے سارے تاثر نظر آتے ہیں، اداسی، درد، کرب، طاقت، گہرائی، پراسراریت جیسے یہ آنکھیں اپنے اندر نہ جانے کتنے

راز چھپائے بیٹھی ہیں، میں پانی کو تمہاری آنکھوں کے ساتھ ایک سمبل کے طور پر دکھانا چاہتی ہوں۔ دونوں میں گہرائی، دونوں میں اسرار۔"

"اس طرح بولتے ہوئے تم پکی پکی مصورہ لگ رہی ہو۔ تمہاری ان بڑی بڑی باتوں سے میں مرعوب ہورہا ہوں سینوریتا۔"

لیزا کی سنجیدگی کے جواب میں وہ ہنسا۔ لیزا نے اسے ان نظروں سے دیکھا تھا، جیسے اس سے براہ راست کچھ پوچھنا چاہتی ہو۔ مگر اس نے سکندر کی آنکھوں کا وہ تنبیہی تاثر فوراً "پڑھ لیا تھا کہ وہ اس سے اس کی ذات اور ذاتی زندگی کے بارے میں کچھ بھی نہ پوچھے۔ وہ چپ ہوگئی تھی۔ کچھ دیر وہ دونوں خاموش رہے تھے۔

"تمہاری ننی کیسی ہیں؟" کچھ دیر کے بعد اس نے گفتگو کے لیے موضوع تلاش کیا تھا۔

"ٹھیک ہیں، تمہیں دعا، پیار کہلوایا ہے انہوں نے، اور یہ بھی کہا ہے کہ تم ہوٹل واپس جانے کے بعد سے ہمارے گھر آئے کیوں نہیں ہو اور ہمارا آج جانے کا مقصد گو کہ تمہاری پینٹنگ بنانا ہے، مگر ننی نے ہمیں اس میں پکنک کا مزا فراہم کرنے کے لیے بڑی زبردست پکنک باسکٹ تیار کرکے دی ہے۔ Tivoli میں جب لنچ کریں گے، تب تم دیکھنا ننی نے کتنی مزے مزے کی چیزیں ہمارے کھانے کے لیے تیار کرکے بھیجی ہیں۔"

اس نے سکندر کے کسی رویے کی وجہ سے کچھ محسوس کیا ہے، یہ تاثر دیے بغیر وہ مسکرا کر بولی۔ باتیں کرتے ہلکی آواز میں میوزک سنتے، لیزا کی فاسٹ ڈرائیونگ کے سبب وہ روم سے باہر اس خوب صورت اور پرفضا ٹاؤن جلد پہنچ گئے تھے۔

پہاڑی علاقہ ہونے کے سبب ٹائیبولی کا موسم وہاں کی آب و ہوا روم سے زیادہ خوش گوار اور پرفضا تھی۔ یوں ہی تو نہیں ٹائیبولی سولہویں صدی سے رومنوں کی پسندیدہ ریزورٹ رہی۔ رومن بادشاہوں کے محلات کے ساتھ بنائے گئے یہ گارڈنز پورے اٹلی میں سب سے خوب صورت اور سب سے منفرد گارڈن مانے جاتے تھے۔ ہنرمندی، کاری گری، مہارت، خوب صورتی اور حسن کا شاہکار آرکیٹکٹس کی مہارت کا منہ بولتا ثبوت یہ باغات اور پانچ سو فوارے دیکھنے والوں کو مبہوت کردیا کرتے تھے۔ ان فواروں کی تخلیق میں سولہویں صدی کے آرکیٹکٹس، سنگ تراشوں اور مجسمہ سازوں کی بے مثال مہارت اور ہنرمندی چھلکتی تھی۔ روم میں سیاحوں کے شور، ہنگامے، گہماگہمی اور رش سے دور یہ ایک خاموش اور پرفضا ٹاؤن تھا۔

وہ دونوں گاڑی سے اتر رہے تھے۔ لیزا گاڑی کی پچھلی سیٹ سے سامان نکالنے لگی۔ اس نے پکنک باسکٹ نکال کر اسے پکڑائی تھی۔ اب وہ اپنا کینوس، ایزل اور رنگ وغیرہ نکال رہی تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)

✡

نگہت عبداللہ

۶
چھٹی قسط

میرے خواب لوٹا دو

توصیف احمد اور یاسمین کا ایک بیٹا حماد اور دو بیٹیاں، سارہ اور اریبہ ہیں۔ یاسمین کی مستقل بدمزاجی اور بدزبانی سے تنگ آکر توصیف احمد نے اپنے بڑے بھائی کی سالی، خالدہ سے دوسری شادی کرلی۔ یاسمین اس پر اپنے جیٹھ، جٹھانی سے بھی شاکی ہے۔ اریبہ ماں سے قریب ہے، جب کہ سارہ اپنے باپ سے محبت کرتی ہے۔ اریبہ کی منگنی اس کے تایا زاد، اجلال رازی سے ہوچکی ہے جو اعلا تعلیم کے لیے امریکا گیا ہوا ہے۔ یاسمین، اریبہ کو باپ اور ددھیالی رشتے داروں کے خلاف بھڑکاتی رہتی ہے۔ اریبہ کو جب باپ کی دوسری شادی کا پتا چلا تو وہ اپنے تایا اور تائی سے بھی بدظن ہوگئی اور اس نے اجلال سے منگنی توڑ دی۔ اجلال تعلیم مکمل کرکے واپس آیا تو اسے منگنی ٹوٹنے کا پتا چلا۔ وہ اریبہ سے محبت کرتا ہے اور یہ رشتہ ختم نہیں کرنا چاہتا۔

اجلال رازی اس بارے میں اریبہ سے بات کرتا ہے، مگر وہ خاصی رکھائی سے پیش آتی ہے، تاہم وہ تحمل سے کام لیتا ہے کیونکہ وہ یہ مسئلہ بردباری کے ساتھ حل کرنا چاہتا ہے۔ اریبہ بے حد خود سر ہوتی جارہی ہے۔ وہ ماں کی شہ پر سب کی مرضی کے خلاف موٹر سائیکل لے لیتی ہے۔ توصیف احمد کو اریبہ کے منگنی توڑ دینے کا بھی علم ہوجاتا ہے۔ وہ ساجدہ بیگم سے بات کرتے ہیں تو وہ انہیں کچھ دن یاسمین کے گھر میں رہنے کا مشورہ دیتی ہیں۔ سارہ کا کزن عمیر اس سے اظہار محبت کرتا ہے۔ سارہ بھی اسے پسند کرتی ہے۔

شمشیر علی شہر میں ملازمت کرتا ہے۔ اسے گاؤں میں مقیم اپنی بہن تاجور کی فکر رہتی ہے کیونکہ وہ وہاں سوتیلی ماں کے ظلم و ستم اور باپ کی عدم توجہ کا شکار ہے۔ وہ تاباں کو پسند کرتا ہے۔ وہ اپنے باپ کو فون کرتا ہے کہ تاباں کے باپ سے رشتے کی بات کرے تاکہ وہ شادی کے بعد تاجور کو اپنے ساتھ رکھ سکے۔

"کیا کر رہی ہو؟ سامنے دیکھو۔"

بائیک لہرانے پر عروسہ نے ڈر کر اس کا کندھا جھنجھوڑا تو چونک کر اس نے گردن سیدھی کی لیکن دھیان ابھی بھی گاڑی کی طرف تھا جو اس سے آگے نکل گئی تھی۔ اگر عروسہ ساتھ نہ ہوتی تو وہ ضرور گاڑی کا تعاقب کرتی۔ اب بس اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

اس نے آتے ہی آفس سے چند دن کی مزید چھٹیاں لے لیں تاکہ تاجور کا مکمل چیک اپ اور پھر علاج شروع کروا سکے گو کہ اس کا ذہن کسی سنجیدہ بات کو سوچ تو رہا تھا پھر بھی وہ خود سے کوئی قیاس نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے پہلی فرصت میں ہی اس نے تاجور کو ڈاکٹر کو دکھایا اور اس کی ہدایات پر مختلف ٹیسٹ کروائے اور جب رپورٹس دیکھ کر ڈاکٹر نے تاجور کو ٹی بی کی نشان دہی کی تو ایک لمحے کو اس کے سامنے دنیا تاریک ہو گئی۔ اس کے بعد بھی وہ کچھ نہیں بولا۔ وحشت بھری نظروں سے ڈاکٹر کو دیکھے گیا جو کہہ رہا تھا۔

"میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ آپ نے آنے میں دیر کردی پھر بھی آپ کو پہلے آنا چاہیے تھا' ابتدائی اسٹیج میں فوری علاج ہو جاتا ہے۔"

"اور اب......؟" وہ سناٹے میں بولا تھا۔

"اب بھی ہو جائے گا' لیکن وقت لگے گا۔ اگر آپ پیشنٹ کی پراپر ٹرٹمنٹ چاہتے ہیں تو اسے ابھی ایڈمٹ کرائیں۔"

اس کے پاس ہامی بھرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا' کیونکہ آج نہیں تو ایک ہفتے یا مہینے بعد بھی یہی ہونا تھا' اس لیے اس نے اسی وقت فارم بھر دیا۔ اس کے بعد دوسرے معاملات نبٹا کر اور تاجور کی طرف سے پوری تسلی کر کے وہ گھر آیا تو ایک دم اسے گھر خالی لگنے لگا حالانکہ پچھلے دو سالوں سے وہ اس اپارٹمنٹ میں اکیلا ہی رہ رہا تھا۔ تاجور صرف دو دن رہی تھی اور یہ دو دن' دو سالوں پر بھاری ہو گئے تھے۔ بہرحال وہ حیران تھا کہ کبھی مسئلے یوں بھی حل ہوتے ہیں کہ وہ جو اس بات سے پریشان تھا کہ تاجور اکیلی کیسے رہے گی تو اس کے لیے قدرت نے یہ انتظام کر دیا تھا۔ وہ بہت عملی تھا' اس لیے اس نے ابھی تک تاجور سے سوال جواب نہیں کیے تھے۔ اس کے لیے پہلے تاجور کی زندگی اور صحت اہم تھی' جب ہی کسی اور سوچ یا خیال کو اس نے قریب بھی نہیں پھٹکنے دیا تھا' لیکن کب تک؟ جب اسے تاجور کی طرف سے تھوڑا اطمینان ہو گیا کہ مستقل علاج سے وہ ٹھیک ہو جائے گی تو اور بہت ساری باتیں اسے پریشان کرنے لگی تھیں۔

☼ ☼ ☼

اس کے لیے اکیڈمی میں وقت گزارنا مشکل ہو گیا تھا' کیونکہ ذہن بالکل کام نہیں کر رہا تھا۔ سامنے کھلی فائل پر نظریں جمائے وہ ساکت بیٹھی تھی۔ عروسہ ڈاکٹر ہمدانی کا لیکچر دہراتے ہوئے کتنے سوال اٹھا رہی تھی' لیکن اس کی سماعتیں کچھ بھی سننے سے قاصر تھیں۔ سارے احساسات سن ہو گئے تھے۔

"کہاں گم ہو؟" آخر عروسہ نے جھنجلا کر اس کی فائل پر ہاتھ مارا تو وہ نظریں اٹھا کر اسے یوں دیکھنے لگی جیسے خود نہ سمجھ پا رہی ہو کہ وہ کہاں ہے۔

"کیا بات ہے' تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟" عروسہ اس کے گم صم انداز پر قدرے متوحش ہو گئی۔

"ہاں' نہیں' میرا سر چکرا رہا ہے۔" اس نے بالوں میں انگلیاں پھنسا کر سر جھٹکا۔

"چلو! کیفے چلتے ہیں۔ ایک کپ چائے پی لو۔" عروسہ نے کہا اور اپنے ساتھ اس کی فائل بھی اٹھالی۔

"نہیں۔ گھر چلتے ہیں۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"یوں چکراتے سر کے ساتھ بائیک چلاؤ گی' نہ بابا' مجھے ابھی نہیں مرنا۔" عروسہ نے اٹھنے سے انکار کر دیا۔

"سنو...! موت اپنے وقت پر ہی آئے گی۔ اگر تمہارا مرنا اسی طرح بائیک ایکسیڈنٹ میں لکھا ہے تو تم کسی طرح اس سے نہیں بچ سکتیں۔ چلو اٹھو۔" وہ عروسہ کا ہاتھ پکڑ کر زبردستی اسے کھینچتے ہوئے باہر آئی تھی۔

اور جب عروسہ کو ڈراپ کر کے وہ گھر آئی تو اس کا ذہن بری طرح چیخ رہا تھا۔ اس وقت وہ کسی کا سامنا بھی نہیں کرنا چاہتی تھی' لیکن جیسے ہی کوریڈور میں قدم رکھا' کچن سے آتی سارہ اسے دیکھتے ہی بھاگی آئی۔

"کیوں کیا ہوا ہے؟" اس کی تمام حسیات سمٹ کر آنکھوں میں آگئی تھیں۔

"مما کی طبیعت بہت خراب ہے۔ پتا نہیں کیا ہوا ہے انہیں۔ کسی کو پہچان ہی نہیں رہیں۔" سارہ پر تشویش لہجے میں بتاتے ہوئے روہانسی بھی ہو گئی تھی۔

"روتی کیوں ہو' ٹھیک ہو جائیں گی۔" وہ شاید کچھ سمجھ نہیں پا رہی تھی' آہستہ سے سارہ کا کندھا تھپک کر بولی۔

"تم انہیں دیکھو تو۔"

"دیکھ چکی ہوں۔" اس کی نظروں میں کچھ وقت پہلے کا منظر ٹھہر گیا۔

"کیسے دیکھ چکی ہو؟ ابھی تو تم آئی ہو۔ آؤ! میرے ساتھ۔" سارہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا' تب جیسے وہ ہوش میں آگئی۔

"کیا کہا تم نے؟ کیا ہوا ہے مما کو؟"

"یہ تو تم ہی دیکھ کر بتا سکتی ہو۔" سارہ نے یوں کہا جیسے وہ کوالیفائیڈ ڈاکٹر ہو۔ اس نے ہونٹ بھینچ کر خود کو کچھ کہنے سے باز رکھا' پھر چلنے کا اشارہ کر کے سارہ کے ساتھ یاسمین کے کمرے میں آگئی۔

یاسمین بیڈ پر بے سدھ پڑی تھی۔ ایک طرف شہباز ربانی بہت فکرمند بیٹھے تھے۔ اریبہ کو دیکھتے ہی انہوں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا' پھر اٹھ کر ان دونوں کو ساتھ لیے ہوئے کمرے سے باہر آگئے۔

"کیا ہوا ہے مما کو؟" اس نے بہت سپاٹ لہجے میں پوچھا۔ شہباز ربانی کو دیکھتے ہوئے اس کی پیشانی پر آپ ہی آپ ناگواری کی لکیریں بھی ابھر آئی تھیں۔

"پتا نہیں بیٹا! شام میں میں اس طرف آیا تو تمہاری مما اکیلی بیٹھی ہنس رہی تھیں۔ میں نے ٹوکا تو رونے لگیں' پھر کبھی ہنستیں' کبھی روتیں اور مجھے پہچان بھی نہیں رہی تھیں۔ گھر میں کوئی نہیں تھا۔ تم بھی سو رہی تھیں۔ میں تمہیں اٹھانا چاہتا تھا' لیکن اچانک تمہاری مما زوردار چیخ کے ساتھ بے ہوش ہو گئیں' تب میں فوراً انہیں گاڑی میں ڈال کر اسپتال لے گیا۔"

"کیا کہا ڈاکٹر نے؟" اریبہ نے الجھ کر پوچھا۔ وہ یقین اور غیر یقینی کی کیفیت میں تھی۔

"ڈیپریشن بتایا ہے اور یہ کہ زیادہ سوچنے کے باعث ہر وقت ٹینس رہتی ہیں' جس سے دماغ پر اثر ہوا ہے۔" شہباز ربانی نے جتایا' پھر اسے تسلی دینے لگے۔

"آپ پریشان نہ ہوں بیٹا! ابھی دوا کے زیر اثر سوئی ہیں۔ اٹھیں گی تو ان شاء اللہ کافی بہتر ہوں گی۔"

"تھینک یو انکل! آپ نے بروقت......" اسے کہنا پڑا۔

"میں نے اپنا فرض نبھایا ہے بیٹا! اور اب تم دونوں سے ایک ہی ریکویسٹ کروں گا کہ اپنی ماں کا خیال رکھو۔" شہباز ربانی نے اریبہ کا سر تھپک کر کہا۔

"جی!" وہ اسی قدر کہہ سکی۔ پھر پلٹ کر یاسمین کے کمرے میں آگئی۔

یاسمین اسی طرح بے سدھ لیٹی تھی۔ اس نے قریب بیٹھ کر یاسمین کی نبض چیک کی' آنکھیں کھول کر

دیکھیں، پھر اس کا ہاتھ ہاتھوں میں لے کر پکارنے لگی۔

"مما۔۔۔ مما!" یاسمین نے آنکھیں کھول دیں اور خالی خالی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

"کیا ہو گیا ہے مما آپ کو کیوں اپنا خیال نہیں رکھتیں؟ آپ کو کچھ ہو گیا تو ہمارا کیا ہوگا۔ میں، سارہ، حماد ہمیں آپ کی ضرورت ہے۔"

وہ عاجزی سے بول رہی تھی۔ یاسمین کی آنکھوں میں آنسو جمع ہو کر کناروں سے بہنے لگے۔

"آخر کیا پریشانی ہے آپ کو؟ کس بات کو خود پر طاری کر لیا ہے آپ نے؟ مجھے کیوں نہیں بتاتیں؟ کیا مجھ پر بھروسا نہیں رہا آپ کو؟" وہ یاسمین کے آنسوؤں سے بے چین ہو کر اسے جھنجوڑنے لگی۔

"یہ بات نہیں ہے بیٹا! تم ہی نے تو مجھے سنبھالا ہے ورنہ میں کب کی مر گئی ہوتی۔" یاسمین رک رک کر بولی۔

"ایسی باتیں مت کریں اور اب آپ کو کوئی ٹینشن لینے کی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے اپنے ہاتھوں سے یاسمین کے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

"سارہ اور حماد کہاں ہیں؟" یاسمین نے پوچھا۔ لہجے میں تشویش تھی۔

"کہاں جائیں گے وہ دونوں، یہیں ہیں۔ بس اب آپ آرام کریں۔" وہ کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی اور کارنر ٹیبل سے دوا اٹھا کر دیکھتے ہوئے یوں ہی پوچھ لیا۔

"کون سے ڈاکٹر کے پاس گئی تھیں؟"

یاسمین نے ان سنی کر کے آنکھیں بند کر لیں۔

☼ ☼ ☼

وہ آفس میں ضروری کام چھوڑ کر گھر آیا تھا کیونکہ سارہ کے فون سے پریشان ہو گیا تھا۔ وہ یاسمین کی طبیعت خرابی کا بتاتے ہوئے روہانسی ہو رہی تھی۔ وہ اسے صرف تسلی دے کے نہیں رہ گیا بلکہ آنے کا بھی کہا اور پھر اکیلے جانے کی بجائے اس نے سوچا ساجدہ بیگم کو ساتھ لے کر جائے گا۔ جب ہی ضروری کام چھوڑ کر آیا تھا اور جب ساجدہ بیگم کو صورت حال بتا کر چلنے کو کہا تو وہ ایک دم خاموش ہو گئیں۔

"امی! آپ اس بات کا خیال نہ کریں کہ یاسمین آنٹی کو آپ کا جانا اچھا لگا یا نہیں۔ آپ چچا جان کو دیکھیں، وہ آپ کا کتنا احترام کرتے ہیں اور یاسمین آنٹی بہرحال ان کی بیوی ہیں۔" رازی یہ ہی سمجھا تھا کہ وہ یاسمین کے برے رویے کی وجہ سے نہیں جانا چاہتیں۔

"بیٹا! مجھے یاسمین کے رویے سے کوئی شکایت نہیں۔ بس میں کسی اور وجہ سے ابھی نہیں جانا چاہتی۔" ساجدہ بیگم نے دھیرج سے کہا۔

"اور کیا وجہ؟ اریبہ؟" اس نے کچھ ٹھٹک کر پوچھا تو ساجدہ بیگم فوراً بولیں۔

"نہیں نہیں بیٹا! میں نے کہا نا مجھے کسی سے کوئی شکایت نہیں۔ اصل میں ابھی وہاں یاسمین کا کوئی مہمان آیا ہوا ہے اس لیے میں نہیں جانا چاہتی۔"

"یاسمین آنٹی کا مہمان؟ کون ہے؟" وہ الجھا تھا۔

"شاید چچا زاد یا ماموں زاد، مجھے ٹھیک سے نہیں معلوم۔" ساجدہ بیگم کا انداز بے حد سرسری تھا۔

"تو آپ کو ان کی، میرا مطلب ہے اس مہمان کی آمد کا کیسے معلوم ہوا؟" اس نے خلاف عادت جرح کی۔

"توصیف نے بتایا ہے، بلکہ اس کی آمد پر ناراض بھی ہے۔" ساجدہ بیگم بتا کر پھر خود ہی بولنے لگی تھیں۔

"ٹھیک ناراض ہو رہا ہے توصیف۔ گھر میں بیٹیاں موجود ہیں۔ یاسمین کو خود خیال کرنا چاہیے۔"

"یہ کہیں وہ والا مہمان تو نہیں جو یاسمین آنٹی۔۔۔" وہ جانے کیا کہنے جا رہا تھا کہ ساجدہ بیگم کے دیکھنے پر ایک دم خاموش ہو گیا۔

"یہ ثنا کیا کر رہی ہے؟ رات کے کھانے کی کچھ فکر ہے اسے کہ نہیں۔" ساجدہ بیگم بات بدلتے ہوئے اٹھنے لگی تھیں کہ اس نے ایک دم ان کے کندھے تھام کر دوبارہ بٹھا دیا، پھر ان کے پاس بیٹھ کر کہنے لگا۔

"امی! میں اب نادان نا سمجھ نہیں ہوں، جو آپ اور چچا جان مجھے بے خبر رکھنے کی کوشش کریں گے، ویسے بے خبر میں پہلے بھی نہیں تھا، البتہ سمجھ نہیں پاتا تھا اور سمجھ تو وقت کے ساتھ ہی آتی ہے نا۔" اس نے کوئی سوال نہیں اٹھایا تھا، پھر بھی ساجدہ بیگم کو یوں دیکھنے لگا جیسے وہ کچھ کہیں گی۔

ساجدہ بیگم کچھ نہیں بولیں اور اس پر سے نظریں بھی ہٹا لیں۔

"امی! یہ بہت نازک معاملہ ہے۔" وہ زور دے کر کہنے لگا۔ "میری بات چھوڑیں، چچا جان سے کہیں اریبہ اور سارہ کو اعتماد میں لیں اور انہیں خبردار کریں۔"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟" ساجدہ بیگم خائف نظروں سے اسے دیکھنے لگیں۔

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ ایسی باتیں یا کوئی بھی بات ہمیشہ پوشیدہ نہیں رہتی۔ اس سے پہلے کہ اریبہ یا سارہ کبھی اچانک یاسمین آنٹی کی سرگرمیوں سے آگاہ ہو کر شاکڈ ہوں، ٹوٹ جائیں، انہیں طریقے سے آگاہ کر دینا چاہیے۔" اس نے کہا تو ساجدہ بیگم کمزور آواز میں بولیں۔

"کوشش کی تھی توصیف نے۔"

"پھر۔۔۔؟" وہ پوری جان سے متوجہ ہوا۔

"پھر کیا، بیٹیاں الٹا اس سے ناراض ہو گئیں۔ تب توصیف نے کہا تھا کہ وہ آئندہ یاسمین سے متعلق کوئی بات نہیں کرے گا اور یہ ہی ٹھیک ہے کیونکہ اولاد پر یاسمین کی گرفت مضبوط ہے۔"

"ہاں! اریبہ تو کچھ سننا ہی نہیں چاہتی۔" وہ گزری کوئی بات سوچتے ہوئے بولا۔

"اور سارہ؟" ساجدہ بیگم نے جانے کس خیال سے پوچھا تھا۔

"سارہ!" وہ چونک گیا، پھر گہری سانس کے ساتھ بولا۔ "پتا نہیں، سارہ سے کبھی کوئی ایسی بات نہیں ہوئی۔"

"خیر! تم اریبہ سے بھی کچھ مت کہنا۔" ساجدہ بیگم نے کہا تو وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

"لیکن میں جاؤں گا ضرور۔"

اس کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ ساجدہ بیگم ٹھٹک کر اسے دیکھنے لگیں۔

☼ ☼ ☼

آج اس کی یونیورسٹی آف تھی اس لیے وہ آفس سے سیدھا تاجور کے پاس آگیا تھا۔ تاجور میں ابھی تک کوئی بہتری نظر نہیں آ رہی تھی، بلکہ وہ پہلے سے زیادہ کمزور لگنے لگی تھی اور یہ شاید ماحول کا اثر تھا کہ وہ ایک بیڈ تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ پھر بات چیت کرنے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ وہ سارا دن ہونٹ سیے دوسرے مریضوں کو یا پھر وقفے وقفے سے آنے والی نرس کو دیکھا کرتی۔ شمشیر علی کی آمد رات گیارہ بجے سے پہلے نہیں ہوتی تھی۔ وہ بس تھوڑی دیر ہی اس کے پاس بیٹھ سکتا تھا۔ آج وہ جلدی آگیا تو تاجور خوش ہو گئی۔

"بھائی! آپ کی پڑھائی ختم ہو گئی؟" تاجور اس کی جلدی آمد سے یہ ہی سمجھی تھی۔

"نہیں ابھی ایک ڈیڑھ سال باقی ہے۔ کیوں تمہیں بھی پڑھنا ہے؟" اس نے پوچھا تو تاجور اداسی سے بولی۔

"میں کیسے پڑھ سکتی ہوں۔ مجھے تو الف ب بھی نہیں آتی۔"

"سب آجائے گی۔ تم جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ' پھر دیکھنا میں تمہیں کیسے پڑھاتا ہوں۔"

"میں پہلے قرآن شریف پڑھوں گی۔ مجھے بہت شوق ہے۔" تاجور نے خوش ہو کر کہا تو وہ حیران ہوا۔

"کیا مطلب؟ تم نے قرآن شریف نہیں پڑھا؟ کیوں' گاؤں میں ہے تو قرآن پاک پڑھانے والی۔ سب لڑکیاں اس سے پڑھنے جاتی ہیں۔"

"ہاں! پہلے میں بھی جاتی تھی' مگر پھر خالہ نے منع کر دیا۔" تاجور نے افسوس سے بتایا تو اس کے اندر ابال اٹھنے لگا۔ بمشکل خود پر قابو پا کر کہنے لگا۔

"تم نے کبھی مجھے کچھ نہیں بتایا تاج! میرے پوچھنے پر بھی یہ کہتی رہیں کہ تم ٹھیک ہو' خوش ہو۔ خالہ کی زیادتیاں چپ چاپ کیوں سہتی رہیں؟ بتاؤ! کیا کہتی تھیں خالہ......؟"

"وہ مجھے بہت مارتی تھیں۔ کہتی تھیں بھائی کو بتایا تو جان سے مار دوں گی۔" تاجور بتاتے ہوئے سہم گئی تھی۔

"پاگل ہو تم جو اس کی دھمکیوں میں آگئیں اور اپنا یہ حال کر دیا۔ خیر تم تو ان شاء اللہ ٹھیک ہو جاؤ گی' لیکن وہ عورت اب میرے ہاتھ سے نہیں بچے گی۔" اس کے اندر انتقامی آگ دہک اٹھی۔

"نہیں بھائی! آپ وہاں نہیں جانا۔ میں نہیں جانے دوں گی آپ کو۔" تاجور کی پریشانی دیکھ کر وہ ایک دم جیسے ہوش میں آیا تھا کہ وہ لڑکی جو پہلے ہی سہمی ہوئی ہے' اس کے سامنے وہ کیسی باتیں کر رہا ہے۔

"پگلی ہے تو بالکل۔ میں مذاق کر رہا تھا۔" اس نے تاجور کا ہاتھ ہاتھوں میں لے لیا' پھر کہنے لگا۔ "جو ہو گیا سو ہو گیا۔ تم بھی سب بھول جاؤ۔ یہاں سے تمہاری نئی زندگی شروع ہو گی' بالکل ویسی جیسی ہماری اماں چاہتی تھیں اور جیسا میں نے سوچا ہے۔"

"آپ کو اماں یاد ہیں بھائی......؟" تاجور کے لہجے میں بلا کی حسرت تھی۔

"صرف اماں...... ان کی ہر بات یاد ہے۔ پتا ہے تم بالکل اماں کی طرح ہو۔ سنہری آنکھیں' سنہرے بال' ان کی ہر بات یاد ہے۔ میں اماں سے کہتا تھا کہ میں ان کی طرح سنہری کیوں نہیں ہوں تو وہ ہنستی تھیں۔ پھر جب تم پیدا ہوئیں میری سمجھ میں آگیا کہ لڑکیاں ماں کی طرح ہوتی ہیں۔"

اس کی ذہنی رو بہت پیچھے بھٹکنے لگی تھی کہ نرس کی آواز اسے واپس کھینچ لائی تھی۔

"آج آپ جلدی آگئے؟" نرس تاجور کی طرف بڑھتے ہوئے اس سے پوچھ رہی تھی۔

"ہاں بس......" اس نے توجیہہ بیان کرنی ضروری نہیں سمجھی۔ نرس بھی اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ تاجور کو چیک کیا۔ دوا دی۔ پھر اسے دیکھ کر بولی۔

"آپ کی بہن کچھ بولتی ہی نہیں۔ سارا دن چپ چاپ پڑی رہتی ہے۔"

"بولنے کے لیے بھی کوئی ہونا چاہیے۔ میں تو اس وقت بلکہ زیادہ تر تو رات میں ہی آتا ہوں۔" وہ اب کچھ سوچ کر سیدھا ہو بیٹھا تھا۔

"یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ تو اور کوئی...... میرا مطلب ہے ماں باپ' بہن بھائی' ان میں سے کوئی دن میں اس کے پاس آجایا کرے۔" نرس کو باتیں کرنے کا موقع مل گیا تھا۔

"اور کوئی یہاں نہیں ہے۔ سب دوسرے شہر میں رہتے ہیں۔"

"اوہ تو آپ اسے علاج کے لیے یہاں لائے ہیں۔"

"جی! ویسے میں پہلے سے یہیں رہتا ہوں۔ میری جاب ہے' اس لیے میں دن میں نہیں آسکتا۔"

"اچھا! اچھا ویسے فکر کی کوئی بات نہیں۔ یہ یہاں آرام سے ہے اور اب آپ نے اپنی مجبوری بتا دی ہے تو میں خیال رکھوں گی۔"

"بہت شکریہ! میں یہی کہنے والا تھا۔ آپ جب فارغ ہوا کریں تو اس کے پاس بیٹھ جایا کریں۔" اس نے فوراً لیکن سلیقے سے دل کی بات کہہ دی تو اس پر نرس نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا' پھر پوچھنے لگی۔

"ویسے اسے یہ روگ لگا کیسے؟"

"چپ رہنے سے...... میرا مطلب ہے اپنی تکلیفیں بتاتی نہیں ہے۔ بتا دیتی تو شاید یہاں تک نہ پہنچتی۔" وہ آزردگی میں گھر گیا۔

"اس کا مطلب ہے بڑی صابر بچی ہے۔" نرس نے کہا لیکن وہ کہیں اور کھویا ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

رات نصف سے زیادہ بیت چکی تھی اور وہ ابھی تک اپنی رائٹنگ ٹیبل پر بیٹھی ہوئی تھی۔ سامنے فائل کھلی پڑی تھی۔ انگلیوں میں قلم بھی دبا تھا لیکن پچھلے تین گھنٹوں سے وہ نہ کچھ پڑھ پائی تھی نہ لکھنے کی نوبت آئی تھی کیونکہ ذہن مسلسل یاسمین میں الجھ رہا تھا۔ گو کہ اس نے ہمیشہ یاسمین کی بات کا یقین کیا تھا اور ابھی بھی وہ اسے جھٹلا نہیں رہی تھی لیکن جو کچھ اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا' وہ بھی جھٹلانے والا نہیں تھا۔

شہباز ربانی کے کندھے پر سر رکھے یاسمین کا چہرہ بار بار اس کی نظروں میں گھوم رہا تھا۔ تفکرات سے عاری چہرہ جس پر چمکتی ہوئی مسکراہٹ پھیلی تھی۔

"مما اس وقت بے ہوش تھیں۔" وہ بار بار خود کو باور کرانے کی کوشش کرتی۔ آخر میں خود کو سرزنش اور ملامت بھی کرنے لگی۔

"کیا ہو گیا ہے مجھے؟ مما پر شک کر رہی ہوں۔ اف! اتنی گھٹیا سوچ ہو گئی ہے میری۔ چہ چہ۔" وہ کرسی دھکیل کر اٹھی تو سارہ کا خالی بیڈ دیکھ کر پہلے ٹھٹکی پھر ایک دم خیال آیا کہ اس نے خود ہی اسے یاسمین کے کمرے میں سونے کو کہا تھا۔ اس وقت گھڑی کی سوئیاں دو بجا رہی تھیں۔ آج اس کا بہت وقت ضائع ہوا تھا' جس پر افسوس کرتے ہوئے اس نے لائٹ آف کر دی۔

پھر صبح بہت دیر سے اس کی آنکھ کھلی تھی۔ اس کے بعد بھی کتنی دیر وہ سستی سے بستر پر پڑی رہی' پھر جب یہ خیال آیا کہ آج کالج سے بھی گئی تو وہ جھنجلا کر اٹھی۔ جلدی جلدی منہ ہاتھ دھویا۔ کمرے سے نکل کر سارہ کو پکارتے ہوئے وہ سٹنگ روم میں آئی تو صوفہ کم بیڈ پر یاسمین کو لیٹے دیکھ کر تیزی سے اس کے قریب آگئی۔

"کیسی طبیعت ہے مما؟"

"اب کچھ بہتر محسوس کر رہی ہوں بیٹا!" یاسمین نے کمزور آواز میں کہا۔

"ناشتا کیا اور دوا لی؟"

"ہاں! بیٹا ناشتا کیا ہے اور دوا بھی لی ہے۔ ابھی کمرے میں دل گھبرانے لگا تو یہاں آگئی۔ تم بہت دیر تک سوئیں؟" یاسمین نے اسے مطمئن کر کے پوچھا۔

"بس مما! آنکھ نہیں کھلی۔ تم نے بھی نہیں اٹھایا مجھے؟" اس نے سارہ کو دیکھ کر کہا تو وہ تپ کر بولی۔

"اٹھایا نہیں' جھنجھوڑا تھا۔ آخر کیا کھا کر سوئی تھیں؟"

"یہ بعد میں بتاؤں گی پہلے بوا سے کہو' چائے' ناشتا بنا دیں۔" اس نے سارہ کو مزید چڑاتے ہوئے کہا۔

"خود نہیں کہہ سکتیں۔" سارہ نے کہا اور بوا سے کہنے چلی بھی گئی تو وہ یاسمین کو دیکھ کر ہنسنے لگی۔ یاسمین کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

"یو آر سو سوئٹ مما!" اس نے جھک کر یاسمین کے گال پر پیار کرتے ہوئے گویا اپنے اندر کے کسی ملال کو کم

کرنے کی کوشش کی، پھر پوچھنے لگی۔
"شہباز انکل کہاں ہیں؟"
"اس نے کہیں گھر کی بات کی تھی، وہی دیکھنے گیا ہے، بلکہ فائنل کرنے گیا ہے۔" یاسمین بتاتے ہوئے اٹھ بیٹھی۔
"اچھا! پھر انکل کی فیملی بھی یہیں آجائے گی؟" اس نے اشتیاق سے پوچھا۔
"وہ تو یہی چاہتا ہے۔ اب پتا نہیں اس کی بیوی اور بچوں کی کیا مرضی ہے۔ اصل میں بیٹا! جنہیں باہر کی آب و ہوا راس آجائے، وہ پھر یہاں آنے پر مشکل ہی سے آمادہ ہوتے ہیں۔"
"یہ تو ہے۔" وہ سر ہلاتے ہوئے کسی سوچ میں ڈوب گئی۔
یاسمین نے چند لمحے اسے دیکھا پھر اٹھتے ہوئے بولی۔
"بیٹا! میں اپنے کمرے میں جا رہی ہوں۔"
"جی۔ جی مما! آپ آرام کریں۔" وہ چونک کر بولی اور یاسمین کو جاتے ہوئے دیکھنے لگی، پھر سارہ کے آنے پر اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔
"اور کوئی حکم؟" سارہ نے ناشتے کی ٹرے اس کے سامنے رکھ کر پوچھا۔
"نہیں بس!" وہ مسکرائی پھر ٹرے پر نظر ڈالی۔ ناشتے کے لوازمات کے ساتھ اس کا سیل فون بھی رکھا تھا۔
"واؤ۔ آج تو ناشتا سیل فون کے ساتھ ہو گا۔" وہ سیل اٹھا کر بولی۔
"بج رہا تھا اس لیے اٹھا لائی، اور سنو! صبح ڈیڈی کا فون آیا تھا۔" سارہ نے بیٹھتے ہوئے کہا۔
"اچھا! ٹھیک ہیں ڈیڈی؟ کیا کہہ رہے تھے؟" اس نے کپ میں چائے ڈالتے ہوئے سرسری انداز اختیار کیا۔
"پوچھ رہے تھے شہباز انکل چلے گئے؟" سارہ بتاتے ہوئے کچھ خائف ہو گئی تھی۔
"تم نے کیا کہا؟" وہ سابقہ انداز برقرار نہیں رکھ سکی۔
"میں نے اپنی طرف سے کہہ دیا کہ ایک دو دن میں چلے جائیں گے۔ اور کیا کہتی۔"
"ہوں!" وہ سلائس دانتوں سے کاٹ چکی تھی۔ منہ چلاتے ہوئے "ہوں" کی آواز نکالی، پھر چائے کی چسکی لے کر کہنے لگی۔ "شہباز انکل چلے ہی جائیں تو اچھا ہے۔ مما بھی ریلیکس ہو جائیں گی۔"
"میں بھی یہی چاہتی ہوں۔" سارہ نے فوراً اس کی تائید کی۔
"تم تو خیر اس لیے چاہتی ہو گی تاکہ ڈیڈی آنا شروع کر دیں۔" اس نے مسکراتے ہوئے سارہ کو دیکھا تو اس نے ایمان داری سے اعتراف کر لیا۔
"بالکل۔۔۔"
"اچھا! ایک بات بتاؤ۔" اس نے کہہ کر چائے کا آخری گھونٹ پیا، پھر پوری طرح سارہ کی طرف متوجہ ہو کر پوچھنے لگی۔ "تمہارے خیال میں ڈیڈی نے دوسری شادی کیوں کی؟ کس بات نے انہیں مجبور کیا تھا؟"
"پتا نہیں۔" سارہ نے دامن بچایا تھا۔
"نہیں، آخر تم سوچتی تو ہو گی۔" وہ سمجھ گئی تھی، سارہ جواب نہیں دینا چاہتی، پھر بھی پیچھے پڑ گئی۔
"تمہاری طرح بہرحال نہیں سوچتی۔ میرا مطلب ہے جیسے تم سارا الزام تائی امی کے سر رکھتی ہو تو مجھے نہیں لگتا کہ محض ان کے کہنے پر ڈیڈی نے دوسری شادی کر لی ہو گی۔" سارہ نے سلیقے سے بات سنبھالتے ہوئے کہا کہ کہیں وہ ہتھے سے نہ اکھڑ جائے۔
"پھر۔۔۔؟" وہ ہر صورت اپنی بات کا جواب چاہتی تھی۔

"پھر یہ کہ مجھے لگتا ہے، مما اور ڈیڈی میں انڈر اسٹینڈنگ نہیں ہو پائی اور شاید ڈیڈی ایسا لائف پارٹنر چاہتے تھے، جو ان کا خیال رکھے، انہیں سمجھے۔" سارہ سوچ سوچ کر بول رہی تھی۔ اس نے چڑ کر ٹوک دیا۔
"غلط سمجھتی ہو تم۔"
"ہاں تو میں کب کہہ رہی ہوں کہ یہی سچ ہے۔ میں نے اپنا خیال ظاہر کیا ہے، جو غلط بھی ہو سکتا ہے۔ بہرحال سچ وہی ہے، جو میں سمجھتی ہوں۔" وہ کہہ کر وہاں سے اٹھ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

اس نے سنا تھا کہ جب عورت ڈھٹائی اور بے شرمی پر اتر آئے تو پھر اس کے سامنے کوئی نہیں ٹھہر سکتا خصوصاً عزت دار آدمی تو کبھی بھی نہیں۔ وہ اندھا، بہرا، گونگا بن جاتا ہے جیسے ساجدہ بیگم اور توصیف احمد بن گئے تھے۔ جس پر وہ تلملایا ہوا تھا کیونکہ یہ صرف توصیف احمد کے گھر کا معاملہ نہیں تھا۔ اس گھر میں اس کی ہونے والی بیوی رہتی تھی، جس کی عزت و ناموس پر وہ کوئی حرف برداشت نہیں کر سکتا تھا، اس لیے ساجدہ بیگم کے منع کرنے کے باوجود وہ اریبہ کے پاس چلا آیا تھا۔ اس کے خیال میں وہ اس وقت اکیڈمی جانے کے لیے تیار ہو گی، لیکن وہ سہ پہر کی ہلکی سنہری دھوپ میں گھٹنوں پر ڈائری رکھے کچھ لکھنے میں مصروف تھی۔
"ہیلو!" اس نے قریب پہنچ کر اسے متوجہ کیا تو وہ قلم روک کر اسے دیکھنے لگی۔ بولی کچھ نہیں۔
"اچھا ہوا! تم گھر پر مل گئیں۔" وہ اس کے سامنے کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا، پھر ادھر ادھر دیکھ کر پوچھنے لگا۔ "باقی سب کہاں ہیں؟"
"تم کیسے آئے؟" وہ اس کا سوال یکسر نظر انداز کر گئی۔
"میرے آنے کی دو وجوہ ہیں۔ ایک تو یاسمین آنٹی کی عیادت، دوسرے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔" وہ بتا کر فوراً پوچھنے لگا۔ "اب کیسی طبیعت ہے یاسمین آنٹی کی؟"
"تمہیں کس نے بتایا؟ آئی مین مما کے بارے میں۔" وہ اس کی بات کا جواب ہی نہیں دے رہی تھی۔
"کل سارہ کا فون آیا تھا۔ بہت پریشان ہو رہی تھی۔ میں اسی وقت آرہا تھا، لیکن راستے میں گاڑی خراب ہو گئی۔ ویسے کل دن میں تو میں نے یاسمین آنٹی کو دیکھا تھا۔" اس نے غلط بیانی پر غلط بیانی کی۔
"کہاں دیکھا تھا؟" اریبہ کا دل یکبارگی زور سے دھڑکا تھا۔
"کوئی آیا ہوا ہے تمہارے ہاں؟" وہ بھی اسی کی طرح اس کا سوال نظر انداز کر گیا۔
"ہاں! شہباز انکل ہیں۔ مما کے کزن۔" وہ بے نیازی دکھانے کی کوشش میں ڈائری کے صفحے الٹنے لگی۔
"شہباز انکل۔" اس نے فوراً سوچنے کا انداز اختیار کیا، پھر کندھے اچکا کر بولا۔ "شاید میں نہیں جانتا۔"
"جاننا چاہتے ہو تو اندر چلے جاؤ۔ سارہ تمہیں ان کا پورا بائیو ڈیٹا بتا دے گی۔" اریبہ کا مقصد یقیناً اسے وہاں سے اٹھانا تھا۔ وہ سمجھ کر فوراً بولا۔
"سارہ کیوں؟ تم بتا دو۔"
"میں فالتو باتوں میں اپنا وقت ضائع نہیں کرتی۔" وہ کہتے ہوئے اٹھ کر جانے لگی تھی کہ رازی نے ایکدم اس کی کلائی گرفت میں لے لی۔
"گویا تم اعتراف کر رہی ہو کہ یہاں کوئی فالتو مہمان آیا ہوا ہے؟"
"رازی!" وہ اس کا ہاتھ جھٹک کر چیخی۔ "میری نظر میں سب سے فالتو تم ہو جو اپنا گھر چھوڑ کر دوسروں کے گھریلو معاملات میں انٹرفیئر کرنا اپنا حق سمجھتا ہے۔"

"حق رکھتا ہوں تو سمجھتا ہوں۔ تمہارے تسلیم نہ کرنے سے میری حیثیت کم نہیں ہو جائے گی اور تم کیا سمجھتی ہو آؤٹ آف کنٹرول ہو کر دوسرے کو زچ کر دو گی؟ چیختے چلاتے وہی ہیں جن میں سچ سننے کا حوصلہ نہیں ہوتا۔ ویسے تو بڑی طرم خاں بنتی ہو۔" غصے میں اس کی آواز بھی اونچی ہو گئی تھی۔ جس پر اریبہ نے گھبرا کر اندر کی طرف دیکھا، پھر اسے دیکھتے ہوئے دانت پیس کر بولی تھی۔

"دیکھو! ابھی گھر میں مہمان موجود ہے۔ تم چلے جاؤ۔"

"کیوں چلا جاؤں؟ مہمان سے ملنے ہی تو آیا ہوں۔ چلو! مجھے ملواؤ اس سے۔" وہ اس کی کمزوری بھانپ کر مزید اکڑ گیا تھا۔

"اس سے؟ تمہارے برابر کے نہیں ہیں وہ جو اس طرح بات کر رہے ہو۔ پہلے تمیز سیکھ کر آؤ، پھر ان سے ملنے کی بات کرنا۔" وہ اپنی بات کہہ کر رکی نہیں۔ تیز قدموں سے اندر چلی گئی تھی۔

اجلال رازی فوراً اس کے پیچھے نہیں لپکا۔ کچھ دیر وہیں رک کر سوچا، پھر یاسمین کے کمرے میں جانا چاہتا تھا کہ لیونگ روم سے باتوں کی آواز سن کر اس طرف آگیا۔ شہباز ربانی کے ساتھ سارہ اور حماد بیٹھے تھے۔

"السلام علیکم!" اس نے توجہ حاصل کرنے کے لیے سلام کیا تو سارہ اور حماد بے اختیار اسے دیکھ کر بولے۔

"رازی بھائی!"

"آیئے رازی بھائی!" سارہ اٹھ کھڑی ہوئی، پھر شہباز ربانی سے بولی۔ "انکل! یہ ہمارے رازی بھائی ہیں۔ تایا ابو کے بیٹے۔"

"آہا رازی! بھئی، بہت ذکر سنا ہے تمہارا۔ کیسے ہو؟" شہباز ربانی نے انتہائی خوش دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ذرا سا اونچا ہو کر اس کی طرف ہاتھ بڑھایا جسے اس نے بس چھونے پر اکتفا کیا اور پھر جتاتے ہوئے لہجے میں بولا۔

"ذکر تو میں نے بھی آپ کا بہت سنا ہے۔"

"اچھا۔" شہباز ربانی اپنا سابقہ انداز برقرار نہیں رکھ سکے۔ سمجھ گئے ان کے سامنے اریبہ نہیں ہے، جو آسانی سے بے وقوف بن جاتی ہے۔

"آپ نے کس سے سنا ہے رازی بھائی؟" سارہ اپنے انداز میں پوچھ رہی تھی، وہ قصداً ان سنی کر کے کہنے لگا۔

"میں آنٹی کے لیے آیا تھا، اب کیسی طبیعت ہے ان کی؟"

"جی! مما کچھ بہتر ہیں۔"

"چلو! پہلے میں ان سے مل لوں۔"

"لیکن وہ تو سو رہی ہیں، کہیں تو اٹھا دوں؟" سارہ نے بتانے کے ساتھ پوچھا تھا۔ وہ جو قدم بڑھا چکا تھا، رک گیا۔

"نہیں نہیں، اٹھاؤ مت۔ مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔ ان کے اٹھنے تک بیٹھ سکتا ہوں۔ بیٹھنے کا مطلب پتا ہے نا؟"

"جی! اچھی سی چائے۔" سارہ فوراً سمجھ کر بولی تھی۔

"گڈ۔" وہ مسکراتے ہوئے حماد کے ساتھ بیٹھا تو شہباز ربانی اٹھ کھڑے ہوئے۔

"اچھا بچو! آپ لوگ انجوائے کرو۔ مجھے ایک کام سے جانا ہے۔" اس نے کوئی توجہ نہیں دی۔ حماد سے اس کا حال احوال پوچھنے لگا۔

پھر وہ یاسمین سے ملنے کے بعد ہی گھر آیا تھا۔

☼ ☼ ☼

یاسمین سست قدموں سے چلتے ہوئے لاؤنج میں آئی تو سارہ اسے دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"مما! کوئی کام تھا تو مجھے بلا لیتیں۔"

"ہاں یاسمین! تمہیں آرام کرنا چاہیے۔" شہباز ربانی نے اسے تنبیہہ کی۔

"آرام ہی تو کر رہی ہوں۔" یاسمین قریبی صوفے پر بیٹھ گئی، پھر سارہ سے بولی۔ "بیٹا مجھے جوس بنا دو، ایپل جوس۔"

"جی مما! ابھی بنا دیتی ہوں۔" سارہ فوراً چلی گئی تو یاسمین نے صوفے کی پشت پر سر رکھتے ہوئے شہباز ربانی کو دیکھا۔ وہ مسکرا رہے تھے۔

"تم نے تو کمال کر دیا یاسمین! ورنہ میں تو ڈر ہی گیا تھا۔"

"ڈر تو خیر میں بھی اس وقت گئی تھی، جب تم نے بتایا کہ اریبہ ہمیں دیکھ رہی ہے اور اگر وہ اسی وقت ہمیں مخاطب کر لیتی تو شاید میں اس سچویشن کو سنبھال نہ پاتی۔ وہ تو اچھا ہوا، ہماری گاڑی آگے نکل گئی اور گھر آنے تک مجھے سوچنے کا موقع مل گیا۔"

"ورنہ تو ہم پھنس گئے تھے۔ جوانی میں تو پکڑے نہیں گئے۔ اب اس عمر میں کیا تماشا بنتا۔" شہباز ربانی اپنی بات پر محظوظ ہو کر ہنسے، پھر کہنے لگے۔ "ویسے یاسمین تمہاری بیٹی واقعی بہت بے وقوف ہے۔ فوراً تمہارا اعتبار کر لیا۔"

"ہوں۔" یاسمین کسی خیال میں کھو گئی۔

"اچھا سنو! کب تک یہ ناٹک کرنے کا ارادہ ہے؟" شہباز ربانی نے اسے متوجہ کر کے پوچھا تو یاسمین نے گہری سانس کھینچ کر دروازے کی طرف دیکھا، پھر کہنے لگی۔

"میں خود اکتا گئی ہوں خود کو بیمار پوز کر کے، لیکن احتیاط تو کرنی پڑے گی۔ میرا خیال ہے، جب تک تم یہاں ہو، مجھے اسی طرح رہنا چاہیے۔"

"میں ایک، دو دن میں اپنے گھر شفٹ ہو جاؤں گا۔ اور یہ خبر تم اپنے میاں تک پہنچا دینا، تاکہ وہ مطمئن ہو جائے۔" شہباز ربانی پھر ہنسے۔

یاسمین نے کچھ کہنا چاہا، لیکن سارہ کو آتے دیکھ کر خاموش ہو گئی۔ شہباز ربانی نے بھی ہونٹ بھینچ لیے تھے۔ سارہ نے ٹرے ٹیبل پر رکھ کر ایک گلاس یاسمین کو تھمایا، دوسرا شہباز ربانی کی طرف بڑھایا تو وہ کہنے لگے۔ "بیٹا! اس کی ضرورت تمہاری ماں کو ہے، میں تو پہلے ہی ہٹا کٹا ہوں۔"

"ایک گلاس سے کچھ خاص فرق نہیں پڑے گا انکل!" سارہ نے کہتے ہوئے گلاس ان کے سامنے رکھ دیا، پھر یاسمین سے پوچھنے لگی۔

"مما! دوپہر کے کھانے میں آپ کیا لیں گی؟"

"کچھ ہلکا پھلکا۔" یاسمین نے اسی قدر کہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے سارہ کو اشارہ کیا تو وہ تیز قدموں سے لابی میں چلی گئی۔

"لو نا شہباز!" یاسمین نے شہباز ربانی کے سامنے رکھے گلاس کی طرف اشارہ کیا، پھر خود بھی گھونٹ گھونٹ پینے لگی۔ کچھ دیر بعد سارہ واپس آکر بولی۔

"ڈیڈی کا فون تھا۔"

"آ رہے ہیں کیا؟" یاسمین نے بے اختیار پوچھا۔

"نہیں کہہ رہے تھے نیکسٹ ویک اینڈ پر آئیں گے۔ آج انہوں نے ہمیں بلایا ہے، مجھے اور اریبہ کو۔" سارہ بتا کر پھر خود ہی کہنے لگی۔

"لیکن مما! ہم دونوں کیسے جاسکتی ہیں؟ آپ کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے۔"

"میری فکر مت کرو بیٹا! تم دونوں بہنیں چلی جانا ورنہ تمہارے ڈیڈی مجھے الزام دیں گے کہ میں منع کرتی ہوں۔" یاسمین نے شہباز ربانی کا خیال نہیں کیا جس پر سارہ جزبز ہوتے ہوئے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

"تمہاری یہ بیٹی لگتا ہے باپ سے زیادہ مانوس ہے۔" شہباز ربانی نے کہا تو یاسمین اثبات میں سرہلاتے ہوئے بولی۔

"ہاں! بہت برا لگتا ہے اسے اگر اس کے باپ کو کچھ کہا جائے تو۔"

"تمہارے خیال میں کیوں بلایا ہوگا توصیف نے بیٹیوں کو؟"

شہباز ربانی نے اچانک پوچھا تو یاسمین سوچ میں پڑ گئی جبکہ دل میں اندیشے گھر کرنے لگے تھے۔

☼ ☼ ☼

اس کے پاس تاباں کا روتا ہوا فون آیا تھا۔ اسے آنے پر بہت واسطے دیے تھے۔ اپنی اس کی محبت کے اور آخر میں جان سے گزر جانے کی دھمکی بھی۔ یہ نہیں تھا کہ وہ بے حس ہوگیا تھا۔ خود اس کے لیے تاباں سے جدائی کا خیال ہی سوہان روح تھا لیکن وہی بات کہ وہ ہمیشہ سے ایمان دار اور پریکٹیکل تھا۔ محنت اور کوشش پر یقین رکھتا تھا اور فیصلہ اللہ پر چھوڑتا تھا۔ صرف چھوڑتا ہی نہیں تعظیم بھی کرتا تھا۔ کبھی کسی بات کو اس نے زبردستی اپنے حق میں کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ جہاں بات تقدیر کی آتی وہ سرنگوں ہو جاتا۔ یقیناً" کم عمری کی ٹھوکروں نے ہی اسے یہ سبق پڑھایا تھا۔ بہرحال تاباں سے محبت کے باوجود جب اس نے دیکھا کہ اس کے اور تاباں کے درمیان تقدیر حائل ہوگئی ہے تو اس نے تاباں کے حصول کا خیال چھوڑ دیا تھا۔ جبکہ دل میں وہ براجمان تھی اسے دل سے نکالنے پر یا اس کی محبت سے دستبردار ہونے پر اسے اختیار نہیں تھا جب ہی اس کے رونے پر وہ تڑپا۔ وہ جان دینے کی دھمکی سے بھی بہت پریشان تھا۔ اور اسی روز اس نے تاجور سے مصلحتاً" غلط بیانی کی کہ وہ آفیشل کام سے شہر سے باہر جارہا ہے اور گاؤں چلا آیا۔

"تاج کدھر ہے؟" ابا نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔

"وہ اسپتال میں داخل ہے۔" اس نے سیدھے سادے انداز میں جواب دیا تھا۔

"کیلی... تو اسے وہاں اکیلا چھوڑ آیا ہے؟" ابا بھڑک اٹھے تو اسے بھی غصہ آگیا۔

"تو یہاں کون دیکھ بھال کرنے والا ہے اس کا؟ اکیلا تو آپ نے اسے یہاں بھی چھوڑ رکھا تھا۔ خوامخواہ کی بات کرتے ہیں۔"

"میں خوامخواہ کی بات کرتا ہوں تجھے احساس ہے جوان لڑکی ہے۔"

"بس کریں ابا! مجھے اس کے لیے جو ٹھیک لگے گا وہی کروں گا۔ آپ اگر اس کی خیر خیریت نہیں پوچھ سکتے تو الٹی سیدھی باتیں بھی مت کریں۔" اس نے کہا تو ابا کو جیسے کچھ احساس ہوا تھا۔ پوچھنے لگے۔

"کیا تکلیف ہے اسے جو اسپتال پڑی ہے؟ یہاں تو بھلی چنگی تھی۔" ان کی دوسری بات پر وہ پھر سلگ گیا۔

"سارے روگ یہیں سے لگے ہیں اسے۔ ٹی بی ہوگئی ہے خون تھوکتی ہے۔"

"خون تھوکتی ہے۔" ابا اپنے آپ بول کر خاموش ہوگئے پھر کتنی دیر بعد پوچھا تھا۔

"ٹھیک ہو جائے گی؟"

"ان شاءاللہ۔"

"تو ادھر کسی کام سے آیا ہے؟" ابا کا دھیان اب غالباً" تاجور کی طرف تھا۔

"ہوں..." وہ اثبات میں سرہلاتے ہوئے سوچ میں پڑ گیا کہ ابا سے کہے یا نہ کہے۔

"کیا بات ہے بتاتا کیوں نہیں۔" ابا نے ٹوکا تب وہ اپنے آپ میں الجھ کر بولا۔

"ابا! وہ تاباں... تاباں کے ابا کو سمجھائیں ناں۔"

"لے وہ کوئی چھوٹا کاکا ہے جو میں اسے سمجھاؤں؟ تو اپنے آپ کو سمجھا۔ وہ نہیں ماننے کا میں نے سنا ہے اپنی ہی برادری میں رشتہ مل رہا ہے اسے 'ادلے بدلے' میں۔ ادھر وہ بھی رنڈوا ہے۔" ابا نے بتایا تو وہ ناسمجھی سے بولا۔

"کون کون رنڈوا ہے؟"

"جس سے وہ تاباں کو بیاہے گا۔"

"میرے خدا!..." اس کے بوجھل دل پر مزید بوجھ آن پڑا۔

"تو چھوڑ دے تاباں کا خیال ادھر شہر میں ہی کوئی لڑکی دیکھ پر ابھی تجھے شادی کی کیا جلدی ہے۔ پہلے بہن کا علاج تو کرالے۔" ابا جانے کیا کیا بولے جارہے تھے وہ کچھ نہیں سن رہا تھا۔ پھر انہیں یونہی بولتا چھوڑ کر گھر سے نکل آیا۔

اس کا رخ نہر والے باغ کی طرف تھا اور یہ پہلا موقع تھا کہ اس کے قدم رک رک کر اٹھ رہے تھے۔ شاید زندگی ہارنے کا خوف تھا۔ دل چاہ رہا تھا یہ راستہ کبھی ختم نہ ہو وہ یونہی چلتا چلا جائے یا پھر راستے میں ہی کہیں کھو جائے۔ لیکن کچھ بھی نہیں ہوا اور وہ سامنے آگئی۔ ہمیشہ کی شوخ چنچل کیسی اجاڑ ویران کھڑی تھی۔

"میں تمہارے ساتھ جاؤں گی شمشیر! بس میں نے سوچ لیا ہے۔" تاباں بے اختیار اس کے سینے سے لگ کر رونے لگی تھی۔

"بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔" اس نے یکدم اپنی بے اختیاریوں کو لگام ڈالی تھی۔ "میں اس لیے نہیں آیا۔ میں تمہیں سمجھانے آیا ہوں۔"

"مت سمجھاؤ مجھے میں کچھ نہیں سمجھوں گی۔ مجھے بس تمہارا ساتھ چاہیے۔ ابا نہیں مانتا نہ مانے۔ تم تو مان جاؤ۔ مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔ میں تمہاری بہت خدمت کروں گی۔" وہ بری طرح بکھر رہی تھی۔

"تاباں! خدا کے لیے مجھے کمزور مت کرو۔ میں کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہتا جو بعد میں میرے لیے پچھتاوا بن جائے۔"

"پچھتاوا... مجھ سے شادی کرکے تم پچھتاؤ گے؟" تاباں جھٹکے سے اس سے الگ ہوئی۔

"پاگل ہو تم میرا یہ مطلب نہیں ہے۔" وہ جھنجلایا۔

"پھر کیا مطلب ہے۔ بتاؤ۔"

"دیکھو جو کام جائز طریقے سے نہ ہو اس کا انجام اچھا نہیں ہوتا۔ لے جانے کو میں تمہیں اپنے ساتھ لے جا سکتا ہوں لیکن اس سے بڑی جگ ہنسائی ہوگی۔ ہم تو آرام سے رہ لیں گے لیکن ہمارے گھر والے... میرا باپ، تمہارا باپ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔ ذرا سوچو! تمہارا ابا جس راستے سے گزرے گا لوگ اس پر انگلیاں اٹھائیں گے۔ آوازے کسیں گے۔ کیا تمہیں یہ منظور ہے۔" تاباں خائف نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

"میں تمہیں حقیقت بتا رہا ہوں تاباں! اس سے یہ مت سمجھنا کہ میں تم سے دامن چھڑا رہا ہوں۔ تم سے زیادہ خود مجھے اپنے آپ کو سمجھانا بہت مشکل ہو رہا ہے لیکن میں کیا کروں۔ میں تقدیر سے نہیں لڑ سکتا۔ تم بھی مت

لڑو کیونکہ تقدیر لکھنے والا بڑا زور آور ہے۔ ہم اگر ابھی اس کے فیصلے پر سر جھکا دیں گے تو وہ ہمارے لیے امان لکھ دے گا' نہیں تو خواری ہی خواری ہوگی۔" وہ ٹوٹے لہجے میں بولتا چلا گیا۔

"مجھے تمہاری باتیں سمجھ نہیں آرہیں۔" تاباں الجھی ہوئی تھی۔

"وقت' وقت سمجھائے گا تمہیں۔ ابھی تم مجھ سے ایک وعدہ کرو' خود کو کوئی نقصان نہیں پہنچاؤ گی۔" اسے اصل میں یہی خدشہ تھا' جو وہ بھاگا چلا آیا تھا۔

"اور جو تم نقصان پہنچا رہے ہو۔" تاباں کے لہجے میں ٹوٹے کانچ کی چبھن تھی۔ "پتا ہے میں بچپن سے ایک ہی خواب دیکھتی آرہی ہوں کہ میں تمہاری دلہن بنوں گی۔ باقی سارے خواب اس کے ساتھ جڑے ہیں۔ کون قبولے گا مجھے ان خوابوں کے ساتھ بتاؤ۔ یہ سب تو تمہاری امانت ہیں۔"

"تو لوٹا دو مجھے' نہیں سنبھال سکتیں تو میرے حوالے سے جتنے خواب سجائے سب لوٹا دو مجھے۔" وہ کٹھور بن گیا تھا۔

"بہت ظالم ہو شمشیر علی! بہت ظالم ہو۔ مرد ہو ناں جینے کا آخری سہارا بھی چھین لینا چاہتے ہو۔ نہیں میں نہیں دوں گی۔ میں اپنے خواب نہیں دوں گی۔ جاؤ چلے جاؤ' تاباں تمہارے لیے مرگئی۔" وہ اپنی چیخوں کا گلا گھونٹتی بھاگتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ شمشیر علی کی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

☼ ☼ ☼

ڈاکٹر غضنفر نے اسے ٹی بی کے مریض کی کیس ہسٹری تیار کرنے کو کہا تھا اور ایسے مریض کی تلاش میں وہ ایک ایک کمرا جا کر دیکھ آئی تھی۔ آخر میں جنرل وارڈ کا رخ کیا تو پہلی نظر میں اسے مایوسی ہوئی۔ زیادہ مریض فریکچر والے تھے۔ وہ ہر بیڈ کے قریب چند لمحے رکی' پھر آگے بڑھ گئی۔ آخری بیڈ تک آتے آتے اس کی ٹانگیں شل ہو گئی تھیں وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی' تب ہی بیڈ پر لیٹی لڑکی پر نظر پڑی تو وہ بلا ارادہ اسے دیکھے گئی۔ سولہ سترہ سال کی خوب صورت لڑکی تھی لیکن بیماری کے باعث اس کا چہرہ مرجھایا ہوا اور بڑی بڑی آنکھیں بے رونق تھیں۔ وہ بالکل لاشعوری طور پر اس کا جائزہ لے رہی تھی کیونکہ اصل میں تو وہ ستانے بیٹھی تھی۔ پھر جب اٹھی تو اس کا ذہن جیسے یکلخت بیدار ہوا تھا۔ چند لمحے رک کر پورے دھیان سے اس لڑکی کو دیکھا' پھر بیڈ کے قریب آکر اسے متوجہ کیا۔

"ہیلو....." لڑکی چھت سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھنے لگی تو اس نے مسکرا کر پوچھا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟"

"تاج....." لڑکی کی آواز اتنی آہستہ تھی کہ وہ سن ہی نہیں سکی اور غیر ارادی طور پر جھک کر بولی۔

"کیا.....؟"

"تاجور....." اب لڑکی نے پورا نام بتایا۔

"اچھا تاجور' تم یہاں کب سے ایڈمٹ ہو؟"

"دو مہینے سے۔"

"دو مہینے سے' کیا تکلیف ہے تمہیں؟" اس نے پوچھنے کے ساتھ اسٹیتھ سکوپ لگا کر اسے چیک کرنا شروع کیا تو اچانک تاجور کو کھانسی کا ایسا دورہ پڑا کہ وہ بے حال ہوگئی۔ اریبہ کبھی اس کا سینہ سہلاتی' کبھی پیٹھ' پھر جلدی سے گلاس میں پانی ڈال کر اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔

ایک گھونٹ لے کر ہی تاجور نے اپنا سر تکیے پر رکھ دیا۔ وہ ہانپ رہی تھی۔ اریبہ نے اس کے پرسکون ہونے کا

انتظار کیا' پھر پہلے اس کی چارٹ شیٹ اٹھا کر دیکھی' جس سے اسے اندازہ ہوگیا کہ یہ اس کی مطلوبہ مریضہ ہے لیکن یہ کوئی خوشی کی بات نہیں تھی۔ وہ حیرت اور دکھ سے اس کم عمر لڑکی کو دیکھے گئی' جس کی ویران آنکھیں چھت پر جمی تھیں۔ وہ احتیاط سے اس کے قریب بیٹھی اور اس کا ہاتھ چھو کر پوچھنے لگی۔

"سنو! یہاں تمہارے ساتھ کون ہے؟" تاجور نے آہستہ سے نفی میں سر ہلایا غالباً" اس ڈر سے کہ کہیں پھر نہ کھانسی شروع ہو جائے اور اس نے سمجھ کر خود کو مزید سوالات سے روک لیا اور دوبارہ آنے کا سوچ کر وہاں سے چلی آئی۔ کوریڈور میں عروسہ' مہک اور جمال اسی کے انتظار میں کھڑے تھے۔ وہ قریب پہنچی تو عروسہ پوچھنے لگی۔

"ہو گیا تمہارا کام؟"

"نہیں' آدھا ہوا ہے۔ میرا مطلب ہے مریضہ تو مل گئی ہے' باقی کیس ہسٹری اس کی زبانی کچھ سننے کے بعد ہی تیار کروں گی۔"

"ابھی اس نے کچھ نہیں بتایا؟" جمال نے قدم آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں' ابھی وہ بولنے کے قابل نہیں تھی۔ اس لیے میں نے کچھ نہیں پوچھا۔ خیر' یہ کام تو ہو ہی جائے گا لیکن مجھے اس لڑکی پر افسوس ہو رہا ہے بلکہ دکھ۔ کم عمر لڑکی ہے۔ پتا نہیں کیسے....."

"اوکے یار' میں تو چلا....." جمال اپنی بائیک کی طرف بڑھ گیا۔ تو وہ تینوں اکیڈمی میں ملنے کا کہہ کر اپنی اپنی گاڑیوں کی طرف بڑھ گئیں۔

آج موسم خاصا سرد تھا۔ سورج نے صبح بس تھوڑی دیر کو ہی اپنی جھلک دکھائی تھی' اس کے بعد جانے کہاں غائب ہو گیا تھا کہ دوپہر میں شام کا گمان ہو رہا تھا' لیکن اسے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ یعنی موسم کے تیور اس کی راہ میں حائل نہیں ہوتے تھے کیونکہ وہ اپنی پڑھائی کے معاملے میں بہت سنجیدہ اور ذمہ دار تھی۔ بہرحال جب وہ گھر آئی تو یاسمین لاؤنج میں اکیلی بیٹھی تھی۔

"السلام علیکم مما! سارہ اور حماد کہاں ہیں؟" اس نے کھڑے کھڑے پوچھا۔

"سارہ کمرے میں ہے اور حماد کا فون آیا تھا کالج سے' اپنے ڈیڈی کے پاس چلا گیا ہے اور ہاں! شہباز بھی اپنے گھر شفٹ ہو گئے ہیں۔" یاسمین نے بتایا تو وہ بے ساختہ بولی تھی۔

"کب؟"

"آج صبح ہی۔ اچھا ہے بیٹا! میں بھی ریلیکس ہو گئی ہوں۔ تمہارے ڈیڈی کو پسند نہیں تھا ناں ان کا یہاں رہنا۔" یاسمین نے جتاتے ہوئے کہا۔

"چلیں' آپ کو ٹھیک لگ رہا ہے تو ٹھیک ہی ہے۔" وہ بات ختم کرکے اپنے کمرے کی طرف بڑھی تھی کہ یاسمین نے پوچھا۔

"کھانا لگاؤں بیٹا!"

"نہیں مما! مجھے بھوک نہیں ہے۔"

"کیا ہو گیا ہے تم لوگوں کو۔ سارہ بھی یہی کہہ رہی ہے۔"

"شاید موسم کا اثر ہے۔" وہ کہہ کر اپنے کمرے میں آگئی۔ سارہ لحاف میں گھسی کوئی کتاب پڑھنے میں مصروف تھی۔ اسے دیکھتے ہی پوچھنے لگی۔

"باہر سردی زیادہ ہے کیا؟"

"پتا نہیں' میں نے غور نہیں کیا۔" وہ اپنی دھن میں بولی۔ سارہ چڑ گئی۔

"یہ غور کرنے کی نہیں' محسوس کرنے کی بات ہے۔"

"اچھا پھر سمجھو میں بے حس ہو گئی ہوں۔" اس نے بظاہر سنجیدگی سے کہا اور اس کی توقع کے مطابق جواب آیا تھا۔

"وہ تو خیر تم شروع سے ہو۔"

"اچھا اب مہربانی کرو مجھے سونے دو اور پانچ ساڑھے پانچ بجے اٹھا بھی دینا۔" اس نے کہتے ہی سر تک کمبل اوڑھ لیا تھا۔

☼ ☼ ☼

جب موسم اپنے اندر ڈھیر ساری رعنائیاں سمیٹ لاتا تھا تب اس روٹھی لڑکی کا خیال اسے کچھ اور کرنے ہی نہیں دیتا تھا۔ وہ اس سے ملنے کو بے چین ہو جاتا۔ ابھی بھی وہ سب کام چھوڑ کر اس کے پاس جانا چاہتا تھا۔ حالانکہ یہ امید بھی نہیں تھی کہ وہ اسے خوش آمدید کہے گی پھر بھی وہ کتنے ضروری کام اگلے دن پر ڈال کر آفس سے نکل آیا تھا۔ فضا میں رچی خنکی نے ماحول پر عجیب فسوں طاری کر دیا تھا۔ اسے یاد آیا ایسے موسم میں وہ چلغوزوں کی فرمائش کرتی تھی۔ گئے دنوں کی کوئی خوب صورت بات یاد آنے پر اس کے ہونٹ مسکرانے لگے اور دل میں امنگیں سی جاگ اٹھیں۔ پھر پہلے اس نے چلغوزے خریدے پھر توصیف ولا میں قدم رکھا تو اس کا استقبال سناٹوں نے کیا۔ اسے پہلا خیال یہی آیا کہ سردی کے باعث سب اپنے کمروں میں لحافوں میں دبکے ہوں گے لیکن پھر پورچ کی طرف نظر اٹھی تو نہ گاڑی تھی نہ اس کی بائیک۔ وہ خاصا بددل ہو کر وہیں لان میں بیٹھ گیا اور شاید وہیں سے واپس لوٹ جاتا کہ بوا نے پکار لیا۔

"ارے میاں! وہاں کیوں بیٹھے ہو۔ اندر آؤ۔" وہ نا چاہتے ہوئے بھی اندر آگیا۔

"سب لوگ کہاں ہیں؟" اس نے چلغوزوں کا لفافہ بوا کو تھماتے ہوئے پوچھا۔

"سب لوگ تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے بڑا لمبا چوڑا کنبہ ہو۔ میاں! گنتی کے چار افراد ہیں۔ مجھے ملا لو تو پانچ۔" بوا غالباً باتیں کرنے کے موڈ میں تھیں لیکن اس کا بالکل دل نہیں چاہ رہا تھا۔

"چلیں تو آپ چار افراد کے بارے میں بتا دیں۔"

"ہاں اریبہ تو اس وقت اکیڈمی جاتی ہے وہیں گئی ہو گی۔ حماد کو کرکٹ کا شوق ہے اور یاسمین کو سیر سپاٹوں کا۔ رہ گئی سارہ تو وہ اپنے کمرے میں ہو گی۔ تم وہیں چلے جاؤ میں چائے بناتی ہوں۔ ساتھ میں کچھ کھاؤ گے؟"

بوا سب کا بتا کر پوچھ رہی تھیں لیکن اس کا ذہن کہیں اور تھا جب ہی جواب نہیں دے سکا۔

"ٹھیک ہے کباب تل دیتی ہوں۔ لیکن تھوڑا وقت لگے گا۔ قیمہ پیسنا ہے۔ خیر تم کوئی مہمان تھوڑی ہو۔ آرام سے بیٹھو۔" بوا کہہ کر کچن کی طرف بڑھیں تب وہ چونک کر بولا۔

"بوا! رہنے دیں میں چلتا ہوں۔"

"ہائیں ایسے کیسے چلتا ہوں۔ سردی میں آرہے ہو۔ چائے پی کر جانا۔ ابھی سارہ بھی چائے چائے کرتی آجائے گی جاؤ، دیکھو کیا کر رہی ہے وہ۔"

بوا اس کا کوئی عذر سننے کے لیے رکی نہیں چلی گئیں تو وہ ناچار سارہ اور اریبہ کے مشترکہ کمرے میں آگیا۔ جانے کس سوچ میں تھا کہ دستک دینا ہی بھول گیا۔ واپس پلٹنا چاہتا تھا کہ سارہ کو دیکھ کر رک گیا۔ وہ بہت مگن کھڑی تھی۔ اسے اچانک شرارت سوجھی عقب سے دبے پاؤں قریب جا کر پکار لیا۔

"سارہ!"

سارہ یوں اچھلی کہ توازن قائم نہ رکھ سکی۔ گرنے کو تھی کہ اس نے فوراً اسے بازوؤں میں تھام لیا۔

"رازی بھائی...!" سارہ سہمی ہوئی رو دینے کو ہو گئی۔

"اتنا سا دل ہے تمہارا..." جلال رازی کو اپنی آواز کہیں دور سے آتی لگی تھی۔

☼ ☼ ☼

ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی تھی۔ عروسہ جو اس کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ جمال کے ساتھ سر کھپاتی اریبہ کو جھنجھوڑ ڈالا۔

"بس کرو اریبہ! بارش ہو گئی تو گھر جانا مشکل ہو جائے گا۔"

"تمہیں کیا مشکل ہو گی۔ تمہارے پاس تو گاڑی ہے۔" اس نے اطمینان سے کہا تو عروسہ دانت پیس کر بولی۔

"میں تمہارے لیے کہہ رہی ہوں۔ بارش میں بائیک چلانا انتہائی خطرناک ہوتا ہے۔ کیوں جمال؟"

"بالکل۔" جمال فوراً تاکید کر کے اریبہ کو سمجھانے لگا۔ "ابھی بھی بہت احتیاط سے چلانا۔ گیلی روڈ پر بائیک سلپ ہو جاتی ہے۔"

"ہائے نہیں۔ اریبہ! تم میرے ساتھ گاڑی میں چلو۔" عروسہ نے کسی خوفناک تصور سے سہم کر اسے آفر کی تو وہ جھنجھلا گئی۔

"کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ پڑھنے کا موڈ نہیں ہے تو صاف کہو خوامخواہ الٹی سیدھی باتیں سوچ کر دماغ خراب کر رہی ہو۔"

"ہاں نہیں ہے موڈ۔ بس چلو۔" عروسہ اٹھ کھڑی ہوئی تو وہ مہک اور جمال کو دیکھنے لگی۔

"چلتے ہیں یار...!" مہک نے کہا تو اس کا موڈ آف ہو گیا۔ اپنی چیزیں اٹھا کر ان تینوں سے پہلے باہر نکل آئی اور بائیک اسٹارٹ کر رہی تھی کہ جمال سر پر پہنچ گیا۔

"دیکھو احتیاط سے بارش....."

"دکھا نہیں جائے گی بارش۔" اس نے کہہ کر بائیک بھگا دی۔ لیکن ابھی اسے مرنے کا شوق نہیں تھا، جب ہی موڑ مڑتے ہی احتیاط کا دامن تھام لیا۔ ہلکی رفتار کے ساتھ اب وہ موسم انجوائے کرنا چاہتی تھی لیکن بارش تیز ہو گئی۔ سردی کی بارش تھی۔ وہ اب پریشان ہو کر جائے پناہ ڈھونڈنے لگی کہ قریب سے گزرتی گاڑی میں نوجوانوں کی ٹولی نے اسے دیکھ کر سیٹیاں بجانا شروع کر دیں۔ ایک شیشے سے سر نکال کر بولا۔

"ہائے بے بی! یہاں آجاؤ ہمارے پاس۔"

"نان سینس!" اس نے دانت پیسے اور بائیک رہائشی علاقے کی طرف موڑ دی تب اچانک خیال آیا کہ شہباز ربانی کا بنگلہ اسی طرف ہے۔ ابھی دو دن پہلے شہباز ربانی نے خود اسے ایڈریس سمجھایا تھا۔ تب اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ یہاں آئے گی۔ بہرحال وہ آرام سے پہنچ گئی تھی۔ گیٹ کھلا تھا اور سامنے ڈرائیو وے پر یاسمین کی گاڑی دیکھ کر اس وقت وہ یہی سوچ سکی تھی۔

"چلو اچھا ہے ممّا بھی یہاں موجود ہیں۔"

وہ بائیک باہر ہی چھوڑ کر اندر آگئی تو اچانک بدن کپکپانے لگا۔ باہر تھی تو صرف جائے پناہ تک پہنچنے کا خیال باقی تمام احساسات پر حاوی تھا اور اب سرد موسم کی شدت اپنا آپ منوا رہی تھی۔ وہ دونوں ہتھیلیاں آپس میں رگڑتے ہوئے یاسمین کو پکارنا چاہتی تھی کہ ہونٹوں سے قبل اس کی سماعتوں کے در کھل گئے تھے۔ لابی میں جہاں وہ کھڑی تھی اس کے دائیں جانب دروازہ بند تھا اور اس بند دروازے کے اندر سے ہی آوازیں آرہی تھیں۔

"تمہارا نشہ ہر شے سے زیادہ دلکش ہے یاسمین! مت پوچھو میں کتنا ترسا ہوں۔"

"او شبی! بس کرو۔"

"ماما....!" اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی تھی۔ کپکپاتے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر اس نے ذرا سی گردن موڑی۔ دروازہ بند تھا لیکن اس کی سماعتوں نے بخوبی اپنی ماں کی آواز پہچانی تھی۔ اس کی ماں جس پر وہ اندھا اعتماد کرتی تھی اس کی آواز کی لڑکھڑاہٹ، لہجے میں لٹنے کا سرور...... یکلخت اریبہ توصیف احمد کو آسمانوں سے پاتال میں لے آیا تھا۔ دھیرے دھیرے پیچھے ہٹتے ہوئے وہ اچانک پلٹ کر بھاگی تھی اور پھر...... اس نے زن سے بائیک بھگا دی۔ وہ اپنے حواسوں میں نہیں تھی۔ اسے سامنے کچھ نظر بھی نہیں آرہا تھا۔ وہ یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ وہ کہاں جا رہی ہے۔ اسے کہاں جانا ہے۔ شاید اب اماں کہیں نہیں تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے اسے مرنے کا کوئی شوق نہیں تھا اور اب اسے زندگی کی طلب نہیں تھی۔ بائیک ہوا سے باتیں کر رہی تھی جیسے ساری مسافتیں ازل تا ابد ابھی طے کرنی ہیں۔ راستے میں کتنے لوگوں نے اشارے سے اسے روکنے کی کوشش کی لیکن اسے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ پھر ایک چوراہا موڑتے ہوئے اس کی بائیک یوں بے قابو ہو کر پھسلی کہ وہ بائیک کے ساتھ دور تک قلابازیاں کھاتی چلی گئی۔ دھند تو پہلے ہی تھی، اب تو اندھیرا بھی چھا رہا تھا۔ اس کی بند ہوتی آنکھوں نے دیکھا ایک شخص اس کی طرف دوڑا چلا آرہا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

خالی ہاتھ،

گزری ہوئی باتوں کی کتنی عجیب سی تقسیم ہے
تم نے وہ کہا تھا
میں نے یہ کہا تھا
ان ہی باتوں کی
ہر بار ایک نئی سی تفہیم ہے
سنو، میری جان!
یہ تو میں بھی جانتی ہوں کہ بچھڑنا تو لازم تھا
تقدیر کی اس کہانی میں وقت ہی بڑا ظالم تھا
سچ کہوں تو
جو ہوا، ٹھیک ہی ہوا
پر جیسے ہوا، وہ ٹھیک نہ تھا
کہانی کے آخر میں
ہمارا یوں خالی ہاتھ رہ جانا
ٹھیک نہ تھا

نگہت نسیم

آگ لگی تھی سینہ سینہ، ہر شعلہ جوالا تھا
اب کے شہر میں روشنیوں کا منظر دیکھنے والا تھا

دروازوں پر پڑے ہوئے تھے ڈھیر شکستہ خوابوں کے
دالانوں میں نفرت کے آسیب نے ڈیرا ڈالا تھا

گلیوں گلیوں بھٹک رہا تھا ایک سنہرا خواب جسے
میرے بڑوں نے اپنی لاکھوں نیندیں بیچ کر پالا تھا

اپنی اپنی کشتی لے کر یوں دریا میں کود پڑے
جیسے صرف جہاز ہی اس طوفان میں ڈوبنے والا تھا

امجد یہ تقدیر تھی اس کی یا قدرت کا کھیل؛
گرا جہاں پر رات کا پنچھی، تھوڑی دیر اجالا تھا

امجد اسلام امجد

دیکھ لیتے ہیں اب اُس بام کو آتے جاتے
یہ بھی آزار چلا جائے گا جاتے جاتے

دل کے سب نقش تھے ہاتھوں کی لکیروں جیسے
نقش پا ہوتے تو ممکن تھا مٹاتے جاتے

تھی کبھی راہ جو ہم راہ گزرنے والی
اب حذر ہوتا ہے اُس راہ سے آتے جاتے

شہرِ بے مہر کبھی ہم کو بھی مہلت دیتا
اک دیا ہم بھی کسی رُخ سے جلاتے جاتے

پارۂ ابر گریزاں تھے کہ موسم اپنے
دُور بھی رہتے مگر پاس بھی آتے جاتے

ہر گھڑی ایک جدا غم ہے جدائی اُس کی
غم کی میعاد بھی وہ لے گیا جاتے جاتے

اُس کے کوچے میں بھی ہو، راہ سے بے راہ نصیر
اتنے آئے تھے تو آواز لگاتے جاتے

نصیر ترابی

اہلِ دل سے معاملہ کیجیے
اور جلنا ہے تو جلا کیجیے

گھر کے افراد بڑھتے جاتے ہیں
اپنے دل کو ذرا بڑا کیجیے

طاق میں جب کوئی چراغ نہ ہو
تب وہاں خواب رکھ دیا کیجیے

مشکلیں آتی جاتی رہتی ہیں
ان کا ہمت سے سامنا کیجیے

یہ خدا ہی کا روپ ہوتے ہیں
طائروں کی دُعا لیا کیجیے

خود کو شاعر قرار دیتے ہیں
دعویٰ داری ملاحظہ کیجیے

رنگ کا بھید کھولیے کامی
روشنی سے مکالمہ کیجیے

سید کامی شاہ

رنگ رنگ پھول

شگفتہ جاہ

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا۔

"جب دو مسلمان اپنی اپنی تلواریں لے کر ایک دوسرے سے لڑیں تو قاتل اور مقتول دونوں دوزخی ہیں۔"

میں نے عرض کیا۔" اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم قاتل تو خیر (ضرور دوزخی ہوگا) مقتول کیوں دوزخی ہوگا؟" فرمایا۔" اس کی خواہش تھی کہ اپنے ساتھی کو قتل کردے۔"

علم

حضرت علیؓ سے کسی نے پوچھا۔" علم کیا ہے؟"

آپؓ نے فرمایا۔" علم یہ ہے کہ اگر کوئی تم پر ظلم کرے تو اسے معاف کردو۔ اگر کوئی تعلقات توڑے تو تم جوڑ دو۔ کوئی تمہیں محروم کردے تو اسے نواز دو۔ قوت انتقام ہو تو عفو و درگزر سے کام لو۔ خطا کار سامنے آجائے تو سوچو اس کی خطا بڑی ہے یا تمہارا رحم۔ اور غصے میں بھی کوئی ایسی بات نہ کرو کہ بعد میں تمہیں ندامت ہو۔

ایک دروازہ

ایک بادشاہ کو خبر ملی کہ اس کے شہر میں بہت ہی پہنچے ہوئے ایک بزرگ آئے ہیں۔ بادشاہ نے ان سے ملنے کی کوشش کی لیکن ان سے ملاقات نہ ہوسکی۔ شہر کے کئی دروازے تھے۔ بادشاہ کبھی کسی دروازے کے پاس تو کبھی کسی دروازے کے پاس ان بزرگ کا انتظار کرتا۔ لیکن دوسرے دن پتا چلا کہ وہ تو کسی اور دروازے سے چلے گئے۔ آخر کار بادشاہ نے سارے دروازے بند کروادیے اور ایک دروازہ کھُلا رکھ کر وہاں ان کا انتظار کرنے لگا۔

جب ایک ہی دروازہ کھُلا رہ گیا تو بزرگ کا وہیں سے گزر ہوا۔ جب بادشاہ کی ان سے ملاقات ہوئی تو بادشاہ نے کہا۔

"اب جاکر آپ سے ملاقات ہوئی ہے، جب میں نے شہر کے سارے دروازے بند کروادیے۔"

بزرگ نے جواب دیا۔

"انسان کو رب کی راہ بھی اسی وقت نصیب ہوتی ہے جب وہ سارے دروازے بند کرکے صرف ایک دل کا دروازہ کھُلا رکھتا ہے۔"

تحریم۔ گوجرہ

نصیب والے

جھڑکیاں دینے والا، رعب جمانے والا، دھمکیاں دینے والا بھول چکا ہوتا ہے کہ وہ بھی انسان ہے انسانوں پر رعب جمانے اور انہیں جھڑکیاں دینے کا کوئی حق نہیں۔ ہر نفلی استحقاق صرف عزور نفس کا دھوکا ہے اور عزور انسان میں صرف اس وقت تک نہیں آسکتا جب تک وہ بد قسمت نہ ہو۔ نصیب والے، قسمت والے ہمیشہ عاجز و مسکین رہتے ہیں۔

(واصف علی واصف)

رضوانہ شکیل راؤ۔ لودھراں

دُعا

تمہارے شہر کی گلیوں میں سیل رنگ بخیر
تمہارے نقشِ قدم پھول پھول کھِلتے رہیں
وہ رہ گزر جہاں تم لحہ بھر ٹھہر کے چلو

وہاں پہ ابر جھکیں، آسمان ملتے رہیں
نمرہ، اقراء۔ کراچی

حضرت معروف کرخیؒ کے اقوال،

- اگر صاحب بدعت کو دیکھو کہ ہوا پر چلتا ہے تو بھی اسے قبول نہ کرو۔
- درویش وہ ہے کہ جو کسی چیز کی طمع نہ کرے۔ جب بے طلب لائے تو منع نہ کرے اور جب لے تو جمع نہ کرے۔
- عقل مند وہ ہے کہ جب اس پر کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے تو اول روز وہ ہی کرے جو کہ وہ تیسرے روز کرے گا۔
- شرکِ ظاہر بتوں کی پرستش اور شرکِ باطن مخلوق پر بھروسا رکھنا ہے۔
- جس طرح تو برائی کو ناپسند کرتا ہے اسی طرح اپنے آپ کو مدح سرائی سے بھی بچا۔
- شیطان کو سب سے پیارا بخیل مسلمان، ناپسند گنہگار سخی ہے۔

رضوانہ۔ لودھراں

پانی،

پانی پینے کے صحیح اوقات جب وہ جسم پر بہتر انداز میں اثر کرتا ہے۔

1۔ ایک گلاس صبح اٹھنے کے بعد اندرونی اعضاء کو متحرک کرتا ہے۔
2۔ ایک گلاس نہانے کے بعد خون کے پریشر کو کم کرتا ہے۔
3۔ دو گلاس کھانا کھانے کے آدھے گھنٹے پہلے ہاضمے کو بہتر کرتا ہے۔
4۔ آدھا گلاس سونے سے پہلے ہارٹ اٹیک اور دماغی امراض سے بچاؤ میں مدد کرتا ہے۔

نورین اسد۔ پشاور

شکر ہے،

لندن میں نسلی فسادات زوروں پر تھے۔ موتی سنگھ اور شیر سنگھ کو ایک سنسان علاقے میں تین گورے غنڈوں نے روک لیا اور مار مار کر انہیں ادھ موا کر دیا اور ان کی جیبوں کا صفایا بھی کر دیا۔ لٹیرے چلے گئے تو شیر سنگھ نے کراہ کر موتی سنگھ سے کہا۔

"شکر ہے ان ظالموں کی نظر میری بیلٹ میں چھپے ہوئے ریوالور پر نہیں پڑی۔ اگر وہ ریوالور دیکھ لیتے تو ہم دونوں کو ہمارے ہی ریوالور سے ختم کر دیتے۔"

اس پر موتی سنگھ کو بہت غصہ آیا اور بولا۔

"جب تیرے پاس ریوالور تھا تو تو نے انہیں گولیاں کیوں نہیں مار دیں؟"

"ارے! یہ تو مجھے خیال ہی نہیں آیا۔ آؤ! انہیں اب ڈھونڈتے ہیں۔"

کوزے میں دریا،

* جو لوگ اللہ کی رحمت پر، اللہ پر آنکھ بند کر کے یقین کرتے ہیں، جو سوال نہیں اٹھاتے، اعتراض نہیں کرتے وہ کبھی اندھیرے راستوں پر ٹھوکر نہیں کھاتے، کوئی ہوتا ہے جو انہیں سنبھال لیتا ہے۔
* اللہ سے سچی اور کامل محبت امارت کی محتاج نہیں، اللہ سے محبت کی صدا تو ہمارے چاروں جانب رقص کرتی ہے اور اس بات کا یقین دلاتی ہے کہ اللہ ہماری بے امارت محبت کا بہت محبت سے جواب دیتا ہے۔
* زندگی بند دروازہ ہی سہی مگر جو لوگ اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہوتے، ان کے لیے یہ بند دروازہ کھلنے پر کبھی مایوسی نہیں لاتا، بس اللہ کے فیصلوں پر مکمل اعتماد اور رحمت کا کامل یقین ہی تو زندگی گزارنے کا اصل مقصد ہے۔

سحر خان۔ کوئٹہ

تنقید نگار،

بہت سے لوگ دوسروں کے بخیے ادھیڑنے میں دن رات دیہاڑی سے لگے ہوتے ہیں۔ آنکھوں پر محدب شیشے لگائے، خورد بین ہاتھوں میں لیے قدیم و جدید ادب میں کیڑے نکالنے میں لگے ہوتے ہیں۔

ایک کہتا ہے
"اس میں سماجی شعور نہیں۔"
دوسرا کہتا ہے۔
"اس سے جدلی مادیت کی نفی ہوتی ہے۔"
تیسرا گرہ لگاتا ہے۔
داخلیت اور خارجیت کا پہلو نظر انداز نہیں ہونا چاہیے۔"
چوتھا پکارتا ہے
"اس سے شعور و لاشعور کا پتا نہیں چلتا۔"
ایک اور اضافہ کرتا ہے۔
"اس میں فکر کی گہرائی بھی نہیں ہے۔"
اور اس طرح سب کے سب اپنے اپنے اکھاڑے بنائے پالیاں جمائے اور دکانیں سجائے بیٹھے ہیں جونہی کوئی نیا لکھنے والا میدان میں آتا ہے، یہ ہلا بول کر اس پر پل پڑتے ہیں۔
"جانے نہ پائے!"
"لیجیو بچو کو!"
"پکڑیو لپک کر۔"
"دے۔"
"دیکھنا۔ ہلنے نہ پائے!"
اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نیا لکھنے والا اپنی عزت کے ساتھ ساتھ جان بچا کر بھاگ نکلتا ہے اور یہ خوش ہو جاتے ہیں کہ
میدان مار لیا!

(اقتباس: سرخ، سفید، سیاہ از شفیع عقیل)
آمنہ اجالا۔ ڈہرکی

ستم ظریفی،

ایک سنسان سڑک پر ایک راہ گیر نے ایک شخص کو روکا اور کہا۔

"کیا آپ ایک روپے کا سکہ عنایت کریں گے؟"

وہ صاحب بولے۔ "ضرور ضرور مگر آپ کو اس وقت اس کی کیا ضرورت پیش آگئی؟"

بات یہ ہے کہ میں اور میرا ساتھی ایک روپے کا سکہ اچھال کر یہ ٹاس کرنا چاہتے ہیں کہ ہم میں سے کون آپ کا موبائل لے گا اور کون آپ کا بٹوا لے گا۔"

صائمہ سلیم سندھو۔ گوجرہ

تصدیق،

پولیس نے ڈاکوؤں سے مقابلے کے بعد جنگل کا محاصرہ ختم کیا تو ڈی ایس پی نے انسپکٹر سے پوچھا۔

"ہماری نفری پوری ہے نا؟" انسپکٹر نے اثبات میں جواب دیا تو ڈی ایس پی پھر ذرا تشویش سے بولے۔

"تم نے اچھی طرح گنتی تو کر لی ہے نا؟"

"جی ہاں! میں نے اچھی طرح گنتی کر لی ہے۔" انسپکٹر نے وثوق سے کہا۔

"شکر ہے۔" ڈی ایس پی صاحب نے اطمینان کی سانس لی۔

"اس کا مطلب ہے کہ میں نے جس بھاگتے سائے کو گولیاں ماری تھیں۔ وہ ڈاکو ہی تھا۔"

ایک دسمبر،

ایک دسمبر میرے اندر
پتھر جیسی آنکھ کی دھرتی
اور دل سات سمندر
سوچ کی لہریں ٹھہریں ایسے
چاند دکھے بس کھنڈر
مجھ میں آن بسا دسمبر

عائشہ۔ فیصل آباد

نیا سال،

تو ہے نیا تو دکھا صبح نئی شام نئی
ورنہ ان آنکھوں نے دیکھے ہیں نئے سال کئی

دیا زورین۔ ڈگری کالج ڈہرکی

باتیں عمران اسلم سے

شاہین رشید

1 ”اصلی نام؟“
”عمران اسلم۔“
2 ”پیار کا نام؟“
”راجو بھی کہتے ہیں اور عبنی بھی کہتے ہیں۔“
3 ”تاریخ پیدائش / شہر / ستارہ؟“
”8 جولائی 1981ء / کراچی / کینسر۔“
4 ”تعلیمی قابلیت؟“
”دو بیچلرز کیے ہیں۔ ایک کامرس میں اور دوسرا فیشن ڈیزائننگ میں۔“
5 ”بہن بھائی / آپ کا نمبر؟“
”دو بڑی بہنیں، ایک بھائی اور پھر میں یعنی آخری نمبر ہے۔“
6 ”شادی؟“
”نکاح ہو گیا ہے اور آپ کا میگزین آنے تک شادی بھی ہو چکی ہو گی۔“
7 ”شوبز میں آمد؟“
”سہیل ہاشمی اور معین اختر کی سپورٹ کی وجہ سے فیلڈ میں آیا اور گھر میں والد کی سپورٹ کی وجہ سے۔“
8 ”وہ پروگرام جو وجہ شہرت بنا؟“
”پہلا پروگرام ”ثانیہ“ ڈرامہ سیریل تھا اور وجہ شہرت ”میرا نصیب“۔“
9 ”پہلی کمائی کیا تھی اور کیا کیا تھا؟“
”پہلی کمائی کے بارے میں نہ پوچھیں تو بہتر ہے۔“
10 ”صبح اٹھتے ہی کیا دل چاہتا ہے؟“
”آج کل کی مصروفیات کو دیکھ کر تو دل چاہتا ہے کہ اٹھوں اور سو جاؤں۔“
11 ”اپنا موبائل نمبر کتنی مرتبہ تبدیل کر چکے ہیں؟“
”جو نمبر شروع میں لیا وہ کافی عرصے چلا، پھر وہ نمبر چوری ہو گیا اس سے کافی پرابلمز بھی ہوئے پھر دوسرا نمبر لیا۔ اس طرح بس ایک ہی بار۔“
12 ”سفر کس پہ کرتے ہیں۔ بس، رکشا یا اپنی گاڑی؟“
”اپنی گاڑی پہ۔“
13 ”آپ کی کوئی انوکھی خواہش؟“
”چاند پر جانا چاہتا ہوں۔“
14 ”گھر والوں کی کس بات پر آپ کا موڈ خراب ہو جاتا ہے؟“
”کسی بھی بات سے نہیں۔ ہم سب بہن بھائی دوستوں کی طرح رہتے ہیں۔“
15 ”کن چیزوں پہ بہت خرچ کرتے ہیں؟“
”کھانے پینے پر اور کپڑوں پر۔“
16 ”فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کر کس چیز کا جائزہ لیتے ہیں؟“
”لوگوں کا۔ ان میں سے کردار تلاش کرتا ہوں۔“
17 ”کس کے بغیر نہیں رہ سکتے؟“
”کھانے کے بغیر۔ کھانا ہی تو زندگی ہے۔“
18 ”کس شخصیت سے خوفزدہ رہتے ہیں؟“
”اللہ کی ذات کے علاوہ کسی سے نہیں۔“
19 ”اپنی کوئی اچھی اور بری عادت بتائیں؟“
”اچھی عادت یہ ہے کہ بہت لونگ ہوں اور بہت فرینڈلی ہوں اور یہی عادت بری بھی بن جاتی ہے۔“
20 ”دن کے کس حصے میں اپنے آپ کو ترو تازہ محسوس کرتے ہیں؟“
”دن کے ہر حصے میں۔“

21 ”آدھی رات کو آنکھ کھل جائے تو؟“
”دراصل میں سوتا ہی آدھی رات کو ہوں تو آنکھ کیسے کھل سکتی ہے۔“
22 ”پاکستان میں کس چیز کی آزادی ہونی چاہیے؟“
”پاکستان میں ہر طرح کی آزادی ہی آزادی ہے۔ جمہوریت والی آزادی نہیں ہے۔“
23 ”ملک میں کون سی تبدیلی کے خواہش مند ہیں؟“
”ہر چیز ریگولیٹ ہو جانی چاہیے۔“
24 ”کس ملک کے لیے کہتے ہیں کہ کاش یہ ہمارا ہوتا؟“
”اپنے ملک میں رہ کر بہت خوش ہوں مگر ہمارے حکمرانوں سے یہ سنبھالا نہیں جا رہا۔“
25 ”اچانک چوٹ لگنے پر بے ساختہ جملہ؟“
”ماں۔“
26 ”بستر پر لیٹتے ہی سو جاتے ہیں یا کروٹیں بدلتے ہیں؟“
”منحصر ہے حالات پر۔ اگر تھکن ہو تو فوراً نیند آ جاتی ہے اور تھکن نہ ہو تو پھر مشکل سے نیند آتی ہے۔“
27 ”کھانے کے لیے پسندیدہ جگہ۔ چٹائی یا ڈائننگ ٹیبل؟“
”کہیں بھی مل جائے، کوئی مسئلہ نہیں۔ روڈ پر بھی کھا سکتا ہوں، 5 اسٹار میں بھی.... بس میرے نزدیک کھانا ایک خوب صورت عیاشی ہے۔“
28 ”آپ کا ذریعہ معاش؟“
”یہی شوبز فی الحال۔“
29 ”کون سے الفاظ زیادہ استعمال کرتے ہیں؟“
”کچھ بھی نہیں، گفتگو نارمل ہوتی ہے۔“
30 ”خواتین کب بری لگتی ہیں؟“
”خواتین تو کبھی بھی بری نہیں لگتیں اور غیر منطقی گفتگو خواہ مرد، عورت کوئی بھی کرے، مجھے پسند نہیں۔“
31 ”پیسہ کس شکل میں جمع کرتے ہیں؟“

"پیسے کی شکل میں ہی جمع کرتا ہوں۔"

32 "اگر مذہب میں ایک قتل کی اجازت ہوتی تو کس کو کرتے؟"

"کسی کو بھی نہیں، کیونکہ میں مارنے پر یقین نہیں رکھتا بلکہ زندہ درگور کرنے پر یقین رکھتا ہوں۔"

33 "بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر کیا رکھتے ہیں؟"

"میری گھڑی، میری رنگ، میرا بریسلٹ، میرا موبائل، میرا والٹ اور پی ٹی سی ایل فون۔"

34 "آپ کی ایک عادت جو گھر والوں کو پسند نہیں؟"

"یہی کہ غلط بات پر غصہ بہت زیادہ کرتا ہوں۔"

35 "اپنے لیے سب سے قیمتی چیز کیا خریدی؟"

"کچھ نہیں.....ان باتوں کو نوٹ نہیں کرتا۔"

36 "دوسرے ملک جا کر کیا باتیں نوٹ کرتے ہیں؟"

"وہاں کی ثقافت اگرچہ میں نے بیرون ملک سفر اتنا نہیں کیا، مگر انڈیا گیا تو وہاں سب کچھ اپنا اپنا سا لگا تھا۔"

37 "ایک شخصیت جو آپ کے لیے سب کچھ ہے؟"

"میرے لیے میرے ماں باپ سب کچھ تھے۔ وہ اب اس دنیا میں نہیں رہے تو اب میری بیوی میرے لیے سب کچھ ہے۔"

38 "کن چیزوں کے بغیر گھر سے نہیں نکلتے؟"

"والٹ، موبائل اور کہیں دور جانا ہے تو گاڑی۔"

39 "آپ کی زندگی عام لوگوں سے کتنی مختلف ہے؟"

"میں بہت عام سا آدمی ہوں اور عام سی زندگی گزاری ہے اور گزارنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

40 "صبح اٹھ کر پہلی خواہش کیا ہوتی ہے؟"

"کہ کہیں سے امی ابا کی آواز آجائے جو کہ نہیں آتی۔"

41 "انسان کی زندگی کا سب سے اچھا دور کون سا ہوتا ہے؟"

"ولادت کے فوراً بعد کا دور..... جب اسے اپنے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہوتا اور بے پناہ محبت اسے مل رہی ہوتی ہے۔"

42 "لائٹ چلی جانے پر بے ساختہ جملہ؟"

"اللہ سب کے حال پر رحم کرے۔"

43 "لوگ آپ سے مل کر پہلا جملہ کیا بولتے ہیں؟"

"جو ڈرامہ سیریل چل رہا ہوتا ہے اسی حساب سے مخاطب کرتے ہیں۔ "میرا نصیب" کیا تو لوگوں نے یہی کہا کہ آپ ڈرامے میں "مر" کیوں گئے۔"

44 "ہندوانہ رسموں میں آپ کی پسندیدہ رسم؟"

"کوئی بھی نہیں۔"

45 "ٹی وی آن کرتے تو سب سے پہلا چینل کون سا لگاتے ہیں؟"

"انٹرٹینمنٹ چینل، نیوز سے نفرت ہے۔"

46 "شادی کی رسموں پر خرچ کرنا اچھا لگتا ہے؟"

"نہیں..... اس فضول خرچی سے بہتر ہے کہ کسی مستحق کو پیسہ دے دیا جائے۔"

47 "خدا کی حسین تخلیق؟"

"انسان۔"

48 "اخبار میں کون سا صفحہ سب سے پہلے پڑھتے ہیں؟"

"میں اخبار ہی نہیں پڑھتا۔"

49 "حالات حاضرہ سے آپ کی دلچسپی؟"

"کچھ خاص نہیں۔ کیونکہ میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔"

50 "پرستار کا کوئی جملہ جس نے ہرٹ کیا ہو؟"

"اللہ کا شکر ہے کہ سب محبت سے ملتے ہیں۔"

51 "لوگ گرنے والوں پہ ہنستے کیوں ہیں؟"

"کیونکہ انہیں اس بات کا احساس نہیں ہوتا کہ وہ بھی اسی زمین پر کھڑے ہیں اور وہ بھی گر سکتے ہیں۔"

52 "اپنے چہرے کے خدوخال میں کیا پسند ہے؟"

"کچھ نہیں۔ میں ایک نارمل سا انسان ہوں۔ سب کچھ اچھا ہے۔"

53 "گھر کے کس کونے میں سکون ملتا ہے؟"

"ہر کونے میں امی ابا کی یادیں ہیں اس لیے ہر جگہ سکون ہی سکون ہے۔"

54 "شدید بھوک میں آپ کی کیفیت؟"

"غصہ آجاتا ہے۔"

55 "اپنے مسائل کس سے شیئر کرتے ہیں؟"

"اللہ سے۔"

56 "کوئی گہری نیند سے اٹھا دے تو؟"

"ہمارے سارے ڈائریکٹرز گہری نیند سے ہی اٹھاتے ہیں۔ پھر اٹھنا پڑتا ہے۔"

57 "پہلی ملاقات میں شخصیت میں کیا دیکھتے ہیں؟"

"انسان کو دیکھتا ہوں کہ یہ انسان میرے لیے اچھا ہے کہ نہیں اور میں اس کے ساتھ کتنا چل سکتا ہوں۔"

58 "آئینہ دیکھ کر کیا خیال آتا ہے؟"

"شکر کرتا ہوں اللہ کا۔"

59 "اپنے آپ کو کب بے بس محسوس کرتے ہیں؟"

"ہمیشہ ہی..... لیکن جب والدین کا انتقال ہوا تو بہت دکھ ہوا کہ میں ان کے لیے کچھ نہیں کر سکا۔"

60 "زندگی میں کس چیز کے لیے وقت نکالنا مشکل ہے؟"

"زندگی میں زندگی کو اچھی طرح گزارنے کے لیے وقت نکالنا مشکل ہے۔"

61 "آپ کے لیے کون جان دے سکتا ہے؟"

"میرے گھر والے اور میری بیوی۔"

62 "اگر اپنی مرضی سے زندگی گزارنے کا موقع ملتا تو؟"

"ابھی بھی اپنی مرضی سے ہی گزار رہا ہوں۔"

63 "کوئی شخص جس نے آپ کی زندگی بدل دی ہو؟"

"بہت سے، آج جس مقام پر ہوں، اس میں پہلا نام معین اختر صاحب کا ہے۔ سہیل ہاشمی اور مومنہ درید۔"

64 "جب پہلی مرتبہ نیا قلم استعمال کرتے ہیں تو کیا لکھتے ہیں؟"

"کنٹریکٹ سائن کرنے کے لیے پین کا استعمال کرتا ہوں آج کل تو۔"

65 "کوئی غلطی جس کو سوچ کر پشیمانی محسوس کرتے ہوں؟"

"نہیں، ایسی کوئی غلطی نہیں کی۔"

66 "کبھی غصے میں کھانا پینا چھوڑا؟"

"نہیں، کھانا نہیں چھوڑتا۔"

67 "کبھی سوچا کہ آج سے چند سال بعد کہاں ہوں گے؟"

"بالکل نہیں سوچا..... کل کا پتا نہیں۔"

68 "کھانا کس کے ہاتھ کا پکا ہوا پسند ہے؟"

"امی کے ہاتھ کا تھا۔ اب زیادہ تر باہر سے کھاتا ہوں۔ ویسے گھر کا کھانا ہی اچھا لگتا ہے۔"

69 "پسندیدہ کھانا؟"

"کوئی بھی، جو بہت اچھا ڈیکوریٹ کیا ہوا ہو۔"

70 "موڈ کب خراب ہوتا ہے؟"

"کوئی بھی بات جس کی کوئی وجہ ہی نہ ہو، اس پر موڈ خراب ہوتا ہے۔"

71 "تنہائی میں کس سے ہمکلام ہوتے ہیں؟"

"اللہ تعالیٰ سے۔"

72 "بھروسے کے قابل کون ہوتا ہے؟ لڑکے یا لڑکیاں؟"

"کوئی بھی نہیں۔"

73 "کیا دعا سے قسمت بدل سکتی ہے؟"

"بالکل بدل جاتی ہے۔"

74 "اپنی شخصیت میں کیا چیز بدلنا چاہتے ہیں؟"

"کچھ بھی نہیں، جیسا ہوں بہت اچھا ہوں۔"

75 "گھر آکر پہلی خواہش کیا ہوتی ہے؟"

"کہ کہیں سے امی ابا نظر آجائیں۔"

76 "موت سے ڈر لگتا ہے؟"

"نہیں۔"

77 "کون سی تقریبات میں جانا پسند نہیں کرتے؟"

"جس میں کافی غلط قسم کے لوگ ہوں۔"

78 "سائنس کی بہترین ایجاد؟"

"فون، جس پہ ہم بات کر رہے ہیں"

79 "جھوٹ کب بولتے ہیں؟"

"کوشش کرتا ہوں کہ نہ بولوں۔"

80 "سچ بولنے پر کیا ملتا ہے؟"

"گالیاں ملتی ہیں۔ آزما کر دیکھ لیں۔"

81 "تہوار جو شوق سے مناتے ہیں؟"

"عید کے تہوار۔"

82 "شوبز کی سب سے بڑی برائی؟"

"یہاں جھوٹ بہت بولا جاتا ہے۔"

83 "چھٹی کا دن کیسے گزارتے ہیں؟"

"سو کر، کھا کر، فیملی کے ساتھ گھوم پھر کر۔"

84 "شہرت کیسی لگتی ہے؟"

"ڈر لگتا ہے۔ شہرت ایک ذمہ داری بن کر میرے پاس آئی ہے اس کی حفاظت کرنی ہے مجھے۔"

85 "زندگی کب بری لگتی ہے؟"

"زندگی کبھی بری نہیں لگتی۔"

86 "انسان کا اس دنیا میں آنے کا مقصد؟"

"انسان اس دنیا میں امتحان کے لیے آیا ہے۔ اب انسان کا کام ہے کہ اس امتحان میں پورا اترے۔"

87 "کوئی لڑکی اگر آپ کو مسلسل گھورے تو؟"

"تو میں ان سے پوچھ لیتا ہوں کہ کیسی ہیں آپ۔"

88 "سارا دن میں پسندیدہ وقت؟"

"ہر وقت اچھا ہے۔"

89 "کب چیخنے چلانے کو دل چاہتا ہے؟"

"کبھی بھی نہیں۔"

90 "کس لمحے نے زندگی بدل دی؟"

"ڈرامہ سیریل "میرا نصیب" نے۔"

91 "زندگی میں کس چیز کی کمی محسوس ہوتی ہے؟"

"چیزیں تو بہت ہیں۔ بس ماں باپ کی کمی محسوس ہوتی ہے۔"

92 "نصیحت جو بری لگتی ہے؟"

"نصیحت اچھی ہو تو اچھی لگتی ہے اور غلط ہو تو بری لگتی ہے۔"

93 "غصہ کب آتا ہے؟"

"جب کوئی غیر منطقی بات کر رہا ہو اور کھانا وقت پر نہ ملے تو۔"

94 "فقیر کو کم سے کم کتنا دیتے ہیں؟"

"اس وقت جتنا ہاتھ میں آجائے۔ کوئی طے نہیں کہ اتنا ہی دینا ہے۔"

95 "کیا محبت ایک بار ہوتی ہے؟"

"عشق ایک بار ہوتا ہے۔ محبت بار بار ہوتی ہے۔"

96 "کبھی مانگ کر تحفہ لیا؟"

"کبھی نہیں۔"

97 "تحفہ لینا اچھا لگتا ہے یا دینا؟"

"دینا اچھا لگتا ہے۔ لینے پر شرمندہ ہو جاتا ہوں۔"

98 "کیا آپ اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہیں؟"

"بالکل کرتا ہوں۔ اپنا جوتا اتار کر سامنے والے کے ہاتھ میں پکڑا دیتا ہوں کہ جو سزا دینی ہے دو۔"

99 "موبائل فون کے بارے میں آپ کے تاثرات؟"

"بہترین ایجاد ہے اور بہت سے فائدے ہیں۔"

100 "اپنی کس بات پر کنٹرول نہیں ہے؟"

"بھوک پر۔"

101 "اگر آپ کی شہرت کو زوال آجائے تو؟"

"کوئی بات نہیں، خدا نے دی تھی۔ خدا نے لے لی۔"

✡

ثمینہ اکرم کی ڈائری سے

منیر نیازی عصر حاضر کے شاعر میرے علاوہ اور بہت سی باذوق اور صاحب دل قارئین کی پسند ہیں۔ لہٰذا ان کی ایک نظم آپ کی نذر۔

میری دعائیں پیچیدہ بہت ہیں
شام کا وقت ہے دعاؤں کی منظوری کا وقت ہے
میں کیسی دعاؤں کو یاد کروں
میری دعائیں پیچیدہ بہت ہیں
میرے دل میں بہت بے اثر دعائیں ہیں
بہت دعاؤں کے بجائے میرے دل میں
ایک دعا ہوتی تو اچھا ہوتا

رانیہ بلوچ کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر پروین شاکر کی یہ غزل آپ سب قارئین بہنوں کے لیے۔

پہنچے جو سر عرش تو نادار بہت تھے
دنیا کی محبت میں گرفتار بہت تھے

گھر ڈوب گیا اور نہیں آواز نہیں دی
حالانکہ مرے سلسلے اس پار بہت تھے

چھت پڑنے کا وقت آیا تو کوئی نہیں آیا
دیوار گرانے کو رضاکار بہت تھے

گھر تیرا دکھائی تو دیا دور سے لیکن
رستے تری بستی کے پُراسرار بہت تھے

ہنستی ہوئی آنکھوں کا نگر کہتے رہے ہم
جس شہر میں تو تھے پس دیوار بہت تھے

آسائش دنیا کا فسوں اپنی جگہ ہے
اس گھر میں مگر روح کے آزار بہت تھے

شبنم شمشاد کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر گلزار کی یہ خوبصورت کاو
آپ کی نذر۔

شام سے آنکھ میں نمی سی ہے
آج پھر آپ کی کمی سی ہے

دفن کر دو ہمیں کہ سانس آئے
نبض کچھ دیر سے تھمی سی ہے

کون پتھرا گیا ہے آنکھوں میں
برف پلکوں پہ کیوں جمی سی ہے

وقت رہتا نہیں کہیں ٹک کر
اس کی عادت بھی آدمی سی ہے

آئیے راستے الگ کر لیں
یہ ضرورت بھی باہمی سی ہے

خبریں وغیرہ

تبصیر نشاط

معاوضہ

وحید مراد وہ عظیم اداکار ہیں، جو وفات کے اٹھائیس سال بعد بھی اپنے پرستاروں کے دلوں میں زندہ ہیں۔ آل پاکستان وحیدی کلب کی جانب سے وحید مراد کی برسی کے موقع پر ہر سال باصلاحیت فنکاروں کو وحید مراد یادگاری ایوارڈز دیے جاتے ہیں۔ اس مرتبہ یہ ایوارڈ پروڈیوسر فیاض خان، موسیقار ذوالفقار عطرے، مصنف پرویز کلیم، اداکارہ مدیحہ شاہ کو دیے گئے، جبکہ اداکارہ بہار بیگم اور نشو بیگم کو لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اس موقع پر ایوارڈ وصول کرتے ہوئے اداکارہ نشو نے وحید مراد کو "آئی کون" قرار دیتے ہوئے اس بات پر بھی زور دیا کہ نئی نسل کو وحید مراد کے کارناموں کے بارے میں علم ہونا چاہیے۔۔۔ اور جب ایک نجی چینل کے نمائندے نے نئی نسل کو وحید مراد کے بارے میں آگاہ کرنے کی غرض سے نشو بیگم سے تاثراتی گفتگو کرنے کو کہا تو محترمہ نے حسب عادت آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے پوچھا کہ

"پیسے کتنے ملیں گے؟"

نمائندہ چونک گیا اور پوچھا۔ "کیسے پیسے؟"

اس پر نشو بیگم بگڑ کر بولیں۔ "بھئی! کسی کے بارے میں بھی بات کریں۔ میں انٹرویو کے بیس ہزار لوں گی۔"

(نشو بیگم! اتنا تو سوچ لیتیں کہ میڈیا پر آنے کا موقع انہیں اس ایوارڈز کی وجہ سے ہی ملا ہے، ورنہ انہیں کون پوچھتا ہے۔)

نقش قدم

شعیب منصور کی فلم "بول" کی پاکستان میں ریلیز

اور پھر بے مثال کامیابی زیادہ پرانی بات نہیں ہے، نہ ہی اس فلم میں عمیمہ ملک کی شان دار اداکاری لوگوں کے ذہن سے ابھی محو ہوئی ہے۔ فلم "بول" کی کامیابی کے بعد عمیمہ ملک نے اعلان کیا تھا کہ انہیں بھارتی فلموں میں کام کرنے کی کئی آفرز ہو رہی ہیں، مگر وہ کبھی بھارتی فلم میں کام نہیں کریں گی۔ جب عمیمہ سے پوچھا گیا کہ "کیا وینا ملک کی طرح کی آفرز ہیں" تو عمیمہ نے نخوت سے کہا کہ

"وہ تو راکھی ساونت جیسی ہے اور راکھی جیسی اداکارہ کا مقابلہ مادھوری سے نہیں کیا جاسکتا۔"

مگر جناب! ان بلند بانگ دعووں کے بعد عمیمہ چپکے سے بھارت پہنچ گئیں اور وہاں فلموں میں کام حاصل کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ (آفرز ملنے والا دعوا جو سچ ثابت کرتا تھا) گزشتہ تین ماہ سے عمیمہ وہیں مقیم ہیں۔

بھارت سے اڑتی اڑتی کچھ خبریں یہاں تک پہنچی ہیں کہ وینا ملک کو راکھی ساونت قرار دینے والی عمیمہ ملک وہاں کام حاصل کرنے کے لیے وہ تمام حربے استعمال کر رہی ہیں جو وینا نے کیے تھے۔ گویا عمیمہ بھی وینا کے نقش قدم پر چل نکلی ہیں۔

(عمیمہ جی! ذرا سنبھل کے۔ وینا ملک نے پاکستان کا نام جتنا "روشن" کر دیا ہے، وہی کافی ہے۔ ابھی آپ کے قدم زیادہ آگے نہیں گئے ہوں گے، بہتر ہے، یہیں سے واپس پلٹ جائیں۔)

بد مزاجی

عائشہ خان (جونیئر) خوب صورت اور باصلاحیت اداکارہ ہیں، لیکن سنا ہے کہ اداکاری کے ساتھ ساتھ بد مزاجی میں بھی ان کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ اپنے ہر ڈرامے کی ریکارڈنگ کے دنوں میں ان کا کسی سے جھگڑا نہ ہو، یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ موڈی تو اتنی زیادہ ہیں کہ سین کرتے کرتے اچانک سیٹ چھوڑ کر چلی جاتی ہیں۔ مزاج میں لاپروائی بھی بے انتہا موجود ہے۔ سین کرانے کے بعد جیولری اور لباس تبدیل کر کے ادھر ادھر پھینک دیتی ہیں۔ اس طرح چھوٹی موٹی جیولری اکثر غائب کر بیٹھتی ہیں۔ سین کے درمیانی وقفے میں باتیں کرتے ہوئے انگوٹھی یا نوزپن (نتھنی) اتار کر پھینک دینا ان کی عادت ہے، لہٰذا ان کے ساتھ کا[م] کرنے والے عقل مند پروڈیوسر اور ڈائریکٹر ایک [جیسی] چیزیں وافر تعداد میں رکھتے ہیں کہ محترمہ کب کوئی چیز گم کر بیٹھیں اور سین کا تسلسل خراب ہو جائے۔

ایک مرتبہ شوٹنگ کے بعد عائشہ خان اپنا لباس تبدیل کر کے حسب عادت لاپروائی سے پھینک گئیں۔ چند روز بعد جب سین کا تسلسل ریکارڈ ہونے کا وقت آیا تو لاکھ ڈھونڈنے کے باوجود مطلوبہ لباس نہیں ملا۔ عائشہ سے پوچھا گیا تو تڑخ کر بولیں۔

"یہ میری ذمے داری نہیں ہے۔" پھر وارڈ روب انچارج پر برس پڑیں۔

"تمام چیزوں کو سنبھال کر رکھنا آپ کا کام ہے۔ اگر میں کہیں اتار کر گئی تھی تو آپ کو اسے ڈھونڈ کر حفاظت سے رکھنا چاہیے تھا۔" (اسے کہتے ہیں۔ "الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔")

ایکا

معروف اداکارہ و ہدایت کارہ سنگیتا اپنے ساتھی

ہدایت کار سید نور کے بھارتی فلم ڈائریکٹ کرنے پر خاصی ناراض ہیں۔ انہوں نے کہا کہ
"ماضی میں سید نور خود بھی بھارتی فلموں کی پاکستان میں نمائش پر تنقید کرتے رہے ہیں۔ اب وہ خود بھارت کے لیے کام کررہے ہیں۔ ریما نے بھی اب انڈین فلموں کے حق میں بیان داغ دیا ہے کیونکہ وہ خود تو شادی کرکے فلم انڈسٹری سے جارہی ہے اور جاتے جاتے ہمارا کام خراب کررہی ہے۔ (آپ کا کام اچھا ہے تو پھر آپ کو انڈین فلموں کی کیا فکر ہے۔) ریما کو اپنے ملک اور فلم انڈسٹری سے محبت ہوتی تو وہ آج ہمارے ساتھ ہوتی۔ اسی انڈسٹری نے ریما کو ریما بنایا ہے۔"

سنگیتا نے اپنے جونیئرز پر کڑی تنقید کرتے ہوئے کہا کہ "ہم لوگوں نے ہمیشہ اپنے بڑوں کے ساتھ چلنا سیکھا ہے' نا کہ یہ 'اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد علیحدہ بنالیں۔ ہمارے زمانے میں فلم انڈسٹری میں اتحاد بہت تھا۔ اب بالکل نہیں ہے۔ (آپ تو انڈسٹری میں ابھی تک ہیں جناب!) مجھے یاد ہے' جب میں فلم انڈسٹری میں نئی نئی آئی تھی تو اس وقت ملک میں سیلاب آیا ہوا تھا۔ اس وقت ساری انڈسٹری نے اکٹھا ہوکر سیلاب کے امدادی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ ایک ہفتے کے لیے انڈسٹری بند کردی گئی تھی۔ کوئی گھر میں نہیں بیٹھا۔ سب لوگ ٹرکوں پر چڑھ کر پورے لاہور میں پھرے تھے اور متاثرین کی بحالی کے لیے چندہ جمع کیا تھا۔ اسی بہانے میں نے لاہور بھی دیکھ لیا تھا۔"
(ارے! اس سے پہلے لاہور نہیں دیکھا تھا؟)

سنگیتا کا یہ بھی کہنا ہے کہ "مجھے لگتا ہے کہ فلم انڈسٹری دوبارہ کراچی میں بنے گی اور اس میں سب لوگ یعنی پروڈیوسر ڈائریکٹر اور اداکار نئے ہوں گے۔"
(نئے ڈائریکٹر؟ تو آپ کا کیا بنے گا بھئی!)

☼ ☼ ☼

کچھ اِدھر اُدھر سے

☆ پہلی بار نواز شریف کی حکومت سڑکیں بنانے اور صنعتی علاقے بنانے کے جرم میں ختم کی گئی۔ اور دوسری حکومت ایٹمی دھماکے کرنے اور بے زمین ہاریوں کو زمینیں دینے کے جرم میں ختم کی گئی۔

(22 نومبر 2011ء وغیرہ وغیرہ... عبداللہ طارق سہیل)

☆ مشرف کا مارشل لاء' پہلا مارشل لاء تھا جو کسی فوجی سربراہ نے اپنی نوکری بچانے اور پکی کرنے کے لیے لگایا تھا۔

(غیر سیاسی باتیں... عبدالقادر حسن)

☆ منصور حلاج ہماری تاریخ کی بڑی شخصیتوں میں سے ایک ہیں۔ عام خیال یہ ہے کہ انہیں "انا الحق" کہنے کی پاداش میں پھانسی دی گئی' لیکن یہ خیال غلط ہے' منصور حلاج کا اصل جرم یہ تھا کہ وہ نوجوانوں میں سیاسی قوت کے خلاف جذبات پیدا کررہے تھے۔

(روبرو... شاہنواز فاروقی)

☆ 50ء کی دہائی میں رینڈ کارپوریشن نے ایک رپورٹ مرتب کی تھی کہ اللہ کی شریعت' خلافت اور مسلمانوں کی بالادستی کو روکنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ ان کی مذہبی پارٹیوں کو مغربی جمہوری نظام کا حصہ بنادو۔ ان کے انقلاب کے غبارے سے ہوا نکل جائے گی۔

(حرف راز... اوریا مقبول جان)

☆ یہ عجیب بات ہے کہ ہم بھارت کے پسندیدہ ترین ملک ہونے کے باوجود صرف 1650 اشیاء بھارت بھجوا سکتے ہیں' جبکہ بھارت ہمارا اب تک پسندیدہ ملک نہ ہونے کے باوجود اس سے کئی سو فیصد زیادہ 13286 اشیاء ہمیں بھجوا سکتا ہے۔ اس سے بھارت کی نیت واضح ہے۔

(سفرنامہ... حامد ریاض ڈوگر)

☆ اگر 22 اگست کو سپریم کورٹ سوموٹو ایکشن نہ لیتی اور کراچی کو رینجرز کے حوالے نہ کیا جاتا تو آج کراچی کی کیا صورت حال ہوتی ہم سب اس سے بھی واقف ہیں۔

(وغیرہ وغیرہ... عبداللہ طارق سہیل)

آپ کا باورچی خانہ

مسز زیتون فیاض

1 کھانا پکاتے ہوئے میں غذائیت اور صحت کو سب سے زیادہ اہمیت دیتی ہوں' مگر پسند و ناپسند کو بھی مدنظر رکھنا پڑتا ہے۔ ساتھ ساتھ اگر کھانے میں ورائٹی بھی ہو تو کیا ہی بات ہے۔ کھانے پکاتے ہوئے میں کوشش کرتی ہوں کہ تازہ اور صاف ستھرے اجزا استعمال کروں۔ پھل اور سبزیاں نمک ملے پانی میں دھو کر استعمال کرتی ہوں۔ گھر کے ایک حصے میں کچن گارڈن بنایا ہوا ہے' جہاں موسمی سبزیاں گاجر' مولی' بند گوبھی' بروکلی' بھنڈی وغیرہ اپنی نگرانی میں مالی سے لگواتی ہوں۔ پودینہ' ہری مرچیں' تلسی اور ہرا دھنیا تو سارا سال لگتا ہے۔ صاف ستھری اور صحت بخش سبزیاں گھر ہی میں دستیاب ہو جاتی ہیں۔ گھر کی صاف ستھری سبزیاں پکانے کا بہت لطف آتا ہے۔

2 ہمارے ہاں مہمان عموماً" اطلاع دے کر ہی آتے ہیں لیکن اگر بغیر اطلاع کے بھی آئیں تو کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔ فریزر میں کباب' نگٹس اور چکن تکہ چنکس ہمیشہ موجود ہوتے ہیں۔ چائے کے ساتھ کیک' نگٹس' نمکو وغیرہ سرو کردیتی ہوں۔ کھانے کا وقت ہو تو پاستا اور چکن کڑاہی بنانے کو ترجیح دیتی ہوں' جو ذائقے دار بھی ہوتی ہیں اور جلدی تیار بھی ہو جاتی ہیں۔ کباب فرائی کرلیتی ہوں اور گھر میں موجود سالن کے ساتھ سلاد اور رائتہ بھی بنالیتی ہوں۔

چکن پاستا

اشیا :

پاستا	ایک پیکٹ
تیل	چار کھانے کے چمچے
سویا ساس	ڈیڑھ کھانے کا چمچہ
بون لیس چکن	دو کپ
پسی کالی مرچ	حسب ذائقہ
نمک	حسب ضرورت
پاستا ساس	تین کھانے کے چمچے
چیڈر چیز	حسب ذائقہ
لیموں کا رس	ایک کھانے کا چمچہ

ترکیب :

پاستا بوائل کرلیں۔ تیل میں چکن بون لیس کالی مرچ، نمک اور لیموں کا رس ڈال کر فرائی کرلیں (موسمی سبزیاں گاجر، مٹر، شملہ مرچ اگر پسند کریں تو وہ بھی چکن کے ساتھ فرائی کرلیں) چکن فرائی ہوجائے تو پاستا ساس ڈال کر مکس کرلیں۔ ابلا ہوا پاستا، فرائی چکن میں شامل کریں۔ سویا ساس اور چیز ڈالیں اور ڈھکن ڈھک کر چولہا بند کردیں۔ پانچ منٹ بعد ٹماٹو کیچپ اور سلاد کے ساتھ سرو کریں۔

3 ناشتے میں پراٹھے، آملیٹ، اچار، بریڈ، جیم سب ہی کچھ چلتا ہے۔ فرنچ ٹوسٹ اور سینڈوچ بھی بنتے ہیں۔ اکثر اتوار کو گھی والی سویاں میوے ڈال کر بناتی ہوں اور مرغ چنے بھی اتوار کو بنتے ہیں۔ نان بازار سے منگوالیے جاتے ہیں۔ ناشتے میں ڈیٹ شیک (کھجور شربت) بھی سب کو پسند ہے۔

ڈیٹ شیک

اشیا :

کھجوریں	سات عدد
دودھ	ایک گلاس
الائچی پاؤڈر	ایک چٹکی
پسا ناریل	ایک چائے کا چمچہ
برف	حسب ضرورت

ترکیب :

کھجوریں، دودھ، الائچی پاؤڈر، ناریل بلینڈ کرلیں اور برف ڈال کر پیش کریں۔

4۔ کچن کی صفائی تو روز ہوتی ہے۔ سنک پر گندے برتن اچھے نہیں لگتے۔ سالن بناتے ہوئے ساتھ ساتھ برتن دھوتی جاتی ہوں۔ دیگچے ہمیشہ صاف ستھرے رکھتی ہوں۔ کیبنٹس بھی ہفتہ دس دن بعد صاف کرتی ہوں۔ تہواروں پر اور گرمیوں کی چھٹیوں میں تفصیلی صفائی کرواتی ہوں اور وائٹ واش بھی کرواتی ہوں۔

5۔ کھانا پکاتے ہوئے توجہ اور محنت ضروری ہے مگر یہ بھی نہیں کہ گھر میں بلینڈر اور دوسری مشینری موجود ہو، پھر بھی سل بٹے پر پیس کر خود کو تھکاؤ۔ کھانا مسالوں کے صحیح انتخاب اور صحیح تناسب کے ساتھ کم تیل میں پکایا جائے تو سب کو پسند آتا ہے۔ اللہ کا نام لے کر کھانا پکانا شروع کریں تو کھانے میں برکت ہوتی ہے۔

6۔ ہم کبھی کبھار جب گھومنے جائیں تو ڈنر باہر ہی کرتے ہیں۔ کسی خاص موقع پر باہر سے منگوا کر گھر پر بھی کھالیتے ہیں۔

7۔ کھانے کا تعلق موسم اور مزاج سے بھی ہے۔ ساون اور رمضان میں پکوڑے، سموسے، رول، املی کی چٹنی اور ہری چٹنی کے ساتھ لطف دیتے ہیں۔ گرمیوں میں دال چاول، کیری کی چٹنی، رائتہ اور سلاد کے ساتھ کھانے کا مزا آتا ہے اور ساگ اور گاجر کا حلوہ تو سردیوں میں ہی مزا دیتا ہے، مگر کبھی کبھی دل چاہے تو فریز کی ہوئی سبزیاں بھی استعمال کی جاسکتی ہیں۔

8۔ چاول پکاتے ہوئے آخر میں لیموں کا رس ڈال دیں چاول کھڑے اور نکھرے ہوئے بنیں گے۔ چاول ابالتے ہوئے سرکہ ڈالیں تو چاول جڑیں گے نہیں۔

مچھلی مسالا

اجزا :

مچھلی	آدھا کلو
میدہ	2 کھانے کے چمچے
انڈا	1 عدد
لہسن پیسٹ	1 کھانے کا چمچہ
پیاز	1 عدد (بڑی)
شملہ مرچ	2 عدد
ٹماٹو کیچپ	2 پیالی
سویا سوس	2 کھانے کے چمچے
سرکہ	4 کھانے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ
تیل	4 کھانے کے چمچے

ترکیب :

بغیر کانٹے کی مچھلی کے برابر پیس کاٹ لیں۔ نمک اور میدہ کو انڈے میں اچھی طرح مکس کرکے مچھلی کے پیس ڈیپ کرکے تل لیں۔ ایک الگ برتن میں تیل گرم کریں۔ اس میں لہسن پیسٹ، کیوبز میں کٹی ہوئی پیاز اور شملہ مرچ، ٹماٹو کیچپ، سویا ساس، سرکہ اور تھوڑا سا نمک ملاکر تھوڑی دیر تک پکائیں، پھر فرائی مچھلی ڈال کر چند منٹ تک دم دینے کے بعد اتار لیں۔ زبردست مچھلی مسالا تیار ہے۔

چکن نوڈلز سوپ

اجزا :

مرغی کا گوشت	ایک پاؤ
نوڈلز ابلی ہوئی	ایک کپ
پانی	تین گلاس
نمک	حسب ذائقہ
چائنیز نمک	حسب ذائقہ
پسی کالی مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
سویا ساس	ایک کھانے کا چمچہ
سرکہ	ایک کھانے کا چمچہ

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

کارن فلور	دو کھانے کے چمچے
پودینہ	حسب ضرورت

ترکیب :

چکن کو پانی اور نمک ڈال کر ابال لیں۔ جب اچھی طرح گل جائے تو چکن نکال کر ریشہ کرلیں اور دوبارہ یخنی میں ڈال دیں۔ اگر ضرورت ہو تو مزید پانی ڈال دیں اور پکنے کے لیے رکھ دیں۔ جب ایک ابال آجائے تو پسی کالی مرچ، نمک، چائنیز نمک، سویا سوس اور سرکہ ڈال کر پکائیں۔ پھر اس میں نوڈلز بھی ملادیں۔ کارن فلور کو آدھا کپ پانی میں گھول کر یخنی میں شامل کرنے کے بعد چند منٹ تک پکائیں۔ سوپ تیار ہے۔ پیالے میں ڈال کر اوپر سے پودینے کے پتے چھڑک کر سویا ساس کے ساتھ پیش کریں۔

ایگ فرائیڈ رائس

اجزا :

باسمتی چاول	1 کلو
انڈے	4 عدد

ہری پیاز کے پتے	ایک پیالی
شملہ مرچ	3عدد
گاجر	2عدد
پسی ہوئی سفید مرچ	ایک چائے کا چمچہ
تل کا تیل	چند قطرے
زردے کا رنگ	چٹکی بھر
چائنیز نمک	حسب ذائقہ
سویا سوس	دو کھانے کے چمچے
سفید سرکہ	دو کھانے کے چمچے
لہسن کے جوے	باریک کٹے ہوئے
نمک	حسب ذائقہ
تیل	آدھی پیالی

ترکیب :

ایک بڑی دیگچی میں چاول دو کنی ابال لیں۔ ساتھ میں ایک کھانے کا چمچہ سفید سرکہ اور نمک ڈال دیں۔ جب دو کنی ابل جائیں تو پانی نتھار کر دم پر رکھ دیں۔

جب دم آجائے تو دیگچی سے نکال کر اخبار پر پھیلا دیں۔ اس طریقے سے چاول خشک اور خستہ رہتے ہیں۔ ایک کڑاہی میں تیل گرم کریں۔ لہسن ڈال کر سنہری کرلیں۔ انڈوں کو پھینٹ کر زردے کا رنگ ملائیں، پھر تیل میں ڈال کر جلدی جلدی چمچہ چلائیں۔ جب انڈوں کے ٹکڑے بن جائیں تو سبزیاں (باریک لمبائی میں یا چوکور کٹی ہوئی) سویا سوس' چائنیز نمک ڈال کر بھون لیں اب اس میں چاول ڈال دیں۔ دونوں ہاتھوں میں دو چمچ لے کر تیز آنچ پر چاول اوپر سے نیچے کریں۔ جب سب چیزیں اچھی طرح مکس ہو جائیں تو تل کا تیل ڈال کر گرم گرم کھانے کے لیے پیش کریں۔

دم کے کباب

اجزا :

مٹن	ایک کلو
دہی	ایک پیالی
خشخاش (پسی ہوئی)	ایک کھانے کا چمچہ
ادرک لہسن پیسٹ	دو کھانے کے چمچے
ہری مرچ	چار عدد
تیل	آدھی پیالی
کچا پپیتا	ایک کھانے کا چمچہ
پسی کالی مرچ	آدھا کھانے کا چمچہ
پسی لال مرچ	ایک کھانے کا چمچہ
لیموں	چار عدد
نمک	حسبِ ذائقہ

ترکیب :

گوشت کی چھوٹی چھوٹی بوٹیاں کرلیں اور ہڈی بالکل نکال دیں اور اچھی طرح دھو کر ایک جگہ پر پھیلا کر رکھ لیں۔ کسی بھاری چھری کے ساتھ ہلکا ہلکا کچل لیں پھر سارے مسالے اچھی طرح لگا کر دو سے ڈھائی گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ ایک دیگچی میں مسالا ملا ہوا گوشت اور تیل ڈال کر ہلکی آنچ پر پکنے دیں۔ جب گوشت کا پانی سوکھنے لگے اور گوشت گل جائے تو پکا ہوا گوشت ایک لگن میں پھیلا دیں۔ ایک چمچہ گھی اس کے اوپر ڈالیں اور ہلکی آنچ پر توا رکھ کر لگن اس کے اوپر رکھ دیں پھر ڈھکن ڈھانک دیں۔ ڈھکن کے اوپر چار پانچ دہکتے ہوئے کوئلے رکھ دیں۔ دس سے پندرہ منٹ بعد مزیدار بوٹی کباب تیار ہیں۔ گرم گرم پراٹھوں کے ساتھ پیش کریں۔

عدنان

نفسیاتی ازدواجی الجھنیں

بہت سے خطوط ایسے آتے ہیں جن میں بہنیں خود کو بدنصیب لڑکی سمجھتی ہیں لکھتی ہیں یا کسی قسم کے وہم گناہ کی وجہ سے ڈر اور خوف میں مبتلا ہوتی ہیں۔

آپ لوگوں نے کبھی سوچا ہے' اس حقیقت کا اندازہ ہے آپ کو کہ قدرت نے آپ کو کتنی نعمتوں سے نوازا ہے۔ آپ کو آنکھیں دی ہیں۔ ہاتھ پیر دیے ہیں۔ صحت دی ہے۔ آپ معذور نہیں ہیں۔ محتاج نہیں ہیں۔ آپ کو والدین جیسی نعمت دی ہے پھر بھی آپ خود کو بدنصیب کہتی ہیں؟

جہاں تک قدرت کی طرف سے سزا اور گناہ کا تعلق ہے تو جب آپ نے توبہ کرلی تو آپ گناہوں سے پاک ہو گئیں۔ توبہ کرنے والا ایسا ہی ہے جیسے اس نے کبھی گناہ کیا ہی نہ ہو۔ آپ یہ وہم دل سے نکال دیں کہ آپ کی ناکامی کا سبب اللہ تعالیٰ کی ناراضی ہے۔ اللہ تو نہایت مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔ وہ اپنے بندوں سے بہت محبت کرتا ہے۔

حسن و خوب صورتی' دولت' شہرت' اہم ضرور ہیں لیکن ضروری نہیں کہ اگر یہ چیزیں آپ کے پاس نہیں ہیں تو آپ کو زندگی میں کوئی خوشی حاصل نہ ہو۔ اللہ پر بھروسا رکھیں۔ کامیابی اور خوشی آپ کے مقدر میں ہے تو آپ کو ضرور ملے گی۔

ڈپریشن

ہمارے ہاں آج کل اکثر لوگوں کو یہ کہتے سنا ہے کہ مجھے ڈپریشن ہو رہا ہے۔ جب ان سے پوچھا جاتا ہے کہ کیا ہو رہا ہے تو بتا نہیں پاتے۔ دراصل ڈپریشن کا مطلب ہے' افسردگی' پژمردگی یا بددلی۔ لوگ یا تو اس کا علاج ہی نہیں کرتے یا پھر ڈاکٹر کے پاس جا کر صحیح صورت حال نہیں بیان کرپاتے۔

سب سے پہلے تو یہ بات دیکھنے کی ہے کہ آپ کو کب سے ڈپریشن ہے۔ یعنی آپ کی افسردگی یا بددلی کب سے پرورش پا رہی ہے' ہو سکتا ہے کہ مہینوں سے ایسا ہو رہا ہو۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کی طبیعت میں ہی افسردگی ہو یا پھر آپ کی زندگی میں کوئی واقعہ یا واقعات ایسے ہوئے ہوں' جنہوں نے آپ کو افسردہ بنا دیا ہو۔ آپ اندازہ کریں کہ بیماری کی مدت کتنی ہے؟ اگر بیماری کی مدت طویل ہے تو اس پر چند گھنٹوں میں قابو نہیں پایا جاسکتا۔

ڈپریشن (افسردگی' پژمردگی اور بددلی) ایک بیماری ہے۔ جتنے دن تک آپ اسے پالتے رہتے ہیں' اسی حساب سے اس کا علاج ہوتا ہے۔ بیماری کی جڑیں جتنی گہری ہوں گی' اتنا ہی وقت علاج میں لگے گا' بعض صورتوں میں تین چار دن یا ہفتہ دس دن بھی لگ سکتے ہیں' لیکن یہ بیماری لاعلاج نہیں ہے کوشش یا دواؤں سے ٹھیک ہو سکتی ہے۔

س۔ الف

جس طرح ہر پھول کی خوشبو جدا اور رنگ مختلف ہوتا ہے۔ اس طرح آدمی کا مزاج اور طبیعت علیحدہ ہوتی ہے۔ آپ کے شوہر جذبات کا اظہار زبان سے کرنے کے عادی نہیں ہیں۔ اس قسم کے لوگ دوسروں کے لیے

بہت گہرے جذبات رکھتے ہیں۔ بہت محبت کرنے والے ہوتے ہیں۔ لیکن وہ زبان سے اظہار کرنا پسند نہیں کرتے یا یوں سمجھ لیں کہ وہ لفظوں میں اظہار پر قادر نہیں ہوتے۔

ایک بات میں آپ کو بتادوں کہ بہت زیادہ لفاظی کرنے والے یا زبان سے محبت کا اظہار کرنے والے لوگ ضروری نہیں کہ دل میں بھی ایسی ہی محبت رکھتے ہوں۔

آپ کا خط پڑھ کر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ آپ کے شوہر آپ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ انہیں آپ کا خیال اور قدر بھی ہے۔ بس ان کی طبیعت عام لوگوں سے قدرے مختلف ہے۔ اس بات کے قوی امکانات ہیں کہ ایک دو سالوں بعد جب بچے ہو جائیں تو ان کے مزاج میں قدرے تبدیلی آجائے گی۔

بہرحال میں آپ کو یہی مشورہ دوں گا کہ آپ اس بات کو مسئلہ نہ بنائیں۔ یہ اتنی اہم بات نہیں ہے۔ خدا کا شکر ادا کریں کہ آپ کو ایک اچھا شوہر نصیب ہوا ہے۔ وہ یقیناً "ایک اچھا آدمی ہے اور اچھا شوہر ثابت ہوگا۔ اِن شاءاللہ

ر۔ بھکر

اچھی بہن! آپ زندگی میں بہت کچھ کرنا چاہتی ہیں۔ کچھ بننا چاہتی ہیں لیکن جب پڑھنے بیٹھتی ہیں تو آپ کو لگتا ہے کہ آپ کو پڑھنے کا شوق نہیں۔ آپ نے یہ نہیں لکھا کہ آپ نے کون سے مضامین کا انتخاب کیا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے جو مضامین آپ نے لیے ہوں' ان میں آپ کو دلچسپی نہ ہو۔ جن مضامین میں دلچسپی ہو ان کا ہی انتخاب کرنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے کہ جب آپ پڑھنے بیٹھتی ہوں تو آپ کو مضامین مشکل لگتے ہوں' آپ پڑھائی کرتے وقت جو بھی مضمون ہو' اس کے مشکل حصوں پر نشان لگالیں اور ممکن ہو تو کسی سے مدد لے کر ان کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ اس طرح وہ اسباق آپ کے ذہن نشین ہو جائیں گے اور آپ کا پڑھائی سے دل اچاٹ نہیں ہو گا۔

اس بات کا یقین رکھیں کہ آپ کی ذہانت میں کوئی کمی نہیں ہے اور آپ پڑھ سکتی ہیں۔ بازو شل ہو[illegible] طبیعت کی خرابی خوف کی وجہ سے ہے۔ خوف دور ہو گا تو صحت بہتر ہو جائے گی۔ اچھی اور متوازن غذا کے ساتھ ڈاکٹر کے مشورے سے کوئی فوڈ سپلیمنٹ بھی لے لیں۔

ش۔ گ (بے بس بہن)

گھر میں غربت' بدحالی سے آپ پریشان تھیں' اس پر آپ کی بہن کو طلاق ہوئی اور اس کے شوہر نے پاگل ہونے کا الزام لگایا تو آپ مزید ذہنی دباؤ اور خوف کا شکار ہو گئیں۔ کبھی کبھی جب ذہن پر بہت بوجھ یا دباؤ ہو تو انسان اس سے باہر نکلنے کے لیے فرار کی راہ اختیار کرتا ہے۔ آپ نے خیالات کے دباؤ سے فرار کے لیے خود کلامی کی راہ اختیار کی' پھر آپ نے اس ڈر سے لوگوں سے ملنا بھی چھوڑ دیا کہ کہیں آپ کی یہ کمزوری کسی کے سامنے نہ آجائے۔ اس وجہ سے تنہائی کا شکار ہوئیں اور خود کلامی کی عادت میں بھی اضافہ ہو گیا۔

اچھی بہن! یہ بات دل سے نکال دیں کہ آپ ذہنی مریض ہیں۔ آپ بی اے تک تعلیم حاصل کرچکی ہیں۔ آپ کا خط انتہائی صاف اور مربوط ہے۔ ذہنی مریض ہوتیں تو ایسا خط نہ لکھ سکتیں۔ آپ اللہ پر بھروسا رکھیں۔ اِن شاءاللہ گھر کے حالات ہمیشہ ایسے نہیں رہیں گے۔ جب بھی تنہا ہوں' درود شریف یا لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم کی تسبیح پڑھتی رہیں۔ ان کے ورد کی وجہ سے اللہ نے چاہا تو آپ کی پریشانیاں دور ہو جائیں اور خود کلامی کی عادت سے بھی چھٹکارا حاصل کرلیں گی۔

رمت الصبور

نگہت جمال...... شکار پور

س : سردی آتے ہی مجھے بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ چہرے پر سفید دھبے نمایاں ہو جاتے ہیں۔ ہاتھ پیر پھٹنے لگتے ہیں۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جم جاتی ہیں۔ بال روکھے اور بے جان ہو جاتے ہیں۔ اگر آپ مجھے ان تمام مسائل کا حل بتا دیں تو میں بھی سردی کا موسم "انجوائے" کرسکوں گی۔

ج : آپ کو جن مسائل کا سامنا ہے۔ یہ موسم سرما کے عام مسائل ہیں۔ سرما کے موسم میں بہت سی بہنیں ان مسائل کا شکار ہوتی ہیں۔ خشک ہوا ہماری جلد پر اثر انداز ہوتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہم موسم سرما میں پانی کم پیتے ہیں موسم سرما میں غذا کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے۔ یاد رکھیے! جس موسم میں جو پھل آتے ہیں۔ ان میں اس موسم کے لحاظ سے افادیت ہوتی ہے۔ موسم سرما میں کینو، مالٹا اور موسمبی ضرور استعمال کریں۔ اس میں موجود "وٹامن سی" جلد کے لیے بے حد فائدہ مند ہے۔ آپ کے مسائل کا حل حاضر ہے۔

چہرے کے لیے

چہرے پر سفید دھبے نمایاں ہونے کی وجہ چہرے کی جلد کا خشک ہونا ہے اور اس بات کا اشارہ بھی ہے کہ آپ متوازن غذا نہیں استعمال کر رہی ہیں۔

اگر ممکن ہو تو ڈاکٹر کے مشورے سے ملٹی وٹامنز ٹیبلٹ استعمال کریں۔

روزانہ رات کو سونے سے پہلے اچھی سی کولڈ کریم لگائیں۔ روزانہ یا ہفتے میں تین بار بالائی اور شہد کا پیسٹ بنا کر چہرے پر لگائیں۔ صابن کا استعمال کم کریں دہی یا دودھ کے ساتھ بیسن کا پیسٹ بنا کر لگانے سے بھی جلد کی خشکی دور ہو جاتی ہے۔ ایک چمچہ دہی یا دودھ میں آدھا چمچہ بیسن ملا کر پیسٹ بنا لیں اور اس کو چہرے پر لیپ کر لیں۔ دس منٹ بعد چہرہ پانی سے دھولیں۔ خشکی دور ہو جائے گی۔ چہرے پر موئسچرائزر ضرور لگائیں۔

ہونٹوں کے لیے

ہونٹوں پر خشکی کی وجہ سے پپڑی آتی ہے۔ آپ رات کو باقاعدگی سے گلسرین لگائیں۔ گائے کا کچا دودھ ہونٹوں پر لگانا بہت مفید ہے۔ بالائی لگانے سے بھی ہونٹوں کی خشکی دور ہو جاتی ہے۔

ایڑیوں کا پھٹنا

چار چمچے گلسرین میں ایک لیموں کا عرق ملا لیں۔ دو چٹکی پسی ہوئی پھٹکری ملا لیں۔ دن میں تین بار لگائیں۔

رات سونے سے پہلے چار کپ گرم پانی میں ایک چمچہ نمک اور ایک چمچہ سرسوں کا تیل ملا لیں۔ دس منٹ تک دونوں پیر اس محلول میں رکھیں۔ پھر جھانویں سے رگڑ کر صاف کر لیں۔ اس کے بعد پاؤں خشک کر کے اچھا سا باڈی لوشن لگائیں۔ اگر باڈی لوشن نہ ہو تو گلسرین اور عرق گلاب کا محلول بنا کر رکھ لیں۔ سونے سے پہلے پیروں پر لگائیں۔

بالوں کے لیے

دہی میں ایک چمچہ ناریل کا تیل ملا کر اچھی طرح پھینٹ لیں۔ سر دھونے سے آدھا گھنٹہ پہلے اس کو اچھی طرح سر اور بالوں پر لگائیں پھر سر دھولیں بال چمک دار ہو جائیں گے۔ کچھ لوگوں کو دہی کے استعمال سے خشکی بڑھ جاتی ہے۔ ان کے لیے مشورہ ہے کہ ناریل کے تیل میں لیموں کا رس ملا کر اس سے سر کی خوب مالش کریں۔ ایک گھنٹے بعد سر دھولیں۔

✡